مردِ حُر، غازی، مجاہد حق پرست وفضلِ حق
تھا کتابِ حُرّیت کا بے گماں پہلا ورق

باغیِ ہندوستان

مؤلف: مولانا محمد فضلِ حق خیرآبادی
(وفات: ۱۲۷۸ھ جزیرہ انڈمان)

مترجم: عبدالشاہد خاں شروانی
وفات: ۱۴۰۴ھ، علی گڑھ

Printed By: مکتبہ قادریہ ○ لاہور

الثورۃ الہندیۃ

باغی ہندوستان

مؤلف : مولانا محمد فضل حق خیرآبادی

(وفات : ۱۳۷۸ھ جزیرہ انڈمان)

مترجم : عبدالشاہد خاں شروانی

(وفات : ۱۳۰۴ھ علی گڑھ)

مکتبہ قادریہ ○ لاہور

کتاب : الثورۃ الھندیۃ (باغی ہندوستان)
تصنیف : علامہ محمد فضل حق خیرآبادی
ترجمہ وتقدیم : عبدالشاہد خان شروانی
مقدمہ اور اسکے متعلقات : " " "
ابتدائیہ اور ضمیمہ : علامہ محمد عبدالحکیم شرف قادری
طبع چہارم : المجمع الاسلامی مبارکپور (انڈیا)
طبع پنجم : جمادی الاخری ۱۴۱۸ھ نومبر ۱۹۹۷ء
قیمت : [illegible]

ملنے کا پتہ

مکتبہ قادریہ، داتا دربار مارکیٹ، لاہور

مورخ، غازی مجاہد حق پرست و فضل حق
تھا کتاب حریت کا بے گماں پہلا ورق

- جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں فرنگی سامراج کے ظلم و بربریت کے لرزہ خیز واقعات اور خونی داستان،
- مجاہدین اسلام کی جلا وطنی، حبس دوام، مردوں، عورتوں اور بچوں کا قتل عام، پھانسیاں اور کالے پانی کی سزا
- سینوں میں مچلتی، تڑپتی، آزادی کی چنگاری کو ہوا دینے والے سر بکف، سرفروش مجاہد، شہید تحریک آزادی علامہ محمد فضل حق خیر آبادی کے بے مثال علمی، ادبی اور مجاہدانہ کارنامے،
- سلسلہ خیر آبادی کے جلیل القدر علماء کے مفصل حالات زندگی،
- علامہ محمد فضل حق خیر آبادی کے مقدمہ اور اس کے متعلقات کی تفصیل پر مشتمل نیا ضمیمہ۔

وہ امامِ فلسفہ وہ نازشِ علم و سخن

از جناب امیر البیان سہروردی

وہ امامِ فلسفہ وہ نازشِ علم و سخن
جس نے زندہ کر دیا تھا قصۂ دار و رسن

موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہنستا رہا
اللہ اللہ جنگِ آزادی کے حُر کا بانکپن

زندگی اس کی سراپا سوز و سازِ عشق تھی
دانش و حکمت میں حاصل تھا اسے معراجِ فن

دیوِ استبداد اس سے لرزہ براندام تھا
اس کی شمشیرِ نگہ سے کانپتا تھا اہرمن

سامراجی طاقتوں کا توڑ کر زورِ جنوں
اس نے پیدا کی تھی آزادی کی ہر دل میں لگن

اس نے سمجھایا "نہیں ممکن نظیرِ مصطفےٰ"
گونجتا ہے آج تک یہ نعرۂ باطل شکن

کانپ اٹھا اس کے فتووں سے فرنگی سامراج
اس کے نعروں سے ہوئے بیدار شیرانِ وطن

وہ خطیبِ حریت، شعلہ نوا، جوش آفریں
جامعِ دہلی کو گرماتا رہا جس کا سخن

اس کا وہ فرزند[1] فاضل، اس کی سچی یادگار
عاشقِ ہیرِ عرب، عبدِ خدائے ذوالمنن

ہند میں روشن کیا جس نے چراغِ فلسفہ
پیکرِ علم و ہنر، ظلمت میں شمعِ انجمن

آسمانِ اہلِ سنّت کا درخشاں آفتاب
ہند کے ظلمت کدوں پر ہو رہا جلوہ فگن

مردِ حر، غازی، مجاہد، حق پرست و فضلِ حق
تھا کتابِ حریت کا بے گماں پہلا ورق

(اضافہ از ناشر)

(رضائے مصطفیٰ ۹ صفر ۱۳۸۸ھ)

---

[1] علامہ محمد عبد الحق خیر آبادی۔

فہرست

مضامین	صفحہ

حرفِ آغاز

اسلاف کے زرّیں کارناموں کو منظرِ عام پر لانے کی کوشش کسی بھی قوم کی زندگی کی علامت سمجھی جاسکتی ہے، اسی سے قوتِ عمل میں اضافہ ہوتا ہے اور منجمد حلقوں میں تحریک کی برقی رَو دوڑ جاتی ہے۔ غیر منصف مؤرخین اور اہلِ قلم نے نہ صرف اپنے اکابر کے جھوٹے سچے کارناموں کو پورے زور شور سے پھیلایا بلکہ اکابرِ اہلِ سنت کے قابلِ فخر کردار کو مشتبہ اور داغدار بنانے کے لئے زورِ قلم صرف کیا۔ حیرت ہے کہ مخالفین کے یک طرفہ جارحانہ حملوں کے باوجود ہمیں مجاہدین اہلسنت کی حمایت اور دفاع کی توفیق نصیب نہ ہوئی، ضرورت ہے کہ اہلِ علم و قلم حضرات کا بورڈ قائم کیا جائے جو ماحول کی ضروریات کے مطابق لٹریچر پیش کرے اور کامل تحقیق و جستجو کے بعد عمائدینِ اہلِ سنت کی عالمانہ اور مجاہدانہ خدماتِ جلیلہ سے عوام و خواص کو روشناس کرائے۔

للہ الحمد کہ مکتبہ قادریہ لاہور نے سراپا اخلاص، اہلِ علم و فکر حضرات کی سرپرستی میں کام شروع کر دیا ہے، انشاء اللہ العزیز مستقبلِ قریب میں ایسا لٹریچر پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی جس سے علمی، اعتقادی، مذہبی اور تاریخی ضرورت پوری ہو جائے۔ اس سلسلے کی ابتدائی کڑی، خاتم الحکماء علامہ فضلِ حق خیر آبادی کی حیات پر سب سے پہلی مبسوط کتاب "باغی ہندوستان" پیشِ خدمت ہے۔ امید ہے کہ علمی حلقوں میں یہ کتاب پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جائے گی اور اربابِ بصیرت اپنے مفید مشوروں سے ہماری راہنمائی فرمائیں گے۔

علم و فضل موافق و مخالف اس بات پر متفق ہیں کہ علامہ محمد فضلِ حق خیر آبادی کشورِ علم کے تاجدار اور دورِ آخر میں منطق و فلسفہ کے مسلّم الثبوت امام تھے۔ تیرہ سال کی عمر میں اس دور کے تمام مروّجہ علوم سے فارغ ہو کر مسندِ تدریس کو زینت بخشی۔ حافظہ اس غضب کا تھا کہ چار ماہ اور کچھ دنوں میں قرآن پاک حفظ کر لیا[1]، اور علم و فضل میں وہ مقام حاصل کیا جہاں تک معاصرین میں سے کوئی نہ پہنچ سکا،

[1] عبد الاول جونپوری، مولانا: مقدمہ مفید المفتی، ص ۱۳۹

سرسید لکھتے ہیں :-

"جمیع علوم و فنون میں یکتائے روزگار ہیں اور منطق و حکمت کی تو گویا انھیں کی فکرِ عالی نے بنا ڈالی ہے۔ علمائے عصر بل فضلائے دہر کو کیا طاقت ہے کہ اس سرگروہِ اہلِ کمال کے حضور میں بساطِ مناظرہ آراستہ کرسکیں۔ بارہا دیکھا گیا کہ جو لوگ آپ کو یگانۂ فن سمجھتے تھے جب ان کی زبان سے ایک حرف سُنا، دعوائے کمال کو فراموش کرکے نسبتِ شاگردی کو اپنا فخر سمجھے" [1]

منشی محمد جعفر تھانیسری لکھتے ہیں :

"مولوی فضل حق معقولی خیرآبادی جو اس زمانے میں حاکمِ اعلیٰ شہر دہلی کے سررشتہ دار اور علمِ منطق کے پتلے اور افلاطون و سقراط و بقراط کی غلطیوں کی تصحیح کرنے والے تھے۔" [2]

علامہ محمد فضل حق خیرآبادی معقول و منقول میں متبحر فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ باکمال شاعر بھی تھے۔ عربی میں چار ہزار اشعار آپ سے یادگار ہیں۔ علّامہ کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں یا تو سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مدح و ثنا ہے یا کفار اور بدمذہبوں کی مذمت۔ مولانا کا بلند پایہ کلام اس لائق ہے کہ اسے عربی ادب کے نصاب میں شامل کیا جائے۔ مولانا محمد الدین لکھتے ہیں :-

"قصائدِ غرا آپ کے امرأ القیس اور لبید کے قصائد پر فوقیت رکھتے ہیں، نظم و نثر میں آپ کو اس قدر مہارت تھی کہ بلا مبالغہ شاید سلف و خلف میں چند آدمی آپ کے ہم پلّہ ہوئے ہوں گے۔" [3]

علّامہ فضلِ حق اور غالب مرزا غالب دہلوی جن کی نظر میں بڑے بڑے شعرا بھی نہ جچتے تھے شعر و سخن میں علّامہ فضل حق خیرآبادی سے نہ صرف مشورہ کرتے تھے بلکہ ان کی اصلاح کو بطیبِ خاطر قبول بھی کرتے تھے، علّامہ ہی کے ایما پر غالب نے مشکل پسندی کو ترک کیا تھا، مؤلفِ

---

[1] سرسید۔ مقالات سرسید حصہ شانزدہم (مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور) ص ۱۴۸
[2] محمد جعفر تھانیسری : حیات سید احمد شہید (سوانح احمدی) مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی، ص ۳۰۷
[3] محمد الدین مولانا : روضۃ الادباء، ص ۱۴۸

آبِ حیات کے مطابق موجودہ دیوانِ غالب، علّامہ اور مرزا خانی ہی کا انتخاب ہے۔ علّامہ نے نہ صرف غالب کی ادبی راہنمائی کی بلکہ اقتصادی مشکلات حل کرنے میں بھی مرزا غالب کی حتی الوسع امداد فرمائی۔ علّامہ کے احسانات کا اثر غالب کے دل پر بہت گہرا تھا جس کا اندازہ مرزا غالب کی تحریرات سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔ علّامہ کی شہادت کے بعد غالب نے شیخ لطیف احمد کو ایک خط لکھا جس میں علّامہ سے گہری عقیدت کی عکاسی اور روحانی درد و کرب کا نمایاں اظہار ہے، لکھتے ہیں:-

"فخرِ ایجاد و تکوین مولانا فضلِ حق ایسا دوست مر جائے، غالب نیم مردہ، نیم جاں رہ جائے ؎

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی — موت آتی ہے پر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی [1]

شیخ محمد اکرام، غالب پرستی میں یہاں تک کہہ گئے:

"یہ صحیح ہے کہ مولوی فضلِ حق کی صحبت سے انہیں (مرزا غالب کو) فائدہ ہوا لیکن ادب اور حکمت کی جن بلندیوں پر مرزا پہنچے وہاں فضلِ حق یا شیفتہ کیسے ساتھ دے سکتے تھے۔" [2]

پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے اس کا سختی سے نوٹس لیا ہے اور واضح الفاظ میں شیخ اکرام کی غلط فہمی کی نشاندہی کی، چنانچہ لکھتے ہیں:-

"اب شیخ محمد اکرام (ایم۔ اے، سابق آئی۔ سی۔ ایس، حال سی۔ ایس۔ پی) کو کوئی کیونکر سمجھا سکتا ہے کہ ادب و حکمت کی جن بلندیوں پر مولانا فضلِ حق خیرآبادی پہنچے، غالب ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی حیثیت مولانا کے سامنے طفلِ مکتب سے زیادہ نہیں ہے ؎

چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک

"جو شخص "نمود" اور "ثبوت" میں بھی امتیاز نہ کر سکے اسے خاتم الحکماء مولانا فضلِ حق مرحوم

---

[1] نادم سیتاپوری: غالب نام آورم، ص ۹۳ (بحوالہ ماہنامہ اردوئے معلّٰی علی گڑھ، دسمبر ۱۹۷۰ء)

[2] محمد اکرام، شیخ: حکیم فرزانہ، ص ۵۲۔

پر فضیلت دینا شیخ صاحب ہی کا حوصلہ ہے۔ اگر اکرام صاحب مولانا کا "حاشیہ بر قاضی مبارک" پڑھ لیتے تو اس جسارت کا ارتکاب ہرگز نہ کرتے۔ سچ تو یہ ہے کہ:

"جب تک فضل حق شامل نہ ہو انسان مولانا فضل حق کے مرتبہ سے آگاہ نہیں ہو سکتا"۔ [۱]

مرزا حیرت کی غلط بیانی

حاشیۂ قاضی کی بات آگئی تو بقول نادم سیتاپوری مشہور "منکرِ حقائق" مرزا حیرت دہلوی کا چھوڑا ہوا ایک شگوفہ بھی ملاحظہ ہو، لکھتے ہیں:

"مولوی امیر احمد صاحب مرحوم نے مولوی فضل حق صاحب کی تصانیف (حواشی اشعار وغیرہ) پر تیرہ سو اعتراض کئے ہیں اور اس رسالہ کا نام تیرہ صدی رکھا ہے، مولوی شبلی صاحب نعمانی نے ان کثیر التعداد اعتراضوں کا جواب دینا چاہا تھا مگر بن نہ پڑا"۔ [۲]

یہ درست ہے کہ بعض علماء نے حاشیۂ قاضی پر کچھ اعتراض کئے تھے لیکن علامہ نے ان اعتراضات کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ مولوی محمد قاسم نانوتوی (مصنف تحذیر الناس) لکھتے ہیں:

"مولانا فضل حق صاحب مرحوم و مغفور کے حاشیۂ قاضی پر بعض فضلاء وقت نے کچھ اعتراض لکھے تھے، مولانا نے دیکھا اور لوگ امیدوار تحریر جواب تھے پر آپ نے کچھ نہ لکھا اور یہ فرمایا کہ اس کے جواب بھی قاضی کے حاشیہ ہی میں ہیں"۔ [۳]

لیکن تیرہ صدی والا مفروضہ محض مرزا حیرت کی اختراع ہے۔

اس سلسلے میں پروفیسر محمد ایوب قادری کا ایک مکتوب پوری طرح حقیقتِ حال کو بے نقاب کرتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"میں نے کتاب حیاتِ طیبہ (سوانح شاہ اسمٰعیل شہید) دیکھی اور

---

[۱] یوسف سلیم چشتی، پروفیسر: مقدمہ شرح دیوانِ غالب، ص ۱۶۱، ۱۶۲۔

[۲] مرزا حیرت دہلوی: حاشیہ حیات طیبہ مطبوعہ لاہور ص ۱۰۰۔

[۳] محمد قاسم نانوتوی، مناظرۂ عجیبہ مطبوعہ بلالی پریس ساڈھورہ ص ۷۷۔

مرزا حیرت کا وہ حوالہ اور نوٹ دیکھا، اس سلسلہ میں عرض ہے کہ میری نظر سے نہ تو تیرہ صدی رسالہ گزرا اور نہ ہی اس حوالہ کے سوا میں نے اس رسالہ کا کہیں دوسری جگہ ذکر یا حوالہ دیکھا بلکہ مرزا نے اس کے مرتب سید احمد رامپوری اور مؤلف امیر احمد (حاشیہ) قرار دئے ہیں۔ میں ان دونوں شخصیتوں سے بھی ناواقف ہوں اور نہ ہی یہ حوالہ کہیں نظر سے گزرا کہ علامہ شبلی مرحوم نے اس رسالہ کی جواب دہی کی کوشش کی۔

تذکرہ کاملان رامپور میرے سامنے ہے اس میں سید احمد یا امیر احمد کوئی ایسے صاحب نہیں ہیں جو تیرہ صدی رسالہ کے مرتب یا مؤلف ہوں، حیات شبلی کو بھی دیکھا، وہاں بھی علامہ شبلی کے حال میں کوئی ایسا ذکر نہیں ہے کہ انہوں نے تیرہ صدی رسالہ کے جواب لکھنے کی کوشش کی۔

میری رائے ہے کہ مرزا حیرت کی یہ سب ذہنی اختراعات ہیں، مرزا حیرت نے حیات طیبہ میں چند اور کتابوں مثلاً سیر دہلی، تذکرہ مشاہیر دہلی اور تواریخ علمائے دہلی کے بھی حوالے دئے ہیں، میرے خیال سے ان کتابوں کا بھی خارج میں کوئی وجود نہیں ہے۔

ویسے بھی مرزا کی یہ کتاب تاریخی ماخذ کے اعتبار سے بہت کمزور ہے اسی طرح امیر الروایات بھی میرے خیال سے غیر مستند ماخذ ہے۔ اس میں بھی اکثر ناقابل اعتبار روایتیں جمع کر دی گئی ہیں۔" [1]

تلامذہ

علامہ محمد فضل حق خیرآبادی تکمیل تعلیم کے بعد بسلسلۂ ملازمت استدراءً دہلی میں

---

[1] مکتوب پروفیسر محمد ایوب قادری بنام راقم الحروف، تحریر ۳۰ راکتوبر ۱۹۷۱ء۔

سررشتہ دار رہے بعدازاں ریاست جھجر، الور، رام پور اور اودھ میں بصد عزت ونیک نامی ذی وقار عہدوں پر کام کرتے رہے ۔ ان کے ساتھ ساتھ درس وتدریس اور حمایتِ مسلکِ اہلِ سنت کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ آپ کے اَن گنت تلامذہ آسمانِ علم و فضل کے مہر و ماہ بن کر چمکے اور آج تک آپ کا علمی فیض پاک وہند کے مدارس کی فضاؤں کو منور کر رہا ہے ۔ باغیٔ ہندوستان میں علامہ کے گیارہ تلامذہ کے اسماء درج ہیں ، راقم کی جستجو کے مطابق چند مزید نام درج کئے جاتے ہیں :-

۱۔ مولانا عبدالعزیز سنبھلی (تذکرہ کاملانِ رامپور، از احمد علی خاں شوق ص ۲۲۴)

۲۔ مولانا عبدالعلی خاں ریاضی داں، متوفی ۱۳۰۳ھ/ ۶-۱۸۸۵ء، استاذ اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خاں بریلوی۔ (ایضاً ص ۲۲۸)

۳۔ مولانا حکیم محمد فیاض خاں، متوفی ۲۵ رجب ۱۲۷۲ھ/ ۱۸۵۶ء (ایضاً ص ۳۶۷)

۴۔ مولانا موسیٰ خاں، متوفی ۱۳۳۳ھ/ ۵-۱۹۱۴ء (ایضاً ص ۴۰۴)

۵۔ مُلّا نواب متوفی ۱۳۰۹ھ/ ۱۸۹۱ء (ایضاً ص ۴۲۲)

۶۔ مولانا قلندر علی زبیری، استاذ مولانا حالی، مصنف "تنزیل التندیر فے نظر البشیر والنذیر" (ردِ تقویۃ الایمان) [۱]

۷۔ مولانا حکیم سید محمد حسن امروہوی، متوفی ۱۳۲۳ھ/ ۶-۱۹۰۵ء (فرنگیوں کا جال، از امداد صابری، ص ۳۰۲)

---

[۱] قلمی یادداشت شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، مملوکہ مکرمی حکیم محمد موسیٰ امرتسری مدظلہ العالی ، اس کی عبارت یہ ہے : "تنزیل التندیر فے نظر البشیر والنذیر" مصنفہ مولوی قلندر علی زبیری ، پانی پتی ، شاگرد مولوی فضل حق خیرآبادی و استاذ شمس العلماء مولانا حالی ، مطبع بدیاس ، جموں (کشمیر) ۱۲۹۱ھ/ ۷۴-۱۸۷۳ء زبان عربی ، صفحات ۱۸۸ ، سائز ۱۱" × ۴" ، موجود در کتب خانہ ...... حکیم نورالدین بھیروی در مرکزی لائبریری قادیان ، مولوی محمد اسمٰعیل شہید نے تقویۃ الایمان میں لکھا تھا کہ خدا تعالیٰ کی ایسی شان ہے کہ اگر چاہے تو ایک آن میں کروڑوں انبیاء اور اولیاء جو جبریل اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی مانند ہوں ، پیدا کر ڈالے "، مولوی قلندر علی نے مذکورہ بالا رسالہ اپنے استاد مولوی فضل حق کی وصیت کی تعمیل میں اس عقیدہ کی تردید میں لکھا تھا۔

۸۔ مولانا دادار بخش پنجابی (تذکرہ علمائے حال از محمد ادریس نگرامی، ص ۸۵)

۹۔ مولانا سید بادعلی سہسوانی (ایضاً ص ۹۹)

۱۰۔ نواب یوسف علی خاں رامپوری (باغی ہندوستان ص ۴۴)

۱۱۔ نواب کلب علی خاں رامپوری (" ص ۴۵)

۱۲۔ مولانا محمد احسن گیلانی، جدِ امجد مولانا مناظر احسن گیلانی، متوفی ۱۳۰۱ھ/ ۴-۱۸۸۳ء (نزہۃ الخواطر، جلد ہشتم، از حکیم عبدالحی لکھنوی ص ۴۰۰)

۱۳۔ مولانا نور احمد بدایونی متوفی ۱۳۰۱ھ/ ۱۸۸۴ء (تذکرہ علمائے اہل سنت، از شاہ محمود احمد قادری ص ۲۵۱)

۱۴۔ مولانا نورالحسن کاندھلوی متوفی ۱۲۸۵ھ/ ۹-۱۸۶۸ء (حاشیہ "تذکرہ علمائے ہند" اردو، ص ۲۶۸)

تحریکِ آزادی ۱۸۵۷ء کے عوامل

علامہ محمد فضل حق خیرآبادی راسخ العقیدہ مسلمان اور بیدار دل و دماغ کے مالک تھے انہوں نے قیامِ دہلی کے دوران اور اس کے بعد، گہری نظر سے ماحول کا جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ سفید چمڑی والے سیاہ باطن انگریز مسلمانوں کو معاشی طور پر مفلوج کر کے ان کی دینی حمیت وغیرت ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ ذیل میں علامہ کے ایک نامکمل فارسی مکتوب کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جس میں انگریزی حکومت کے اوچھے ہتھکنڈوں کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ مکتوب غالباً خاندانِ مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے نام ہے، اس سے اندازہ ہو سکے گا کہ اُس وقت کا ایک عالمِ دین حالاتِ حاضرہ سے کس قدر باخبر اور اقتصادیات پر کتنی گہری نظر رکھتا تھا، علامہ فرماتے ہیں:

> اس ملک کے باشندے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، ان میں کچھ کسان اور کاشت کار ہیں، کچھ روزگار پیشہ، کچھ تاجر اور اہلِ حرفہ، کچھ لوگ لاخراجدار اور روزینہ دار ہیں، کچھ کی معاش محض دریوزہ گری پر ہے۔
>
> یہاں کے باشندے مسلمان بیشتر اور ہندو کمتر ایسے ہیں جو اپنا اصلی وطن ترک

کر کے کسی زمانے میں یہاں آکر آباد ہوئے جب تک ہندوستان کی حکومت بادشاہوں اور راجاؤں کے تصرف میں رہی اس ملک کے باشندوں کو معیشت کی کوئی تنگی نہ تھی کیونکہ ہر قسم کی سرکاری خدمات خواہ وہ سپاہ کی نوکری ہو یا دوسری خدمات اس ملک کے باشندوں کے واسطے مختص تھیں اور یہاں کے باشندوں میں ہر شخص اپنے حوصلے اور لیاقت کے موافق تجارت، حرفہ، سپاہ یا مناصب میں اپنا روزگار پالیتا تھا۔

مگر جب سے انگریزوں کی عملداری ہوئی ہے اس وقت سے بتدریج معاش کی تنگی اور روزگار کا فقدان اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ عوام کی حالت تباہ ہوگئی ہے کیونکہ انگریز سرکار کے زمانے میں معاش کے سارے وسائل مفقود ہیں اور روزگار کے دروازے بند ہوگئے ہیں سوائے معدودے چند لوگوں کے جنہیں عدالت دیوانی، کلکٹری، فوجداری پرمٹ، تھانہ یا تحصیل کے عملے میں معمولی سی تنخواہ کی نوکری مل جاتی ہے، وہ بھی اب دفتروں کے تبدیل ہونے اور سرکاری کام کا ڈھانچہ بدل جانے کے بعد ایسا نظر آرہا ہے کہ ان لوگوں سے چھن جائے گی۔

چنانچہ اس شہر کے باشندوں کا حال اور یہاں کے تاجروں کی کیفیت یہ ہے کہ سرکار انگریز نے تجارت کے سارے گُر اپنے قبضے میں رکھے ہیں اور تمام اجناس مثلاً کپڑا، سوت، برتن، گھوڑے اور دوسرے مویشی وغیرہ ملک انگلستان سے لاتے ہیں اور اس ملک کے ہر ہر شہر اور گاؤں میں فروخت کر کے خود نفع کماتے ہیں اور یہاں کے باشندوں کو نفع اندوزی کا کوئی موقع نہیں دیتے، اس لئے ہمارے ملک کے تاجر اپنے پیشوں سے دستبردار ہوگئے ہیں۔

اور معافی داروں کا حال یہ ہے کہ ۱۸۰۳ء اور ۱۸۰۵ء کے قوانین

کی رُو سے اگرچہ انگریز سرکار نے عہد و پیمان کئے تھے کہ ساری لاخراجی زمینیں جو یکم جنوری ۱۸۰۱ء اور یکم جنوری ۱۸۰۳ء سے پہلے لاخراجی دار کے تصرف میں ہوگی، چاہے وہ ان کی سند رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو، اور خواہ ان کے واہب کو عطا کا اختیار ہو یا نہ ہو، ایسی زمینوں کو ضبط نہ کیا جائے گا، مگر اب بغیر کسی تحقیقات کے ہر ضلع میں معافیاں ضبط کر لی گئی ہیں اور معافی داروں کے لئے کوئی وجہ معاش باقی نہیں چھوڑی۔

اور کسانوں کا یہ حال ہے کہ ان پر اتنے محاصل واجب کر دئے گئے ہیں کہ ان میں ادا کرنے کی سکت نہیں ہے، ان کی بے استطاعتی اور بے مقدوری خود دفتر کلکٹر کے ریکارڈ سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ پس جب کسی کے لئے اس ملک میں روزگار باقی نہ رہا تو اب اہلِ حرفہ کس کے لئے کام کریں جو ان کا پیٹ بھرے، اور جب سارے ہی لوگ تنگیٔ معاش میں مبتلا ہوں تو بھیک منگے کو کون خیرات دے، یہ مختصر سی کیفیت رعایائے ہندوستان کی معاشی تنگی کی ہے۔

اور علاقہ شاہجہان آباد کی رعایا کا اقتصادی حال بطور اجمال یہ ہے کہ ابتدائے عمل سرکار انگریزی میں ہوڈل، دیول و بتین و نجف گڑھ و سالکہ و فیروز آباد و ڈیگ و بہونا ہانا و سانگرس و بجنور و سونی پت و گوہانہ و جرسٹھ و کھرکھودہ و روہتک و مہم و ہانسی و حصار، یہ سارے پرگنے جاگیر میں تھے اور جاگیرداروں کی سرکار میں ہزارہا آدمی فوج، انتظامیہ اور شاگرد پیشہ کی خدمات پر مامور تھے، ان میں اکثر دیہات معافی کے تھے، اب یہ سب پرگنے اور دیہات و اراضیات سرکار انگریز نے ضبط کر لی ہیں اور لاکھوں انسان یک لخت بے روزگار ہو گئے اور تمام عالم میں روزگار عنقاء کی طرح ناپید ہو گیا،

سینکڑوں بیوائیں اور محتاج اپنی روزی کا دار و مدار چرخہ کاتنے، رسیاں بٹنے یا چکّی پیسنے پر موقوف کئے ہوئے تھے۔ اب ریسمان کی تجارت سرکار نے اپنے ہاتھ میں لے لی ہے اور ہاتھ کی چکیوں کی جگہ پن چکّیاں لگ گئی ہیں، تو یہ ذریعۂ معاش بھی جاتا رہا۔ اسی طرح اہلِ حرفہ اور ساہوکار عوام کی بےبضاعتی کے باعث نفع اندوزی سے محروم ہو گئے اور جو کچھ سرمایہ ان کے پاس تھا کھا پی کر برابر کر دیا اور اپنے دیوالے نکال دیئے۔

ان ساری دشواریوں کے باوجود سر چارلس مٹکاف بہادر کی پیشی سے حکم ہوا کہ ہم غریب "زرِ چوکیداری" ادا کریں اگرچہ کبھی سلاطین کے زمانے میں یہ رسم نہیں ہوئی مگر "حکمِ حاکم مرگِ مفاجات" سمجھ کر اسے بھی قبول کیا اور اب تک ادا کرتے رہے۔ اب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا نیا حکم آیا ہے جس میں انہوں نے ہر گلی کوچہ میں پھاٹک تعمیر کرنے کا حکم دیا ہے جس کا فائدہ نہ پہلے کچھ تھا نہ آئندہ ہو سکتا ہے۔ ہم غریبوں نے فاقہ کشی کی مصیبت جھیل کر سامان گروی رکھ کر یا بیچ کھوچ کر ہزارہا روپیہ خرچ کیا اور اس حکم کی تعمیل بھی کر دی اب ان نوتعمیر پھاٹکوں کے کھلنے اور بند ہونے کے اوقات یا چوکیدار کے تساہل سے ہم لوگوں کو آئے دن تکلیف کا سامنا ہے مگر اسے بھی جھیل لیا۔ اس خبر کے علاوہ اب صاحب مجسٹریٹ بہادر نے ہر محلہ میں پانچ پانچ پنچوں کے مقرر کرنے کا حکم دیا ہے۔" [1]

اس طویل مگر نامکمل مکتوب سے پتہ چلتا ہے کہ انگریزی حکومت نے اہلِ ہند کو بے بس اور لاچار بنانے کے لئے کیا کیا حربے اختیار کئے اور مجبور انسانوں کو کس طرح بے دست و پا بنایا۔ علامہ کے نزدیک تحریکِ آزادی ١٨٥٧ء کے یہی عوامل تھے جن کی بنا پر

---

[1] نثار احمد فاروقی، مولانا فضلِ حق خیرآبادی کا ایک غیر مطبوعہ خط، سہ ماہی رسالہ نوائے ادب بمبئی، ص ٤٠، ٤٦

مجاہدین کفن بردوش میدانِ عمل میں نکل آئے تھے۔ علامہ نے اپنی داستانِ اسیری میں بڑے اختصار اور جامعیت سے ان عوامل کی نشاندہی کی ہے، فرماتے ہیں :۔

۱۔ انگریزوں نے بچوں کو اپنا دین اور اپنی زبان سکھانے کے لئے جگہ جگہ اسکول کھولے اور دینی مدارس کو ختم کرنے کے لئے پوری کوشش کی۔

۲۔ ملک کی تمام پیداوار خرید کر غلے کی قیمت اور سپلائی پر اجارہ داری قائم کرلی اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ خلقِ خدا ہماری دست نگر ہو جائے اور بے چون و چرا ہمارے احکام کی تعمیل کرے۔

۳۔ مسلمانوں کو ختنہ کرانے سے روکنے اور پردہ نشین خواتین کا پردہ ختم کرانے کی کوشش کی۔

۴۔ مسلمانوں کو سؤر کی چربی والے اور ہندوؤں کو گائے کی چربی والے کارتوس دئے گئے جو منہ سے کاٹنے پڑتے تھے۔ ان کی نظر میں اپنی حکومت کو مستحکم بنانے کا یہی طریقہ تھا کہ مذہبی اختلافات ختم کر کے تمام رعایا کو ملتِ کفر والحاد پر متفق کر دیا جائے۔[1]

علامہ فضلِ حق کا تحریکِ آزادی میں حصہ

اس تجزیئے کے پیشِ نظر کون سا ایسا مسلمان ہوگا جو انگریزوں سے متنفر اور بیزار نہیں ہوگا، یہی وجہ تھی کہ علامہ کے دل کے کسی گوشے میں انگریزوں سے محبت اور ہمدردی کے لئے کوئی جگہ نہ تھی بلکہ علامہ" قصائدِ فتنۃ الہند" میں تو یہاں تک فرماتے ہیں :۔

" نصِ قرآنی سے ثابت ہے کہ ان کی محبت کفر ہے، کسی حق پرست

---

[1] عبد الحق خیرآبادی، علامہ : الثورۃ الہندیہ (باغی ہندوستان) ص ۳۵۷، ۲۶۰

انسان کو اس میں شبہ نہیں ہو سکتا، نصاریٰ سے محبت کس طرح جائز ہو سکتی ہے جب کہ یہ لوگ اس ذاتِ اقدس (صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم) کے دشمن ہیں جن کے طفیل ارض و سما پیدا کئے گئے۔" [1]

جنگِ آزادی کی ابتدا مئی ۱۸۵۷ء میں ہوئی اس وقت علامہ محمد فضل حق خیرآبادی الور میں مقیم تھے، انہیں خاص طور پر دہلی سے بلایا گیا۔ علامہ کے اپنے الفاظ یہ ہیں:۔

وإذ كان في دهلي كثير من عيالي
وأهلي و مع ذلك كنت مدعوًا و كان
الفلاح و الإفلاج مرجوًا و الفرج و الفرح
مظنونًا [2]

"چونکہ دہلی میں میرے بہت سارے اہل و عیال تھے اس کے باوجود مجھے بلایا بھی گیا تھا اور کامیابی و کامرانی کی قوی امید تھی۔"

یہ امر تو "باغی ہندوستان" کے مطالعہ سے واضح ہو جائے گا کہ بہادر شاہ ظفر کے علامہ کے ساتھ گہرے مراسم تھے اس لئے قرینِ قیاس یہی ہے کہ صلاح و مشورہ کے لئے انہوں نے ہی علامہ کو بلایا ہوگا۔

اُس دور کے روزنامچوں سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ شریکِ دربار ہوتے رہے اور اپنے مشوروں سے راہنمائی کرتے رہے۔ اس زمانے کی پوری تفصیل نہ تو روزنامچوں سے ملتی ہے اور نہ ہی علامہ نے اسے قلمبند کیا، صرف اشارات ملتے ہیں مثلاً ایک جگہ علامہ فرماتے ہیں:۔

واشرت الى الناس بما اقتضى رائي وقضى ب

---

[1] محمد فضل حق خیرآبادی، علامہ: قصائد فتنۃ الہند ص ۲۴۸۔

[2] ایضاً — الثورة الہندیہ، ص ۳۷۸

عقلی فلم یأتمروا بما اشرت ۔[1]

اپنی عقل اور فہم کے مطابق لوگوں کو اپنی رائے اور مشورہ
سے آگاہ کیا لیکن نہ انہوں نے میرا مشورہ قبول کیا اور نہ
میری بات مانی "

ظاہر ہے کہ علامہ ایسا مفکر صحیح راستے اور فکر صائب ہی سے راہنمائی کر سکتا تھا اور یہ بھی مسلّم ہے کہ میدانِ جنگ میں لڑنے والی فوج وہ کام نہیں کر سکتی جو ایک دانشور کی راہنمائی کر سکتی ہے ۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں :-

" میں بیٹھنے والوں کو لڑائی میں برابر آگے بڑھاتا رہا اور
لڑائی شروع ہو جانے پر خود بیٹھا رہا ۔۔۔۔ میں اپنی سستی
کی وجہ سے ایسے موقع پر باز رہا ، یہ میں نے بڑا جرم کیا
جب نیک بخت حضرات نے مجھے شہادت کے لئے پکارا
تو میں حاضر نہ ہوا یا میں شہادت سے محروم رہا جب کہ
سعادت مندوں نے جامِ شہادت نوش کیا " [2]

اس اقتباس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کو صرف اس بات کا افسوس تھا کہ وہ عملی جہاد میں حصہ لیکر جامِ شہادت نوش نہ کر سکے ورنہ وہ ترغیبِ جہاد اور فکری راہنمائی میں کسی سے پیچھے نہ تھے ۔ اسیری اور جلاوطنی کی موت نے شوقِ شہادت بھی پورا کر دیا ، یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ علامہ دہلی سے اپنے اہل و عیال کو لے کر چلتے نہیں بنے بلکہ انگریزوں کے تسلط کے بعد بھی پانچ دن تک وہیں ٹھہرے رہے ۔ اگر علامہ کا تحریک

---

[1] ایضاً : ص ۳۷۸

[2] محمد فضل حق خیرآبادی ، علامہ ، قصائد فتنۃ الھند ، ص ۴۵۶

آزادی سے کوئی تعلق نہ ہوتا تو اتنی دیر وہاں ٹھہرنے کی کوئی وجہ نہ تھی ورنہ فوراً کسی اور جگہ چلے جانا چاہئے تھا۔

سوءِ اتفاق کہ منظم تیاری نہ ہونے اور اپنوں کی غداری اور غفلت کی وجہ سے انگریز دہلی پر مسلط ہو گئے اور جی بھر کر خونریزی کی، اس دوران علامہ پانچ دن بھوکے پیاسے دہلی میں رہے، پھر اہل و عیال سمیت چھپتے چھپاتے خیرآباد پہنچ گئے، سقوطِ دہلی کے باوجود اودھ کی ملکہ حضرت محل نے کمال جرأت و ہمت کا مظاہرہ کیا، بھاگ کر آنے والے فوجیوں کو پناہ دی اور شمالی علاقے میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ قیام پذیر ہو گئیں، افواج کو علاقے کا انتظام کرنے اور دریا کے گھاٹوں پر حفاظت کے لئے معین کر دیا اور انہیں حکم دیا کہ اگر دشمن اس طرف رُخ کرے تو اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے۔ علامہ اس جگہ بھی مشیرِ خاص کے طور پر شریک ہوئے۔

علامہ پر قائم کردہ مقدمہ کی رپورٹ میں لکھا ہے:

> "یہ بات ان ایام میں عام طور پر مشہور تھی کہ چند آدمی بیگم (حضرت محل) کے مشیرانِ خاص ہیں، باغی فوج میں ان کی "اربعہ شوریٰ" کے نام سے شہرت تھی بلکہ کبھی کبھی انہیں "کچہری پارلیمنٹ" کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا اس شوریٰ میں ملزم (علامہ فضل حق) بہت ممتاز تھا۔" [1]

فیصلے میں یہ بھی لکھا ہے:

> "وہ خطرناک ترین آدمی ہے جو کسی وقت بھی بے حد

---

[1] ماہنامہ تحریک دہلی: شمارہ جون ۱۹۶۰ء، ص ۱۲۔

نقصان پہنچا سکتا ہے ، اس لئے انصاف اور امنِ عامہ کا
تقاضا ہے کہ اسے ملک بدر کر دیا جائے ۔" [1]

علامہ پر الزام قائم کیا گیا کہ انھوں نے بیگم حضرت محل کے مشیر ہونے کی حیثیت سے بوندی میں دو ایسے شخصوں کے قتل کا فتوے دیا تھا جو انگریز کے وفادار تھے ، چنانچہ ان میں سے ایک شخص عبد الحکیم نے بیان دیتے ہوئے کہا :

" مجھے ممو خاں اور مولوی فضل حق کے سامنے پیش کیا گیا ، ممو خاں نے مولانا فضل حق سے دریافت کیا کہ میرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے ؟ مولانا نے فتوے دیا کہ یہ شخص فرنگیوں کا ملازم ہے اس لئے سزائے موت کا مستحق ہے ۔" [2]

خود علامہ نے صحیح صورتِ حال کا انکشاف ان الفاظ میں کیا ہے :-

" میری چغلی ایسے دو مرتد ، جھگڑالو ، تندخو افراد (عبدالحکیم اور مرتضٰے حسین) نے کھائی جو مجھ سے قرآن کی محکم آیت میں مجادلہ کرتے تھے جس کا حکم یہ ہے کہ نصاریٰ کا دوست بھی نصرانی ہے وہ دونوں نصاریٰ کی مودت و محبت پر مصر تھے انھوں نے مرتد ہو کر کفر کو ایمان سے بدل لیا تھا ۔" [3]

علامہ فضل حق خیر آبادی نے اپنی تحریرات میں اپنے مجاہدانہ کارناموں کو اجاگر

---

[1] ایضاً : ص ۱۶ ۔

[2] ایضاً : ص ۱۰ ۔

[3] محمد فضل حق خیر آبادی ، علامہ : الثورة الهندية ، ص ۴۱۷

کرنے کی کوشش نہیں کی، یہ الگ بات ہے کہ ضمناً اس رۃ کوئی بات آگئی ہو، بوندی میں بیگم حضرت محل کے مشیر ہونے کی حیثیت سے اپنی کاروائی کا اس رۃ بھی ذکر نہیں کیا جب کہ قیام دہلی کے بارے میں کئی باتیں کہہ گئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی سرگرمیاں بوندی کی نسبت دہلی میں زیادہ تھیں۔

مسٹر جارج کیمبل جوڈیشنل کمشنر اودھ اور میجر بارو قائم مقام کمشنر خیرآباد نے ۴ مارچ ۱۸۵۹ء کو فیصلہ صادر کرتے ہوئے لکھا:۔

"بغاوت شروع ہونے کے وقت وہ الور میں ملازم تھا، یہاں سے دیدہ دانستہ دہلی آیا اور اس کے بعد وہ باغیوں اور بغاوت کے قدم بقدم چلتا رہا ایسے شخص کو سخت ترین سزا ملنا چاہئے اور اسے خاص طور پر ہندوستان سے خارج کردینا چاہئے۔"[۱]

اپیلوں اور کوششوں کے باوجود جلاوطنی کا فیصلہ بحال رہا اور علامہ کو کلکتہ سے فائر کوئین نامی جہاز میں سوار کرکے انڈیمان بھیج دیا گیا یہ جہاز ۸ اکتوبر ۱۸۵۹ء کو پورٹ بلیر پہنچا[۲]

فتوائے جہاد

علامہ فضل حق خیرآبادی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے نامور مجاہد تھے۔ یہ وہ تاریخی حقیقت ہے جسے رد نہیں کیا جا سکتا، ایک عرصہ تک

---

[۱] ماہنامہ تحریک دہلی : ص ۱۷۔

[۲] ایضاً : ص ۲۰۔

ان کے فتوائے جہاد میں شریک ہونے کو بغیر کسی اختلاف کے تسلیم کیا جاتا رہا ہے قریباً جس نے بھی علامہ کا ذکر کیا ہے اس فتوے کا ضرور ذکر کیا ہے۔ مثلاً عبد الشاہد خاں شروانی نے "باغی ہندوستان" ص ۱۵۶، مولوی حسین احمد مدنی نے "نقش حیات" جلد دوم ص ۴۶، مفتی انتظام اللہ شہابی نے "ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء" ص اور "مولوی فضل حق خیر آبادی اور پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء" ص ۳۷، غلام رسول مہر نے "اٹھارہ سو ستاون کے مجاہد" ص ۲۰۶، پروفیسر محمد ایوب قادری نے "مولانا فیض احمد بدایونی" ص ۲۱، ۲۲، ڈاکٹر سید عبد اللہ نے اپنے ایک مضمون "مولانا فضل حق خیر آبادی — سراپا فضل، سراپا حق، سراپا خیر" (ہفت روزہ زندگی (اذان حق) شمارہ ۱۳ر نومبر ۱۹۷۲ء) میں، مولانا عبد السلام ندوی نے "حکمائے اسلام" جلد دوم ص ۳۳۲ میں اور مولانا ریاست علی نے ماہنامہ معارفِ اعظم گڈھ (اکتوبر ۱۹۴۶ء) ص ۳۱۲ میں وغیرہ وغیرہ۔

لیکن ماضیٔ قریب میں بعض لوگوں نے علامہ کے فتوائے جہاد کا انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ علامہ کا دہلی آنا ۱۶ر اگست ۱۸۵۷ء سے پہلے ثابت نہیں جب کہ فتوائے جہاد جولائی ۱۸۵۷ء کی ابتدا یا وسط میں جاری کیا گیا تھا۔ نیز صادق الاخبار، دہلی مورخہ ۲۶ر جولائی ۱۸۵۷ء میں بحوالہ اخبار الظفر دہلی جو فتویٰ شائع ہوا تھا اس میں علامہ کے دستخط نہیں ہیں۔[1]

حالانکہ اس دور کے تاریخی روزنامچوں سے ۱۶ر اگست ۱۸۵۷ء کو علامہ کی بہادر شاہ ظفر کے دربار میں موجودگی کا ثبوت ملتا ہے۔ اس سے یہ یقین کیسے پیدا ہو گیا کہ علامہ اس سے پہلے دہلی میں نہیں تھے۔ پھر اپنے دعوے کو ثابت کرنے کیلئے مخالفین کو یہ بھی ثابت کرنا پڑے گا کہ دہلی سے صرف ایک ہی فتویٰ جاری ہوا تھا جس کی نقل صادق الاخبار میں چھپی تھی۔

---

[1] امتیاز علی عرشی رامپوری: مولانا فضل حق خیر آبادی اور ۱۸۵۷ء کا فتوائے جہاد ماہنامہ تحریک دہلی شمارہ اگست ۱۹۵۷ء

علامہ کے مخالفین کا تعصب

علامہ فضل حق خیرآبادی کے ساتھ یہ ٹریجڈی ہوئی کہ اول تو ان کی حیات پر بہت کم کام کیا گیا، اور جو کچھ کیا گیا وہ بلا تحقیق سنی سنائی باتوں پر مشتمل تھا۔ بہت سی غلط روایات ان سے منسوب کر دی گئیں جیسا کہ "باغی ہندوستان" کے جستہ جستہ حواشی سے معلوم ہوگا،

دوسری طرف بعض مورخین نے مذہبی مخالفت کی بنا پر ان پر رکیک حملے کئے اور ان کے بلند کردار کو مجروح کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی، جناب نادم سیتا پوری نے بجا کہا ہے:

"مولانا فضل حق خیرآبادی گذشتہ انقلابی صدی کا وہ بدنصیب کردار ہے جسے دشمنوں سے زیادہ دوستوں نے نقصان پہنچایا، انگریز اور ان کے ہوا خواہ تو مولانا سے اس لئے ناراض تھے کہ انقلاب ستاون کے سلسلہ میں کسی نہ کسی نہج سے ان کا نام آگیا تھا لیکن خود مسلمانوں کا ایک "پروپیگنڈسٹ گروپ" مولانا سے اس لئے بیزار تھا کہ وہ ان کے مذہبی نظریات کے خلاف عالمانہ محاہدہ کر چکے تھے، یہ باوقار علمی مباحثہ کوئی ذاتی اور عامیانہ جنگ نہیں تھی جس کا سہارا لے کر مولانا خیرآبادی کے خلاف ایک مستقل محاذ قائم کر دیا جاتا لیکن ہوا کچھ ایسا ہی :

مولانا کے اکثر سیرت نگاروں نے نادانستہ نہیں، دانستہ مولانا کی مدح اس انداز سے کی کہ خود "مدح" اور

"ہجو بلیغ" سربگریباں ہو گئے چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ
آج جب ریسرچ اور تحقیق کی نگاہیں تاریخ کے ان اوراق
تک پہنچیں تو دنیا ہی بدلی ہوئی نظر آئی"۔ [1]

مولانا امتیاز علی عرشی رامپوری کا ایک مقالہ "مولانا فضل حق خیر آبادی اور ۱۸۵۷ء کا فتوائے جہاد" ماہنامہ تحریک دہلی میں اگست ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا جس میں انہوں نے علامہ کے فتوائے جہاد جاری کرنے، جج کے سامنے اقرار جرم کرنے اور جج کے بادل ناخواستہ حبس دوام کا فیصلہ کرنے کا تنقیدی جائزہ لیا، اس ضمن میں انہوں نے نواب یوسف علی خاں والیٔ رامپور کے نام علامہ کا ایک مکتوب نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا پر تین الزام قائم کئے گئے تھے:

۱۔ نواب خان بہادر خاں نبیرۂ حافظ رحمت خاں بہادر نے جب انگریزوں کے خلاف بریلی میں بغاوت کی تو مولانا نے ان کا ساتھ دیا اور ان کی طرف سے نظامت پیلی بھیت کا کام انجام دیا۔

۲۔ جب انگریزوں نے بریلی فتح کرلی تو مولانا یہاں سے بھاگ کر اودھ پہنچے اور خان علی خاں کی طرف سے ریاست محمدی کے چکلہ دار (منتظم) مقرر ہوئے۔

۳۔ مولانا نے اس کے بعد ایک باغی لشکر کی کمان اپنے ہاتھ میں لی۔ [2]

اس مکتوب کو تسلیم کرلیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ علامہ کا تحریک آزادی سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ ایک دوسرے شخص فضل حق شاہجہانپوری کے

---

[1] نادم سیتاپوری: غالب نام آورم، طبع لاہور ۱۹۶۹ء، ص ۱۰۱۔
[2] امتیاز علی عرشی رامپوری: ماہنامہ تحریک دہلی، اگست ۱۹۵۷ء

شُبہے میں انہیں اسیری اور جلاوطنی کے مصائب برداشت کرنے پڑے جیسا کہ مولانا عرشی نے بھی تاثر دینے کی کوشش کی ہے، اس سلسلے میں چند امور قابلِ توجہ ہیں :-

۱. علامہ فضل حق خیرآبادی کا جنگِ آزادی میں حصہ لینا مسلّمات سے ہے لہذا اسے جھٹلانے کے لئے اس مکتوب کا عکس شائع کرنا ضروری تھا۔

۲. جناب مالک رام نے علامہ کے مقدمے کی کاروائی ماہنامہ تحریک' دہلی کے شمارہ جون ۱۹۶۰ء میں شائع کرادی ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ پر مذکورہ بالا الزامات میں سے کوئی الزام بھی قائم نہیں کیا گیا بلکہ مخبروں کے بیانات سے ثابت ہونے والے الزامات کی بناء پر ان کی جلاوطنی کا حکم صادر کیا گیا جن کا تعلق بوندی (اودھ) کے ساتھ تھا، بریلی یا محمدی کے واقعات سے نہ تھا، الثورة الہندیہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جیسا کہ عنقریب آئے گا۔

۳. مولانا عرشی نے علامہ کے شریکِ فتویٰ نہ ہونے کے ضمن میں کہا ہے :-

> "مولانا نے علماء زہاد اور ائمہ اجتہاد کے فتوے دینے کا تو ذکر کیا ہے مگر اپنا حوالہ بالکل نہیں دیا، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر وہ شریکِ فتوےٰ بھی ہوتے تو جیسا کہ آگے چل کر (ص ۳۷۸ پر) اربابِ حکومت کو اپنے مشورے دینے کا تذکرہ فرماتے ہیں یہاں بھی فتوے کی طرف کچھ نہ کچھ اشارہ ضرور کرتے۔" [۱]

اسی طرح یہاں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اگر علامہ تحریکِ آزادی سے

---

[۱] ایضاً :

علیحدہ ہوتے اور ان کے خلاف تمام کاروائی محض اشتباہ کی وجہ سے ہوئی ہوتی تو علامہ اپنی خود نوشت الثورۃ الھندیہ میں ضرور اپنی "بے گناہی" کا تذکرہ کرتے حالانکہ انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ انہوں نے قید و بند کی دو وجہیں بیان کی ہیں :۔

(۱) انگریزوں کو اس بات کا علم تھا کہ میں ایمان و اسلام میں راسخ العقیدہ ہوں اور علامۂ وقت ہونے کی حیثیت سے شہرت رکھتا ہوں، مجھے سزا دینے کا مقصد یہ تھا کہ علم دین کے آثار کو صفحات کتب سے بھی مٹا دیا جائے۔ [۱]

(۲) حاکم نصرانی کے سامنے دو مرتد، سخت دل دشمنوں (عبدالحکیم اور مرتضیٰ حسین) نے چغلی کھائی، وہ دونوں میرے ساتھ قرآن پاک کی اس آیت مبارکہ کے بارے میں جھگڑا کرتے تھے جس کا حکم یہ ہے کہ نصاریٰ کا دوست بھی نصرانی ہے اور ان دونوں کو نصاریٰ کی دوستی پر اصرار تھا چنانچہ انہوں نے ایمان کے بدلے کفر اپنا لیا۔ [۲]

۴۔ علامہ کا اشتباہ کی بنا پر اسیر ہونا اس اعتبار سے بھی محل نظر ہے کہ علامہ کوئی معمولی آدمی نہ تھے، دہلی وغیرہ میں ممتاز عہدوں پر فائز رہے تھے، مسٹر جارج کیمبل اور مسٹر باروسے نے اپنے فیصلے میں لکھا :

> " ایک زمانے میں وہ خود بھی سرکاری ملازمت ترک کر کے اودھ، رام پور، الور وغیرہ متعدد دیسی ریاستوں میں معقول عہدوں پر ممتاز رہا ہے، اس کی ہمیشہ بہت شہرت رہی ہے جن گواہوں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا وہ بھی مولوی

---

[۱] محمد فضل حق خیرآبادی، علامہ : الثورۃ الھندیہ ص ۳۵۴، ۳۵۵

[۲] ایضاً : ص ۴۱۷

فضل حق کا نام اکثر سنتے آئے تھے۔" ؎۱

بلکہ یہ بھی لکھا کہ :

"اس نے مقدمے کے دوران ایک موقع پر یہ صفائی پیش کی تھی کہ اودھ میں دو مشہور فضل حق ہیں لیکن یہ بات صاف ہوگئی کہ وہ دوسرا شخص (فضل حق شاہجہانپوری) ضلع بریلی کا تحصیلدار رہا ہے اور پچھلے دنوں چکلہ دار اور باغیوں کا سرغنہ رہا ہے، لیکن ملزم تو کبھی صاحبِ سیف رہا ہی نہیں بلکہ اس کی ہمیشہ صاحبِ رائے و مشورہ کی حیثیت سے شہرت رہی ہے۔" ؎۲

جناب ڈاکٹر محمد ریاض اپنے ایک مضمون میں مالک رام پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

مولوی فضل حق اتنا مسکین آدمی نہیں تھا کہ اسے کسی دوسرے شخص کے بدلے میں عمر قید کی سزا دی جاتی اور اس کا کوئی پرسانِ حال نہ ہوتا۔ شاید انہیں (مالک رام وغیرہ کو) یہ معلوم نہیں کہ اس کا چھوٹا بھائی سردار فضل الرحمن ریاست پٹیالہ کا وزیر تھا اور نواب والا جاہ بہادر آف کرناٹک اس کا عزیز قریب تھا اور نواب سید برکت علی خاں بہادر جو انگریز سرکار میں بڑا مقتدر تھا، اس کا بھانجہ تھا، کیا یہ سب حضرات اتنے سنگدل ہوگئے تھے کہ اپنے خاص اثرات.. خاندان کے ایک بزرگ کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے استعمال نہیں کر سکتے تھے؟ ؎۳

انگریز حکومت اگر چاہتی تو مقدمہ چلائے بغیر علامہ کو کوئی بھی سزا دے سکتی تھی لیکن اس نے

؎۱ ماہنامہ تحریک دہلی : شمارہ جون ۱۹۶۰ء، ص ۱۷

؎۲ ایضاً : ص ۱۶

؎۳ محمد ریاض، ڈاکٹر : جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، ماہِ نو کراچی، مئی ۱۹۶۹ء، ص ۵۴

ایسا نہیں کیا بلکہ تحقیق و تفتیش کے بعد عائد کردہ الزامات کے ثابت ہو جانے اور اشتباہ کے صاف ہو جانے پر فیصلہ صادر کیا ، ان امور کی بنا پر مولانا عرشی کے نقل کردہ مکتوب کی اصلیت مشکوک ہو جاتی ہے ۔

۵ ۔ مولانا عرشی رامپوری نے فتوائے جہاد پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے :۔

"اس وقت کے حالات کو بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ دستخط کرنے والوں میں کچھ اہلِ علم ایسے بھی تھے جو دل و جان سے انگریزی تسلط کے مخالف تھے اور انگریزوں کے خلاف جنگ کو مذہبًا ضروری جانتے تھے اس لئے انہوں نے یہ فتوےٰ مرتب کیا اور اپنے اختیار اور رضامندی سے دستخط کئے ، بقیہ نے مجبورًا توثیق کی ، شکست کے بعد جان بچانے کی صرف یہی ایک تدبیر تھی کہ جبر کی پناہ لی جائے ، اس بناء پر جس سے بازپرس ہوئی اس نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا" [۱]

اگر مولانا عرشی کے نقل کردہ مکتوب کو تسلیم بھی کیا جائے تو کیا یہ ممکن نہیں کہ علامہ نے بھی جان بچانے کے لئے یہ تدبیر اختیار کی ہو کہ فضل حق دو ہیں ، تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ جسے مجرم گردانا جا رہا ہے وہ میں ہی ہوں ؟

حافظ الملک حافظ رحمت خاں شہید کے پوتے نواب خان بہادر خاں شہید ، جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے ممتاز مجاہدین میں شمار ہوتے ہیں ، جناب سید مصطفےٰ علی بریلوی نے اپنی تالیف " نواب خان بہادر خاں شہید " (طبع آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی) میں ان کے مجاہدانہ کارناموں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے اور تفصیلًا بیان کیا ہے کہ نواب خان بہادر خاں نے کس طرح افواج کو منظم کیا اور کس طرح انگریزی افواج کے مقابل دادِ شجاعت دی اور کیونکر گرفتار ہو کر تختۂ دار پر چڑھائے گئے ،

لیکن جب خان بہادر شہید پر مقدمہ چلایا گیا تو انہوں نے جنگِ آزادی سے اپنی

---

[۱] ماہنامہ تحریک دہلی ، اگست ۱۹۵۷ء

برات کا اظہار کیا ، جناب نادم سیتاپوری نے لاہور کے قدیم اخبار کوہِ نور کی فائل سے نواب خان بہادر شہید کے مقدمہ کا ایک حصہ نقل کیا ہے ، نواب صاحب نے اپنے بیان میں کہا ہے :۔

"جب تک فوج باغی ، بریلی میں رہی کسی نے اطاعت نہیں کی اور میرے پاس فوج نہ تھی کہ ان کو شرارت سے باز رکھتا ، میں نے کسی صاحب بہادر کے مارے جانے کا حکم نہیں دیا بلکہ میں نے ملک کو بد معاشوں کی یورشوں سے بچانے کے واسطے کوششیں کیں ، میں بیکس تھا اور انتظام شہر یوں کا نہ کر سکا ، انہوں نے میرے حکم کو نہیں مانا بلکہ وے سب مرضی خود (یہ) کار بند رہے۔ مجھ کو معلوم ہے کہ ایک اشتہار بھی درباب قتل صاحبان انگریزی کے جاری ہوا تھا ، وے کہتے تھے کہ فرنگی اب نہیں آویں گے ، جب میں نے آمد انگریزوں کی سنی تو میں فوراً بریلی سے نکل گیا اور فوج انگریزی سے صف آرا نہیں ہوا ۔" [۱]

کیا نواب صاحب کے بارے میں بھی یہ کہا جائے گا کہ انہوں نے پہلی جنگِ آزادی میں کوئی حصہ نہیں لیا ؟ اور اگر یہ کہا جائے کہ نواب خان بہادر شہید نے اپنی جان بچانے کی خاطر یہ بیان دیا تھا تو علماء کے بارے میں یہی توجیہ کیوں قابلِ قبول نہیں ہو سکتی ؟

۶۔ مولانا رشید احمد گنگوہی کو بھی تحریکِ آزادی ۱۸۵۷ء کے مجاہدین میں شمار کیا جاتا ہے ، اگرچہ اس بارے میں مستند مواد دستیاب نہیں ہو سکا لیکن ان کے معتقدین جوشِ عقیدت کی بناء پر انہیں صفِ مجاہدین میں شامل کرنے پر مُصر ہیں ، مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں :

"ان بزرگوں (مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی) نے بھی ۱۸۵۷ء کے جہادِ آزادی میں حصہ لیا تھا ، افسوس کہ صحیح تفصیلات آج تک معلوم نہ ہو سکیں ۔" [۲]

---

[۱] سہ ماہی رسالہ العلم : اکتوبر تا دسمبر ۱۹۷۱ء ، ص ۲۱ ۔

[۲] غلام رسول مہر : اٹھارہ سو ستاون کے مجاہد ، ص ۲۵۰ ۔

جہاں تک ان کے سوانح نگار مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کا بیان ہے اس سے قطعی یہ پتہ نہیں چلتا کہ مولانا گنگوہی جنگِ آزادی میں شریک تھے بلکہ ان کے بیان سے تو "خیر خواہِ سرکار" ہونا معلوم ہوتا ہے۔ مولانا عاشق الٰہی جنگِ آزادی کا نقشہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"بدنصیب، خانماں برباد بہادر شاہ ظفر بادشاہ دہلی کا وہ بلاخیز سماں تھا جس میں کارتوسوں پر چربی لپیٹنے کی جھوٹی افواہ اڑی اور غدر برپا کرنے کے چھپے کھلے مجمعوں میں چرچے شروع ہوئے تھے، تباہ ہونیوالی رعایا کی نحوست تقدیر نے ان کو جو کچھ سمجھایا اس کا انہوں نے نتیجہ دیکھا اور ان کی نسل دیکھ رہی ہے جن کے سروں پہ موت کھیل رہی تھی انہوں نے کمپنی کے امن و عافیت کا زمانہ قدر کی نظر سے نہ دیکھا اور اپنی رحمدل گورنمنٹ کے سامنے بغاوت کا عَلَم قائم کیا۔" [۱]

تحریکِ آزادی کا دَور گزر گیا تو بعض لوگوں نے کسی مخاصمت کی بنا پر مولانا گنگوہی اور مولانا نانوتوی کے "باغی" ہونے کی مخبری کر دی، مولانا عاشق الٰہی کے الفاظ یہ ہیں :-

"جب بغاوت و فساد کا قصہ فرو ہوا اور رحمدل گورنمنٹ کی حکومت نے دوبارہ غلبہ پاکر باغیوں کی سرکوبی شروع کی تو جن بزدل مفسدوں کو سوائے اس کے اپنی رہائی کا کوئی چارہ نہ تھا کہ جھوٹی سچی تہمتوں اور مخبری کے پیشہ سے سرکاری خیر خواہ اپنے کو ظاہر کریں، انہوں نے اپنا رنگ جمایا اور ان گوشہ نشین حضرات پر بھی بغاوت کا الزام لگایا۔" [۲]

حالانکہ واقعہ یہ تھا کہ :

"یہ حضرات حقیقۃً بے گناہ تھے مگر دشمنوں کی یاوہ گوئی نے ان کو باغی و مفسد اور مجرم و سرکاری خطاوار ٹھیرا رکھا تھا اس لئے گرفتاری کی تلاش

---

[۱] عاشق الٰہی میرٹھی، تذکرۃ الرشید، جلد دوم (طبع ثانی) ص ۷۳۔
[۲] ایضاً : ص ۷۶۔

تھی مگر حق تعالیٰ کی حفاظت برسر تھی اس لئے کوئی آنچ نہ آئی اور جیسا کہ آپ حضرات اپنی مہربان سرکار کے دلی خیرخواہ تھے تازیست خیرخواہ ہی ثابت رہے۔[1]

ان دنوں خوف و ہراس کی لہر ہر شخص کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھی مولانا گنگوہی کو معلوم ہو گیا تھا کہ ان کا نام بھی قابل اخذ مجرموں کی فہرست میں درج ہو چکا ہے لیکن ان کی حالت یہ تھی کہ :۔

"آپ کوہ استقلال بنے ہوئے خدا کے حکم پر راضی تھے اور سمجھے ہوئے تھے کہ میں جب حقیقت میں سرکار کا فرمانبردار رہا ہوں تو جھوٹے الزام سے میرا بال بھی بیکا نہ ہوگا اور اگر مارا بھی گیا تو سرکار مالک ہے، اسے اختیار ہے، جو چاہے کرے"۔[2]

ایک دفعہ مولانا گنگوہی، مولانا نانوتوی، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور حافظ ضامن کہیں جا رہے تھے کہ باغیوں کا سامنا ہو گیا، پھر کیا ہوا، مولانا عاشق الٰہی کی زبانی سنئے :

یہ نبرد آزما جتھا اپنی سرکار کے مخالف باغیوں کے سامنے سے بھاگنے یا ہٹ جانے والا نہ تھا، اس لئے اٹل پہاڑ کی طرح پرا جما کر ڈٹ گیا اور سرکار پر جاں نثاری کے لئے تیار ہو گیا"۔[3]

مولانا گنگوہی کو مظفرنگر کی عدالت میں پیش کیا گیا اور پوچھا گیا کہ تم نے مفسدوں کا ساتھ دیا

---

[1] عاشق الٰہی میرٹھی : تذکرۃ الرشید جلد دوم، ص ۱۷، [2] ایضاً : ص ۸۰ ۔

[3] ایضاً : ص ۷۵، (نوٹ) مولانا مہر نے علماء دیوبند کو مجاہد ثابت کرنے کے لئے اس عبارت کی عجیب توجیہ کی ہے فرماتے ہیں "مبادا" سرکار کے باغیوں" کے الفاظ سے غلط فہمی پیدا ہو، یہاں "سرکار" سے مراد خود حضرت حاجی صاحب ہیں اور مقابلہ ان لوگوں سے تھا جو انگریزوں کے طرفدار ہو کر آئے تھے ـــــ یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ میری رائے اور میرا تاثر ہے اور میں اسے قطعی طور پر صحیح سمجھتا ہوں، نہیں کہہ سکتا کہ مصنف مرحوم کے پیش نظر کیا بات تھی (۱۸۵۷ء کے مجاہد ص ۲۵۴)۔

ہمیں اس توجیہ میں سوائے غلو فی العقیدت کے اور کچھ دکھائی نہیں دیا، جس توجیہ کو مولانا مہر قطعی طور پر صحیح قرار دے رہے ہیں ہماری سمجھ سے وراء ہے کیونکہ اس جتھے میں خود حاجی صاحب بھی شریک تھے جو بقول مولانا میرٹھی "اپنی سرکار کے مخالف باغیوں کے سامنے سے بھاگنے یا ہٹ جانے والا نہ تھا" تو کیا حضرت حاجی صاحب اپنی سرکار آپ تھے؟ فیا للعجب! ۱۲ اشرف قادری

اور فساد کیا تو انہوں نے کہا، "ہمارا کام فساد کا نہیں، نہ ہم مفسدوں کے ساتھی"[1] تحقیق کے بعد ثابت ہوا کہ انہیں بغاوت سے کوئی تعلق نہیں تو رہا کر دئے گئے۔

علامہ فضل حق خیرآبادی اور نواب خان بہادر خاں کے بارے میں تو کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ظالم و جابر حاکم کے سامنے، جان بچانے کی خاطر ایسی باتیں کہہ دیں جن سے پتہ چلتا تھا کہ ان کا تحریکِ آزادی سے کوئی تعلق نہیں لیکن مولانا گنگوہی تو ظالم حاکم کے سامنے نہیں بلکہ اپنی جگہ یہ کہہ رہے ہیں" اگر مارا بھی گیا تو سرکار مالک ہے "۔ ایسے ارشادات کے باوجود اگر مولانا گنگوہی مجاہدین میں شامل ہیں تو علامہ فضل حق خیرآبادی کا کیا قصور ہے کہ انہیں یک قلم تحریک سے غیر متعلق قرار دیا جائے؟

مولانا گنگوہی بے قصور ثابت ہونے تک چھ ماہ قید میں رہے، مولانا نانوتوی کے گرفتار ہونے کی نوبت ہی نہ آئی لیکن علامہ خیرآبادی کے جلاوطن ہونے اور غریب الوطنی کی حالت میں انڈیمان میں وصال فرمانے میں کیسے شک ہو سکتا ہے؛ ان کا جہادِ آزادی سے کسی قسم کا تعلق ثابت نہ بھی ہو تو ان کے شہید ہونے میں کوئی شک نہیں کیونکہ وہ ایک ظالم حکومت کے جور و تشدد کا تختۂ مشق بنے اور جلاوطنی میں مالکِ حقیقی کے دربار میں حاضر ہو گئے۔

غالب کے مشہور محقق مالک رام نے علامہ فضل حق خیرآبادی کے مقدمہ کا فیصلہ اپنے مضمون میں ماہنامہ تحریک، دہلی جون ۱۹۶۰ء میں پیش کیا ہے اور اس بنا پر کہ علامہ فتوائے دہلی میں شامل نہیں ہوئے (کیونکہ اس وقت دہلی میں موجود ہی نہ تھے) اور انہوں نے ایک موقعہ پر یہ بیان دیا تھا کہ دوسرے شخص کے شبہے کی بنا پر میرے خلاف کاروائی کی جا رہی ہے، یہ نظریہ قائم کر لیا کہ

"مولانا فضل حق مرحوم نے ۱۸۵۷ء کی تحریک میں واقعی کوئی حصہ نہیں لیا تھا انہوں نے اس سے پہلے لوگوں کو جو تلقین بھی کی ہو (اور اس کی طرف انہوں نے ایک جگہ اشارہ بھی کیا ہے) لیکن جب یہ ہنگامہ شروع ہوا تو وہ عملاً اس سے الگ تھلگ رہے، نہ علمی پہلو سے اس میں شریک ہوئے نہ عملی لحاظ سے، انہوں نے نہ کوئی فتویٰ لکھا نہ تلوار اٹھائی"۔[2]

---

[1] عاشق الٰہی میرٹھی، تذکرۃ الرشید جلد دوم، ص ۸۵

[2] مالک رام: ماہنامہ تحریک دہلی، ص ۲۵

تفصیل سابق کو کافی سمجھتے ہوئے اس جگہ جناب نادم سیتا پوری کی ایک عبارت نقل کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے، وہ رقمطراز ہیں:

"آج کی نئی ریسرچ و تحقیق نے محققانہ زاویہ نگاہ سے کم، ایرادی اور جوابی نقطۂ نظر سے زیادہ اس بات سے انکار کیا ہے کہ مولانا خیرآبادی نے اس جنگ آزادی میں کسی قسم کا حصہ لیا ہے۔ اس سلسلہ میں کئی مضامین سامنے آچکے ہیں جن کی فاضلانہ اور محققانہ بصیرت افروزی کے اعتراف کے باوجود میں اپنے آپ کو اس زاویۂ نگاہ سے متفق نہیں کر سکا۔" [1]

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں علامہ فضل حق خیرآبادی کے مجاہدانہ کارناموں کا سب سے زیادہ مستند ماخذ علامہ کا عربی رسالہ الثورۃ الھندیہ اور قصائد فتنۃ الہند ہیں، جناب نادم سیتاپوری نے انہیں مشکوک قرار دیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

"جس زمانے میں کونکر اور مینسل کے لکھے ہوئے یہ منتشر پرچے شمس العلماء مولوی عبدالحق کو پہنچے تو اس زمانے میں وہ اپنے بوڑھے باپ کی رہائی کے لئے کوشاں تھے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ منتشر پرچے ایک سیاسی قیدی کے ساتھ صحیح وسلامت حالت میں جزائر انڈمان سے ہندوستان کے ساحل تک پہنچ گئے تو بھی یہ بات قرین قیاس نہیں ہے کہ ان کی ترتیب و تدوین کے وقت شمس العلماء مولوی عبدالحق نے اس بات کو نظر انداز کر دیا ہو کہ یہ اوراق اگر حکومت ہند تک پہنچ گئے تو مولانا کی رہائی دشوار ہی نہیں محال ہو جائے گی۔ ایسی صورت میں اس کا قوی امکان ہے کہ ان کتابوں میں کچھ نہ کچھ تحریف ضرور کی گئی، وہ تحریف یا تنسیخ یا اضافہ کیا تھا؟ اس کے بارے میں قطعی طور پر کوئی بات کہی نہیں جا سکتی لیکن روایت بالا کہ رسالہ اور قصائد مختلف پرزوں پر کوئلہ سے لکھے ہوئے تھے، کی روشنی میں انہیں کلیۃً مولانا کی تصنیف سمجھنا ایک حل طلب معمہ ضرور رہے۔" [2]

---

[1] نادم سیتاپوری، غالب نام آورم، ص ۱۰۸، ۱۰۹۔

[2] ایضاً : ص ۱۲۴

پروفیسر محمد ایوب قادری نے اس روایت کی تردید کی ہے کہ رسالہ و قصائد کوئلے سے منتقل پرزوں پر لکھے ہوئے نکلے کیونکہ جزائر انڈیمان اور نکوبار میں دفتر قائم ہو چکا تھا، اسکول کھل چکا تھا، عدالتی کارروائیاں جاری تھیں، وہاں کے انگریز حکام کی اجازت سے تصنیف و تالیف کا کام جاری تھا تو پھر کوئلے سے لکھنے کا کیا قرینہ؟ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے نادم سیتاپوری کی تشکیک کا محاسبہ کیا ہے، ذیل میں اس کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے:۔

(۱) داخلی یا خارجی شواہد پیش کئے بغیر محض ظن و تخمین سے قصائد کو مشکوک قرار دینا درست نہیں ہے۔

(۲) مولانا مفتی عنایت احمد کاکوروی انڈیمان سے رہا ہو کر آئے تو اپنے ساتھ اپنی تین کتابیں لائے جن میں سے تواریخ حبیب الٰہ اور علم الصیغہ شائع ہو کر مقبول عام ہوئیں۔ جب یہ تین کتابیں بحفاظت پہنچ گئیں تو رسالہ اور قصائد کے پہنچنے سے کیا مانع تھا؟

(۳) ۱۲۷۷ھ میں مفتی عنایت احمد کاکوروی رہا ہو کر آئے، ایک دو ماہ بعد رسالہ اور قصائد غالباً کو پہنچے ہوں گے، ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ کو علامہ فضل حق کا وصال ہو جاتا ہے، اس لئے یہ بات قرین قیاس ہے کہ مولانا عبدالحق نے علامہ کے وصال کے بعد رسالہ و قصائد کی طرف توجہ دی ہو گی لہٰذا علامہ کی رہائی کے لئے کوشش ان کی ترتیب سے مانع نہ ہوئی ہوگی۔

(۴) یہ رسالہ اور قصائد مولانا عبدالحق کی زندگی میں شائع نہیں ہوئے لہٰذا حکومت کے خوف کی بنا پر تحریف و ترمیم کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔

(۵) اس رسالہ و قصائد میں حکومت برطانیہ پر سخت تنقید کی گئی ہے، اگر حکومت کے خوف سے ترمیم کی گئی ہوتی تو لب و لہجہ نرم ہوتا۔[۱]

آخر خاتم الحکماء مجاہد جلیل مولانا فضل حق خیرآبادی نے ایک سال نو ماہ ۱۹ دن جزیرۂ انڈیمان میں سیاسی قیدی رہ کر ۱۲ صفر ۲۰ اگست ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء کو جام شہادت نوش کیا، رحمہ اللہ تعالیٰ و ارضاہ۔[۲]

---

[۱] محمد ایوب قادری: "جزائر انڈیمان و نکوبار میں مسلمانوں کی علمی خدمات" سہ ماہی اردو، جنوری ۱۹۶۰ء ص ۶۳-۶۴

[۲] نادم سیتاپوری، غالب نام آورم، ص ۱۲۱

خان بہادر سید مسعود حسن مسعود نے تاریخِ وفات کہی :

باعمل تھے حضرتِ فضلِ حق — کر دیا نیرنگ نے جینا محال

انڈمن کو لے گئی قیدِ فرنگ — ہو گیا آخر وہیں پہ انتقال

سال ہے مسعود "بے ہادیٔ ہند"

فضلِ حق خیرآبادی باکمال! [1]

۱۸۶۱ ھ

مولانا محمد سعید، حسرت (م ۱۳۰۴ھ) مرید مولانا نذر محمد بلہوری خلیفہ سید احمد بریلوی نے عربی میں قطعۂ تاریخ کہا :

قد توفی الالٰہ فضل الحق — عالماً جیداً بلا ریب

ان نفاہ الولاۃ من بلدہ — بجفاء فلیس من عیب

قال تاریخہ "لا دریکہ — فضل حق" ھواتف الغیب

۱۲۷۸ ھ

(ولہ ایضاً) مادۂ مذکورہ کی فارسی میں تضمین کی ہے :

مولوی فضلِ حق چو رحلت کرد — جنتی گشت، نیست ریب مرا

گفت تاریخ "لا دریکہ — فضلِ حق" سروشِ غیب مرا [2]

۱۲۷۸ ھ

شاہ اسمٰعیل دہلوی کی تحریک

مولانا عبد الشاہد خاں شروانی، علامہ فضلِ حق کے سلسلۂ تلامذہ میں ہونے کی وجہ سے علامہ سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں، اس کے ساتھ شاہ اسمٰعیل دہلوی جن کے خلاف علامہ نے تمام عمر علمی اور قلمی جہاد کیا، سے بھی نیازمندانہ تعلقِ خاطر رکھتے ہیں، علامہ کے مسلک کو ترجیح دینے کے ساتھ چاہتے ہیں کہ شاہ اسمٰعیل کا دامنِ عقیدت بھی ہاتھ سے نہ چھوٹے، اسی لئے انہوں نے

[1] مسعود حسن مسعود : عندلیبِ تواریخ (ادارہ انیس الہ آباد) ص ۱۱۰

[2] محمد سعید، حسرت : قسطاس البلاغہ (مطبوعہ احسن المطابع عظیم آباد ۱۳۰۰ھ) ص ۲۱۰۔

جابجا یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ ان حضرات کا اختلاف صحابۂ کرام کے مشاجرات کی طرح تھا اور یہ اختلاف علمی اور فروعی نوعیت کا حامل تھا حالانکہ فریقین کی تصانیف کے مطالعہ سے ہر انصاف پسند اس نتیجے پر پہنچے گا کہ یہ اختلاف صرف علمی نہیں بلکہ اصولی اور اعتقادی تھا اور ایسے اختلاف کے ہوتے ہوئے ہر دو فریق کو حق پر نہیں کہا جا سکتا۔ مولانا عبدالشاہد بھی مانتے ہیں کہ شاہ اسمٰعیل نے غلو اور تشدد سے کام لیا اور تقویۃ الایمان میں ان امور کو جو شرک خفی تھے شرک جلی لکھ دیا[1] اور ان تحریرات سے متوقع شور و شر کے بارے میں یہ کہہ کر دل کو تسلی دے لی کہ:

"گو اس سے شورش ہو گی مگر توقع ہے کہ لڑ بھڑ کر خود ٹھیک ہو جائیں گے"[2]

تقویۃ الایمان کا منظر عام پر آنا تھا کہ واقعی زبردست اختلاف پیدا ہو گیا اور سواد اعظم اہل سنت کی طرف سے بیسیوں کتابیں[3] اس کے رد میں لکھی گئیں۔ اس کتاب نے اختلاف و انتشار کا ایسا دروازہ کھولا کہ "شورش" بھی ہوئی "لڑائی بھڑائی" بھی ہوئی مگر "ٹھیک ہونے" کا مرحلہ شاید صبح قیامت تک نہ آسکے۔

مولوی اسمٰعیل دہلوی نے تقویۃ الایمان میں شفاعت کی تین قسمیں بیان کیں (۱) شفاعت وجاہت (۲) شفاعت محبت (۳) شفاعت بالاذن، اور پہلی دو قسموں کا بڑی شد و مد سے انکار کیا[4] کسی نے یہ عبارت نقل کر کے علامہ فضل حق خیرآبادی کی خدمت میں استفتاء پیش کیا اور پوچھا یہ کلام حق ہے یا باطل؟ اس میں سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شان اقدس کا استخفاف ہے یا نہیں؟ اور اس کے قائل کا کیا حکم ہے؟ علامہ نے اس کے جواب میں ایک مبسوط کتاب تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ کی طرح ڈالی اور اسے چار مقامات پر تقسیم کیا، آخر کتاب میں قائل کا حکم بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"جواب سوال ثالث این است کہ قائل این کلام از روئے شرع مبین بلاشبہ کافر و بے دین است، ہرگز مومن و مسلمان نیست و حکم او شرعاً قتل و تکفیر است۔"[5]

---

[1] عبدالشاہد خاں شروانی: باغی ہندوستان، ص ۱۱۵

[2] حکایات اولیاء: (ارواح ثلاثہ کا نیا ایڈیشن، طبع دارالاشاعت کراچی)، ص ۱۰۴

[3] تفصیل کیلئے، سیف الجبار، از مولانا شاہ فضل رسول قادری قدس سرہ العزیز، مطبوعہ مکتبۂ رضویہ لاہور، حاشیہ ص ۹۱، ۹۴ ملاحظہ ہو۔

[4] اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان (دفتر اخبار محمدی دہلی) ص ۳۵، ۳۷۔

[5] محمد فضل حق خیرآبادی علامہ: تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ (قلمی)، ص ۱۲۴

ترجمہ: تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ اس بے فائدہ کلام کا قائل از روئے شریعت کافر و بددین ہے ہرگز مومن اور مسلمان نہیں ہے اس کا شرعی حکم قتل اور تکفیر ہے۔"

اگر ایمان و کفر دونوں برحق ہو سکتے ہیں تو علامہ اور مولوی اسمٰعیل دہلوی دونوں برحق ہو سکتے ہیں ورنہ خطِ التفات د!

علامہ کا یہ نظریہ وقتی نہیں تھا بلکہ بحالتِ اسیری انڈمان جاتے ہوئے اپنے شاگرد مولانا قلندر علی زبیری کو خاص طور پر نصیحت کی کہ میں تقویۃ الایمان کا بالاستیعاب رد نہیں کر سکا اس لئے یہ کام تم سرانجام دینا، ایسے حالات میں یہ کس طرح مان لیا جائے کہ علامہ نے ایک موقعہ پر یہ فرمایا:

"میں اور مولوی اسمٰعیل پر تبرا کروں، یہ نہیں ہو سکتا، جو کچھ مجھ سے ہو چکا ہے وہ بھی بہکانے سکھانے سے ہوا تھا اور اب تو وہ بھی نہیں ہو سکتا۔" [1]

"اور جب مولوی اسمٰعیل دہلوی کی "شہادت" کی خبر پہنچی تو سناٹے کے عالم میں کئی گھنٹے خاموش بیٹھے روتے رہے اور اس کے بعد فرمایا کہ اسمٰعیل کو ہم مولوی نہیں جانتے تھے بلکہ وہ امت محمدیہ کا حکیم تھا، کوئی شئے نہ تھی جس کی کیفیت اور لمیت اس کے ذہن میں نہ ہو، امام رازی نے اگر حاصل کیا تو دود چراغ کھا کر اور اسمٰعیل نے محض اپنی قابلیت اور استعداد خداداد سے۔" [2]

ایسی خود ساختہ حکایات کو خوش عقیدگی کا نتیجہ ہی قرار دیا جا سکتا ہے ورنہ حقیقت سے انہیں دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

اس بحث میں مولوی اسمٰعیل دہلوی نے یہ بھی کہہ دیا:

"اس شہنشاہ کی تو یہ شان ہے کہ ایک آن میں ایک حکم کن سے چاہے تو کروڑوں نبی اور ولی اور جن اور فرشتہ، جبرئیل اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر پیدا کر ڈالے۔" [3]

---

[1] اشرف علی تھانوی، مولوی: حکایاتِ اولیاء، طبع کراچی، ص ۴۳۹

[2] فضل حسین بہاری: الحیاۃ بعد المماۃ، طبع کراچی، ص ۱۹۷

[3] اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۳۶

علامہ نے اس پر گرفت کی اور فرمایا :

" باید دانست کہ ایں کلام ناتمام کاذب و دروغ و گزاف بے فروغ است " [1]

اور شرح وبسط سے اس پر تنقید کی اور بتایا کہ اوصافِ کاملہ میں حضرت خاتم النبیین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نظیر بالذات ناممکن ہے۔ اس کا جواب دینے کی کوشش کی گئی تو علامہ نے امتناع النظیر ایسی محققانہ کتاب لکھی جو اب تک لاجواب ہے۔

علامہ ارشد القادری مدظلہٗ (حال بریڈفورڈ) نے اپنی قابلِ قدر کتاب زلزلہ میں علماءِ دیوبند کا فکری تضاد جس حسن وخوبی سے بیان کیا ہے، لائقِ داد ہے۔ اس میں انہوں نے تقویۃ الایمان وغیرہ کتب سے ایسے حوالے پیش کئے ہیں کہ جن سے سرورِ دوعالم صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تصرف اور علمِ غیب کے انکار کا پتہ چلتا ہے۔ دوسری طرف دیوبندی لٹریچر سے ایسے اقتباس پیش کئے ہیں جن میں اکابرِ دیوبند کے علومِ غیبیہ اور شانِ تصرف کو نمایاں کر کے بیان کیا ہے۔

زلزلہ کی وقعت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ مولانا عامر عثمانی نے ماہنامہ تجلی، دیوبند میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :

" ہمارے نزدیک جان چھڑانے کی ایک ہی راہ ہے کہ یا تو تقویۃ الایمان اور فتاویٰ رشیدیہ اور فتاوئے امدادیہ اور حفظ الایمان جیسی کتابوں کو چوراہے پر رکھ کر آگ دے دی جائے اور صاف اعلان کر دیا جائے کہ ان کے مندرجات قرآن وسنت کے خلاف ہیں اور ہم دیوبندیوں کے صحیح عقائد ارواحِ ثلاثہ اور سوانحِ قاسمی اور اشرف السوانح جیسی کتابوں سے معلوم کرنے چاہئیں یا پھر ان مؤخر الذکر کتابوں کے بارے میں اعلان فرمایا جائے کہ یہ تو محض قصے کہانیوں کی کتابیں ہیں جو رطب ویابس سے بھری ہوئی

---

[1] محمد فضل حق خیرآبادی، علامہ : تحقیق الفتوےٰ (قلمی)، ص ۵۹

ہیں اور ہمارے صحیح عقائد وہی ہیں جو اول الذکر کتابوں میں مندرج ہیں"[1]

مولوی اسمٰعیل اور سید صاحب صوبہ سرحد میں

مولانا عبدالشاہد شروانی نے باغی ہندوستان میں جا بجا مولوی اسمٰعیل دہلوی کے جہادِ بالاکوٹ کا ذکر کیا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ صوبہ سرحد کی کاروائی کا مختصر جائزہ پیش کر دیا جائے۔

مولانا رشید احمد گنگوہی کا بیان ہے کہ :

"سید صاحب نے پہلا جہاد یار محمد خاں حاکمِ یاغستان سے کیا تھا" [2]

اس جہاد کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا، پشاور اور کوہاٹ قبضے میں آگئے۔ سید مراد علی منشی سرحد چوکی دربند (ہزارہ) لکھتے ہیں :-

"راویانِ معتبر بچشمِ دیدہ نقل کرتے ہیں کہ ۱۸۳۰ء میں خلیفہ سید احمد سرگروہِ وہابیاں نے یار محمد حاکم پشاور و کوہاٹ، برادر دوست محمد خاں والیٔ کابل کو بہ پشت گرمی لشکر غازیاں شکست دی اور ملک پشاور و کوہاٹ پر قبضہ کر کے اپنے مقامہ جات مقرر کئے اور بہ لقب سید بادشاہ مشہور ہوا" [3]

اس کے بعد فتح خاں رئیس پنجتار اور پلال قوم کے سربلند خاں وغیرہ سید صاحب کے مرید ہو گئے لیکن اپنے دور کے مشہور باہمت سردار پائندہ خاں نے بیعت نہ کی، سید صاحب اور مولوی اسمٰعیل دہلوی نے بمقام عشرہ ان سے ملاقات کی اور بیعت کی دعوت دی لیکن وہ تیار نہ ہوئے۔ اسی اثناء میں سردار پائندہ خاں کا چھوٹا بھائی سردار مدد خاں سید صاحب سے بیعت ہوا اور بتایا کہ میرا بھائی میرا جانی دشمن ہے، میں اس کے ہاتھوں بہت پریشان ہوں، سید صاحب نے اسے تسلی دی اور پائندہ خاں پر کفر کا فتوے لگا دیا (اس لئے کہ وہ بیعت نہیں ہوا تھا) اور اس سے جہاد کرنے

---

[1] زلزلہ، بحوالہ تجلی (مطبوعہ مظہر فیض رضا، برناح منڈھی، لائلپور، جون ۱۹۷۳ء) ص ۱۸۷، ۱۸۸

[2] عاشق الٰہی میرٹھی : تذکرۃ الرشید جلد دوم، ص ۲۷۰

[3] مراد علی، سید : تاریخ تناولیاں (مطبع کوہِ نور، لاہور ۱۸۷۰ء) ص ۴۹۔

کے لئے پنجتار سے موضع کنیر ڑی پہنچ گئے، پاینده خاں کو پتہ چلا تو وہ بھی مقابل آکر صف آرا ہو گیا
سخت کشت و خون کے بعد پاینده خان کو شکست ہو گئی اور وہ جان بچا کر موضع بانڈی سے ہوتا ہوا
موضع شمد ہڑہ (علاقہ اگرور) چلا گیا۔

سردار پاینده خاں اس سے پہلے بھی سکھوں سے ٹکر لے چکا تھا اور اس کے بعد بھی ان
سے برسرِ پیکار رہا لیکن اس وقت اسے اپنی حفاظت کی یہی صورت نظر آئی کہ ہری سنگھ
سے امداد کی اپیل کی جائے جو اس وقت مانسہرہ میں مقیم تھا۔ ہری سنگھ نے امداد دینے کے لئے
یہ شرط عائد کر دی کہ تمہیں اپنا لڑکا جہانداد خاں بطورِ ضمانت میرے سپرد کرنا ہو گا تا کہ تم میرے
خلاف کوئی کارروائی نہ کر سکو، پاینده خاں نے اس شرط کو منظور کر لیا اور سکھوں کی دو پلٹن
فوج لے کر پھگلڑہ کی طرف روانہ ہوا۔ دریائے سرن کے راستے پر سید صاحب کے بھانجے مولوی
احمد علی اور اس کے ساتھیوں نے مزاحمت کی۔ میدانِ کارزار گرم ہوا، بے شمار سکھ مارے گئے
مولوی احمد علی اور (چند ایک کے سوا) ان کے تمام ساتھی مارے گئے۔ اس کے علاوہ موضع
چھتر بائی میں مقابلہ ہوا اور سید صاحب کے رفقاء کو شکستِ فاش ہوئی، اس کے بعد سید
صاحب پنجتار چلے گئے۔ [1]

اس طرح پاینده خان کی جان بھی بچ گئی اور علاقہ بھی خالی ہو گیا لیکن ہری سنگھ نے
حسبِ وعدہ اس کا لڑکا جہانداد واپس نہ کیا، وہ چاہتا تھا کہ پاینده خاں خود آ کر اپنے بیٹے کی
رہائی کے لئے التجا کرے لیکن پاینده خاں کسی صورت میں بھی ملاقات پر آمادہ نہ ہوا کیونکہ اس
کے باپ کی وصیت تھی کہ کسی حاکم سے نہ ملنا۔ اسی سلسلے میں اسے سکھوں سے نبرد آزما ہونا پڑا اور
جانگسل معرکے ہوئے، ہری سنگھ نے جہانداد کو رنجیت سنگھ کے پاس لاہور پہنچا دیا جہاں سے
سات سال بعد اس کی واپسی ہوئی [2] اس جگہ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ سردار پاینده خاں تمام
عمر سکھوں سے برسرِ پیکار رہا اور بالآخر ۱۲۵۷ھ/۱۸۴۰ء میں فوت ہوا۔ [3]

اس تفصیل سے یہ واضح ہو گیا کہ سید صاحب مسلمانوں سے بھی شمشیر بکف ہوتے رہے اور انہیں

---

[1] مراد علی سید: تاریخ تناولیاں، ص ۴۷، ۵۴۔
[2] ایضاً: ص ۵۴، ۶۱۔
[3] ایضاً: ص ۶۸

مجبور کر دیا کہ وہ سکھوں کی امداد حاصل کریں اور سرحد میں سید صاحب کی ناکامی کی بڑی وجہ وہابیانہ عقائد، بیجا تشدد اور بات بات پہ کفر کے فتوے تھے کیونکہ سرحد کے اکثر باشندے سنی حنفی، دیندار، بہادر اور غیرت مند تھے، اگر تشدد اور وہابیت ایسے امور درمیان میں حائل نہ ہوتے تو شاید سید صاحب کو کبھی ناکامی کا منہ نہ دیکھنا پڑتا، بالآخر مولوی اسمٰعیل دہلوی اور سید صاحب ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء میں قلعہ بالاکوٹ کے قریب معرکے میں کام آئے اور عقیدت مندوں نے شہید مشہور کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ سید صاحب نے سرحدی مسلمانوں کے علاوہ سکھوں سے بھی جہاد کیا مگر یہ بات ابھی تشنہ تحقیق ہے کہ وہ کسی سکھ کے ہاتھوں مارے گئے یا کسی سرحدی پٹھان کے ہاتھوں، سر سید لکھتے ہیں :۔

"۱۸۲۴ء میں وہابیوں نے پہاڑوں میں جا کر قیام کیا اور انہوں نے اس بات کا قصد کیا کہ سکھوں پر ہم لوگ جہاد کریں اور شہید ہوں لیکن چونکہ پہاڑی قومیں ان کے عقائد کے مخالف تھیں اس لئے وہ وہابی ان پہاڑیوں کو ہرگز اس بات پر راضی نہ کر سکے کہ وہ ان کے مسائل کو بھی اچھا سمجھتے۔

مگر چونکہ وہ سکھوں کے جور و ستم سے نہایت تنگ تھے اس سبب سے وہابیوں کے اس منصوبہ میں بھی شریک ہو گئے کہ سکھوں پر حملہ کیا جاوے اور آخر کار وہابیوں اور پہاڑیوں نے متفق ہو کر سکھوں پر حملہ بھی کیا لیکن چونکہ یہ قوم مذہبی مخالفت میں نہایت سخت ہے اس سبب سے اس قوم نے اخیر میں وہابیوں سے دغا کر کے سکھوں سے اتفاق کر لیا اور مولوی محمد اسمٰعیل صاحب اور سید احمد صاحب کو شہید کیا"[1]

جناب یوسف جبریل جن کا کہنا ہے کہ میرے جد امجد سکھوں کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ لکھتے ہیں :۔

"اسمٰعیل شہید جیسے لوگ سر سے کفن باندھ کر لوگوں کو سکھوں کے عذاب سے نجات دلانے آئے اور مسلمانوں کے ہاتھوں ہی سے شہید ہو کر خالق حقیقی سے جا ملے"[2]

---

[1] سر سید : مقالات سر سید حصہ نہم (مجلس ترقی ادب لاہور) ص ۱۳۹ ۔ ۱۴۰

[2] یوسف جبریل : المیہ ہسپانیہ کے عوامل، نوائے وقت لاہور ۲۵ راگست ۱۹۷۴ء

سید صاحب کی تحریک کا پس منظر معلوم کرنے کے لئے مولانا حسین احمد دیوبندی کی عبارت کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو، وہ لکھتے ہیں:۔

"سید صاحب کا اصل مقصد چونکہ ہندوستان سے انگریزی تسلط اور اقتدار کا قلع قمع کرنا تھا جس کے باعث ہندو اور مسلمان دونوں ہی پریشان تھے اس بناء پر آپ نے اپنے ساتھ ہندوؤں کو بھی شرکت کی دعوت دی اور صاف صاف انہیں بتا دیا کہ آپ کا واحد مقصد ملک سے بدیسی لوگوں کا اقتدار ختم کرنا ہے اس کے بعد حکومت کس کی ہوگی؟ اس سے آپ کو غرض نہیں ہے، جو لوگ حکومت کے اہل ہوں گے، ہندو یا مسلمان یا دونوں وہ حکومت کریں گے۔" [1]

مولانا عامر عثمانی نے ماہنامہ تجلی دیوبند میں اس پر یوں تبصرہ کیا ہے:

"کوئی شک نہیں اگر استاذ محترم حضرت مدنی کے ارشاد گرامی کو درست مان لیا جائے تو حضرت اسمٰعیل کی شہادت محض فسانہ بن جاتی ہے۔ مادی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لئے غیر ملکی حکومت کے خاتمے کی کوشش کرنا ذرا بھی مقدس نصب العین نہیں اس نصب العین میں کافر و مومن سب یکساں ہیں، اس طرح کی کوشش کے دوران مارا جانا اس شہادت سے بھلا کیا تعلق رکھے گا جو اسلام کی ایک معزز ترین اور مخصوص اصطلاح ہے اور اس طرح کی کوششوں کے نتیجے میں قید و بند کی مصیبتیں اٹھانا اجر آخرت کا موجب کیوں ہوگا؟" [2]

وضع احادیث

سید صاحب کے مریدین کو عقیدت میں اس قدر غالی بنا دیا گیا تھا کہ وہ ہر جائز اور ناجائز طریقے سے سید صاحب کی مدح و ثنا کرنے کے خوگر ہوگئے تھے۔ یہ سلسلہ یہاں تک پہنچا کہ من گھڑت روایات کو نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے میں بھی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے، مشہور اہل حدیث مولانا عنایت اللہ اثری، مولانا غلام رسول مہر کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

---

[1] حسین احمد دیوبندی: نقش حیات ج ۲، ص ۱۳ (بحوالہ زلزلہ، ص ۱۸۶)

[2] زلزلہ: ص ۱۸۶، ۱۸۷ (بحوالہ تجلی، دیوبند)

"آپ (مولوی فضل الٰہی) نے اس جماعت کا شائع کردہ رسالہ بنام خلاصہ مجھے دکھایا جس میں یہ حدیث تھی کہ "اذا مضت الف و مأتان واربعون سنۃ بعث اللہ المھدی فیبایع علیٰ یدہ خلق کثیر ثم یغیب اللہ تعالیٰ فیرتدون الیٰ دین آبائھم الا من اتبع کتاب اللہ وسنۃ نبیہ" [1]

ترجمہ: ۱۲۴۰ھ گزرنے پر اللہ تعالیٰ مہدی کو بھیجے گا جس کے ہاتھوں پر خلقِ کثیر بیعت ہو گی، پھر اللہ تعالیٰ اسے غائب کر دے گا تو لوگ اپنے آباء کے دین کی طرف لوٹ جائیں گے سوائے کتاب و سنت کے متبعین کے"

چونکہ اس وقت لاہور پر سکھ حکمران تھے اس لئے روایت سابقہ پر اکتفاء نہ کرتے ہوئے ایک روایت میں یہ بھی بڑھا دیا:- فیقاتل کفرۃ لاہور [2]

مولانا عنایت اللہ اثری (حال گجرات) نے اس روایت کے بارے میں کچھ اس طرح اظہار خیال کیا ہے:-

"یہ روایت کسی حدیث کی کتاب میں بھی نہیں دیکھی بلکہ جو ذخیرہ موضوعات کے نام سے علماء کرام نے جمع فرمایا ہے، یہ روایت اس میں بھی نہیں، معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کی شہادت کے بعد اسے وضع کیا گیا ہے" [3]

مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا عبدالشاہد خاں شروانی نے مولانا ابوالکلام آزاد کی مدح سرائی میں بھی بڑے مبالغے سے کام لیا ہے اور آزاد کو علامہ کے ہمسر کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے حالانکہ علامہ فضل حق خیرآبادی نے جو نظریہ ابتداء قائم کیا تھا تاحیات اس پر قائم رہے جبکہ مولانا آزاد ابتداء میں بڑے زور سے مسلمانوں کی انفرادیت کا پرچار کرتے اور فرمایا کرتے تھے:

"مسلمانوں کیلئے اس سے بڑھ کر کوئی شرم انگیز سوال نہیں ہو سکتا کہ وہ دوسروں کی پولیٹکل تعلیموں کے آگے جھک کر نیا راستہ پیدا کریں، ان کو کسی جماعت میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں وہ خود دنیا کو اپنی راہ پر چلانے والے ہیں اور صدیوں تک چلا چکے ہیں..... وہ خدا کی جماعت ہیں اور خدا کی غیرت اس کو کبھی گوارا نہیں کر سکتی کہ اس کی چوکھٹ پر

---

[1] عنایت اللہ اثری: مکاتیب العنایہ نے مکاتیب العنایہ (جنوری ۱۹۶۹ء) ص ۸۵، ۸۶

[2] ایضاً ص ۸۶ [3] ایضاً ص ۸۶

نوٹ: اس سے پتہ چلتا ہے کہ مجاہدین صرف سکھوں کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے اسی لئے لاہور کا نام لیا، انگریزوں کے خلاف جہاد کے عزم کا نام و نشان تک نہیں۔

جھکنے والوں کے سرغیروں کے آگے جھکیں۔" [1]

اور یہ بھی فرمایا:

"ہم تو خود مسلمانوں کی سب سے بڑی غلطی سمجھتے ہیں کہ ہمیشہ انہوں نے اپنے سامنے دو ہی راستے دیکھے ہیں یا گورنمنٹ پر اعتماد اور یا ہندوؤں اور کانگریس کی شرکت۔" [2]

لیکن خود مولانا آزاد ایک طرف شاہِ برطانیہ کی تاجپوشی کے موقعہ پر یوں قصیدہ خواں نظر آتے ہیں:

ہوئی لندن میں از فضلِ الٰہی — نہایت شان سے جب "تاجپوشی"

کہا آزاد نے بڑھ کر ادب سے — مبارک شاہ کو اب "تاجپوشی" [3]

۱۳۳۰

اسی موقعہ پر ایک طویل قصیدے کے آخر میں یوں دعاگو ہیں:

دستم بدعا کنوں برآرم — کاے رب قدیر کردگارم

باشد بہ ادب قیام شاہی — باصولت و رعب عز و جاہی [4]

دوسری جانب جب ہندو نوازی کا دور شروع ہوا تو بڑے زور سے مسلمانوں کو کانگریس میں شریک ہونے کی تلقین کی، چنانچہ ایک بیان میں کہا:

"مسلمانوں کو اپنے (حقوق) کے تحفظات کے لئے گورنمنٹ برطانیہ کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے انہیں برادرانِ وطن (ہندوؤں) کی طرف دیکھنا چاہیے، ان سے بدگمان نہیں رہنا چاہیے بلکہ جوق در جوق کانگریس میں شریک ہو جانا چاہیے کانگریس کے ہاتھوں میں ان کے حقوق بالکل محفوظ ہیں۔" [5]

علمائے اہلِ سنت نے جب انہیں "ہندو مسلم اتحاد" کی خرابیوں سے مطلع کیا تو وقتی اقرار کے باوجود اپنی روش میں تبدیلی پیدا نہ کی جس کی کچھ تفصیل تتمہ میں پیش کی جا رہی ہے، ایک وقت وہ تھا جب مولانا آزاد پوری کی پوری ملتِ اسلامیہ کو جسمِ واحد قرار دیتے تھے اور ایک وہ وقت بھی آیا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کی وحدت کو صحیح نہیں مانتے تھے بلکہ یہاں تک کہہ گئے:

"یہ کہنا کہ مذہبی ہم آہنگی ان علاقوں کو جو جغرافیائی، اقتصادی، لسانی اور تمدنی طور پر

---

[1] حبیب احمد چودھری: تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماء، ص ۲۱۱، بحوالہ روزنامہ الہلال [2] ایضاً، ص ۲۱۲، ۱۹۱۲ء دسمبر
[3] ابو سلمان شاہجہانپوری: ارمغانِ آزاد، ص ۵، [4] ایضاً: ص ۷۴، ۷۵
[5] حبیب احمد چودھری: تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماء، ص ۲۱۲، بحوالہ اسٹیٹسمین ۱۹ فروری ۱۹۴۰ء

مملف ہیں، متحد کر سکتی ہے، لوگوں کے ساتھ سب سے بڑا فریب ہے؛ یہ صحیح ہے
کہ اسلام نے ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کی کوشش کی جو نسلی، لسانی، اقتصادی اور
سیاسی حدود سے بالاتر ہو لیکن تاریخ نے ثابت کر دیا کہ پہلے چند قرنوں یا زیادہ سے
زیادہ پہلی صدی کے بعد اسلام صرف اسلام کی بناء پر تمام مسلم ممالک کو ایک اسٹیٹ
میں منسلک کرنے میں ناکام رہا۔" [1]

اس اقتباس کو پڑھ کر بے ساختہ کہنا پڑتا ہے کہ مولانا آزاد کے دل و دماغ پر گاندھی پرستی کا اس قدر غلبہ
ہو گیا تھا کہ وہ صرف برائے نام مسلمان رہ گئے تھے ورنہ وہ اس طرح بے دھڑک ہو کر اسلام کو ناکام قرار
دینے کی جرأت نہ کرتے، اکبر الٰہ آبادی نے سچ کہا تھا:

کانگریس کے مولوی کی کیا پوچھتے ہو کیا ہے
گاندھی کی پالسی کا عربی میں ترجمہ ہے

مولانا آزاد نظریۂ پاکستان کے ان مخالفین میں سے تھے جنہوں نے کبھی اس نظریہ کو دل سے
قبول نہیں کیا، انتخاب صدارت کے بعد صاف لفظوں میں اعلان کیا:

"جناح کا یہ نظریہ کہ ہندوستان میں (ہندو اور مسلمان) دو جدا گانہ اقوام ہیں غلط فہمی
پر مبنی ہے، میں اس بات میں ان سے متفق نہیں ہوں۔" [2]

رئیس احمد جعفری لکھتے ہیں:

"منظر عام پر وہ (ابوالکلام) اس طرح ابھرے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا رجز
ان کی زبان پر تھا لیکن سی، آر، داس کی رفاقت گاندھی کی نیاز مندی، موتی لال کی
دوستی اور جواہر سے تعلق خاطر نے انہیں اتنا بدل دیا کہ وہ مسلمانوں کے حق خود ارادیت
کے قائل نہیں تھے...... آخر میں جب جواہر لال، پٹیل اور گاندھی تک چار و ناچار تقسیم
ہند یعنی مطالبہ پاکستان تسلیم کر لینے پر مجبور ہو گئے، مولانا تب بھی اپنے رفیقوں سے
ذہنی طور پر متفق نہ ہو سکے..... تحریک پاکستان کے راستے میں جو سنگ گراں حائل

---

[1] حبیب احمد چودھری: تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء، ص ۲۲۱ (بحوالہ انڈیا ونس فریڈم، ص ۲۲۷)
[2] ایضاً: ص ۲۱۳ (بحوالہ اسٹیٹسمین ۱۹ فروری ۱۹۴۰ء)

تھے، ان میں ایک مولانا (ابوالکلام) بھی تھے، انہوں نے ہر موقعہ پر پاکستان کے

تصور اور مطالبے کی مخالفت کی۔" [1]

کچھ باغی ہندوستان کے بارے میں

مولانا عبدالشاہد شروانی نے بیش نظر کتاب لکھ کر علمی دنیا میں بلند مقام حاصل کیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے مصنف کی وسعت نظری، علمی گہرائی، سلاست بیان اور علامہ فضل حق خیرآبادی سے والہانہ عقیدت کا پتہ چلتا ہے۔ ہم ان کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اہلسنت کے بطل جلیل قائد حریت علامہ فضل حق خیرآبادی کے علمی، ادبی اور مجاہدانہ کارنامے کتابی شکل میں مرتب کرکے لافانی بنا دیا ہے۔ "باغی ہندوستان" کو نظر انداز کرکے علامہ پر کوئی تحقیقی مقالہ یا کتاب نہیں لکھی جا سکتی۔

مولانا عبدالشاہد خان شروانی نے سب سے پہلے تحریک آزادی کی مستند دستاویز جہاد آزادی کے ہیرو علامہ فضل حق خیرآبادی کی تصنیف لطیف "الثورۃ الھندیہ" اور "قصائد فتنۃ الھند" کو اردو ترجمہ اور مفصل مقدمہ کے ساتھ ۱۹۴۷ء میں شائع کرواکر علمی دنیا میں متعارف کرایا، بعد ازاں رسالہ اور قصائد کا یہی ترجمہ رئیس احمد جعفری نے اپنی کتاب "بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد" میں شامل کر دیا، مولانا غلام مہر علی مدظلہ (چشتیاں شریف) نے کتاب مطبوعہ بہادر شاہ ظفر سے الثورۃ الھندیہ کا ترجمہ اپنی کتاب دیوبندی مذہب کا علمی محاسبہ میں شامل کر دیا۔ اسکے علاوہ مولانا غلام مہر علی مدظلہ نے الثورۃ الھندیہ پر الیواقیت المہریہ کے نام سے عربی میں حاشیہ لکھکر ۱۹۶۴ء میں شائع کیا جس میں حل کتاب کے علاوہ کثیر تعداد میں علماء اہل سنت کے حالات قلمبند کئے ہیں۔

مولانا عبدالشاہد شروانی انڈین نیشنل کانگریس سے تعلق اور مولانا آزاد سے عقیدت کی بنا پر ایسی باتیں کہہ گئے ہیں جو نظریہ پاکستان کے مخالف اور مولانا آزاد کی بیجا، مبالغہ آمیز مدح سرائی پر مشتمل ہیں، بعض جگہ قائد اعظم پر بھی نام لئے بغیر طعن کیا گیا ہے، مولانا ریاست علی ندوی، باغی ہندوستان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اس میں بہت سی ایسی تفصیلات آگئی ہیں جن کا تعلق حیات فضل حق سے کچھ زیادہ نہ تھا۔" [2]

اسی طرح انہوں نے اپنے حالات بیان کرتے ہوئے پچاس صفحات صرف کر دئیے ہیں۔ ہونا تو یہ

---

[1] رئیس احمد جعفری : کاروان گم گشتہ (طبع رئیس احمد جعفری اکیڈمی، کراچی ۱۹۷۱ء) ص ۳۹۔

[2] ریاست علی ندوی : ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ (اکتوبر ۱۹۴۷ء) ص ۳۱۴۔

چاہیے تھا کہ یہ مواد اپنی جگہ رہتا اور حرفِ آغاز میں اس کی تردید کر دی جاتی لیکن کاغذ کی ہوش رُبا گرانی نے اتنی گنجائش نہیں رہنے دی اس لئے ہم نے بعض مقامات سے انٹی پاکستان مواد اور غیر ضروری حصہ حذف کر دیا ہے تاہم ایسی بعض سطریں باقی رہ گئی ہیں، نیز مؤلف کے حالات کی تلخیص کر دی ہے۔

جذباتِ تشکر

مکرمی حکیم محمد موسیٰ امرتسری مدظلہ کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے کہ انہوں نے شب و روز کی مصروفیت کے باوجود باغی ہندوستان پر جستہ جستہ حواشی تحریر فرمائے جن کی بدولت کتاب کی ثقاہت میں اضافہ ہو گیا ہے، نیز قدم قدم پر ان کے مشورے ہمارے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوئے، جن کی وجہ سے ہم کتاب کو بہتر صورت میں پیش کرنے کے قابل ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم ان کے شکریہ سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے، ہمارے فاضل دوست محمد عالم مختار حق بھی شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ہمیں باغی ہندوستان کا نسخہ فراہم کیا جو ہمیں کوششِ بسیار کے باوجود دوسری جگہ سے نہیں مل سکا تھا۔

استاذ العلماء مولانا مفتی محمد عبد القیوم ہزاروی مدظلہ، ناظمِ اعلیٰ جامعہ نظامیہ رضویہ (لاہور) و ناظمِ اعلیٰ تنظیم المدارس (اہل سنت) پاکستان، مولانا الحاج محمد منشا تابش قصوری زید مجدہ، برادرِ محترم مولانا محمد عبد الغفار ظفر صابری، سنی رضوی کتب خانہ، آستانہ عالیہ حضرت شیخ الحدیث جھنگ بازار لائلپور، اور مولانا شاہ محمد چشتی قصوری زید مجدہ کی کوششیں لائقِ صد تحسین ہیں کہ ان کی وجہ سے یہ کتاب پاکستان میں پہلی بار پیش کی جا رہی ہے۔

۲۹ شعبان ۱۳۹۴ھ
۱۷ ستمبر ۱۹۷۴ء

محمد عبد الحکیم شرف قادری

لاہور

باسمہٖ سبحانہٗ

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

آٹھ دس برس ہوتے ہیں دار الخیر اجمیر میں مقیم اور حضرت الاستاذ علامۃ الہند
مولانا معین الدین اجمیری مرحوم و مغفور سے کسبِ علوم میں مشغول تھا۔ مولانا تلامذہ کی تعلیم کے ساتھ
ساتھ تربیت کا بھی پورا خیال فرماتے تھے۔ اکثر صحبتوں میں جہادِ حریت کی تلقین اور ثبات و
استقلال کا درس بھی رہتا تھا۔ حضرۃ العلامہ فضل حق خیرآبادی کا ذکرِ خیر بڑے والہانہ انداز میں ہوتا تھا۔
علامہ خیرآبادی مولانا کے پردادا استاد بھی تھے اور جادۂ آزادی کے رہبرِ طریقت
بھی۔ علامہ کا جس طرح علمی فضل و کمال مسلّم تھا اسی طرح انقلاب ۱۸۵۷ء میں عزم و ثبات
ضرب المثل تھا۔ مولانا جہاں درس گاہ میں بیٹھ کر علّامہ کے منطقیانہ و فلسفیانہ حقائق و نکات
بیان فرماتے تھے وہیں دوسری صحبتوں میں اپنے اساتذہ و اسلاف سے سنے ہوئے چشم دید
واقعاتِ انقلاب اور علامہ کے کارہائے نمایاں کا تذکرہ بھی کرتے رہتے تھے۔
مجھ پر غیر معمولی شفقت تھی۔ سفر و حضر میں بیشتر ساتھ رہتا۔ جمعیۃ العلمائے ہند،
مجلسِ احرارِ اسلام ہند اور دوسرے حریت پسند اداروں کے اجلاسوں میں بھی معیت کا
شرف اکثر حاصل رہتا تھا۔ اس فیضِ صحبت نے مجھ جیسے خاندانی رجعت پسند کو تھوڑے
ہی دن میں پورا "باغی" بنا دیا تھا۔ ۱۹۳۸ء میں فلسطین سے متعلق چند تقریروں پر حکومتِ
راجپوتانہ نے مجھے گرفتار کر کے مقدمہ چلا دیا۔ مولانا علیل تھے۔ کرمِ بے پایاں نے پریشانی
میں مبتلا کر دیا۔ خدا نے ایک سال بعد اس مصیبت سے جس پر ہزار راحتیں قربان ہوں،
نجات دی تو مولانا نے خوش ہو کر "رسالہ غدریہ" عنایت فرمایا۔

یہ رسالہ علامہ خیرآبادی نے جزیرۂ انڈمان میں بحالتِ محبوسی لکھا تھا۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے المناک حادثات حکومتِ مسلطہ کے عزائم اور اپنی تباہی و بربادی کا اپنے مخصوص انداز میں نقشہ کھینچا ہے۔ جب حضرت مولانا مفتی عنایت احمد کاکوروی (استاذ مولانا لطف اللہ علیگڈھی) ایک انگریز افسر کی فرمائش پر تقویم البلدان کا ترجمہ کر کے ۱۲۷۷ھ میں رہائی پاکر عازمِ ہندوستان ہوئے تو یہ رسالہ علامہ نے اپنے خلف الرشید مولانا عبدالحق خیرآبادی کے پاس مختلف کاغذ کے پرزوں اور کپڑوں پر کوئلہ وغیرہ سے لکھ کر بھیج دیا تھا۔ اسی رسالہ میں قصائد فتنۃ الہند بھی تھے۔ مولانا عبدالحق نے بڑی محنت و کاوش سے اسے مرتب کیا اور چند مخلصین و معتقدین نے اس کی نقلیں حرزِ جاں بنا کر اپنے پاس رکھیں۔

اس طرح اس کے نسخے خاص خاص حضرات کے پاس محفوظ ہو گئے۔ حکومت کے خوف سے نہ کسی نے اس کے عام کرنے کی کوشش کی نہ کوئی چھپوانے کی جرأت کرسکا۔ مولانا اجمیری نے کئی بار ارادۂ اشاعت کیا لیکن کل امرٍ مرھونٌ باوقاتہٖ کے مطابق پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

یہ موہو بہ نسخہ مولانا نے اپنے قلم سے استاذِ محترم مولانا حکیم برکات احمد بہاری ٹونکی کے نسخہ سے بزمانہ طالب علمی خوش خط نقل کیا تھا۔ حواشی پر جا بجا حلِ لغات بھی کر دیا گیا ہے۔ اس رسالے میں دو عربی قصائدِ فتنۃ الہند بھی ہیں جو ۱۲۷۶ھ میں رسالہ کے ساتھ انہیں واقعات پر مشتمل لکھے گئے ہیں ایک قصیدہ ہمزیہ اور دوسرا دالیہ ہے۔

تکمیلِ درسیات اور مولانا اجمیری کی وفات کے بعد میں ۱۹۴۰ء میں وطنِ مالوف چلا آیا اور دارالعلوم حافظیہ سعیدیہ دادوں ضلع علیگڈھ میں تدریسی خدمات او خانگی مصروفیات میں پھنس گیا۔ ۷، ۸ فروری ۱۹۴۵ء کو بجوئی تحصیل اترولی ضلع علیگڈھ میں کسان کانفرنس بڑے اعلیٰ پیمانہ پر منعقد ہوئی۔

ہندوستان کے مشہور لیڈر (سابق کانگریسی کمیونسٹ) ڈاکٹر کنور محمد اشرف صدر اجلاس تھے۔ کانفرنس سے فارغ ہو کر سابقہ تعلقات کی بنا پر غریب خانہ (ہادی منزل بھموری ضلع علیگڈھ) پر قیام پذیر ہوئے۔ میرے مختصر سے کتاب خانہ کا شبانہ روز جائزہ لیتے رہے

رسالہ غدریہ بھی ہاتھ میں آگیا۔ دیکھا اور دیکھتے چلے گئے۔ عبارت کی فصاحت و بلاغت، مضمون کی روانی و سلاست پر وجد کرتے جاتے تھے۔ جب زیادہ لطف آتا تھا یا متاثر کرنیوالا کوئی جملہ آتا تھا تو جھوم جھوم کر بلند آواز سے مجھے سنانے لگتے تھے۔ شب کی مجلس میں جہاں سیاستِ حاضرہ اور ملکی معاملات پر گفتگو رہی ڈاکٹر صاحب نے اس رسالہ کے ترجمہ کی بھی پر زور طریقہ پر خواہش ظاہر کی۔ ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا۔ آتشِ شوق کی دبی ہوئی چنگاری بھڑک اٹھی۔ میں نے اولین فرصت میں ترجمہ کرنے کا وعدہ کر لیا۔ کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر صاحب نے بمبئی سے پھر یاد دہانی کی۔ اسی زمانے میں موصوف نے اپنے دوست سید محمد ٹونکی ٹیچر مسلم یونیورسٹی اسکول علیگڈھ کو بھی اس کے متعلق لکھا۔ ٹونکی صاحب نے بروقتِ ملاقات مجھے اس طرف متوجہ کیا۔

اسی درمیان میں سید الطاف علی پریزیڈنٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے ملاقات ہوئی اور یہ بھی حسنِ اتفاق تھا کہ سید صاحب نے سب سے پہلی علمی خدمت اسی رسالہ کے ترجمہ کی میرے سپرد کی اب تو اسے تائیدِ غیبی ہی سمجھنا پڑا اور خدا کا نام لے کر اس بارِ گراں کو اٹھانے کا عزمِ مصمم کر لیا۔

ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا کتنا دشوار امر ہے خصوصًا جب کہ ترجمہ بامحاورہ بھی ہو اور الفاظ کے معانی نظر انداز نہ ہوں اس پر طرّہ یہ کہ صاحبِ فضل و کمال اور مسلم ادیب کی وہ تحریر بھی جو علامہ کی درجنوں معرکۃ الآرا تصانیف ہیں ہر تصنیف میں علمی و ادبی کمال پورے طور پر جلوہ گر ہے اس رسالہ کی اہمیت یوں بڑھ گئی ہے کہ خوفناک مصائب اور الم انگیز حالات میں لکھا گیا ہے شاہانہ خلعت کے بجائے فقیرانہ لباس میں ملبوس، فضاءِ آزادی کی جگہ جزیرہ انڈمان میں محبوس، اعزاء و احباب سے دور اور اس پر مجبور و مقہور، پھر بھی ادبیت کی چاشنی پوری طرح حلاوت ریز، اور فصاحت و بلاغت کی بو مشک بیز ہے۔

۲۷ ستمبر ۱۹۴۵ء کو دہلی جانا ہوا۔ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں حاضری ہوئی۔ میں نے رسالہ کے ترجمہ کا ذکر کیا تو نہ صرف کلماتِ ہمت افزائی فرمائے بلکہ وقت کی اہم ترین ضرورت بھی بتائی۔ یہ بھی فرمایا کہ ۱۹۲۱ء میں مولانا معین الدین اجمیری مرحوم نے یہ رسالہ

مجھے دکھایا تھا میں نے عرض کیا وہی رسالہ مولانا مرحوم نے مجھے عنایت فرمادیا تھا اور میرے پاس محفوظ ہے بالآخر یہ طے رہا کہ ترجمہ کی تکمیل کے بعد مولانا کی خدمت میں بھیجا جائے چنانچہ ۱۱ر اکتوبر ۱۹۴۵ء کو بذریعہ رجسٹری پارسل مولانا کے پتہ پر کلکتہ روانہ کردیا، مولانا کلکتہ سے خرابی صحت کی بنا پر بندھیاچل ضلع مرزاپور تشریف لے گئے اور وہاں سے سوا مہینے کے بعد ملاحظہ کرکے ۱۹ر نومبر ۱۹۴۵ء کو واپس روانہ کیا جو ۲۱ر نومبر کو مجھے مل گیا، مولانا نے شفقتِ بزرگانہ سے چار مقام پر مختصر اصلاح بھی فرمائی رسالہ کے ساتھ حسبِ ذیل گرامی نامہ بھی باعثِ افتخار ہوا :-

بندھیاچل (مرزاپور)

۱۷ر نومبر ۱۹۴۵ء

عزیزی آپ کا خط اور رسالہ پہنچ گیا تھا۔ رسالہ کو میں نے سرسری نظر سے دیکھا ترجمہ صاف اور سلیس ہے رسالہ کو "غدریہ" سے تعبیر نہ کیجئے۔ اسے "ثورۃ الهندیہ" کے نام سے مسمّٰی کرسکتے ہیں۔ رسالہ رجسٹرڈ واپس کر رہا ہوں۔

اردو میں عربی عطف کا استعمال حالتِ ترکیب میں مستحسن نہیں مثلاً "اب محبوس ظلم و تباہ شدہ ہے" اسے یوں لکھنا چاہیئے "اب محبوسِ ظلم اور تباہ شدہ ہے"

جس تفسیر کی عبارت سرسید مرحوم نے تہذیب الاخلاق میں نقل کی تھی اس کا نام غالباً اسرارُ الغیب[1] تھا۔ آپ کتب خانہ میں دیکھئے کوئی تفسیر عربی قلمی غیر مطبوعہ موجود ہے یا نہیں؟ اگر موجود ہو تو سورۂ نساء کے اس مقام کی تفسیر دیکھئے جس میں حضرتِ مسیح کی نسبت وما قتلوہ وما صلبوہ ولکن شبہ لھم آیا ہے۔ یہی حصہ سرسید نے نقل کیا تھا۔ میں چاہتا ہوں اس کے مصنف کا نام معلوم ہو۔ جو عبارت سرسید مرحوم نے نقل کی تھی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مصنف وفاتِ مسیح کا قائل ہے۔ میں نے تہذیب الاخلاق کا مجموعہ کلکتہ میں ڈھونڈا تھا مگر کتابوں میں ملا نہیں کیونکہ ادھر کتابیں غیر مرتب ہوگئی ہیں۔ والسلام علیکم

ابوالکلام

---

[1] اس تفسیر کا نام کشف الاسرار و ہتک الاستار ہے لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں اس کی دو ناقص جلدیں محفوظ ہیں افسوس ہے کہ ان سے نام مصنف و کاتب اور سنِ کتابت کا پتہ نہیں چلتا۔ مصنف وفاتِ مسیح کا قائل اور رفع کا مطلب رفعِ درجات لیتا ہے۔

میں نے اس رسالہ کے ترجمہ کے سلسلے میں کتاب خانہ حبیب گنج اور لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی کے نسخوں سے بھی مدد لی ہے۔ ایک نسخہ مولانا ہدایت اللہ خاں جونپوری شاگرد رشید علامۂ خیرآبادی کے دست مبارک کا لکھا ہوا بھی دستیاب ہو گیا تھا۔ یہ نسخہ مولانا سید سلیمان اشرف مرحوم سابق صدر دینیات مسلم یونیورسٹی (شاگرد مولانا جونپوری) کی دوسری مخصوص کتابوں کے ساتھ حبیب گنج پہنچ گیا تھا۔ کتابت کے لحاظ سے دوسرے نسخوں سے قدیم اور صحیح ثابت ہوا۔

ترجمہ کرنے اور امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی سندِ قبول حاصل ہو جانے کے بعد خیال ہوا کہ اس نعمت سے دوسروں کو بھی متمتع ہونے کا موقع دیا جائے۔ مکرمی مولوی مجید حسن صاحب مالک اخبار مدینہ بجنور سے حسب مشورہ مولانا آزاد رجوع کیا گیا۔ موصوف نے میری آواز پر صدائے لبیک بلند فرمائی اور ممدوح کے خلف الصدق عزیز محترم سعید اختر بجنوری نے پیہم تقاضے بھی شروع کر دئے۔

روداد جہادِ حریت کی اشاعت کے لئے آزاد پریس اور مجاہد مالک مطبع کی ضرورت تھی وہ خدا نے پوری کی۔ اب ایک مرحلہ باقی تھا اور وہ یہ کہ علامہ جیسے صاحبِ فضل و کمال اور بطلِ جلیل کے رسالہ "الثورۃ الہندیہ" پر مقدمہ یا پیش لفظ لکھنے والا بھی انہیں جیسا یگانۂ روزگار محقق اور جادو نگار ادیب، شہسوارِ رخشِ حریت اور مجاہدِ اعظم ہونا چاہئے۔ چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ پیشوائے اعظم امام الہند مولانا آزاد کے سوا ان اوصاف سے متصف کوئی دوسرا نظر نہ آیا۔

ایک طرف مولانا کی ہنگامہ خیز سیاسی مصروفیت کے ساتھ خرابیٔ صحت، دوسری جانب اس معاملہ کی اہمیت و ضرورت، ادھر اپنی علمی تہی مائگی و بے بضاعتی۔ ادھر علم و فضل کی فراوانی و ہمہ گیری، عقل و دل میں کشمکش پیدا ہوئی۔ شوقِ دل قدم آگے بڑھاتا تھا اور عقل دامن پکڑتی تھی۔ جذبۂ خاطر قلندرانہ جرأت دلاتا تھا اور ہوش و خرد راہ کے نشیب و فراز دکھلاتے تھے۔ آخر ۱۴ رجون ۱۹۴۶ء کو یہ امتحان کا وقت آ ہی گیا۔ دہلی پہنچ کر شاہی دربار میں حاضری ہوئی۔ ڈرتے ڈرتے حرفِ مدعا زبان پر آیا۔ حسبِ معمول خندہ پیشانی کے ساتھ متبسم انداز میں شرف

پذیرائی بخش گیا۔

وزارتی مشن لندن کی موجودگی کی وجہ سے کثرتِ کار اور ہجومِ افکار کے پیشِ نظر اسی اقرار پر اکتفا کرتے ہوئے واپس آگیا۔ اس درمیان میں منتظرِ موقع رہا کہ ذرا بھی سکون میسر آئے تو یاد دہانی کروں مگر کوئی موقع ہاتھ نہ آیا۔ عارضی حکومت کی ترتیب کے سلسلے میں مولانا کا نزولِ اجلال دہلی ہوا تو ۲۰ راگست ۱۹۴۶ء کو خدمتِ والا میں حاضر ہوا۔ ایک گھنٹہ کی تفصیلی گفتگو میں یاد دہانی کی بھی نوبت آئی۔ از راہِ شفقتِ بزرگانہ فوراً آمادگی ظاہر فرمائی اور دوسرے دن صبح کو مختصر رشحاتِ قلم عطا کرنے کا وعدہ فرمایا۔

میں جتنا بھی شکر گزار ہوں کم ہے کہ وقتِ موعود پر حسبِ وعدہ دو صفحے اپنے قلم سے تحریر کر کے عنایت فرماتے۔ یہ دو صفحے میرے نزدیک دو سو صفحات سے بھی زیادہ وزنی ہیں مولانا کے دو کلمہ خیر بھی اس زمانے کی بڑی سے بڑی سندِ قبول ہے۔ میں نے یہ سوچ کر کہ "غبارِ خاطر" اور "کاروانِ خیال" نے مولانا آزاد اور نواب صدر یار جنگ بہادر کو سالوں کے بعد یکجا کر دکھایا ہے نواب صاحب کو لکھا کہ آپ بھی رسالہ کے ترجمہ کے متعلق کچھ لکھ دیں موصوف نے جواب دیا کہ مولانا کے کچھ تحریر کر دینے کے بعد کسی کے لکھنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی وہی بہت کافی ہے سچ ہے ؏

قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

ہم سب کی خوش نصیبی ہے کہ ہندوستان میں اس دورِ قحط الرجال میں ایسی گرامی ہستی موجود ہے ؎

گوہرے کز دو کون بیرون است | مینواں یافت در خزانۂ ما

شاید نظیری نیشاپوری نے مولانا ہی کے لئے کہا تھا ؎

در آشیانِ ما پر و بال ہما رسید | ہر جا رسید سایۂ دولت زما رسید

پہلے میں نے سوچا تھا کہ دیباچہ میں علامہ خیرآبادی کی مختصر سوانح حیات کا بھی ذکر کردوں گا مگر جب لکھنے بیٹھا تو قلم پر قابو نہ رکھ سکا۔ دوسرے اس وقت تک اس فاضلِ اجل اور مجاہدِ اعظم کی کوئی سوانح حیات مرتب بھی نہ ہوئی تھی اور یہ خوف بھی اپنی جگہ دامنگیر تھا کہ اگر کچھ دن اور اسی طرح یہ ذاتِ گرامی پردۂ خفا میں رہی تو اتنے حالات بھی نہ مل سکیں گے جتنے

پیہم جدوجہد اور کوشش و کاوش سے اب دستیاب ہو سکتے ہیں۔

مصر میں جب علامہ کی معرکۃ الآرا کتاب ہدیہ سعیدیہ چھپی تو مدیر مطبع نے اظہارِ تأسف کرتے ہوئے لکھا کہ افسوس ہے ایسے فاضلِ جلیل کے متعلق ہمیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ اس مصنف کا تعارف کرا سکتے۔ ان خیالات کے پیشِ نظر ۸۰ سال کے بعد اس عظیم بار کو اٹھانے کی جرأت کرنا پڑی۔ خوش نصیبی سے مسلسل سات سال ۵۴ھ تک حصولِ علم کی خاطر خیرآباد میں قیام رہا۔ علامہ کے اہلِ خاندان سے گھر کا سا واسطہ رہا۔ بزرگوں کی شفقت اور برابر والوں کی عنایت شاملِ حال رہی۔ وقتاً فوقتاً علامہ کے اور ان کے خلف الرشید مولانا عبدالحق کے حالات و واقعات سے کان آشنا ہوتے رہے۔

شعبان ۵۴ھ کو حضرت الاستاذ علامۃ الہند مولانا اجمیری کی خدمت میں طالع کی بلندی اور نصیبہ کی فیروزمندی نے پہنچا دیا۔ مولانا اجمیری سلسلۂ خیرآباد کے نہ صرف شاگرد تھے بلکہ عاشق بھی تھے۔ جس ذوق و شوق اور بیخودی و وارفتگی سے ذکرِ افاضلِ خیرآباد کرتے تھے سننے والے اور دیکھنے والے ہی اس کی لذت سے واقف ہو سکتے ہیں۔ کافی ذخیرۂ معلومات اس دربار سے ہاتھ لگا تھا۔

بیسیوں تاریخیں اور درجنوں تذکرے بھی دیکھنے پڑے۔ ہر جگہ نہایت اختصار کے ساتھ علامہ کا ذکر ملا۔ اس میں بھی مرزا اسداللہ خاں غالب کا شکرگزار ہونا پڑے گا کہ موصوف نے بعدِ وفات بھی حقِ دوستی ادا کیا۔ غالب کے تقریباً تمام تذکروں میں علامہ کا ذکرِ خیر مختلف پہلوؤں سے ملا۔

مجاہدِ جلیل مولانا اسمٰعیل شہید کی سوانح حیات لکھنے والوں نے علامہ کے ساتھ بڑا ظلم روا رکھا۔ رنگ آمیزی اور بہتان طرازی سے بھی دریغ نہ کیا۔ خالص علمی مسائل کے مناظرہ و مباحثہ کو ذاتی بغض و عناد پر محمول کیا۔ مجھے اس مقام پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈالنی پڑی۔ علامہ کے حالات کے سلسلے میں مختلف مقامات کو خطوط لکھنا پڑے۔ میں ان تمام دوستوں اور بزرگوں کا شکرگزار ہوں جنہوں نے میری عرضداشت پر تکلیف گوارا کر کے حالات بھیجے۔

سب سے زیادہ مدد رفیقِ محترم مولوی سید نجم الحسن رضوی خیرآبادی نے پہنچائی۔

لہ اس قسم کے القاب فیشن کے طور پر یا مولانا آزاد کی خوشنودی کے لئے لکھے گئے ہیں۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اس تحریک کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے جناب وحید احمد مسعود بدایونی کی کتاب "سید احمد شہید کی صحیح تصویر" طبع لاہور ملاحظہ کی جائے۔ محمد موسیٰ عفی عنہ

خیرآباد و اجمیر میں ۱۱ سال تک میرے شریکِ درس رہے ہیں۔ علامہ کے خاندان سے قرابت بھی رکھتے ہیں خیرآباد کے مشہور محدث حاجی صفت اللہ[1] کی اولادِ امجاد سے ہیں۔ رفیقِ موصوف نے خیرآباد و لاہرپور کے قلمی تذکروں سے بھی حالات اخذ کئے۔ محترم المقام مولوی ظہیر احمد فاروقی رئیس خیرآباد سے بھی مدد لی۔ مولوی صاحب نسبی شجروں اور خاندانی حالات و واقعات کے حافظ ہیں آپ کے والد ماجد نواب بشیر احمد فاروقی مرحوم نے خاندانی یادداشتیں مرتب کر دی تھیں۔ یہ نایاب ذخیرہ بھی موصوف ہی کے پاس ہے۔ نہ صرف خیرآباد بلکہ ہر گام، گوپامئو سندیلہ اور کاکوری وغیرہا جہاں بھی خیرآباد کا سلسلۂ نسب ملتا ہے سب کے تفصیلی شجرے موجود ہیں۔

عزیزِ گرامی مسٹر منیر خان خلفِ اوسط حضرت الاستاذ مولانا محمد بشیر خان رام پوری صدر المدرسین مدرسہ نیاز خیرآباد نے علامہ کے دیوانخانہ کے شکستہ دروازہ کا اندرونی و بیرونی فوٹو کھینچکر روانہ کیا اس میں بھی رفیقِ محترم کی کوششوں ہی کو دخل ہے۔ مولوی حکیم ظفر الحق نبیرۂ مولانا عبد الحق نے جائداد کی ضبطی کا تفصیلی حال لکھ کر اعانت فرمائی۔ مفتی انتظام اللہ شہابی اکبرآبادی کے تذکرۂ علمائے گوپامئو اور فضلائے ہند سے بھی کافی مدد ملی۔ موصوف کے مفید مشورے بھی شاملِ حال رہے۔ ہندوستان کے مشہور لیڈر عبد المجید خواجہ بیرسٹر صدر آل انڈیا مسلم مجلس سید بشیر الدین لائبریرین لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی علیگڈھ اور نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا محمد حبیب الرحمٰن خان شروانی رئیس حبیب گنج ضلع علی گڑھ سے بھی وقتاً فوقتاً حالاتِ پارینہ اور واقعاتِ گزشتہ

---

[1] محدوم شیخ صفت اللہ دیا خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد سے ہیں اجلۂ مشائخ اور عمادید فضلا میں آپ کا شمار ہے۔ فنون عقلی و نقلی میں رتبۂ بلند اور سلوک و فقر میں منزلۂ ارجمند رکھتے تھے۔ مولوی قطب الدین شمس آبادی تلمیذ ملا قطب الدین شہید سہالوی و والد ملا نظام الدین سہالوی صاحب درس نظامیہ کے شاگرد اور مشہور بزرگ حاجی عبد اللہ سیاح کے مرید تھے۔ سالہا سلسلۂ تدریس جاری رہا۔ بہت سے افاضل آپ سے فیض یاب ہوئے۔ ۱۱۲۳ھ میں حج و زیارت کے لئے گئے۔ کافی عرصہ وہاں قیام کیا۔ مشہور محدثِ وقت شیخ محمد طاہر مدنی سے سندِ حدیث حاصل کی۔ وہیں درس دینا شروع کیا۔ تمام علماء بقاعِ مقدسہ آپ کے فضل و کمال کا اعتراف کرتے تھے۔ اور تعظیم و اکرام سے پیش آتے تھے۔ ایک بڑا حلقہ شریکِ درس ہوتا۔ تین حج کرنے کے بعد وطنِ مالوف پہنچے۔ یہاں پھر بدستور سلسلۂ درس و تدریس جاری کر دیا مگر درس معقولات بالکل بند کر دیا۔ آخر عمر تک وعظ و درس تفسیر و حدیث پر اکتفا کی۔ ریاضاتِ شاقہ سے سینہ کو گنجینۂ انوار بنایا۔ بروز پنجشنبہ ۸ ذی قعدہ ۱۱۵۷ھ کو اسّی سال کی عمر میں وفات پائی۔ مادۂ تاریخ "ملا نظام الدین" ہے:۔
۱۱۵۷ھ

بحرِ عرفاں صفت اللہ کہ بود	عالم عامل والا رتبت !
خامۂ فکرت من تاریخش !	زد رقم صدر نشینِ جنت
	۱۱۵۷ھ

(مآثر الکرام ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مصنفہ میر غلام علی آزاد بلگرامی

پر گفتگو رہی جس سے کافی مواد مہیا ہوا۔ میں ان حضرات کا بھی صمیمِ قلب سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

میں اس پر بھی فخر کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ۲۰ اگست ۱۹۴۶ء کو جب مولانا آزاد کی خدمت میں بہ معیت خواجہ صاحب موصوف حاضری ہوئی تو مولانا نے نصف گھنٹہ اس سوانح حیات کو ملاحظہ کرنے میں صرف فرمایا اور کلماتِ تحسین سے نوازا۔ میں اپنی اس ناچیز سعی کو مجاہدِ اعظم بطلِ جلیل حضرت الاستاذ مولانا محمد معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے نامِ نامی سے منسوب و معنون کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ باری تعالیٰ مولانا اجمیری اور علامہ خیر آبادی کا ثبات و استقلال ہم سب وابستگانِ دامن کو بھی عطا فرمائے۔ آمین۔

میں نے رسالہ و قصائد کے متعلق کچھ نہیں لکھا "مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید" پر عمل کیا ہے۔

اس رسالہ کے دیکھنے سے اس وقت کے ہولناک حالات کا نقشہ سامنے آجاتا ہے اور نصاریٰ کے خوفناک عزائم کا پتہ چلتا ہے کہ کس طرح ہندوستان کی رعایا کے گلے میں دائمی غلامی اور نصرانیت کا پٹہ ڈالنے کی کوششیں ہو رہی تھیں اور علماء مجاہدین کا ایسے موقع پر اعلانِ جہاد کس قدر بر وقت اور ضروری تھا۔ علامہ خیر آبادی کا رجب ۱۲۷۵ھ میں باطل قوتوں کے سامنے یہ اعلانِ حق ہمیشہ آبِ زر سے لکھا جاتا رہے گا:

"وہ فتویٰ صحیح ہے۔ میرا لکھا ہوا ہے۔ اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے"

ان جملوں کے بعد عدالت سے حبسِ دوام بعبور دریائے شور کی سزا خندہ پیشانی سے سن کر راہیٔ جزیرۂ انڈمان ہوئے اور ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء کو سفرِ آخرت فرمایا۔ رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ کاملۃً۔

بعدِ وفات تربتِ ما در زمیں مجو!
در سینہ ہائے مردمِ عارف مزارِ ما

محمد عبد الشاہد خاں شروانی
اور ینٹلسٹ لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

جمعہ ۲۴ رمضان المبارک ۱۳۶۵ھ
۲۲ اگست ۱۹۴۶ء

از امام الہند مولٰنا ابوالکلام محی الدین احمد آزاد مدظلہٗ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا فضل حق رحمۃ اللہ علیہ کا یہ رسالہ اہلِ علم میں متداول تھا لیکن آجتک اس کی طباعت کا سروسامان نہ ہوسکا۔ "غدر" ۵۷ء کی بربادیوں کے بعد لوگوں کی ہمتیں اس درجہ پست ہوگئی تھیں کہ اس قسم کی تحریرات کی اشاعت کا کسی کو وہم وگمان بھی نہیں ہوسکتا تھا خود مولانا کے خاندان نے اس کی اشاعت مصلحت کے خلاف سمجھی اور جن لوگوں کے پاس اس کی نقلیں تھیں وہ بھی اس کی نمائش احتیاط کے خلاف سمجھتے تھے۔ آج ہم اس رسالہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں کوئی بات ایسی نہیں پاتے جسے سیاسی حیثیت سے خطرناک تصور کیا جائے لیکن اس زمانے کا حال دوسرا تھا۔

"غدر" کے حوادث کا تذکرہ اور پھر ایسے شخص کی زبانی جسے بجرم بغاوت مدۃ العمر قید کی سزا دی گئی تھی زیادہ سے زیادہ خطرناک بات یقین کی جاتی تھی۔

والد مرحوم نے معقولات کی تکمیل مولانا مرحوم کی خدمت میں کی تھی اس لئے ان کی مصنفات اور حالات سے خاص علاقہ رکھتے تھے۔

مولانا کے فرزند مولانا عبدالحق مرحوم نے یہ رسالہ خود اپنے قلم سے نقل کرکے والد مرحوم کو مکہ معظمہ بھیجا تھا چنانچہ وہ میرے کتب خانہ میں موجود ہے۔

مولوی عبدالشاہد صاحب شروانی نے جب مجھ سے اس رسالہ کی تصحیح واشاعت کے ارادہ کا ذکر کیا تو مجھے نہایت خوشی ہوئی۔

اب ان کی کوشش سے نہ صرف اصل رسالہ پہلی مرتبہ شائع ہو رہا ہے بلکہ اس کا اردو ترجمہ بھی مہیا ہوگیا ہے۔ ترجمہ میں نے مختلف مقامات سے دیکھا سلیس اور شگفتہ عبارت میں کیا گیا ہے اور اصل کی لفظی رعایت کے ساتھ اسلوبِ بیان کی شگفتگی اور روانی بھی ملحوظ رکھی گئی ہے۔

امید ہے کہ عزیز موصوف کی یہ سعی مشکور ہوگی اور رسالہ عام طور پر مقبول ہوگا۔

ابوالکلام

دہلی ۲۱ اگست ۱۹۴۶ء

حامداً ومصلیاً ومسلماً

ہندوستان جنت نشان جہاں اپنی زرخیزی، صنعت وحرفت اور خام پیداوار کی وجہ سے ہمیشہ سے ایک خاص شہرت کا مالک رہا ہے وہیں اہلِ فضل وکمال کا گہوارہ بھی بنا رہا ہے، فلاسفہ وحکماء ہند کی خدمت میں استفادہ کے لئے دوسرے ملکوں سے محقق آتے رہے ہیں سکندر ذوالقرنین کے حملۂ ہندوستان اور رائے فور بادشاہ ہند پر فتح پانے کے بعد ہندوستانیو نے سکندر کے مقرر کردہ حاکم کو قتل کر کے رائے وابشلیم کو اپنا بادشاہ بنا لیا تھا۔ اس بادشاہ نے اس احسان کا بدلہ رعایا پر ظلم وستم سے دیا۔ کسی کی اتنی مجال نہ تھی کہ بادشاہ کو نصیحت کر سکے یا کوئی صحیح مشورہ دے سکے۔ پنڈت حکیم بید پا فلسفی نے اپنے شاگردوں کو جمع کر کے اس اہم مسئلہ پر رائے طلب کی۔ بالآخر تجویز کے ماتحت ایک کتاب لکھی گئی جس میں جانوروں کی زبان سے عدل وانصاف کے قصے تحریر کئے گئے اور اس حیلہ سے ظلم سے باز رکھنے کی کوشش کی گئی۔ اس کتاب کی نقل کے لئے نوشیرواں عادل شاہِ فارس نے اپنے مشیرِ خاص حکیم برزویہ کو ہندوستان بھیجا اور اس کی نقل کرا کے فارسی میں ترجمہ کرایا۔ یہ کتاب اب "کلیلہ ودمنہ" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا ترجمہ فارسی، یونانی، عبرانی، ترکی، عربی اردو اور دوسری مشہور زبانوں میں ہو چکا ہے۔ عربی زبان میں فارسی سے عبداللہ بن المقفع الخطیب الفارسی مصاحب ابوجعفر المنصور العباسی خلیفہ عباسی خلیفہ ثانی نے سب سے پہلے ترجمہ کیا۔[1]

قدیم زمانے میں جبکہ شاہانِ چین وترک وفارس وروم کو علی الترتیب ملک الناس، ملک السباع، ملک الملوک اور ملک الرجال کہا جاتا تھا ہندوستان کو معدن الحکمۃ اور اس کے بادشاہ کو ملک الحکمۃ کے باوقعت لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔[2]

فلسفہ وحکمت میں اہلِ ہند اپنی مستقل رائے رکھتے تھے۔[3] ہندوستان کی قدیم ہندو منطق کی بنیاد گوتم رشی نے علاقہ ترہت (دربھنگہ بہار) میں ڈالی تھی جو نیائے شاستر کے نام سے مشہور ہے۔

---

[1] طبقات الامم ص۴۵ [2] ایضاً ص۱۱ [3] ایضاً ص۱۳۔

راجگان و امرائے ہند کی صاحبانِ علم و فضل کی قدر دانیاں تاریخی کتب کی ورق گردانی اور جے پور وغیرہ کی عالیشان رصدگاہوں سے معلوم ہو سکتی ہیں۔

آٹھویں صدی عیسوی اور پہلی صدی ہجری سے ہی مسلمانوں کے قدم اس ملک میں جمنا شروع ہوئے ان کے ساتھ ان کے متداول علوم نے بھی اپنی جگہ بنانا شروع کی۔

اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کے دورِ خلافت ۹۲ھ مطابق ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم ثقفی اٹھارہ سالہ نوجوان نے سندھ پر قبضہ کیا ۹۵ھ میں قنوج تک رسائی ہوئی۔ اس طرح خلفائے امویہ و عباسیہ کی فتوحات پانچویں صدی ہجری تک دیبالپور تک پہنچ چکی تھیں۔ چوتھی صدی کے آخر میں سلطان محمود غزنوی کے حملے شروع ہوئے۔ ۴۱۷ھ میں خلیفہ القادر باللہ عباسی کے حکام سے سندھ چھین لیا۔ ۵۸۲ھ میں سلطان شہاب الدین غوری نے خسرو پرویز کو گرفتار کر کے دہلی کو دارالسلطنت قرار دیا اور سارے ملکِ ہند پر قبضہ جما لیا ۱۸۵۷ء/۱۲۷۳ھ تک مسلمانوں کی ۶۹۰ برس مسلسل حکومت رہی۔ باضابطہ اور بے ضابطہ ۷۶ بادشاہ ہوئے۔ آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر تھے [1]

ہر دور میں علماء و اولیاء آتے رہے۔ ظاہری سلطنت کی طرح باطنی حکومت بھی اپنا کام کرتی رہی۔ ابو حفص ربیع بن صبیح السعدی البصری المتوفی ۱۶۰ھ شاگرد امام الاولیاء حسن بصری سندھ ہی میں وفات کے بعد دفن ہوئے۔ یہ بزرگ سفیان ثوری اور وکیع (استاد امام شافعی) کے استاد تھے۔ ان کے علاوہ علی بن عثمان الہجویری المتوفی ۴۶۵ھ شاہ یوسف گردیزی، شیخ فخر الدین زنجانی، خواجہ معین الدین چشتی سنجری اجمیری المتوفی ۶۳۳ھ، شیخ ابو زکریا ابو محمد بہاؤ الدین بغدادی ملتانی المتوفی ۶۶۱ھ وغیرہم اپنے علوم و معارف سے اہلِ ہند کو مستفیض فرماتے رہے۔

مذہبی علوم اسلام کی طرح صیقل شدہ فنونِ یونانی بھی مسلمانوں ہی کے ذریعے پہنچے۔ اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ منطق و فلسفہ کو اس بلند مقام تک مسلمان علماء نے ہی پہنچایا۔ یوں تو منطق ایک فطری علم ہے۔ کسی مقصد پہ دلیل و برہان پیش کرنا، قیاس کر کے نتیجہ نکالنا، افکارِ ذہنیہ کو خطا سے بچانا، اسی کا نام منطق ہے اور معمولی سمجھ کا آدمی بھی اسی کی

[1] ۔۔۔ ۔۔ ہندوستان۔

کوشش کرتا ہے۔ اس علم کا باضابطہ اظہار سب سے پہلے حضرت ادریس علیہ السلام سے ہوا مخالفین کو عاجز و ساکت کرنے کے لئے بطورِ معجزہ اس کا استعمال کیا گیا۔[1]

پھر ان علوم کو یونانیوں نے اپنایا۔ یونان میں بڑے رتبے کے یہ پانچ مشہور فلسفی گزرے ہیں۔[2]

۱۔ بندقلیس ۵۰۰ قبل مسیح زمانہ داؤد علیہ السلام میں گزرا ہے۔ حضرت لقمان سے علمِ حکمت حاصل کرنے کے بعد یونان واپس آگیا۔

۲۔ فیثاغورس اصحابِ سلیمان علیہ السلام کا شاگرد ہے۔

۳۔ سقراط، فیثاغورس کا شاگرد ہے۔ بتوں کی پرستش سے مخلوق کو روکنے اور دلائل کے ساتھ خالقِ واحد کی طرف توجہ دلانے پر بادشاہِ وقت نے قید کرکے زہر دلا دیا۔

۴۔ افلاطون۔ یہ بھی فیثاغورس کا شاگرد اور خاندانِ اہلِ علم سے ہے۔ سقراط کی موجودگی میں گمنام رہا اس کے بعد چمکا اور خوب چمکا۔

۵۔ ارسطاطالیس۔ نیقوماخوش کا بیٹا ہے اور صاحب المنطق کے لقب سے مشہور ہے خاتمِ حکماء یونان کہا جاتا ہے اور بعد کے سارے فلاسفہ اسی کے رہینِ منت اور خوشہ چین ہیں۔

ان پانچ کے بعد دوسرے درجہ پر بالیس[1] الملطی صاحب فیثاغورس، ذیمقراطیس[2] وانکسانوراس[3] ہیں ارسطو کی کتابوں کے شارح ہونے کی حیثیت سے ۹ فلسفی مشہور ہیں یہ سب مقلد تھے مجتہد نہ تھے۔ ثاؤفرسطس[1]، اصطفن[2]، بیس یحییٰ[3] بطریق اسکندریہ، امونیوس[4]، بلیقیوس[5]، ثماوس[6]، فرفوریوس[7]، ثامسطیوس[8]، افرودیسی[9] (اسکندر) ان میں آخرالذکر تینوں شراح اونچے درجہ کے مالک ہیں۔

یونان میں مخصوص فنون کے کامل بھی بڑے بڑے نامور گزرے ہیں، بقراط و جالینوس علمِ طبعیات و طب میں، اقلیدس ہندسہ میں، ارشمیدس علم الدوائر میں، بطلیموس اور دیوجانس کلبی علم المناظر و النجوم میں اپنی نظیر آپ تھے۔ ہر ایک اپنے فن میں یگانۂ روزگار تھا۔ آج بھی ان سب کے نام زبانِ زدِ خواص اہلِ علم ہیں۔

---

۱ اخبار الحکماء، قفطی، ص ۲۔ ۲ طبقات الامم، اندلسی، ص ۱۹، ۳۲۔

مسلمان بادشاہوں میں سب سے پہلے عباسیہ خاندان کے خلیفۂ ثانی ابوجعفر المنصور عبداللہ بن محمد بن علی بن عبداللہ بن العباس نے علم فقہ کے ساتھ علم فلسفہ و منطق و ہیئت کو بھی حاصل کیا۔ اسکے کاتب عبداللہ بن المقفع الخطیب الفارسی مترجم کلیلہ و دمنہ نے ارسطو کی تین کتابوں قاطیغوریاس[1]، باری ارمیناس اور انولوطیقا کا عربی میں ترجمہ کر کے منطقی کے لقب سے شہرت حاصل کی۔[1]

ارسطو سے لیکر خلافت عباسیہ تک گیارہ صدیاں گزر چکی تھیں علوم فلسفہ کی کوئی ترقی نہ ہو سکی۔ گویا بازار سرد پڑ چکا تھا۔ ساتواں خلیفۂ عباسی مامون الرشید جب ۱۹۸ھ میں تخت خلافت پر بیٹھا تو اپنے ذوق کی بنا پر فنون کی طرف متوجہ ہوا قیصر روم کو لکھا۔ وہاں سے ارسطو کی کتابوں کا ڈھیر آ گیا۔ وزیر جمال الدین قفطی اخبار الحکماء میں لکھتے ہیں :

ولما سیرت الکتاب الی المامون جاء بعضہا تاما و بعضہا ناقصا فالناقص منہا ناقص الی الآن۔

(ترجمہ) ارسطو کی کتابیں (روم کے کتاب خانہ سے) جو مامون کے پاس پہنچیں ان میں بعض مکمل اور بعض ناقص تھیں جو ناقص تھیں وہ اب تک ناقص ہیں۔

مامون الرشید نے حنین بن اسحاق الکندی اور ثابت بن قرہ وغیرہما کو عربی ترجمہ کا حکم دیا۔ اس طرح شروع تیسری صدی ہجری میں مسلمانوں نے کلمۃ الحکمۃ ضالۃ المؤمن این وجدھا فھو احق بھا پر عمل پیرا ہو کر اپنی وراثت سمجھتے ہوئے آب و تاب کے ساتھ ان علوم کو چمکایا۔ چوتھی صدی ہجری میں شاہ منصور بن نوح سامانی کی درخواست پر حکیم ابونصر فارابی نے ان کی ترصیع و تہذیب کر کے معلم ثانی کا لقب پایا اور فلسفۂ ارسطو میں مہارت پیدا کر کے تقریباً دو درجن تصانیف کیں جو سلطان مسعود کے زمانے تک اصفہان کے کتبخانہ صوان الحکمۃ کی زینت بنی رہیں۔ سلطان مسعود نے شیخ الرئیس ابوعلی بن سینا المتوفی ۴۲۷ھ / ۱۰۳۷ء کو اپنا وزیر بنا کر تصانیف فارابی سے اقتباس کرا کے کتابیں لکھوائیں۔ اتفاق سے کتب خانہ نذر آتش ہو گیا تو ابن سینا محافظ علوم بن گیا۔ اب جو کچھ ہے اسی کی محنت کا ثمرہ ہے۔

---

[1] طبقات الامم اندلسی ص ۴۸، ۴۹

ابو محمد بن احمد اندلسی وزیر عبد الرحمٰن مستظہر باللہ محمد زکریا رازی صاحب صد تصانیف المتوفی ۳۲۰ھ/۹۳۲ء (عہد منصور بن اسمٰعیل سامانی) نے بھی چوتھی صدی ہجری میں اس پودے کو پروان چڑھانے میں کسر نہ اٹھا رکھی۔ آخر الذکر نے فلسفۂ ارسطو کی دھجیاں فضائے آسمانی میں اڑائیں اور اعتراضات و شبہات کا بے پناہ ذخیرہ کتابوں میں چھوڑا۔

پانچویں صدی ہجری اور اس کے بعد امام ابو حامد محمد الغزالی المتوفی ۵۰۵ھ علامہ ابن رشد المتوفی ۱۱۹۸ء، امام فخر الدین رازی المتوفی ۶۰۶ھ، ابن تیمیہ الحرانی المتوفی ۷۲۸ھ/۱۳۲۷ء، نجم الدین نخجوانی، ابن سہلان اور افضل الدین خونجی وغیرہم نے ان فنون میں نئی نئی باریکیاں پیدا کیں۔ اجتہادات کئے۔ آخر الذکر کی کتابیں دو سو سال تک داخلِ نصاب رہیں۔ علامہ ابن خلدون نے وعلیٰ کتبہ معتمد المشارقۃ لھٰذا العھد "اس کی کتابوں کو اس عہد کے علماءِ مشرق کا اعتماد حاصل ہے" لکھ کر سندِ اہمیت عطا کر دی ہے۔

شیخ الاشراق شہاب الدین سہروردی نے مشائیہ (متبعین ارسطا طالیس) کے معتقدات پر ضربِ کاری لگا کر نئے باب کا اضافہ کیا۔

نصیر الدین محقق طوسی، قطب الدین رازی، صدر الدین شیرازی، ملا جلال محقق دوانی، ملا محمود جونپوری صاحب شمس بازغہ و فرائد وغیرہم نے اس فن کو چار چاند لگا دیئے۔ یوں تو شاہانِ اسلام کی قدر افزائیوں نے اطراف و اکنافِ عالم کے مشاہیر و فضلاء کو ہندوستان کی طرف متوجہ کر دیا تھا لیکن سلاطینِ مغلیہ کے عہد میں عرب و عجم کے اہلِ فضل و کمال کا یہ ملک مسکن بن گیا۔

حضرت امیر خسرو نے یکے بعد دیگرے سات بادشاہوں کے دربار میں اعزاز حاصل کیا۔ مختلف انقلابات دیکھے مگر ہندوستان سے منہ نہ موڑا۔

شعراء میں نظیری نیشاپوری، ملک قمی، عرفی شیرازی، ظہوری، غزالی مشہدی، عالی شیرازی، کلیم ہمدانی، غنی کشمیری۔

اطباء میں حکیم بینا، حکیم علی، حکیم الملک گیلانی، حکیم عین الملک شیرازی، حکیم ابو الفتح گیلانی، حکیم ہمام گیلانی، مسیح الملک شیرازی۔

کتّاب میں شیریں قلم، زریں قلم، ہفت قلم۔

علماء میں شیخ حسین موصلی، مولانا فتح اللہ شیرازی المتوفی ۹۹۷ھ، مولانا میر اسمرقندی، میر اسلم ہروی المتوفی ۱۰۶۱ھ، میر زاہد ہروی المتوفی ۱۱۱۱ھ، مولانا میر کلاں معلم جہانگیر المتوفی ۹۸۳ھ مولانا صدر جہاں، مولانا غازی خاں بدخشی وغیرہم۔

ان کے علاوہ دوسرے فنون کے ماہرین نے شاہی درباروں کو رونق بخشی تھی ہندوستان درحقیقت جنت نشان بن گیا تھا۔ علوم و معارف کے دریا بہہ رہے تھے۔ روحانیت کے چشمے اُبل رہے تھے۔

مسلمان بادشاہوں کی قدردانی کے صرف دو واقعے شہادت کے لئے کافی ہیں۔ سلطان محمد بن تغلق شاہ نے مولانا معین الدین عمرانی دہلوی کو قاضی عضد الدین صاحب مواقف کی خدمت میں شیراز بھیج کر درخواست کی کہ ہر قیمت پر ہندوستان تشریف لا کر متن مواقف کو میرے نام پر معنون کر دیجئے۔ سلطان ابو اسحق والی شیراز کو پتہ چلا تو دوڑا ہوا علامہ قاضی کی خدمت میں پہنچکر عرض پرداز ہوا کہ ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں تخت سلطنت کی خواہش ہو تو دستبردار ہونے کو تیار ہوں۔ خدا کے لئے شیراز کو یتیم نہ بنایئے۔ قاضی صاحب نے سلطان کی تواضع و قدردانی سے متاثر ہو کر ارادہ بدل دیا اور سلطان ہی کے نام پر کتاب معنون کر کے ہمیشہ کے لئے زندہ جاوید بنا دیا۔

دوسرا واقعہ علامہ امیر فتح اللہ شیرازی سے متعلق ہے۔ عادل شاہ بیجا پوری نے ہزاروں خواہشوں کے ساتھ دکن بلا کر اپنا وکیل مطلق بنایا۔ ۹۹۱ھ میں اکبر بادشاہ نے صدر کل بنا کر ۹۹۳ھ میں امین الملک اور عضد الدولہ کے خطاب سے نوازا۔ ہندوستان کے مشاہیر علماء ان کے حلقۂ درس میں شریک رہے۔ محقق دوانی، صدر شیرازی، میر غیاث الدین منصور اور میرزا جان کی تصانیف ہندوستان لا کر داخل نصاب کیں۔ انہی کے زمانے سے علوم عقلیہ کو شاندار فروغ حاصل ہوا۔ ۹۹۷ھ میں ان کے انتقال پر اکبر بادشاہ کے الفاظ نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔ مآثر الکرام میں ہے:-

---

[۱] مآثر الکرام دفتر اول ص ۱۸۵

"پادشاہ از فوتِ میر بسیار متاسف شد و بر زبان گزرانید کہ میر وکیل وطبیب و منجم ما بود۔ اندازۂ سوگواری کہ تواند شناخت اگر بدستِ فرنگ افتادے و ہمگی خزائن در برابر خواستے دریں سودا فراواں سود کردمے۔ وآں گرامی لبس ارزاں خریدمے"

فیضی گوید ؎

شہنشاہ جہاں را در فاتش سینہ پر نم شد
سکندر اشکِ حسرت ریخت کافلاطون عالم شد

یہی وہ قدر دانی اور عزت افزائی تھی جس کی وجہ سے سارے عالم سے مشاہیر وقت کھنچے چلے آرہے تھے، علوم کی بارش ہورہی تھی۔ علامہ فضل حق کے مورثانِ اعلیٰ شمس الدین اور بہاؤ الدین دونوں بھائیوں نے بھی ہندوستان کو رونق بخش کر عہدے سنبھالے۔

ولادت و نسب

علامہ فضل حق خیر آبادی ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۷ء میں اپنے آبائی وطن خیر البلاد خیر آباد میں پیدا ہوئے[1]۔ آپ کے والدِ ماجد مولانا فضل امام خیر آبادی علمائے عصر میں ممتاز اور علومِ عقلیہ کے اعلیٰ درجہ پر سرفراز تھے۔ دار السلطنت دہلی میں صدر الصدور کے عہدۂ جلیلہ پر فائز اور دینی و دنیوی نعمتوں سے مالا مال تھے مولانا کے والد مولانا محمد ارشد ہرگام سے خیر آباد آکر سکونت پذیر ہوئے۔

شجرۂ نسب یہ ہے :-

فضل حق بن مولانا فضل امام ابن شیخ محمد ارشد بن حافظ محمد صالح بن ملا عبد الواحد بن عبد الماجد بن قاضی صدر الدین بن قاضی اسمٰعیل ہرگامی بن قاضی عماد بدایونی بن شیخ ارزانی البدایونی بن شیخ منور بن شیخ خطیر الملک بن شیخ سالار شام بن شیخ وجیہ الملک بن شیخ بہاؤ الدین بن شیر الملک شاہ ایرانی بن شاہ عطاء الملک ابن ملک بادشاہ بن حاکم بن عادل بن تاروں بن جرجیس بن احمد نامدار بن محمد شہریار بن محمد عثمان بن دامان بن ہمایوں بن قریش بن سلیمان بن عفان بن عبد اللہ بن محمد بن عبد اللہ بن امیر المومنین خلیفۃ المسلمین حضرت عمر الفاروق رضی اللہ تعالےٰ عنہ۔

اس طرح ۳۳ واسطوں سے خلیفۂ ثانی تک نسب گرامی پہنچتا ہے۔

علامہ کے مورثِ اعلیٰ شیر الملک بن شاہ عطاء الملک ایرانی کے مورثان ایک قطعۂ ملک ایران پر قابض و حکمران تھے۔ زوالِ ریاست پر دولت علم کمائی۔ شیر الملک کے دو صاحبزادے بہاؤ الدین اور شمس الدین ذی علم بزرگ تھے۔ اس وقت ہندوستان قدر دانیٔ علما و مشاہیر میں خاص شہرت رکھتا تھا، تمام اہلِ کمال ادھر کھنچ رہے تھے۔ یہ دونوں بھائی

---

[1] دیباچہ ہدیہ سعیدیہ۔

ایران سے واردِ ہندوستان ہوئے۔ شمس الدین نے مسندِ افتا رِ رنگ سنبھالی حضرت شاہ ولی اللہ بن شاہ عبدالرحیم محدث دہلوی انہیں کی اولاد سے تھے۔[1]

بہاؤالدین قبۃ الاسلام بدایوں کے مفتی ہوئے ان کی اولاد میں شیخ ارزانی بدایونی نامور بزرگ اور اعلیٰ درجہ کے مفتی ہوئے ہیں۔ شیخ عماد الدین بن شیخ ارزانی تحصیلِ علم کی خاطر قاضی ہرگام (ضلع سیتاپور اودھ) کی خدمتِ بابرکت میں پہنچے۔ قاضی صاحب نے تحقیق شرافت ونجابت کے بعد اپنا داماد بنا لیا۔ قاضی صاحب کے انتقال کے بعد قاضی ہرگام بن گئے۔[2] وہیں شیخ اسمٰعیل پیدا ہوئے جو اپنے نانا اور والد کے بعد قاضی بنے۔ شیخ سعدی کاکوروی کی دختر سے شادی ہوئی جن سے قاضی صدرالدین پیدا ہوئے جن کا شمار مشاہیرِ وقت میں تھا۔[3]

قاضی صاحب کے دو صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں ہوئیں۔ ایک صاحبزادے ملا ابوالواعظ اورنگ زیب عالمگیر کے اتالیق رہے اور فتاویٰ عالمگیری کے مؤلفین میں سے ہیں ہدایہ ومطول وملا جلال پر حاشیے لکھے۔ ان کی شخصیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ملا قطب الدین شہید سہالوی (والد استاذ الکل ملا نظام الدین سہالوی لکھنوی فرنگی محلی) ان سے ملاقات کے لئے ہرگام پہنچے تھے۔ ملا محب اللہ بہاری صاحبِ سلم آپ کے درس میں شریک ہونا چاہتے تھے۔ آپ کے پاس وقت نہ تھا۔ اس لئے سہالی جا کر ملا قطب الدین شہید کے شاگرد ہو گئے۔[4]

دوسرے صاحبزادے ملا عبدالماجد کے خلف الصدق ملا عبدالواجد فاضل جلیل تھے کافیہ کی مبسوط شرح اور حاشیہ اقلیدس لکھا۔ ملا سید عبدالواجد کرمانی خیرآبادی (استاذ مولانا فضل امام خیرآبادی) نے کتابخانۂ ملا قطب الدین بن قاضی شہاب الدین گوپاموی المتوفی ۱۱۶۰ھ میں یہ حاشیۂ اقلیدس دیکھ کر فرمایا کہ "من حواشیِ ملائے بر تحریرِ اقلیدس نوشتہ دیدہ ام بغایت خوب نوشتہ"۔[5]

دخترِ قاضی صدرالدین سے نسلِ مفتیانِ گوپامؤ چلی اسی خاندان کے ایک علمی فرد مفتی انعام اللہ خاں بہادر گوپاموی مفتی محکمۂ قضاۃ دہلی و معاصر علامہ تھے۔ یہ خاتون مفتی عبیداللہ شہابی برادرِ کلاں

---

[1] حیاتِ شاہ ولی اللہ۔ [2] قاضی ہرگام دختر خود را قاضی عماد الدین معروف عماد کتخدا کردند بعد قاضی ہرگام قاضی عماد بہ مسندِ قضائے ہرگام مامور شدند ہمان جا وفات یافت و مدفون گردید۔ تذکرۃ الانساب مولوی مصطفےٰ علی گوپاموی۔ [3] منتخب التواریخ۔
[4] سیر العلماء [5] آمدنامہ مولانا فضل امام خیرآبادی [6] تذکرۃ الانساب۔

ملا وجیہ الدین گوپاموی مؤلف ربع فتاویٰ عالمگیری کو بیاہی گئی تھیں۔ دوسری صاحبزادی خاندان صدیقیاں قصبہ لاہر پور (ضلع سیتاپور) میں منسوب ہوئیں۔ اس خاندان کے ایک بزرگ روم سے وارد ہند ہو کر اقامت گزین اودھ ہوئے۔ جن صدیقی صاحب کو یہ صاحبزادی منسوب ہوئیں جب ان کا پیغام آیا تو قاضی صاحب نے حسب و نسب دریافت کیا۔

آں بزرگ گفت کہ من صحیح النسب صدیقی ہستم زہر اژدہا بہ من اثر نمی کند اگر شما بخواہند تجربہ نمایند قاضی گفت کہ ایں در مار گیراں می باشد ایں را اعتبار نیست ......

بہ روم رفتہ نسب نامہ خود بخط کوفی بمواہیر سلطان و قاضی و مفتی و دیگر اکابران روم آورد آں قاضی مسطور دختر خود را باں بزرگ کتخدا کرد حالا دختر زندان بزرگ نسب نامہ مذکور موجود است[1]۔

ملا عبد الواحد بن قاضی عبد الماجد بن قاضی صدر الدین ہرگامی کے متعلق مولانا فضل امام آمد نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:-

ملا عبد الواحد ہرگامی جد اعلیٰ محرر اوراق فاضلے بود متبحر بر کافیہ شرح مبسوط و بر تحریر اقلیدس حاشیہ و تعلیقات متفرقہ بر ہدایہ نوشتہ بود۔ چوں در عہد بہادر شاہ اول تمام اسباب آبائی قصبۂ ہرگام بتاراج رفت .... و دیگر مردم اشرار کتب وغیرہا بہ آتش دادند ہمہ کتب خانہ سوخت و برباد شد ....

در ہرگام وفات یافت ہماں جا مدفون شد۔

ملا عبد الواحد کے صاحبزادے اور علامہ کے پردادا حافظ محمد صالح تھے۔ عہد محمد شاہ بادشاہ میں منصب پر فائز تھے۔ جاگیر شاہی بھی ملی ہوئی تھی۔ قاضی مبارک گوپاموی شارح سلم کے معاصر و دوست اور مؤلف تذکرۃ الاولیاء تھے۔

حافظ محمد صالح کے دو صاحبزادے شیخ جعفر ہرگامی اور شیخ محمد ارشد ہرگامی خیرآبادی

---

[1] آمد نامہ۔

اور دو صاحبزادیاں متولد ہوئیں۔ ایک صاحبزادی ملا معز الدین گوپاموی اور دوسری شیخ خیر الدین فاروقی بن شیخ خیر اللہ العمری گوپاموی (از اقربائے نواب والاجاہ محمد علی) کو منسوب ہوئیں۔

علامہ کے دادا شیخ محمد ارشد نے ہرگام کو خیرباد کہہ کر خیرآباد (ضلع سیتاپور اودھ) آباد کیا۔ موصوف کی زوجۂ ثانیہ سے علامہ کے والد ماجد مولانا فضل امام خیرآبادی تھے۔

لہ مولانا محمد ارشد نے دو شادیاں کیں۔ زوجۂ اولی خاندان مفتیان لکھنؤ سے تھیں ان سے احمد حسین میاں عرف فقیرا میاں صاحبزادے اور ام النساء صاحبزادی ہوئیں۔ احمد حسین میاں کے صاحبزادے مولوی فضل احمد کے تین صاحبزادے تھے (۱) منشی کرم احمد آپ امجد علی شاہ فرمانروائے اودھ کے وزیر اعظم نواب شرف الدولہ بہادر کے میر منشی تھے (۲) منشی حسن احمد آپ مولوی عنایت احمد وکیل دہلی کے والد تھے (۳) منشی حسین احمد آپ نواب بشیر احمد مرحوم داماد ہز ہائنس نواب عظیم جاہ انتظام الملک بہادر سوم پرنس آف ارکاٹ (مدراس) کے والد تھے جن کے خلف الصدق مولوی ظہیر احمد فاروقی رئیس و متولی مدرسہ عربیہ نیازیہ خیرآباد و لائف مجسٹریٹ راقم السطور کے قدیمی کرم فرما اور بلند کردار بزرگ ہیں۔ اس خاندانی شجرہ اور دوسرے معلومات میں موصوف نے بڑا ہاتھ بٹایا ہے۔

دو صاحبزادیاں تھیں ایک علامہ کی شریک حیات اور مولانا محمد عبد الحق کی والدہ ماجدہ تھیں اور دوسری خان بہادر نواب مظہر علی داماد ہز ہائنس پرنس آف ارکاٹ کی والدہ تھیں۔

دوسری زوجہ سید محمد شکر اللہ کی دختر تھیں جو فرزندانِ قطبِ وقت مخدوم اللہ دیا خیرآبادی سے تھے ان سے حسبِ ذیل اولاد ہوئی:۔

(۱) مولانا فضل امام۔ ۲۔ مولوی محمد صالح۔ ۳۔ بی بی عائشہ۔ ان بی بی صاحبہ کی صاحبزادی علیمہ حضرت شیخ وقت معشوق علی شاہ خیرآبادی کی زوجہ تھیں اور صاحبزادے منشی برکت علی خان مولانا قادر بخش برادر مولانا نبی بخش خیرآبادی کے خسر اور جنرل ایکٹرلونی کے میر منشی تھے مولوی محمد صالح کی صاحبزادی بی بی نعمت اور صاحبزادے مولوی الٰہی نادش خیرآبادی تھے۔

مولانا فضل امام نے تین شادیاں کیں پہلی بیوی صدر پور کی تھیں ان سے علامہ فضل حق مولانا فضل عظیم اور مولوی فضل الرحمٰن پیدا ہوئے مولانا فضل عظیم کی ایک صاحبزادی بی بی امتل تھیں جن کے صاحبزادے سید نیاز علی تھے (از خاندان مخدوم اللہ دیا رحمۃ اللہ علیہ) سید نیاز علی کی شادی نور الحسن خان ابن مولوی قادر بخش کی دختر سے ہوئی۔ مولوی فضل الرحمٰن نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بی بی سے دو صاحبزادیاں ہوئیں ۱۔ بی بی مریم زوجۂ نور الحسن خان۔ ۲۔ بی بی ہاجرہ زوجۂ شمس العلماء مولانا محمد عبد الحق خیرآبادی۔ بی بی ہاجرہ سے بی بی عائشہ پیدا ہوئیں جو صوفی محمد حسین بسمل برادر مضطر خیرآبادی کی زوجہ تھیں۔ مولوی فضل الرحمٰن کی دوسری زوجہ سے جو دہلی کی تھیں دو صاحبزادے مولوی فضل حکیم اور مولوی فضل علیم پیدا ہوئے۔ اول الذکر کے صاحبزادے خان بہادر فضل تبین سشن جج ریاست پٹیالہ تھے۔ آخر الذکر کی دو صاحبزادیاں تھیں ایک کا عقد سید اعجاز الحسن رئیس خیرآباد سے ہوا جن کے صاحبزادے خان بہادر سید احراز الحسن خان چیرمین میونسپل بورڈ خیرآباد ہیں (موصوف تقریباً تیس سال سے مسلسل چیرمین ہو رہے ہیں جو ایک ریکارڈ ہے) دوسری صاحبزادی دہلی میں منسوب تھیں۔ انہی صدر پور کی بی بی صاحبہ سے تین صاحبزادیاں بھی ہوئیں۔ ۱۔ نوراں اہلیہ غلام مخدوم سندیلوی۔ ۲۔ مہراں اہلیہ یکے از خانۂ نوابانِ گوپامؤ ۳۔ ظہور النساء اہلیہ غلام لئیق بن غلام محمد۔ دوسری زوجہ نور محمد لاہر پوری کے خاندان سے تھیں۔ ان کے بطن سے حرمت بی بی اہلیہ حسن احمد لحاظاً نا کتخدا۔ خدیجہ اہلیہ سید محمد بخش بن امانۃ اللہ للیاپوری۔ سرفراز ن اہلیہ مولوی ارشاد حسین ... دکیل ٹونک اور امتیاز اہلیہ حکیم بو علی سندیلوی (خوشدامن مولانا عبد الحق خیرآبادی) پیدا ہوئیں۔ تیسری دختر خدیجہ کے صاحبزا...

موصوف بڑے طبّاع و ذہین تھے، مولانا سید عبدالواجد کرمانی خیرآبادی کے ارشد تلامذہ سے تھے علوم نقلیہ و عقلیہ انہیں سے حاصل کئے اس کے بعد صدرُ الصدوری کے عہدۂ جلیلہ پہ دہلی جاکر فائز ہوئے: تذکرہ علمائے ہند میں ہے:-

شاگرد رشید مولوی سید عبدالواجد خیرآبادی بمنصب صدر الصدوری، شاہجہان آباد از سرکار انگریزی عزت و امتیاز داشت برمیر زاہد رسالہ و میر زاہد ملا جلال حواشی نوشتہ ودر علوم عقلیہ گوئے سبقت ربودہ۔ آمد نامہ کہ دراں قواعد فارسی بیان کردہ و نیز ترجمہ علمائے جوار لکھنؤ تحریر فرمودہ بس مفید بتندیان است۔

مولانا شاہ صلاح الدین صفوی گوپاموی (تلمیذ رشید مولانا محمد اعظم سندیلوی و مرید و خلیفہ مولانا شاہ قدرت اللہ صفی پوری) کے مرید تھے[1]

مولانا نے بیسیوں مفید و معرکۃ الآراء کتابیں لکھیں جن مصنفات کا نام اور پتہ معلوم ہوسکا وہ درج کی جاتی ہیں، دو ایک کے سوا سب غیر مطبوعہ ہیں، سب سے زیادہ مشہور تصنیف منطق میں مرقات[2] ہے جو تمام مدارس عربیہ میں داخل نصاب ہے۔ میر زاہد[3] رسالہ میر زاہد ملا جلال[4] اور افق المبین[5] پر حواشی لکھے۔ تلخیص الشفاء[6]، نخبۃ السر[7] اور آمد نامہ[8] تصنیف کیا[9]۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) حاجی لطف احمد تھے جن کی دختر کلثوم النساء بمفتی حاجی سید فخر الحسن رئیس خیرآباد کو منسوب ہوئیں۔ مفتی صاحب موصوف نے دوسری شادی دختر یعقوب علی سندیلوی سے کی جن سے دو صاحبزادے مولوی سید نجم الحسن خیرآبادی صلاح نوجوان پاک سیرت پاکباز ہیں راقم السطور کے ساتھ خیرآباد و اجمیر میں گیارہ سال تک شریک درس رہے ہیں۔ علامۃ الہند مولانا معین الدین اجمیری مرحوم سے آخر وقت تک استفادہ کیا ہے۔ اپنے مکان سے متصل جد اعلیٰ مخدوم اللہ دیا رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ میں صبح کو درس قرآن پاک اور اس کے بعد مختلف فنون کی کتابیں پڑھا کر اجر عظیم حاصل کرتے ہیں۔ اس وقت خیرآبادی حضرات میں مولوی حافظ حکیم احمد علی کے بعد دوسرے عالم ہیں اور مشغلۂ درس و تدریس اور وعظ و ارشاد کا سلسلہ انہیں سے جاری ہے۔ مولانا فضل امام کے پردادا استاذ مولانا حاجی صفت اللہ صاحب محدث خیرآبادی کی اولاد امجاد سے ہیں۔ علامہ کی اس سوانح حیات میں موصوف سے بڑی مدد ملی ہے۔ مولانا فضل امام کی تیسری زوجہ سے دو صاحبزادے مولوی اعظم حسین اور مولوی مظفر حسین شوخی ہوئے۔ اول الذکر کو بی بی حفیظہ دختر مولوی قادر بخش منسوب ہوئیں۔ [1] سیر العلماء ص ۴۲ حکیم بہاء الدین صدیقی گوپاموی۔ [2] حاشیہ میر زاہد رسالہ امانت علی خورجوی کے ہاتھ کا ۱۲۳۳ھ کا لکھا ہوا بخط پختہ مالیقرأ اور تلخیص الشفاء خود مصنف کے دست مبارک کا مبیضہ لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے نوادر میں محفوظ ہے۔ نخبۃ السر کتب خانہ صاحبزادہ عبیداللہ خاں رئیس ٹونک میں، حاشیہ افق المبین کتب خانہ مفتی اللہ شہاب [illegible] میں و آمد نامہ کتب خانہ ذکا[illegible]یت احمد سجادہ نشین [illegible] فندر یہ لاہرپور میں موجود ہیں ۱۲

فرائض ملازمت کے ساتھ مشغلۂ تدریس و تصنیف ہمیشہ جاری رکھا۔ مادۂ افہام و تفہیم خدا نے ایسا بخشا تھا کہ ایک بار شریک درس ہونے کے بعد طالب علم دوسری طرف کا رخ بھی نہ کرتا تھا شاہ غوث علی صاحب جو موصوف کے شاگرد اور صوفی منش بزرگ گزرے ہیں جنہوں نے تمام عمر سیاحت میں بسر کی ان کا بیان تذکرۂ غوثیہ میں نظر سے گزرا فرماتے ہیں: شاہ عبدالعزیز صاحب شاہ عبدالقادر صاحب اور مولانا فضل امام کی شاگردی کا مجھے فخر حاصل ہے۔ آخر الذکر استاد کی جو شفقت میرے حال پر تھی وہ بیان سے باہر ہے۔ مولانا کے ساتھ دہلی سے پٹیالہ تعلیم کی غرض سے میں بھی چلا گیا۔ میری عمر اٹھارہ سال کی تھی کہ استاد عالم جاودانی کو رخصت ہو گئے۔ میں نے بھی تعلیم کو خیرباد کہہ دیا کہ نہ ایسا شفیق و قابل استاد ملے گا نہ پڑھوں گا۔[1]

ایک بار جب یہی شاہ صاحب علامہ فضل حق کو ملے اور موصوف نے تعلیم کے نامکمل رہ جانے پر اظہار افسوس کیا تو کہنے لگے:

"کہ پورے عالم ہو جاتے تو کیا ہوتا، زیادہ سے زیادہ آپ جیسے ہوتے"

علمی قابلیت کا اندازہ تو اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک جانب شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر کا ڈنکا منقولات میں بج رہا تھا اور دوسری طرف اسی دہلی میں مولانا فضل امام کے معقولات کا سکہ چل رہا تھا۔ طلباء دونوں دریاؤں سے سیراب ہو رہے تھے۔ مفتی صدرالدین خان آزردہ، علامہ فضل حق وغیرہ بھی دوسرے طلباء کی طرح حدیث ایک جگہ پڑھتے تھے اور منطق و فلسفہ دوسری جگہ، خود علامہ کی ذات گرامی مولانا کی مسلم الثبوت قابلیت کی شاہد عادل ہے۔

سرسید احمد خاں نے آثار الصنادید میں مولانا کا ذکر جس عقیدت مندی سے کیا ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ابتداء ان صفات و القاب سے کی ہے:

"اکمل افراد نوع انسی، مہبط انوار فیوض قدسی، سراب چشمۂ عین الیقین، مؤسس اساس ملت و دین، ماحی آثار جہل، ہادم بنائے اعتساف، محی مراسم علم، بانی مبانی انصاف، قدوۂ علمائے فحول، حاوی معقول و منقول، سند اکابر روزگار، مرجع اعالی و ادانی ہر دیار، مزاجدان شخص کمال، جامع صفات جلال و جمال، مورد

---

[1] تذکرہ غوثیہ ص ۱۷۔

فیضِ ازل و ابد، مطرحِ انظارِ سعادت سرمد، مصداق مفہوم تمام اجزاء واسطۃ العقد، سلسلۂ حکمت اشراقی ومشائی، زبدۂ کرام، اسوۂ عظام، مقتدائے انام مولٰنا مخدومنا مولوی فضل امام ادخلہ اللہ المنعام فی جنۃ النعیم بلطفہ العمیم۔

مولانا روحانیت میں بھی بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ آپ کے والد شیخ محمد ارشد فرشتہ سیرت انسان تھے۔ مولانا احمد اللہ بن حاجی صفت اللہ محدث خیرآبادی سے بیعت تھے۔ آپ کے ایک صاحبزادے عالم جوانی میں فوت ہوگئے بہ اقتضاء نوعمری احکام شرعیہ کے پابند نہ تھے۔ اس لئے مولوی ارشد صاحب کو تشویش رہتی تھی۔ پیر مرشد کی خدمت میں قلبی بے چینی ظاہر کی۔ پیر نے دعا کی، شب میں سرکارِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی کہ سرورِ رسالت (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) پکّے باغ میں (جہاں مرحوم کی قبر تھی) تشریف لائے اور بیل کے نیچے وضو فرمایا۔ بعد نمازِ فجر پیر ومرید دونوں ایک دوسرے کو مبارکباد دینے روانہ ہوئے۔ راستہ میں دونوں ملاقی ہوئے تو ایک دوسرے کو بشارت کا حال بتایا۔ وہیں سے دونوں پکّے باغ میں پہنچے تو دیکھا کہ مقام معہود پر وضو کا اثر یعنی پانی کی تری موجود تھی۔ ایک عرصہ تک لوگ اس جگہ کی زیارت کرتے رہے۔ مولانا نقی علی خان بھی مع صاحبزادہ مولانا احمد رضا خان ۱۳۰۹ھ میں اس مقام کی زیارت کے لئے بریلی سے خیرآباد پہنچے اور مولانا حسن بخش کے مہمان ہوئے۔ افسوس نہ اب وہ درخت باقی ہے نہ اس جگہ کا پتہ چل سکتا ہے۔ مفتی فخر الحسن خیرآبادی جوان معزز مہمانوں کی زیارت میں شریک رہے تھے حظیرہ کے پاس اس بیل کے درخت کی جگہ بتاتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے شفیق باپ نے فضل امام کی تربیت میں کیا کسر اٹھا رکھی ہوگی۔

مولانا نے دہلی میں خواب دیکھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکان میں فروکش ہوئے ہیں

---

[۱] موصوف علم ظاہر وباطنی دونوں میں باکمال تھے۔ اپنے والد ماجد اور ملا کمال الدین سہالوی کے شاگرد تھے۔ والد سے ہی بیعت تھے۔ صاحب کرامات اور عالم علم کشفِ قبور تھے۔ ایک بار وبائی بخار پھیلا بہت لوگ ہلاک ہوگئے۔ قاضی غلام امام بھی اس میں مبتلا ہوئے۔ ان کے والد قاضی حفظ الملک اپنے اکلوتے بیٹے کی وجہ سے سخت پریشان تھے۔ کپڑے پھاڑ کر ننگے ہوئے جارہے تھے کہ فرشتہ رحمت بن کر مولانا حمد اللہ اچانک عیادت کو پہنچ گئے۔ یہ حال دیکھ کر رقت طاری ہوگئی اس بخار کو اپنی طرف منتقل کرلیا اور قاضی صاحب کو تسلی دی کہ آپ پریشان نہ ہوں۔ یہ بلا میں نے اپنے سر لے لی۔ مولانا کو گھر پہنچتے پہنچتے بخار نے آدبایا اور شدت بڑھتی گئی تیسرے چوتھے روز شب جمعہ میں رحلت فرمائی۔ والدہ ماجدہ کے پاس مدفون ہوئے، رحمۃ اللہ علیہ (آمدنامہ)

اور فلاں کمرے میں اقامت گزیں ہیں تعبیر دریافت کرنیکے علامہ کو حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بھیجا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ جاکر فوراً اسامان کمرے سے نکال لو اور اس کو بالکل خالی کردو چنانچہ ایسا ہی کیا گیا خالی ہوتے ہی وہ کمرہ فوراً گر گیا۔

یہ چیز سمجھ میں نہ آئی شاہ صاحب سے دریافت کیا گیا کہ یہ تعبیر کیونکر ہوئی فرمایا کہ اس وقت بے اختیار یہ آیت ذہن میں آگئی تھی ان الملوک اذا دخلوا قریۃ افسدوھا

ہزاروں تلامذہ میں سب سے زیادہ نمایاں علامہ فضل حق اور مفتی صدر الدین خاں[1] آرزدہ صدر الصدور دہلی ہوئے۔ ۵ ذیقعدہ ۱۲۴۰ھ مطابق ۱۸۲۴ء کو مولانا نے سفرِ آخرت اختیار کیا۔ مرزا غالب نے حسب ذیل تاریخ وفات لکھی :-

اے دریغا قدوۂ اربابِ فضل — کرد سوئے جنت الماوی خرام
چوں ارادت از پئے کسبِ شرف — جُست سالِ فوتِ آں عالی مقام
چہرۂ ہستی خراشیدم نخست — تا بنا تخرجہ گردد تمام
گفتم اندر سایۂ لطفِ نبی
باد آرامشگہِ فضلِ امام[2]

۱۲ — ۴۰ ھ

(۱۲۴۴ھ اردو ترجمہ تذکرہ علمائے ہند ص۳۷۷)

احاطۂ درگاہ مخدوم شیخ سعد الدین خیرآبادی میں اپنے دادا الاستاذ مولانا محمد اعلم سندیلوی[3] کے استاذ ملا عبد الواحد کرمانی خیرآبادی کے قریب مدفون ہوئے۔ اب تینوں قبریں شکستہ ہیں۔ ممکن ہے کچھ

---

[1] مفتی صاحب دہلی میں ۱۲۰۴ھ مطابق ۱۷۸۹ء میں پیدا ہوئے "تاریخ ولادت" چراغ "ہے۔ باپ دادا کشمیری تھے، شاہ عبد العزیز شاہ عبد القادر اور مولانا فضل امام خیرآبادی کے شاگرد رشید، علامہ فضل حق کے ہم درس اور عمر میں علامہ سے آٹھ سال بڑے تھے۔ عربی فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے شاہ نصیر اور میر ممنون دہلوی سے تلمذ تھا۔ نواب یوسف علی خان والی رامپور، نواب صدیق حسن خان قنوجی بھوپالی اور سر سید احمد خان مخصوص تلامذہ سے ہیں۔ منتہی المقال فی شرح حدیث لاتشد الرحال، در المنضود فی حکم امرأۃ المفقود اور اجوبہ کثیرہ مستفتیان یادگار ہیں، ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں بغاوت کے الزام میں دھر لیے گئے۔ جائداد ضبط ہوئی بعد میں کچھ جائداد واپس ملی اور گوشہ نشین ہوگئے۔ فتویٰ جہاد پر دستخطوں کے سلسلے میں شہدتٗ بالجبر بجائے بالخیر کہہ کر جان چھڑائی۔ ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۸ء بروز پنجشنبہ وفات پائی " چراغ دو جہاں بود " مادۂ تاریخ ہے۔ مرزا غالب بھی جو مفتی صاحب کے جلیس و ہم نشین تھے اسی سال راہیٔ ملکِ عدم ہوئے۔ سر سید احمد خان نے آثار الصنادید میں والہانہ انداز میں ذکر کیا ہے۔ [2] سید مبین غالب۔ [3] مولانا کا وصال ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۹ء میں ہوا (تذکرہ علمائے ہند اردو، ص ۳۷۷)۔

دن بعد آثار بھی باقی نہ رہیں۔ اس وقت بھی ان کے جاننے والے خال خال ہیں۔ کاش کوئی قدردانِ علم بزرگ ان کے نام کے پتھر لگا کر ان فضلاء کے آثارِ قبور کو مٹنے سے بچا لیتے۔

تعلیم و تربیت

علامہ نے آنکھ کھولی تو گرد و پیش، علم و فضل اور امارت و ریاست کو جلوہ گر دیکھا۔ خاندانی حالات سے پتہ چل گیا ہوگا کہ نسلاً بعد نسلٍ، اَباً عن جدٍ علم و امارت دونوں ساتھ ساتھ وراثت بنے رہے یہی وجہ تھی کہ علامہ کے خلاف ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد مادی ریاست سے محروم ہو کر بھی مستغنی اور کوہِ وقار رہے۔ خلف الصدق شمس العلماء مولانا عبدالحق خیرآبادی کی نازک مزاجی، سیر چشمی و راولوالعزمی کے واقعات اب بھی چشم دید بیان کرنے والے ملتے ہیں۔

ہندوستان کے مشہور مردم خیز قصبات میں خیرآباد (ضلع سیتاپور اودھ) کا نام بھی صفِ اول میں صدیوں سے رہا ہے۔ شاہی زمانے میں کمشنری کا پایۂ تخت بھی رہ چکا ہے۔ محلہ میاں سرائے میں اب تک گڑھی کے آثار پائے جاتے ہیں، محلہ توپخانہ اور فراشخانہ بھی اب تک موجود ہے۔ اولیائے کرام علماء عظام بڑے بڑے نامور گزرے ہیں، مخدوم شیخ سعدالدین[1]، مخدوم نظام الدین الٰہ دیا کے مزارات آج بھی زیارت گاہِ خلائق ہیں، مولوی شاہ محمد صالح عرف ملا میاں، شیخ موسیٰ اور شاہ غلام یحییٰ گیارہویں اور بارہویں صدی کے باکمال بزرگ در جیدِ عالم گزرے ہیں آخری دور میں حضرت معشوق علی شاہ حافظ محمد علی شاہ[2] اور

---

[1] شیخ سعد کے والد ماجد مولوی بدھن قصبہ اناؤ کے قاضی تھے۔ فرزند کو عالم طفلی میں ہی چھوڑ کر سفرِ آخرت اختیار کر گئے۔ مکتب میں پہنچنے کے بعد اپنا سبق روزانہ یاد کرتے اور شب میں ہر سبق کو ہزار بار دہراتے۔ قرآن پاک بھی اسی طریقہ پر حفظ کیا۔ بچپن ہی سے آثارِ رشد پیشانی سے ہویدا تھے۔ سن تمیز کو پہنچے تو مولانا اعظم لکھنوی سے کسبِ علوم کر کے سرآمد علماء عصر بنے۔ حضرت شاہ مینا نور اللہ مرقدہ کے مرید ہوئے۔ ۲۳ صفر ۸۷۰ھ کو شاہ مینا عالم جاودانی کو روانہ ہوتے تو مرید خاص کو کچھ دن اقامت لکھنؤ کے بعد خیرآباد جانے کی بشارت دی۔ آپ نے خیرآباد پہنچ کر وہیں سکونت اختیار کر لی۔ ایک عالم فیضیاب ہوا۔ کثرت سے خوارق و کرامات کا ظہور ہوتا رہا۔ جس قدر نذرانے آتے مسافرین وارد و صادر پر صرف فرما دیتے۔ گیہوں کی روٹیاں مستحقین کو تقسیم ہوتیں۔ متعلقین کو اناؤ سے بلا کر یہیں آباد کیا۔ جب وصال ہوا تو جائداد کفن بھی گھر میں نکل سکا۔ سالہا مسند تدریس و ارشاد کو رونق بخشی اور اپنے شیخ طریقت کی طرح آخر تک حصور یعنی غیر شادی شدہ رہے۔ تصانیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ شرح بزدوی، حسامی، کافیہ، مصباح وغیرہ لکھیں۔ مجمع السلوک: رسالہ مکیہ کی شرح لکھی اور اس میں ملفوظات و حالات شاہ مینا بھی کافی درج کر دئیے ہیں۔ (ماثر الکرام)

[2] موصوف ۱۱۹۲ھ میں قصبہ کھیری (اودھ) میں پیدا ہوئے۔ دہلی اور اجمیر میں ریاضات شاقہ کیں۔ تونسہ جا کر حضرت شاہ سلیمان صاحب کے مرید و خلیفہ ہوئے۔ مولانا عبدالوالی عرف پیر بخش نبیرۂ حاجی صفت اللہ محدث خیرآبادی کے شاگرد تھے۔ حدیث مولانا شاہ عبدالقادر محدث دہلوی سے پڑھی۔ علامہ کے استاد بھائی اور ہم عصر تھے۔ ۷۴ سال کی عمر میں ۱۹ ذی قعدہ ۱۲۶۶ھ کو وصال ہوا۔ حافظ محمد اسلم رحمۃ اللہ علیہ آپ کے بھتیجے، ورثہ گرد و مرید تھے۔ اپنے عہد کے باکمال بزرگ تھے۔ ۲۱ ذی قعدہ ۱۳۲۰ھ کو وصال ہوا۔ پیر و مرشد کے برابر علیحدہ میں مدفون ہیں۔

حافظ محمد اسلم رحمہم اللہ اپنے اپنے وقت کے صاحب کشف وکرامات بزرگ ہوئے ہیں۔ یہ بزرگان کرام شاعر بھی تھے تصوف و معرفت میں ان کا ڈوبا ہوا کلام اب بھی اودھ کے قوالوں کو یاد ہے جو اعراس کے مواقع پر زینتِ محافل بنتا ہے۔ اس وقت بھی حضرت شاہ مقبول میاں صاحب قلندر کی بدولت خیرآباد مرجع خلق بنا ہوا ہے۔

علماء میں پچھلے دور میں سب سے بڑی شخصیت مولانا حاجی صفت اللہ محدث خیرآبادی شاگرد ملا قطب الدین شمس آبادی کی گذری ہے۔ آپ کے صاحبزادے مولانا احمد اللہ ان کے شاگرد ملا عبدالواجد کرمانی خیرآبادی صاحب فضل وکمال اور دور و نزدیک مشہور تھے۔

علامہ خیرآباد سے دہلی پہنچے تو ایک سے بڑھ کر ایک باکمال نظر آیا، مفسرین، محدثین، فقہاء، فلاسفہ، اولیاء، اور شعراء جس طبقہ پر نگاہ ڈالئے:

زکدام باغے اے گل کہ چنیں خوش است بویت

زبان پر بے ساختہ آجاتا تھا۔

والد ماجد مولانا فضل امام صدر الصدور نے مکان کے علاوہ ہاتھی اور پالکی پر بھی دربار آجاتے وقت ساتھ بٹھا کر درس دینا شروع کیا، علوم آلیہ میں صغر سنی ہی میں اپنا جیسا یکا نہ روزہ بنادیا منقولات کی تحصیل کے لئے دربار حضرت شاہ عبدالقادر اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی میں پہنچایا۔

علامہ فضل حق وہاں بھی ہاتھی ہی پر جاتے تھے۔ مفتی صدر الدین خاں آزردہ بھی ساتھ ہوتے تھے۔ رئیس زادہ ہونے کی وجہ سے کبھی خدمتگار کتاب ساتھ لے کر پہنچتا تو شاہ صاحب کشف سے مطلع ہو کر اس روز سبق نہ پڑھاتے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تعلیم کے ساتھ اس دربار

---

[۱] موصوف خوش تقریر فاضل تھے، آپ کا ہر شاگرد درجۂ کمال پر پہنچا ہوا تھا تقریر ایسی فرماتے کہ عامی اور بازاری انسان بھی اچھی طرح سمجھ لیتا تھا۔ مولانا محمد اعلم سندیلوی سے تلمذ حاصل تھا۔ استاد شاگرد پر بے انتہا شفقت کرتے تھے۔ بعض کتابیں ملا دہاج الدین بن مولوی قطب الدین گوپاموی سے پڑھیں، صدرا کے کچھ اسباق مولوی غلام طیب کی معیت میں مولانا احمد اللہ خیرآبادی ابن حاجی صفت اللہ سے بھی پڑھے ۱۲۱۸ھ میں رحلت ہوئی۔ ایک عزیز نے تاریخ وفات کہی:

روز جمعہ بود چارم عید — از جہاں سوئے جنت الماوٰی
رفت آمد نوید از رضواں — رضی اللہ عنک، زود بیا

(آئینہ نامہ)

ہیں تربیت کا بھی پورا لحاظ رہتا تھا۔ علم کی عظمت سکھائی جاتی تھی۔ استاد کی وقعت کے طریقے بتائے جاتے تھے۔ مولوی اکرام اللہ بہ روایت مفتی انعام اللہ گوپاموی پدر بزرگوار خود، مولانا احمد علی خیرآبادی بہ روایت مولانا ماجد علی شاگرد مولانا عبدالحق خیرآبادی اور مولانا بدرالدین علوی بہ روایت استاذ العلماء مولانا لطف اللہ علیگڈھی[1] اس کے راوی ہیں کہ ایک روز علامہ اور مفتی صدرالدین خان یہ باتیں کرتے آرہے تھے کہ اس خاندان کے لوگ علومِ دینیہ حدیث، فقہ تفسیر وغیرہا خوب جانتے ہیں مگر معقولات نہیں جانتے یہ دونوں ابھی شاہ صاحب تک پہنچے بھی نہ تھے کہ شاہ صاحب نے اپنے خادم کو حکم دیا کہ ایک بوریا مسجد سے باہر صحن میں ڈال دو اور ایک مسجد کے اندر بچھا دو اور جب فضل حق اور صدرالدین آئیں تو ان کو وہیں صحن میں بٹھا دینا ان کے آنے پر تشریف لائے اور فرمایا کہ میاں آج سبق پڑھانے کو جی نہیں چاہتا البتہ یہ جی چاہتا ہے کہ کچھ معقولیوں کی خرافات میں گفتگو ہو۔

یہ دونوں اس میدان کے مرد تھے ہی فوراً بولے جیسی حضرت کی خوشی، شاہ صاحب نے کہا کوئی مسئلہ لو۔ قوی پہلو تم اختیار کرو اور کمزور مجھے دو۔ چنانچہ "حصول الاشیاء بانفسہا وباشباحہا" پر گفتگو شروع ہوئی۔

شاہ صاحب نے دلائل سے "باشباحہا" کے قول کو ثابت کر دکھایا۔ بالآخر دونوں کو اعتراف کرنا پڑا کہ شکست تو کھا گئے لیکن یہ شکست روحانیت سے کھائی ہے

---

[1] ضلع علیگڈھ کے قصبہ بکھنہ میں ۱۲۴۴ھ میں پیدا ہوئے "چراغم"، مادۂ تاریخ پیدائش ہے علیگڈھ کے مشہور والیٔ باخدا حضرت شمس العارفین شاہ جمال کی اولاد سے ہیں، ممدوح کا نسب حضرت ابوعبیدہ بن الجراح سے ملتا ہے۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں حضرت شمس العارفین کا ذکر کیا ہے۔ ابتدائی استاد سید رونق علی، میاں جی موہن لال مولوی محمد عظیم اللہ اور مولوی حفیظ اللہ رہے۔ درسیات مولانا عنایت احمد کاکوروی مفتی و منصف کول سے پڑھے، ۱۸۵۷ء کے قبل استاد کے محکمۂ بریلی کے سررشتہ دار ہوئے۔ "غدر" کے بعد مفتی عنایت انڈمان بھیج دئے گئے۔ یہ علیگڈھ آ گئے۔ ابتدا میں کایستوں کے قائم کردہ مکتب میں دس روپیہ ماہانہ پر زندگی بسر کی۔ اس کے بعد استاد نے انڈمان سے واپسی پر مدرسہ فیض عام کانپور میں مدرس دوم کر دیا۔ کچھ دن بعد مدرس اول ہو گئے۔ سات برس کانپور رہنے کے بعد مدرسہ جامع مسجد علیگڈھ میں مدرس اول ہوئے۔ پچاس روپیہ مشاہرہ ہوا۔ ۱۲۸۵ھ سے ۱۳۱۲ھ تک مسلسل درس دیا۔ ۱۳۱۲ھ میں تقلید و عدمِ تقلید کے قصے میں زہر دیا گیا اس سے اللہ نے نجات دی۔ ۱۸۹۵ء میں سات سو روپیہ ماہانہ پر صدارت امدرسین پر حیدرآباد میں تقرر ہوا۔ بعد میں، ایک ہزار تنخواہ پر مفتی عدالت ہو گئے۔ ۱۳۳۴ھ مطابق ۱۹۱۶ء عرفہ کے دن نوے برس کی عمر میں علیگڈھ میں وفات ہوئی۔ شاہ جمال میں مدفون ہوئے۔ "استاذ العلماء" مادۂ تاریخ ہے۔

(استاذ العلماء مصنفہ نواب صدر یار جنگ بہادر)

علمیت سے نہیں۔ لاجواب تو ہو گئے لیکن بات وہی ٹھیک ہے جو ہم کہتے ہیں (یہ بڑا معرکۃ الآرا مسئلہ ہے۔ علامہ نے حاشیۂ قاضی مبارک میں اس پر مفصل و مدلل خامہ فرسائی فرمائی ہے۔)[2]

شاہ صاحب نے فرمایا کہ تم یہ نہ سمجھو کہ ہم کو معقول نہیں آتی۔ ہم نے اس کو ناقص اور واہیات سمجھ کر چھوڑ دیا ہے مگر اس نے ہمیں اب تک نہ چھوڑا۔ وہ اب تک ہماری قدم بوسی کئے جاتی ہے۔

اس مباحثہ سے شاہ صاحب کا مقصد صرف تنبیہ تھا کہ اساتذہ کی جانب سوظنی حصول علم سے مانع ہوتی ہے۔ استاد اور شاگرد کے درمیان عقیدت ہی کا رابطہ ہوتا ہے جو افہام و استفہام میں معین و مددگار بنتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس دور میں کامل کی بجائے ناقص اور لائق کے بدلے نالائق افراد کی بہتات ہے۔

فطانت وذہانت

۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۰۹ء میں تیرہ سال کی عمر میں تمام مروجہ علوم عقلیہ ونقلیہ وآلیہ کی تکمیل کی۔ چار ماہ اور کچھ روز میں قرآن مجید حفظ کیا۔[1]

تواتر سے یہ روایت پہنچی ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے جب ردِ شیعہ میں تحفہ اثنا عشری محققانہ انداز میں تحریر فرمائی تو شیعیانِ ہند کی طرح اہلِ تشیع ایران میں بھی ہیجان پیدا ہوا۔ ایران سے میر باقر داماد صاحب افق المبین کے خاندان کا متبحر عالم و مجتہد اونٹوں پر کتبِ فریقین بار کر کے شاہ صاحب سے مناظرہ کے لئے دہلی پہنچا۔ خانقاہ میں داخل ہونے پر شاہ صاحب نے فرائضِ میزبانی ادا فرماتے ہوئے مناسب جگہ قیام کے لئے تجویز فرما کر رختِ سفر کھلوایا۔

شام کو فضل حق حاضر ہوئے تو شاہ صاحب کو مصروفِ مہمان نوازی دیکھ کر کیفیت معلوم کی۔ تھوڑی دیر حاضرِ خدمت رہ کر بعدِ مغرب مجتہد صاحب کی خدمت میں پہنچے مزاج پرسی کے بعد کچھ علمی گفتگو کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مجتہد صاحب نے پوچھا:-

---

[1] سیر اعلام۔

[2] علامہ نے حاشیۂ قاضی میں "حصول الاشیاء باشباحہا" کے قول کو ثابت کیا ہے جس سے اس روایت کی ثقاہت ختم ہو جاتی۔ محمد موسیٰ عفی عنہ

"میاں صاحبزادے کیا پڑھتے ہو ؟"

عرض کیا شرح اشارات، شفاء اور افق المبین وغیرہا دیکھتا ہوں۔ مجتہد صاحب کو بڑی حیرت ہوئی۔ افق المبین کی کسی عبارت کا مطلب پوچھ لیا۔ علامہ نے ایسی مدلّل تقریر کی کہ متعدد اعتراضات صاحب افق مبین پر کر گئے معزز مہمان نے اعتراضات کی جوابدہی کی کوشش کی تو ان کو جان چھڑانا اور بھی دوبھر ہو گئی۔ جب خوب عاجز کر لیا تو اپنے شبہات کے ایسے انداز میں جوابات دیئے کہ تمام ہمراہی علما بھی انگشت بدنداں رہ گئے۔

آخر میں آپ نے یہ بھی اظہار کر دیا کہ حضرت شاہ صاحب کا ادنیٰ شاگرد اور کفش بردار ہوں اور اظہارِ معذرت کرتے ہوئے رخصت ہوئے۔

علماءِ ایران نے اندازہ کر لیا کہ اس خانقاہ کے بچوں کے علم و فضل کا جب یہ عالم ہے تو خود شیخِ خانقاہ کا کیا حال ہو گا۔

صبح کو جب خیریت طلبیٔ مہماناں کے لئے شاہ صاحب نے آدمی بھیجا تو پتہ چلا کہ آخر شب میں دہلی ہی سے روانہ ہو چکے ہیں۔

شاہ صاحب کو بڑی حیرت ہوئی۔ سبب ناخوشیٔ مہماناں معلوم کرنے کی کوشش فرمائی تو فضل حق کی کرشمہ سازیوں کا راز کھلا۔ بلا کر بہت ڈانٹا کہ مہمانوں کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا جاتا وہ ہم سے گفتگو کرنے آئے تھے ہم خود ان سے نبٹ لیتے۔

حضرت الاستاذ علامۃ الہند مولانا معین الدین الاجمیریؒ رامپور کے ایک اعلےٰ عہدیدار (جن کا نام حافظہ میں نہیں رہا) کے متعلق یہ روایت بیان کرتے تھے کہ ان کا قول تھا کہ —— "میں اس وجہ سے مسلمان ہوں کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی اور علامہ فضل حق خیرآبادی مسلمان ہیں۔"

غور کیجئے کہ اول الذکر کے کمالاتِ روحانیت اور ثانی الذکر کی ذہانت و فطانت کا سکّہ لوگوں کے دلوں پر کیسا جما ہوا تھا۔ ان عہدیدار کے کہنے کا مقصد تھا کہ فضل حق جیسا ذہین و فطین انسان جس مذہب کو حق سمجھے وہ یقیناً حق ہی ہو گا۔

درس و تدریس

ہند و بیرونِ ہند سے جو طلبہ مولانا فضل امام سے پڑھنے آتے مولانا کے ارشاد کے مطابق علامہ بھی انہیں پڑھاتے۔ تیرہ برس کی عمر اور مسندِ تدریس پر رونق افروزی عجیب سا واقعہ معلوم ہوتا ہے حلقۂ درس میں معمر و صاحب ریش و بروت تلامذہ اور قدما کی کتابیں زیر درس ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ایک طرف یہ بزرگی اور دوسری جانب یہ اقتضائے طفلی کہ ایسے ہی موقع پر ایک چڑیا اڑتی ہوئی درس گاہ میں آگئی۔ جب زد پر آئی تو زقند لگا کر اسے پکڑ ہی تو لیا۔ تمام شریکِ درس طلبہ بے اختیار ہنس پڑے۔

ابتداءِ تدریس کا زمانہ تھا کہ ایک طالب علم سے جو مولانا سے پڑھنے آیا تھا موصوف نے فرمایا کہ میاں تم بھی فضل حق ہی سے سبق پڑھ لیا کرو۔ وہ آیا غریب آدمی، بدصورت، عمر زیادہ علم کم، ذہن کند۔ یہ نازک طبع، ناز پروردہ، جمال صورت و معنی سے آراستہ، چودہ برس کا سن، نئی فضیلت ذہن میں جودت۔ بھلا میل ملے تو کیسے؟ صحبت راس آئے تو کیونکر آئے؟ تھوڑا سبق پڑھایا تھا کہ بگڑ گئے۔ اس کی کتاب پھینک دی۔ برا بھلا کہہ کر نکال دیا۔ وہ روتا ہوا مولانا کے پاس پہنچا اور سارا حال بیان کیا فرمایا کہ بلاؤ اس خبیث کو۔ آئے اور دست بستہ کھڑے ہو گئے۔ مولانا نے ایک تھپڑ ایسے زور سے دیا کہ ان کی دستارِ فضیلت دور جا پڑی۔ پھر فرمانے لگے تو تمام عمر لبِ اللّٰہ کے گنبد میں رہا، ناز و نعم میں پرورش پائی، جس کے سامنے کتاب رکھی اس نے خاطر داری سے پڑھایا، طلبہ کی قدر و منزلت تو کیا جانے۔ اگر مسافرت کرتا، بھیک مانگتا اور طالبعلم بنتا تو حقیقت معلوم ہوتی۔ طالب علم کی قدر ہم سے پوچھ۔ خبردار تم جانو گے اگر آئندہ ہمارے طالبعلموں سے کچھ کہا ؎

درازیٔ شب از مژگانِ من پرس
کہ یکدم خواب در چشمم نگشت است

یہ چپ کھڑے روتے رہے کچھ دم نہ مارا، خیر قصہ رفع دفع ہوا لیکن پھر کسی طالب علم سے کچھ نہ کہا۔[1]

شاہ غوث علی صاحب جب ایک بار رامپور میں علامہ سے ملے اور یہ واقعہ یاد دلایا تو علامہ نے اس سبّ وشتم اور ضرب مولم کی تائید کی۔[2]

مولانا کے اس واقعہ سے طلبا پر شفقت اور اولاد کی ہدایت و تربیت کا جذبہ معلوم ہوتا ہے جن طلبہ کے متعلق حدیث میں یہ آتا ہو کہ فرشتے ان کے قدموں کے نیچے پر بچھاتے ہیں۔ اس دور کا سرمایہ دار انہیں کیسی نظرِ حقارت سے دیکھتا ہے یہ کوئی پوشیدہ چیز نہیں۔ کاش وہ سمجھے کہ علومِ دینیہ کی بقا اور قال اللہ، قال الرسول کا غلغلہ انہیں کے دم سے بلند ہے۔ اگر یہ بوریہ نشین اور غربا، و مساکین کی جماعت نہ ہوتی تو ہندوستان سے مذہبی علوم کا جنازہ ہی نکل چکا ہوتا۔

مولوی رحمٰن علی اپنا مشاہدہ لکھتے ہیں کہ میں نے ۱۲۶۴ھ میں (پوری ایک صدی پہلے کی بات ہے اس وقت علامہ کی عمر باون سال کی تھی) بمقام لکھنؤ مولانا کو دیکھا کہ حقہ نوشی کی حالت میں شطرنج بھی کھیلتے جاتے تھے اور ایک طالب علم کو افق المبین کا درس اس خوبی سے دیتے تھے کہ مضامین کتاب طالب علم کے ذہن نشین ہوتے جاتے تھے۔[3]

۱۸۰۹ء سے لے کر ۱۸۵۸ء تک مسلسل پچاس برس تدریس کا سلسلہ جاری رہا فرائضِ ملازمت، امورِ سلطنت اور تصنیف و تالیف کا مشغلہ بھی اس میں کبھی حارج نہ ہوا۔

ملازمت

والدِ ماجد کے انتقال کے وقت علامہ کی عمر اٹھائیس[4] سال تھی۔ خاندانی ذمہ داریوں کا بار پڑا۔ اکبر شاہ ثانی کا زمانہ تھا۔ دلّی میں ریزیڈنٹ رہا کرتا تھا اس کے محکمہ میں سر رشتہ دار ہو گئے۔

دہلی میں جب انگریزی حکومت قائم ہوئی تو علماء و ثقات کا عام مسلک یہ رہا کہ انگریزی ملازمت سے اجتناب کیا جائے لیکن پھر آہستہ آہستہ نرم پڑتے گئے چنانچہ دہلی کے کئی خاندانی آدمیوں نے ملازمت اختیار کر لی تھی۔

---

[1] تذکرہ غوثیہ ص۱۲۳ گل حسن شاہ پانی پتی۔ [2] تذکرہ غوثیہ۔ [3] تذکرہ علمائے ہند۔
[4] بلکہ تیس سال تھی۔ ۱۲ محمد موسیٰ عفی عنہ

حضرت شاہ عبدالعزیز کا مولوی عبدالحی اپنے خویش کو ملازمت میرٹھ کی اجازت دینے بنا
اس دروازے کی آخری بندش کا ٹوٹنا تھا البتہ خانقاہ والوں کا مسلک غدر (انقلاب ۱۸۵۷ء) تک
یہی رہا کہ وہ انگریزی حکومت کے نوکروں سے کسی طرح کا نذرانہ یا تحفہ بھی قبول نہ کرتے تھے اور کہتے
تھے کہ ان کا وسیلہ معیشت مشتبہ ہے۔

سرسید احمد خاں مرحوم بھی خانقاہ کے مریدوں میں سے تھے اور شاہ غلام علی سے بڑی
عقیدت رکھتے تھے انہوں نے جب انگریزی نوکری کر لی اور اس کے بعد ملنے گئے نیز حسبِ معمول
نذر لے گئے تو خانقاہ کے تمام مشائخ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا[1]

انگریزوں کو اس بات کی بڑی خواہش وجستجو رہتی تھی کہ مسلمانوں کے خاندانی اور ذی وجاہت
اشخاص افتاء وصدارت کے مناصب قبول کر لیں تاکہ شمالی ہند میں انگریزی حکومت عوام میں
مقبول ہو سکے۔ ہندوستانیوں کے لئے بڑا عہدہ صدر الصدور عدالت کا تھا اس لئے اکابر وافاضل
کو ہی پیش کیا جا سکتا تھا۔ دہلی چونکہ قدیم دار السلطنت اور اسلامی تہذیب کا مرکز تھی اس لئے
یہاں کی صدارت کے لئے خصوصیت سے اہتمام کیا جاتا تھا چنانچہ علامہ کے والد ماجد مولانا
فضل امام صدر الصدور کئے گئے۔ ان کے بعد ان کے شاگرد رشید مفتی صدر الدین خان
آزردہ اس عہدہ پر فائز کئے گئے۔ ان کے متعلق ریزیڈنٹ نے اکبر شاہ ثانی بادشاہ سے
بھی مشورہ کر لیا تھا۔ اسی طرح سر رشتہ داری پر علامہ کا تقرر ہوا۔ آخر میں لکھنؤ میں صدر الصدور
کر دئے گئے تھے۔

کچھ عرصہ بعد ریزیڈنسی کمشنری میں اپنے آپ کو تبدیل کرا لیا۔ یہاں بھی رنگ بے رنگ
تھا۔ یہ نازک مزاج واقع ہوئے تھے حکام تنک مزاج حفظِ مراتب کہاں ارباب علم و بے علم
سب ایک آنکھ سے دیکھے جاتے علامہ نے استعفا دے دیا نواب فیض محمد خاں والئ جھجر نے
پانصد روپیہ ماہوار مصارف کے پیش کئے اور قدر دانی کے ساتھ اپنے پاس بلا لیا۔ دہلی سے وانگی
کے وقت ولیعہد سلطنت صاحب عالم مرزا ابوظفر بہادر نے اپنا ملبوس و شالہ علامہ کو اوڑھایا
اور بوقتِ رخصت آبدیدہ ہو کر کہا :

---

[1] غالب از مہر ۲۵۸۔

"چونکہ آپ جانے کو تیار ہیں میرے لئے بجز اس کے کوئی چارۂ کار نہیں کہ میں بھی اسکو منظور کروں مگر خدا علیم ہے کہ لفظِ وداع زبان پر لانا دشوار ہے۔"

مرزا غالب نے اپنے ایک خط میں اس المناک دردِ فراق کا حال لکھا ہے۔ مولوی سراج الدین کو مرزا نے کسی واقعہ کا قطعۂ تاریخ لکھ کر بھیجا۔ انہوں نے مرزا کی خواہش کے بغیر وہ قطعہ بہت سی مدح و ستائش کے ساتھ اخبار آئینۂ سکندر میں چھپوا دیا۔ جب وہ پرچہ نظر سے گزرا تو اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ایک خبر کی اشاعت کی طرف توجہ دلائی ہے:

"گمنامے را ناموس ساختن و ہیچ را ہمہ پنداشتن عنایتی است سترگ و رحمتے ست بزرگ خاصہ کہ آں سترگ عنایت بے ابرام داعی روئے نماید و آں بزرگ مرحمت بے استدعائے سائل بظہور آید۔ نگرندہ اگر دیدۂ حق بیں دارد بنگرد کہ واجب تعالیٰ شانہ اجزائے ممکنہ را کہ در کتمِ عدم متواری بودہ اند بمحض عنایت پیرایۂ وجود بخشیدہ و بر آں معدومات منت ننہادہ۔ حقا کہ اگر تا ئلے بسزا کردہ شود رقم گشتن قطعۂ تاریخ در آئینۂ سکندر ازیں عالم خبر میدہد۔ و چوں ناخواستہ ایں چنیں نوازشش بمیاں آمد ہر آئینہ ردائے خوشش را چگونہ چشم تواں داشت لاجرم در گزارش مدعا فصلے بہ میان نہادہ آرزو را سر انجام گفتگو دادہ می شود۔

نہفتہ مباد کہ قدر ناشناسیٔ حکام رنگ آں ریخت کہ فاضل بے نظیر و المعیٔ یگانہ مولوی فضل حق از سر رشتہ داری عدالتِ دہلی استعفا کردہ خود را از ننگ و عار وا رہاند حقا کہ اگر پایۂ علم و فضل و دانش و کنش مولوی فضل حق آں مایہ بکاہند کہ از صد یک وا ماند و باز آں پایہ را بسر رشتہ داریٔ عدالت دیوانی سنجند۔ ہنوز ایں عہدۂ دوں مرتبہ وے خواہد بود۔ بالجملہ بعد ازیں استعفا نواب فیض محمد خاں (رئیس جھجر) پانصد روپیہ ماہانہ برائے مصارفِ خدام مخدومی معین کردہ و نزدِ خود خواند۔ روزے کہ مولوی فضل حق ازیں دیار می رفت ولیعہد خسروِ دہلی صاحب عالم مرزا ابو ظفر بہادر مولانا را تا پدرود کند سوئے خود طلبید و دوشالۂ ملبوس خاص بدوشِ وے نہاد و آب در دیدہ گرداند و فرمود:۔

"کہ ہرگاہ شمامی گوئید کہ من رخصت می شوم مراجزایں کہ بپذیرم گریز نیست
اما ایزد دانا داند کہ لفظِ وداع از دل بزباں نمی رسد الا بصد جرِ ثقیل"

تا اینجا سخن ولیعہد بہادر است غالب مستہام از شما می خواہد کہ واقعہ
تودیعہ مولوی فضل حق واندوہناکی ولیعہد بہادر و بدرد آمدن دلہائے اہلِ
شہر بعبارتے روشن و بیان دلآویز در آئینۂ سکندر بقالب طبع درآرید
و مرا دریں تفقد منت پذیر انگارید۔ والسلام [1]

اس خط سے مرزا غالب کا علامہ سے بے پایاں خلوص اور غم ہجر ظاہر ہوتا ہے
اخلاص و محبت کا پتہ ایک طویل خط کے ابتدائی جملوں سے بھی چلتا ہے۔ علامہ کے مکان
کے قریب آگ لگنے کی خبر مرزا کو بذریعہ لالہ ہیرالال معلوم ہوئی۔ اس پر اس طرح لکھتے ہیں:۔

قبلہ و کعبہ! اگرنہ ایں بودے کہ لالہ ہیرالال راہوائے دیدن عنقا۔ درسر
و ناگاہ شامگاہے کہ پنجشنبہ بست و پنجم ربیع الاول بود بہ نشیمنِ تنہائی من
گذر افتادے آں در گرفتن آتش گرداگرد والا کاشانہ و سوختن خانہ و رختِ
ہمسائیگاں از ہر کرانہ و نرسیدن آسیبے بملازماں دراں میانہ از کجا شنودمے
واگر نہ شنودمے ہر آئینہ حق دوستانہ پرسش کہ شیوۂ غم خواری واندوہ ربائی
است ناگزاردہ ماندے، و ہم ایزدے نیایشش کہ لازمۂ حق شناسی و سپاس
گذاری است بتقدیم نرسیدے۔ ہاں اے وفا دشمن! بیگانگاں (چوں ہیرالال)
کامیاب پیام و نامہ و آشنایاں جگر تشنۂ رشحۂ خامہ!

وائے برمن کہ رقیب از تو بہ من بنماید
نامۂ واشدہ مہر بعنواں زدہ! [2]

ایک عرصہ تک جھجر رہے پھر مہاراجہ الور نے بلا لیا کچھ دن بعد سہارنپور قیام رہا
دو سال تک کسی بڑے عہدے پر فائز رہے۔ نواب ٹونک کے پاس بھی رہے۔ نواب یوسف علی
خاں نے رامپور بلا لیا خود تلمذ اختیار کیا اور محکمۂ نظامت اور مرافعۂ عدالتین میں منسلک کر دیے

---

[1] یادگارِ غالب ص ۳۵۵۔ [2] یادگارِ غالب ص ۳۴۳ و کلیات نثر غالب ص ۱۱۷۔

گئے۔ نواب کلب علی خاں نے بھی آپ سے پڑھا۔

دورانِ قیام رامپور میں اپنے مخلص دوست مرزا اسداللہ خاں غالب کی تعریف و توصیف اکثر نواب صاحب سے فرماتے رہتے تا آنکہ نواب مرزا کے کلام کے مشتاق ہوگئے اور کچھ دن بعد تعلقات نے استواری اختیار کرلی اس طرح مرزا کی قدیم دوستی کا حق بھی ادا کردیا گیا۔

آٹھ برس رامپور رہنے کے بعد لکھنؤ چلے گئے۔ وہاں صدر الصدور بنائے گئے۔ ۲۶ صفر ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۳ فروری ۱۸۴۷ء کو واجد علی شاہ اختر اپنے والد امجد علی شاہ کے انتقال کے بعد سریر آرائے سلطنت اودھ ہوئے۔ ابتداء عمر ہی سے عیش و عشرت کے خوگر تھے۔ حکمران ہونے پر بھی عادت نے ساتھ نہ چھوڑا۔ نظام سلطنت میں ابتری پیدا ہوئی۔ لارڈ ہارڈنگ گورنر جنرل نے دوسرے ہی سال ۱۸۴۸ء میں لکھنؤ پہنچکر فہمائش کی اس کا اثر یہ ہوا کہ ایک کچہری "حضور تحصیل" کے نام سے مقرر ہوئی۔ اس کے مہتمم علامہ فضل حق خیرآبادی ہی قرار پائے۔ مستغیثان سپاہ فوج سرکار کمپنی ساکنہ ملک اودھ کی زمینداری کا مقدمہ محکمہ جات شاہی میں فیصل ہوا کرتا تھا مگر غفلت یا طمع عمّال سے یا سرکشی تعلقہ دار سے وہ لوگ اپنے حق کو نہ پہنچکر ہمیشہ داد بیداد کرتے رہتے تھے۔ ان کی دادرسی کے لئے "حضور تحصیل" مقرر ہوئی تھی[۱]۔

زمانہ ملازمت میں تمام امور دیانتداری اور زیرکی سے انجام دئے۔ حکام و رعایا دونوں خوش رہے۔ قاضی الیاس حسین سیتاپوری راوی ہیں کہ زمانہ سر رشتہ داری دہلی میں ایک قطعہ زمین کے لئے ہندو اور مسلمان دونوں خواہشمند تھے برادرانِ وطن نے ایک لاکھ روپیہ کی پیشکش بھی کی چونکہ استحقاق مسلمانوں کا ثابت ہوا اس لئے علامہ نے وہ قطعۂ زمین مسلمانوں ہی کے حوالے کردی۔

یہی انصاف پروری و ہر دلعزیزی تھی جس کی وجہ سے بلند اقبال عبدالحق کی پیدائش پر رعایا نے اور بالخصوص برادرانِ وطن نے تحفے تحائف کے علاوہ لاکھوں روپے نذر کئے[۲]۔

یہی قاضی صاحب راوی ہیں کہ دہلی کے کسی پل پر کسی وجہ سے آمد و رفت ممنوع قرار دے دی گئی تھی۔ علامہ کے پاس کچھ لوگ آئے اور برات نکال لے جانے کی بصد منت و الحاح

---

[۱] انتخاب یادگار منشی امیر احمد مینائی۔ [۲] تاریخ اودھ جلد چہارم ص ۲، نجم الغنی خاں رامپوری۔ [۳] حرۃ العلماء بوفات شمس العلماء از مولانا حکیم برکات احمد ٹونکی۔

اجازت چاہی۔ علامہ نے ایک دستخطی پرچہ لکھ دیا کہ" روکو مت جانے دو " محافظین نے پرچہ دیکھ کر نکل جانے دیا۔ حکومت کی طرف سے جواب طلب ہوا۔ محافظین نے اجازت نامہ پیش کر دیا۔ علامہ نے جواب دہی کرتے ہوئے فرمایا میں نے تو لکھا تھا" روکو، مت جانے دو"

علامہ نے اپنی زیرکی اور دانائی سے غریبوں کا کام بھی نکال دیا اور الزام بھی اپنے اوپر نہ آنے دیا۔ اس جملہ میں لطیفہ یہ ہے کہ" روکو" کو مابعد سے علیحدہ کر کے پڑھا جائے تو ممانعت کا پہلو نکلتا ہے اور اس کے ساتھ" مت" ملا کر پڑھا جائے تو اجازت ہو جاتی ہے۔

روکو، مت جانے دو — روکو مت، جانے دو۔

سخن فہمی

عام علماء کی طرح علامہ شعر و سخن کے فن سے بے خبر نہ تھے۔ شعر گوئی کے مانند سخن فہمی میں بھی کمال حاصل تھا۔ وطن مالوف خیرآباد جہاں علماء و صلحاء کا منبع و مسکن چلا آرہا تھا وہیں لکھنؤ کے قرب اور اپنی زمین مردم خیز کی وجہ سے معدن شعراء بھی بنا ہوا تھا۔ علامہ کے دور میں حاجی مولوی تراب علی نامی منشی قدرت حسین قدرت مولوی مظفر حسین شوخی متولی منشی محمد جعفر زمہری منشی بہاری لال خاوری منشی موہن لال گرامی مولوی الٰہی بخش نازش مولوی فضل عظیم عظیم وغیرہم گلستانِ شاعری کے مختلف رنگ و بو رکھنے والے شگفتہ پھول تھے۔ نمونے کے طور پر ایک ایک دو دو شعر پیش کئے جاتے ہیں۔ قدرت بیان اور سلاست زبان کا اندازہ خود ہو جائے گا۔

نامی: سحر از جنبشِ شمشاد لگ گشت چمن — یادم آمد روشِ قامتِ دلجوئے کسے

قدرت: بیاضِ صبحِ نورانی ز نورِ عارضش روشن — سوادِ شامِ ظلمانی ظہورِ موئے پیچانش

شوخی: دی نالہ ام کہ دم کشِ آہنگِ صور بود — شامِ فراق خندۂ صبحِ نشور بود

زمہری: اے بنامِ تو سخن تازہ چو گل — وے بحمدِ تو زبانہا بلبل

دلربائی تو مانا کہ کشد — دل سوئے کاکل و پیچ سنبل

خاوری: دود آہِ دل بہم پیچیدہ کاکل ساختند — چوں گلستاں رخش بر دند و سنبل ساختند

چوں احد بر صورتِ احمد عیاں شد در جہاں — عارفاں نامش ہمیں از تجاہل ساختند

گرامی: میتواں جست از زبانِ شمع — قصۂ سوز و سازِ معشوقاں

فرہاد نیستم کہ بہ سنگے زدہ است سر — از نالہ کوہ را بہ طپیدن در آورم

نازش: اٹھاتا بوت یارب کس حریق سوزِ ہجراں کا — کہ شعلہ آکے کاندھا دے گیا برقِ درخشاں کا

عظیم: ستم نمود بہ جانِ من اینکہ شب نگہش — بہ بزمِ غیر رواجِ ستمگری میداد

یہی وہ شعر و سخن کے چرچے تھے جس نے علامہ کو سخن فہمی و نکتہ سنجی میں ماہر بنادیا تھا۔ علامہ کی صاحبزادی بی بی سعید النساء (والدہ حضرتِ مضطر خیر آبادی) بھی بڑی شاعرہ تھیں۔ حرماں تخلص فرماتی تھیں یہ مشہور زبان زد شعر موصوفہ ہی ہے ؎

خانۂ یار کا کیا تم کو پتا بتلاؤں — جیسا مشتاق ہو نزدیک بھی ہے دور بھی ہے

خیر آباد کی یہی وہ علمی و ادبی فضا تھی جس نے اس آخری دور میں بھی ریاض، مضطر، وسیم، کوثر، بسمل، نیر اور اختر جیسے صاحبِ دیوان و باکمال شعراء پیدا کئے جنھوں نے لکھنوی اسکول کی شان کو چار چاند لگا دئے۔ لسان الملک ریاض کی وفات کے بعد میں نے "ریاض اور خیر آباد" کے عنوان سے ایک مبسوط مضمون لکھا تھا جو الناظر لکھنؤ جون و جولائی ۱۹۳۵ء میں دو قسطوں میں شائع ہو چکا ہے جس میں دوسرے نامور شعرائے خیر آباد کا ذکر بھی ضمناً آگیا ہے، "ومن شاء فلیطالع" خیر آباد سے دہلی پہنچے تو وہاں بھی یہی رنگ دیکھا دار السلطنت دہلی ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی کاملین فن کا مرکز تھی ولیعہد سلطنت صاحب عالم ابو ظفر بہادر شاہ کی شعر و سخن کی دلچسپی نے زمین دہلی کو اور بھی رشکِ آسماں بنادیا تھا۔

علامہ ریزیڈنٹ کے محکمہ کے سر رشتہ دار ہو چکے تھے، ولیعہد سے دوستانہ مراسم تھے قلعہ میں آمد و رفت رہتی تھی۔ بڑے بڑے کہنہ مشق شاعر مولوی امام بخش صہبائی، علامہ عبداللہ خاں علوی حکیم مومن خاں مومن، مفتی صدر الدین خان آزردہ، مرزا اسد اللہ خان غالب، نواب ضیاء الدین خاں نیر، شاہ نصیر الدین نصیر، شیخ محمد ابراہیم ذوق حکیم آغا جان عیش، حافظ عبد الرحمن خاں احسان، میر حسن تسکین اور خدا جانے کتنے سخنوران باکمال کا جمگھٹا تھا جب یہ لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہوں گے تو آسمان کو بھی زمین پر رشک آتا ہوگا۔ [1]

---

[1] گل رعنا صفحہ ۳۱۲۔

مرزا غالب سے علامہ کے پرخلوص اور گہرے تعلقات تھے۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ دونوں بالکل ہم سن تھے۔ دونوں ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے تھے۔ مفتی صدرالدین خان آزردہ " ثالث ثلاثہ " تھے۔ گویا صلیبیوں کی اصطلاح میں " اقانیم ثلثہ " بنے ہوئے تھے۔ یہ تینوں ایک جسم کے لئے " ابعادِ ثلاثہ " (طول، عرض، عمق) کا حکم رکھتے تھے جس طرح جسم اپنے ابعاد کے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا اسی طرح ان تینوں کو جسم خلوص و محبت سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مفتی صاحب دونوں سے آٹھ سال بڑے تھے " چراغ " (۱۲۰۴ھ) تاریخ ولادت ہے۔ اگر سنِ ولادت میں دونوں میں سے کسی کا ساتھ نہ دے سکے تھے تو سنِ وفات میں ایک کا ساتھ نہ چھوڑا " چراغ دو جہاں بود " (۱۲۸۵ھ) تاریخ وفات ہے۔ مرزا غالب کا بھی سالِ رحلت یہی ہے۔ اور یہ بھی کیسا پُر لطف اتفاق ہے کہ مفتی صاحب علامہ سے آٹھ سال بڑے تھے اور آٹھ سال بعد ہی دنیا سے رخصت ہوتے۔ علامہ کی وفات جزیرۂ انڈمان میں ۱۲۷۸ھ میں ہوئی ہے مرزا غالب نے ولادت میں ایک دوست کا ساتھ دیا اور وفات میں دوسرے کا۔

مرزا کی شعر گوئی کا طرز سب سے جداگانہ تھا۔ طبیعت مشکل پسند واقع ہوئی تھی۔ علماء و فضلا کی صحبت نے قابلیت میں اور چار چاند لگا دئے تھے۔ روزانہ کی صحبتوں میں مشکل اور ادق الفاظ استعمال ہوتے رہتے تھے، جملوں کی نئی نئی ترکیبیں اور بندشیں پیدا ہوتی رہتی تھیں۔ مرزا جب شعر کہنے بیٹھتے تو انہیں مجالس کا خیال دامنگیر رہتا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ میرے اشعار کے مخاطب یہی باکمال حضرات ہیں تحسین کی توقع بھی انہیں سے ہوتی تھی اس لئے مرزا ان ترکیبوں اور مشکل و دقیق الفاظ کے لئے مجبور بھی تھے۔

مفتی صاحب اسی بنا پر سخت ناخوش رہتے تھے اور ایسے اشعار سے طبیعت میں تکدر پیدا ہو جاتا تھا جس کا اظہار شہود و غیبت میں کرتے بھی رہتے تھے۔ مرزا کو آزردہ کی اس روش کی کوئی پرواہ نہ ہوتی تھی لیکن علامہ کے شریکِ مجلس ہونے اور غزلوں کو سننے اور دیکھنے کے بعد جب مرزا کو سمجھانے کی نوبت آئی کہ یہ اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں گے تو مرزا بہت پریشان ہوئے۔

مولوی محمد حسین آزاد آبِ حیات میں لکھتے ہیں کہ:-

" مولوی فضل حق صاحب فاضل بے عدیل تھے۔ ایک زمانے میں دہلی میں سررشتہ دار تھے، اس عہد میں مرزا خاں کوتوال تھے۔ وہ مرزا قتیل کے شاگرد تھے۔ نظم و نثر فارسی اچھی لکھتے تھے

غرضکہ یہ دونوں باکمال مرزا صاحب کے دلی دوست تھے۔ ہمیشہ باہم دوستانہ جلسہ اور شعر و سخن کے چرچے رہتے تھے۔ انہوں نے اکثر غزلوں کو سنا اور دیوان کو دیکھا تو مرزا صاحب کو سمجھایا کہ یہ اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں گے۔ مرزا نے کہا جو کچھ کر چکا اب تدارک کیا ہو سکتا ہے؟ انہوں نے کہا کہ خیر ہوا سو ہوا انتخاب کرو اور مشکل شعر نکال ڈالو۔ مرزا صاحب نے دیوان حوالے کر دیا۔ دونوں صاحبوں نے دیکھ کر انتخاب کیا وہ یہی دیوان ہے جو آج عینک کی طرح لوگ آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں۔ [1] مولانا حالی لکھتے ہیں:۔

"مولوی فضل حق کی تحریک سے انہوں نے اپنے اردو کلام میں سے جو اس وقت موجود تھا دو ثلث کے قریب نکال ڈالا اور اس کے بعد اس روش پر چلنا بالکل چھوڑ دیا۔[2]"

مرزا نے اسی سے متاثر ہو کر یہ رباعی کہی تھی ؎

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل — سن سن کے اسے سخنورانِ کامل

آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش — گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

علامہ کی سخن فہمی کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ مولانا حالی لکھتے ہیں:۔

مرزا کے ایک فارسی قصیدے کی تشبیب کا شعر ہے ؎

ہمچناں در تُتُقِ غیب ثبوتے دارند — بوجودے کہ ندارند ز خارج اعیاں

مرزا صاحب خود مجھ سے کہتے تھے کہ میں نے "ثبوتے" کی جگہ "نمودے" لکھا تھا۔ مولوی فضل حق کو جب یہ شعر سنایا تو انہوں نے کہا کہ اعیانِ ثابتہ کے لئے نمود کا لفظ نامناسب ہے اسکی جگہ ثبوت بنا دو۔ چنانچہ طبع ثانی میں بجائے نمود کے ثبوت بنا دیا ہے [3]

اہلِ علم جانتے ہیں کہ اس اصلاح نے فلسفیانہ اصطلاح کے مطابق شعر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ مرزا کو ایسے باریک بینوں اور بال کی کھال نکالنے والوں سے سابقہ تھا یہی وجہ تھی کہ موصوف کو اپنے لئے نئی راہ نکالنی پڑی اور دشواریوں میں مبتلا ہو کر:

"گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل" کہنا پڑا۔

---

[1] آب حیات ص۵۱۲۔ [2] یادگار غالب ص۲۰۱۔ [3] یادگار غالب ص۴۹۔

مرزا نے ایک خط میں علامہ کو خط نہ بھیجنے کی شکایت لکھی ہے اور ایک قصیدہ جو حمد میں عرفی کے قصیدے پر لکھا ہے، خط کے ساتھ بھیجا ہے اور اس کی داد چاہی ہے۔ مرزا لکھتے ہیں :۔

"سبحان اللہ! باآنکہ از فرامش گشتگانم، ہمدانم کہ دوست مرا بوجود بلکہ بنیم خس برنگیرد۔ ہرگاہ بساز دادن آہنگ گلہ روئے آرم دسنجم کہ ایں پردہ (یعنی نغمہ) را بے پردہ (یعنی بے تکلف) می توانم سرود از قہرماں اندیشہ دور باشی (یعنے اعتنائی) درمیان نیست۔ ہر آئینہ، بدیں شادمانی کہ ہنوزم با دوست روئے سخنے ہست۔ آنچناں برخویشتن می بالم کہ غم جانگداز فراموشی فراموش دلب از زمزمہ کہ دل در بند سرودن آنست (یعنی شکایت) خاموش میگردد۔

از خویشتن بہ ذوق جفا با تو ساختیم   با ما دگر مساز کہ ما با تو ساختیم

دریں روز ہوائے آں در سر افتاد کہ بیتے چند در توحید مجیباً لعرفی گفتہ آید چوں کوشش اندیشہ بجائے رسید کہ نہ عرفی را محل ماند و نہ مرا جائے۔ ناگزیر آں ابیات را برکسے عرضہ میدارم کہ چوں من صد و چوں عرفی صد ہزار را بہ سخن پرورش تواند کرد و پایۂ ہر یک بہ ہر یک تواند نمود۔ والسلام [1]

اس خط سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا علامہ کو سخن فہمی و نکتہ پروری میں کیا سمجھتے تھے نیز یہ کہ مرزا کی شاعری علامہ کی توجہ و التفات کی کس قدر رہین منت تھی۔ غالب ہی پر کیا موقوف ہے علامہ کی نظر توجہ جس کی طرف ہو گئی اسے پارس بنا دیا۔

سید اسمٰعیل حسین، منیر شکوہ آبادی جو ناسخ و رشک کے نامور شاگرد اور انیسویں صدی کے مشہور شاعر ہیں مصطفےٰ بیگ نامی ایک شخص نے قتل نواب جان کے سلسلے میں پھنسا دیا تھا۔ اسی دور میں ہنگامۂ ۱۸۵۷ء رونما ہو گیا۔ نواب فرخ آباد کے ساتھ شریک انقلاب ہو گئے۔ عبور دریائے شور کی سزا ملی۔ باندہ، الہ آباد، کلکتہ جیلوں میں رہے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ ہتکڑی و بیڑی پہنا کر پا پیادہ لے جایا گیا تھا۔ ان پر صعوبت سفروں کو دیوان میں مختلف جگہ نظم کیا ہے۔ جب علامہ انڈمان پہنچ گئے تو یہ بھی شریک مجلس ہونے لگے۔ دلی کی پرلطف

[1] یادگار غالب ص۲۶۵۔

معصیتوں کا کچھ کچھ غم غلط ہونے لگا۔

منیر اپنے ایک خط میں جو انہوں نے محمد وزیر خان مقیم شہر باندہ کو ۲۳ ماہ ذی الحجہ ۱۲۷۶ھ کو بھیجا تھا لکھتے ہیں :۔

"بیشتر غزلیات و بعض قصائد لباسِ نظم پوشیدہ ازاں جملہ یک قصیدہ در تتبع بدر چاچی و خاقانی کہ بہ مبالغہ و اصرار عالم معقول و ادب علامۃ لبیب المشتہر فی الہند جناب مولوی فضل حق خیر آبادی موطن دہلوی مسکن ایں جزیرہ مدفن سختہ ام و بخاتمہ قصیدہ کیفیت اصرار جناب مرحوم بہ نظم آوردہ بالجملہ قصیدہ ایست کہ از قدرتِ ایزدی خبر میدہد۔" [۱]

علامہ کے اصرار پر ۱۵۱ اشعار کا حضرتِ امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی منقبت میں بڑی قابلیت سے ایک قصیدہ لکھا۔ علامہ کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ ڈیڑھ سو اشعار تقریباً ڈیڑھ سال میں پورے کر پائے ہیں علامہ کی وفات ۱۲۷۸ھ میں واقع ہوئی۔ ۱۲۷۹ھ میں قصیدے کی تکمیل ہو پائی۔ قصیدہ کا پہلا مطلع یہ ہے :۔

اشکِ زلیخا ہوتے بجز صفتِ جوشِ تن ... غرق ہوا نیل میں یوسفِ گل پیرہن

قصیدے کے آخری اشعار کے ذریعے ساری روئداد منیر ہی کی زبان سے سنیئے :۔

مخزنِ فضل و کمال، عالمِ عالی مقام ... ناقدِ تازی زباں نبض شناسِ سخن

مولوئ بے نظیر فضلِ حق اسمِ شریف ... دہلی سے تا لکھنؤ مشتہر و مؤتمن

قید میں ہیں اور وہ رہتے تھے ایک جگہ ... عین سمندر میں تھے غرقۂ بحرِ محن

کہنے لگے ایک دن کچھ سبب اسکا بتا ... شاعرِ اردو زباں اس میں ہوں تو یا کہن

مصطلحاتِ عجم اور کنایاتِ فرس ... کس لئے کرتے نہیں زینتِ نظمِ سخن

یا متحمل نہیں لہجۂ اردو زباں ... یا کوئی لائق نہیں تم میں ہے بے ریب و ظن

گو غزل میں نہو پر ہے قصیدے میں فرض ... دقتِ مضموں سے ہے حسن بوجہِ حسن

حضرتِ سودا بغیر کس نے قصیدے کہے ... وہ بھی ہم اس راہ میں ہو نہ سکے قطرہ زن

---

[۱] کلیاتِ منیر

شاعروں میں جز غزل پھر نہ کسی نے کہا　　زعم میں گو اپنے ہوں طوطیٔ شکر شکن

میں نے کہا راست ہے آپ جو فرماتے ہیں　　آپ سنیں تو کہے کچھ یہ اسیرِ محن
مصطلحاتِ غریب جو کہ نہ معروف ہوں　　نظم کرے کس طرح شاعرِ ہندی سخن
جو متعارف ہوا شاعروں میں پہلے سے　　اس کو بھی سن سکے آج ہوتے ہیں سب طعنہ زن

کہنے لگے یہ کلام مہمل و بے مغز ہے　　ہیں شعرا بے سواد، جہل ہے ان کا وطن
گرم ہوئے بڑھ گیا سلسلۂ قہر و خشم　　بس کہ تھے نازک مزاج ماتھے پہ آئی شکن
کہتے تھے وہ بار بار ہندیوں سے ہے محال　　رمز و کنایات میں دقّتِ لطفِ سخن

ہو کے ادب سے خموش پھر یہ قصیدہ کہا　　کوچۂ نو میں چلا قاصدِ مشقِ کہن
قید میں قحطِ کتاب حافظہ از بس ضعیف　　پر مددِ غیب سے خامہ ہوا حرف زن
بعض تراکیبِ خاص طبع کی ایجاد ہیں　　نظم ہوئیں جو تھیں یاد مصطلحاتِ کہن
نصف قصیدہ کیا سامنے ان کے رقم　　ختم ہوا جب وہ تھے ہمدمِ گور و کفن
میری خطائیں کریں صاحبِ انصاف عفو　　قید میں خود میں ہوں پوچ پوچ ہے میرا سخن

غیب سے تاریخِ نو ہاتھ لگی اے منیر
جزو دل و جاں ہوئی شرحِ حدیثِ حسن [1]

۱۲۷۹ھ

شاعری و نثر نگاری

سخن فہمی نکتہ آفرینی اور شاعرگری کا حال آپ معلوم کر چکے۔ اب شاعری کی کیفیت بھی ملاحظہ کرتے چلیے۔

---

[1] کلیاتِ منیر۔

یہ تو گزر ہی چکا ہے کہ وطن مالوف خیرآباد علم و ادب کا مرکز بنا ہوا تھا۔ دہلی پہنچے تو وہاں بھی ہر طرف باکمال حضرات کا جمگھٹا نظر آیا۔ ماحول و گرد و پیش کا اثر پڑنا لازمی ہے والدِ ماجد کے انتقال کے بعد جب تک دِلّی میں رہے علامہ کے یہاں اہلِ علم و ادب کی نشست روزانہ رہتی۔ دہلی میں علماء کی دو جگہ نشست تھی۔ ایک علامہ کے یہاں دوسری مفتی صدرالدین خان آزردہ کے دولت کدہ پر۔ علامہ کے علمی دربار میں آٹھویں روز شعرائے دہلی کا بھی اجتماع ہوتا تھا۔

غالب صہبائی، مومن، آزردہ، احسان، تیر، نثار، شیفتہ، ضمیر، ممنون، نصیر وغیرہم

علماء میں مولوی عبداللہ خان علوی، مولوی عبدالخالق، مولوی محبوب علی، مولوی نصیرالدین شافعی، مولوی کریم اللہ، مولوی نورالحسن، مولوی کرامت علی، مولوی مملوک علی، مفتی سید رحمت علی خاں، مولوی امان علی، مولوی محمد جان، مولوی محمد رستم علی خاں وغیرہم۔

ان کے علاوہ دوسرے ماہرینِ فنون میں امام الدین خاں خوشنویس، غلام علی خاں مصور، ہمت خاں گوّیا، راگ رس خاں گوّیا، صوفی شاہ محمد حنیف، صوفی شاہ فدا حسین، سید عسکری، حکیم غلام نجف خاں، حکیم صادق علی خاں، حکیم نصراللہ خاں قابلِ ذکر ہیں۔ یہ حضرات روزمرہ کے آنے جانے والے تھے۔

اندازہ لگائیے کہ اکبر بادشاہ کے شاہی دربار سے یہ دربار کس طرح کم تھے۔ بادشاہ نے لاکھوں روپے صرف کر کے نورتن جمع کئے تھے اور ان شاہانِ علم نے اپنے حسنِ اخلاق سے سینکڑوں باکمال حضرات کو درباری بنا لیا تھا۔

امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے ان مجالس کا ذکر مولانا مہر سے کیا تھا انہوں نے غالب میں اسے نقل کیا ہے۔

والد مرحوم (مولانا خیرالدین دہلوی) شب کی نشستوں میں جب کبھی اس عہد کا ذکر کرتے تو بار بار یہ شعر پڑھتے اور آبدیدہ ہو جاتے:

تمتع من شمیم عرار نجدٍ　　　فما بعد العشیة من عرار[1]

---

[1] یہ شعر صمہ قشیری کا ہے پانچ اشعار اسی سلسلے کے اور ہیں ناظرین کی دلچسپی کے لئے ترجمہ کے ساتھ نقل کئے جاتے ہیں۔ (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

فرماتے تھے کہ مفتی صاحب کا دیوانخانہ دہلی کے تمام منتخب افراد کا مرکز تھا۔ جاڑا، گرمی برسات کوئی موسم ہو لیکن شب کی یہ مجلس کوئی قضا نہیں کرتا تھا۔ ہر فن کے اکابر کو وہاں ان کے بہترین وقتوں میں دیکھا جا سکتا تھا۔ اگر کوئی نووارد دہلی آتا اور چاہتا کہ دہلی کے سارے اہلِ فضل و کمال کو بیک وقت اور بیک مجلس دیکھ لے تو وہ سیدھا مفتی صاحب کے دیوان خانہ کا رخ کرتا [1]

اٹھارویں صدی میں پیرس اور لندن کے علم دوست امراء کے سیلون اور ڈرائنگ روم کے جو حالات ہم پڑھتے ہیں بعینہٖ یہی حال دہلی کے دیوانخانوں کی مجلسوں کا بھی تھا۔ ہر حلقے میں کسی نہ کسی امیر کا دیوانخانہ شب کے اجتماع و سمر کا مرکز بن جاتا تھا اور اس حلقے کے لئے ٹھیک ٹھیک ایک علمی و ادبی اور تفریحی کلب کا کام دیتا تھا۔

والد مرحوم ان دیوان خانوں کی مجلس کے جو افسانے سنایا کرتے تھے کاش وہ قلمبند کئے جا سکتے۔ بجھنے والے چراغ کا یہ آخری اجالا تھا۔ دہلی مرحوم کے ہفت صد سالہ زندگی کی انجمن طرازیوں کی یہ آخری بزم تھی۔ گو شان و شکوہ کے سارے پچھلے نقوش مٹ چکے تھے لیکن مٹے ہوئے رنگ و روغن میں بھی عہدِ ماضی کے مرقعوں کی بہار دیکھی جا سکتی تھی۔ [2]

(بقیہ صفحہ گذشتہ) مولانا آزاد کو ان اشعار سے کافی تعلق ہے بعض احباب کو اپنے خطوط میں بھی تحریر فرما دیتے ہیں۔

اقول لصاحبی والعیس تہوی — بنابین المنیفۃ فالضمار

میں نے اپنے ساتھی سے جبکہ اونٹ ہمیں تیزی سے منیفہ (چشمہ بنی تمیم) اور ضمار (گاؤں) کے درمیان لئے جا رہے تھے کہا۔

تمتع من شمیم عرار نجد — فما بعد العشیۃ من عرار

عرار نجد (زرد رنگ خوشبودار پھول جس کی مدت حیات صرف ایک شب ہے) سے جی بھر کے فائدہ اٹھا لے کیونکہ اس شب کے بعد اس کا ملنا ناممکن ہے۔

الا یا حبذا نفحات نجد — وریّا روضۃ بعد القطار

کس قدر خوشگوار ہیں نجد کے پھولوں کی مہکیں اور بارش کے بعد اس کے باغوں کی تر و تازگی کتنی پر بہار ہے۔

واھلک اذ یحل الحی نجدا — وانت علی زمانک غیر زار

نجد کے رہنے والے عزت و محبت کے مستحق ہیں اس کی آب و ہوا واردین کے لئے موافق ہے وہاں پہنچ کر کوئی زمانے کی ناموافقت کا شکوہ سنج نہیں ہو سکتا۔

شھور ینقضین وما شعرنا — بانصاف لھن ولا سرار

مہینے گزر رہے ہیں اور عیش و آرام کی وجہ سے ہمیں نصف شب اور آخر حصۂ شب کا پتہ بھی نہیں چلتا۔

فاما لیلھن فخیر لیل — واقصر ما یکون من النہار

ان مہینوں کی راتیں بہترین راتیں ہیں اور ان کے دن بے حد مختصر ہیں۔

[1] غالب از مہر صفحہ ۲۹ [2] غالب از مہر صفحہ ۲۹

علامہ نے آنکھ کھولی تو آبائی وطن خیرآباد اور اقامتی وطن دہلی میں علمی و ادبی مجالس، شعر و شاعری کی صحبتیں قدم قدم پر نظر آئیں۔ ذہانت و جودت طبع مبدء فیاض کی جانب سے پہلے ہی ودیعت ہو چکی تھی، جہاں تیرہ سال کی عمر میں سندِ تکمیلِ منقولات و معقولات حاصل کی تھی وہاں فنونِ ادبیہ میں بھی مہارت تامہ پیدا کر لی تھی۔ بچپن ہی سے شعر کہنا شروع کیا، عربی، فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی فرمائی۔ فارسی شاعری کے لئے فرقتیؔ تخلص رکھا۔

فرقتی در کعبہ رفتی بارہا   نامسلماں نامسلمانی ہنوز [۱]

علامہ نے ادبِ عربی میں وہ کمال پیدا کیا کہ عرب کے معاصرین شعراء سے کہیں سبقت لے گئے۔ نظم کی طرح نثر میں بھی شاعری کی ہے۔ رسالہ ثورۃ الہندیہ اور بعض خطبات اس کے شاہدِ عادل ہیں۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے المناک واقعات کے بیان میں بحالت اسیریٔ جزیرۂ انڈمان مصائب و آلام کے بے پناہ ہجوم میں جو فصاحت و بلاغت اور درد انگیز پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے اس سے علامہ کی زبانِ عربی پر مہارت اور قدرتِ کاملہ کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

"مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید" کے اصول پر جب اہلِ علم و ادب اس رسالہ کو جو اب تک پردۂ خفا میں تھا اور اب اس سوانح حیات کے ساتھ شائع ہو رہا ہے دیکھیں گے تو مشامِ جاں کو معطر بنائے بغیر نہ رہ سکیں گے اور سر دھننے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہیگا۔

علامہ نے بیچاسوں قصیدے کہے ہیں جن میں نعت کا حصہ زیادہ ہے۔ ہزارہا اشعار مختلف بیاضوں میں (جو دستبردِ زمانہ سے محفوظ رہی ہیں) موجود ہیں۔ [۲]

---

[۱] گلزار بہار ص۱۱۲۔ [۲] ۳۶ اور ۴۲ اوراق کے دو قصیدے اور قصائد فتنۃ الہند سبحان اللہ اورینٹل کلیکشن لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی میں ہیں۔ دو بیاضیں مولوی شاہ ولایت احمد لاہرپوری سجادہ نشین آستانہ عالیہ قلندریہ کے کتاب خانہ میں اور کلام کا کچھ حصہ جس میں اصل مسودہ بھی شامل ہے کتاب خانہ مفتیان گوپامؤ میں ہے۔ ایک نامکمل بیاض جس میں عربی میں مختلف بزرگوں اور دوستوں کے نام چھ خطوط اور پندرہ طویل قصیدے ہیں جن میں اکثر مکمل اور بعض نامکمل ہیں۔ محب محترم مولوی حکیم نصیر الدین اجمیری برادر زادۂ علامۃ الہند مولانا معین الدین الاجمیری مرحوم کے پاس ہے اس کی خصوصیت یہ ہے کہ بعض قصائد و خطوط خود علامہ ہی کے دست مبارک کے لکھے ہوئے ہیں۔ کہیں کہیں جگہ دستخط بھی ثبت ہیں۔ اس بیاض کی نقل اور رسالہ ثورۃ الہندیہ مع قصائد فتنۃ الہند حضرت الاستاذ علامۂ اجمیری مرحوم کے ہاتھ کے لکھے ہوئے میرے پاس بھی ہیں۔ رسالہ ثورۃ الہندیہ مع قصائد فتنۃ الہند کتاب خانہ حبیب گنج، کتاب خانہ ٹونک اور کتاب خانہ مولوی سید نجم الحسن خیرآبادی میں بھی موجود ہے۔

علامہ عربی اشعار حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کو دکھلاتے تھے۔ ولی عمری کا واقعہ ہے عرب کے مشہور اشعر الشعراء امرأ القیس کے ایک قصیدے کے طرز پر قصیدہ لکھا شاہ صاحب کو جاکر سنایا۔ مولانا شاہ غوث علی قلندر کا بیان ہے کہ شاہ صاحب نے ایک مقام پر اعتراض کیا اس کے جواب میں انہوں نے متقدمین کے بیس اشعار پڑھ دئیے۔ مولانا فضل امام بھی اس وقت وہاں موجود تھے۔ وہ فرمانے لگے کہ بس حدِ ادب!

عرض کیا کہ حضرت یہ کوئی علم تفسیر و حدیث تو ہے نہیں، فنِ شاعری ہے اس میں بے ادبی کی کیا بات ہے۔ شاہ صاحب نے فرمایا:

"برخوردار تم سچ کہتے ہو، مجھ کو سہو ہوا" [1]

عربی قصائد کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔ جمادی الاولی ۱۲۳۲ھ میں بمقام ہانسی ۸۰ اشعار کا نعتیہ قصیدہ لکھا جس کے چند اشعار یہ ہیں:

یاسائلاً عن شانہٖ یغنیک عن تبیانہ — دمع جری فی شانہ ھملاً وفرط انانہ

ماذا تسائل نازعا قاصی المواطن نازحا — عنہا الیہا نازعا یشکو اسا توقانہ

فھواہ فی ھیجانہٖ وحبواہ فی وھجانہ — والطرف فی ھمعانہ والقلب فی خفقانہ

ان شام برقا وامضا اھراق دمعا قابضا — فاذاع سرًّا غامضا قد جد فی کتمانہ

واذا تألق بارق اوسح وبل وادق — فاجاہ دمع دافق وذکا لظی نیرانہ

یزداد فی ھیمانہ ویحنّ فی اشجانہ — ان اورق فی بانہ غنّی علی اشجانہ

رمضان المبارک ۱۲۳۶ھ میں ۱۱۱ اشعار کا قصیدۂ نعتیہ دربارِ رسالت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے اس کے چند متفرق اشعار یہ ہیں:-

خفاخفی ھواہ دمعہ الجاری — لماخفا بارق بادی السناشاری

ویلاہ من ھائم کلف تکلف ان — یبدی التجلد اسرارا لااسرار

وکیف یخفی الھوی من کان لوعتہ — تبدواذا ذکر الدار والجار

---

[1] تذکرہ غوثیہ۔

کم لائم لامہ عنفا و عیرّہ ۔۔۔ جدا فلم یکترث باللوم و العار

و من اطاع الھوی طوعا و دان لہ ۔۔۔ فلا محالۃ یعصی اللائم الزاری

یا لائمی فی ھوی لعذرا بدلت ان ۔۔۔ جلوتہا فی الھوی العذری اعذاری

ما للکری یتحامی مقلتی و قد ۔۔۔ دبّ المنام الی اجفان سحّار

کم بات فی عضدی من لو تأمّلہ ۔۔۔ بدر لعاد ھلالا بعد ابدار

للہ درّ زمان بالحبیب مضی ۔۔۔ لو کان یبقی و ھل باق سوی الباری

مولانا فیض اللہ رفیق خاص محب با اخلاص کے حادثۂ شہادت پر ۲ جمادی الاخری ۱۲۳۶ھ

اذ خبرِ وحشت اثر ملتے ہی شب کو ۵۳ اشعار کا مرثیہ لکھا بعض اشعار درج ذیل ہیں :

ایا ما للیلی لا تسیر نجومہ ۔۔۔ و ما الصباحی لا یھب نسیمہ

کذبت و من این الصباح لجاذع ۔۔۔ بجنح دجی لا یستنیر بھیمہ

و ما بال طرفی لا یلذ بنومۃ ۔۔۔ و قد طال جدا سھدہ و نجومہ

لقد ساقہ ظلما علیہ اخ لہ ۔۔۔ یعادیہ مشؤم الشمال لئیمہ

علی غیر ذنب غیر ان الھہ ۔۔۔ حباہ اعتزارا احد عنہ سھیمہ

فطوبیٰ لمن یودی شہید افیدخل ۔۔۔ الجنان و یلقی فی الجحیم خصیمہ

لہ فی جنان العدن نعمی و للذی ۔۔۔ یقتلہ سوء العذاب الیمہ

فیا صاحب الفضل الدیوم سقی ثری ۔۔۔ ضریحک من غیث یبثّ دیومہ

علیک سلام اللہ ما قال ساھر

ایا ما للیلی لا تسیر نجومہ

اسی حادثۂ شہادت کے متعلق والدِ ماجد مولانا فضل امام کو ایک نیاز نامہ ۲۷ رجمادی الاولیٰ ۱۲۳۶ھ کو جب کہ مولانا پالی میں قیام فرما تھے لکھا اور اسی کے ساتھ ۲۰ رجمادے الاولیٰ کا لکھا ہوا ۱۰۵ اشعار کا مرثیہ بھی بھیجا جس کے بعض اشعار درج ہیں۔ مولانا محمد فیض اللہ نے جامِ شہادت نوش کرنے سے قبل خواب دیکھا تھا جس میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی تھی سرکارِ رسالت نے عزت کے ساتھ گلے لگا کر سیدھے ہاتھ پر بٹھایا تھا۔ دو اشعار اس

دہ کی حرف بھی اشارہ کر رہے ہیں :

ایاما الدھری بعد اسعادہ عدا　　واعتدلی ادھی المصائب واعتدی

قسا بعد لین واعتدٰی بعد مرفق　　وواعد لطفا ثم عاد فاوعدا

فکنا زمانا لانخاف فراقنا　　مدی الدھر حتی قیل لن یتبدّدا

فلما افترقنا بعد طول اجتماعنا　　بلینا ببعد ما لمدّتہ مدی

فواللہ ثم اللہ لو ان مثلہ　　یفادی بمثلی کان نفسی لہ فدا

قتلت شہیدا عند ربک شاھدا　　وقد کنت مشہود الکمال محسّدا

تعیشت فی الدنیا حمیدا محسّدا　　وفارقتہا متشھدا متشھدا

وقد ایقنت نفسی بان ستفوز با　　لشہادۃ اذ زرت النبی محمدا

فحیاک اکراما وضمّک رافۃ　　وآواک فی النادی وارواک بالندی

علیک سلام اللہ مارنّ جارع　　وحنّ غریب ندقیہ مصعّدا

سلام علیٰ قبر حواک فانہ　　حوی منک احسانا وبرا ومحتدا

---

۴۳ اشعار کے قصیدۂ نعتیہ میں محرم ۱۲۴۱ھ میں لکھتے ہیں :-

واھا لواہ مکمد　　فی جنح لیل سرمد

قد بات لیلۃ ارمد　　یلقی القذی من اثمد

یاویلہ یاویلہ　　یشکوالزمان ومیلہ

ویقول یشکو لیلہ　　یالیل ھل لک من غد

یصف الغموم وشومھا　　یرعی السماء نجومھا

دریہا وغمومھا　　من نثرۃ او فرقد

ماوی الانام باسرھم　　طرا وجابر کسرھم

لطفاو واضع اصرھم　　عنھم غدا فی الموعد

خیرالوریٰ وابرّھم　　جمعاو کاشف ضرھم

ونجاءھم فی امرھم　　وشفیعھم فی المشھد

حامی الحقیقۃ انجد — اعلی الخلیفۃ امجد

ذاکی الخلیقۃ احمد — خیر الانام محمد

ھو اول النور السنی — یتلوہ کل تعین

ثانیہ لیس بممکن — عند الحصیف المھتدی

علامہ اپنے والد ماجد مولانا فضل امام کو اپنے ابن العمۃ مولوی محمد بقا کے انتقال کی خبر سن کر ۲۰ ذیقعدہ ۱۲۳۴ھ کو ایک طویل عریضہ دہلی سے دجانہ لکھتے ہیں۔ اس خط کا ابتدائی کچھ حصہ نقل کیا جاتا ہے :

"اقبّل ارضا یھزء شمیم ترابھا العتیق ، بالمسک الفتیق؛ والعنبر السحیق ، واستلم عتبتہ ھی قبلۃ طلاب لتحقیق، وارباب التدقیق ، فیاتیھا الرجال رجالا ، علی کل ضامر بکل فج عمیق ، من کل بلد سحیق ، بین یدی الامام الحبر بل القمقام البحر مولانا الشیخ النحر ، الھازیۃ شذرات کلامہ بعقد السحر ، وقلائد نظامہ بعقود النحر ، لا زال بابہ مقصودا وفضلہ محسودا وکرمہ محمودا وظلہ ممدودا مدی الدھر بحرمۃ محمد الامین صلعم (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم ، وبعد فما یصف المملوک من حزن دھاہ ، وشجن ادھاہ ، ونصب شغلہ عن عیشہ والھاہ ، وشجو ماناہ وکرب داناہ ، وکمد عنّاہ ، و وجد اضناہ ، وقلق ایسرہ بسکرۃ الموت وادناہ ، وجزع بلغ بہ غایتہ فما اغناہ ، لما بلغہ نعی اجود من نعاہ ناع ، ودعی لہ بالرحمۃ داع ، وند بہ حزین لاع ، وافضل من وصف بطول باع وبسط ذراع واسخی من امّہ معتف وسعی الیہ ساع واسبق ساع الی معال ومساع ذی عطاء مکتوم

وشاء مشاع ويعرض مصون وعرض مضاع السميدع
المتقي الحميد اللقاء الراقي من ذرى المجد واعلى مرتقى، الباقي
في جوار رحمة الله محمد بقا، اكرم الله مثواه ونزله في دار
البقاء، وبرد ضريحه بشآبيب رحمته وسقى، فبالله اي قمر
انخسف بعد ابداره، واي نظر انكشف غب ادراره واي نجم
خوى وهو طالع في وسط سمائه واي نجم ذرى وهو طالع
في نشوه ونمائه افهكذا يموت الشبان قبل الاوان اهكذا
يزوي البان وهو ريان اهكذا تطرق الموت قبل اوانه اهكذا
يموت الشب في عنفوانه اهكذا يتردى السرات اهكذا
يتمشى الحسرات اهكذا يحدث الاحداث في الجديدين
ويتجدد اهكذا يتفرق الشمل ويتبدد ياليت الزفرات
المرددة والجيوب المقددة والدموع المنحدرة والانفاس
المتصعدة اغنت من موت فاجع او شفت بلا بل جانع
وياليت المندوب يرجع ويؤب كلا ان سكرة الموت
سكر ليس له صحو وظلمة الثرى دجية ليس بعدها ضحو تانع؟
وكذا الدنيا اولها النة واخرها لهفة واولها امل واخرها
اجل واولها امنية واخرها منية واولها سرور وغرور
واخرها مضى ومرور۔

ایک دوسرے خط میں ۵ ربیع الاول ۱۲۳۶ھ کو مولانا خلیل الرحمٰن بن نجم الدین الکاکوروی
کو تحریر فرماتے ہیں :۔

" وبعد فرب اذن عشقت قبل العین، ورب اشاش قبل
العین، وکم فی الوریٰ من هام یطیف سری فی الکری قبل
ان یری ولواعج الشوق قد تهتاج بسورة، قبل لقیان وذرة،

وكم من حبيب يتصبّا قبل ان يُرى، وكم من لهيب يتلظى قبل ان يورى، وابعد المتوقفين عن الريب، من ايقن بالغيب، كذلك مولانا ان لم الاقه فقد علمت باخلاقه وان كنت لم اره فقد سمعت خبره، وان لم اكن لقيته فقد لقيني صيته وشاقتني احاديث كماله، وان لم اكتحل بلألاء جماله وهيمتني نوافح عرفه ومنائح عرفه قبل ان اشرف منه بعرفه وبعوارف نشره، قبل معارف بشره، وشغفت برّياه، قبل ان يرى محيّاه ولم يزل مذاخر بمدائحه ظاميا الى الاستمتاع بمنائحه وماقتي منذ انبئ بانبائه يتلمس سبيلا الى لقائه ليستفيئ بلألائه ويستفى من الائه ولكن لم يساعده على ذلك الدهر ولم يساعفه الزمن۔

ماكل مايتمنى المرء يدركه
تجري الرياح بمالا تشتهي السفن

مولانا شیخ احمد الانصاری الیمنی الشروانی صاحب نفحۃ الیمن مشہور ادیب عصر کو ۱۹ ر جمادی الاخری ۱۲۳۶ھ کو ارقام فرماتے ہیں۔ علامہ کے شریک کار سلطنت اودھ اور رفیق خاص و محب مخلص مولانا فیض اللہ شہید کو ان کے حاسد بھائیوں نے موقعہ پاکر شہید کر ڈالا تھا۔ اس حادثۂ فاجعہ سے علامہ سخت متأثر ہوئے حکومت میں دادرسی کے لئے کوشاں ہوئے۔ مولانا شروانی کو اعانتِ مظلوم کی طرف توجہ دلا رہے ہیں :۔

فقد كان المملوك مملوكا له بلارق، واخا له بلا اجتماع معه في عرق وقريبا له بالمصافات، لا بالمكافات، ونسيبا له بالحب والوداد، لا بالآباء والاجداد، وحسيبا له بالصداقة والخلال، لا بالاعمام والاخوال، ورب بعيدين تقاربا بالوداد، وقريبين تباعدا بالاحقاد، والارواح جنود مجنّدة

ما تعارف منها ائتلف وما تناكر منها اختلف۔

فزعت الى الشيخ المولى، فمثلهما بان يشكى مظلمتى اولى، فقد قيل ان المناسبة فى الادب فوق المقاربة فى النسب فان رق مولانا لباك متفجع، وشاك متوجع، وحنان مرجم، ولهفان مسترجع، منّ علينا باسو المكلوم، ونصر المظلوم، فالمامول من المولى ان لا يألو جهدا فى ان يجازى ادام الله ايامه من ظلم بنقمة، ويواسى من اخلف المظلوم بنعمة، ويبقى ما كان ادرلى ولاخى لتربية ايتامه اسباغا لمنه و اتماما لانعامه۔

سر سید احمد خان مرحوم نے "آثار الصنادید" میں علامہ کا ایک خطبہ نقل کیا ہے۔ یہ خطبہ حضرت الاستاذ مولانا الاجمیری کے ہاتھ کا لکھا ہوا، رسالہ ثورة الہندیہ کے آخر میں میرے پاس بھی موجود ہے۔ اس کا کچھ اقتباس پیش ہے:۔

اما بعد فان الدنیا غرور، ما لها قرور، بل قرورها مرور، وظلها حرور، لا یوازی ھمومھا سرورها، ولا یوازن خیورها شرورها، ولا تتکافی معافاتها و آفاتها ولا تتادی افراحها و اتراحها، ولا محنها و راحها، ولا یتلافی سمومها نعیمها، و لا سمومها نسیمها، ولا ضنکها رخائها، ولا زعزعها رخائها تریاقها ثمال، و نقصانها کمال، عاقبة عافیتها اوصاب وحلوئها وسلوئها علاقم اوصاب، اولها حبور، واخرها ثبور، وصفائها غبار ولقائها غبور، واهلها بور، وقصورها قبور، کل من عمر فیها مرموس، وکل ما عمر فیها مطموس، وکل من الوری وان ثری، فان مصیره الی الثری، مبادیها امال ومنا، وعواقبها احبال ومنا، ما فیها صفو عیش الا و

ویکدرہ نوازل الاحداث وما علیہا من ذی نفس ونفس
الا وھبوہ منازل الاجداث۔

۵ ذی قعدہ ۱۲۶۱ھ کو مولانا حیدر علی فیض آبادی کو موصوف کی کتاب منتہی الکلام کے موصول ہونے اور اس کے مطالعہ کرنے کے بعد ایک طویل خط میں لکھتے ہیں۔ یہ کتاب مولانا نے ایک شیعی متبحر عالم سبحان علی خاں کے رسالہ مصنفہ ۱۲۴۷ھ کے جواب میں لکھی ہے۔ سنیوں کے دلائل قاہرہ اور براہین باہرہ اس میں درج ہیں۔ مولوی سبحان علی خاں سے مولانا اسمٰعیل شہید کے مناظرے بھی لکھنؤ میں رہے۔

کذلک استبشرت اذ منّ لہ المولی علی بارسال کتابہ فلثمت لثامہ، ورحّبت من اتی بہ، فیا لہا من نعمۃ وافیۃ، سرت فسرت موافاتہا ومنۃ کافیۃ اصطنعت فامتنعت مکافاتہا، فکان طلوعہ علیّ قبل تطلعی الیہ وطلاعی ما فیہ واطلاعی علیہ ابہج من تباشیر طلوع الصباح علی عاشق مہجور، وابلج من تباشیر طلوع الصباح فی غاسق دیجور، فاما ما حرر المولی الی رقہ من توقانہ الی العبد الذی کاتبہ باحسانہ وحنانہ، فکانما ھو صدا حنینی الی لقیانہ، فانی مذ طالعت کتابہ الموسوم بمنتہی الکلام، واطلعت علی ما فیہ من کلام، فی ما لہا من التیام، فی نحر کل نحر من اللئام، ورأسہ ان المولی لم یال جہدا فی تخریج روایاتہم، واجتہد جدا فی الارشاد والتنبیہ علی غوایاتہم، وامعان النظر لتبصیر عمایاتہم، وتصفح کتب علمائہم، لاعلام جہالاتہم ولم یصفح عن صفائح صحائفہم الی ان دل علی ضلالاتہم ونکی فی نحور نحاریرہم بما طعنوا فی تعاریرہم، وابکم اَلسِنَۃ دقاریرہم، بقلب

دقاریرھم، بردّ تقاریرھم، بل باقاریرھم، فاشجی اخلیائھم
المترفین باشجان من الاشجان والافکار، ولم یذر لدیھا تھم
الانکار سبیلا الی الانکار، ولم یدع لقال مجال اقال، بل غال
کل غال، اوغل فی العلم من ادغال، فتری کل مفتر مفترا، وکل
نکر منھم مستنکرا، لا ازال مشتاقا الی لقائہ، داعیا بطول بقائہ،
لاصلاح مفاسد المبتدعین، وفضوح مکائد المختدعین، و
قطعا لدابر المدابرین المبتدرین، وارغافا بالانوف المکابرین
المتکبرین، واما ما استکشف عنہ المولی الجلیل النبیل
من حال النزیل النذیل فانما ھو خال خال خال وخال، بل
شن بال مغطی بسربال، مبتلی بوبال، غیر ذی خطر وبال،
لایستاھل ان یخطر بخاطر وبال، ولا بان یسمابہ مبال، فانہ
انما ضیع عمرہ فی مراث ومبال، او توضیر وخبال، لایتوسم
فیہ من العلم علامۃ، وقصاری امرانہ تکلامۃ، یحفظ قصصا
واساطر مخترعۃ، محترعۃ مختلفۃ فی باب الامامۃ، وھی
اکاذیب موضوعۃ لاحادیث مرفوعۃ قد صاغھا صواغون،
طاغون، وتناقلھا راوون غاوون یرفون کذبات ویرونھا
قربات، وائمۃ الھدی یشھدون علیھم بانھم زنادقۃ و
شھادات الائمۃ لاشک صادقۃ ومن یقص اکاذیب الاسماء
واباطیل الاخبار، لایستاھل ان یعد من معاشر العلماء او
من قبیل الاحبار، بل ھو ادون حالا واخس مالا من
سمیر یونق فی سرد الملھیات لتنویم امیر ومن ھازھا نل
منطیق، یفتری خزعبلات بتلفیق، تعلیلا لقلب علیل، او
تطیبا لخاطر رفیق، وحاشا ان یکون ذلک من العلوم والمعارف
وغایتہ ان یعد من الملاھی والمعازف"

سلسلۂ تلمذ

علامہ نے سندِ حدیث حضرت شاہ عبدالقادر بن شاہ ولی اللہ بن شاہ عبدالرحیم محدث دہلوی سے حاصل کی۔ علامہ شاہ عبدالحق محدّث دہلوی صاحبِ لمعات و اشعۃ اللمعات کے بعد شاہ عبدالرحیم ہی کے خاندان سے یہ بابرکت علمِ حدیث ہندوستان میں پھیلا۔ ملک میں صدیوں سے معقولات کا دور دورہ تھا۔ شاہانِ وقت نے علم معقول کی سرپرستی تو کی تھی لیکن علوم نقلیہ کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ یہ شاہ صاحبان کا ہی طفیل ہے کہ آج ملک کا گوشہ گوشہ نورِ علم سے معمور ہے اور ہر وادی سے قال اللہ قال الرسول کی صدائیں اٹھ رہی ہیں اس دور میں کتب دینیہ کی کمیابی کا یہ عالم تھا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث کو تفسیر کبیر یا کسی دوسری کتابِ تفسیر و حدیث کے دیکھنے کی ضرورت پیش آتی تھی تو قلعۂ معلّٰی میں جانا پڑتا تھا۔ بخاری شریف جو اصح الکتب بعد کتاب اللہ کا درجہ رکھتی ہے اس کے نسخے بھی خال خال ہی پائے جاتے تھے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہ کیا ہے۔ عربی اشعار شاہ صاحب ہی کو دکھاتے تھے۔ سلسلۂ تلمذ یوں ہے:

سلسلۂ تلمّذ منقولات

۱۔ علامہ فضل حق خیرآبادی

۲۔ حضرت شاہ عبدالقادر محدث و حضرت شاہ عبدالعزیز محدث

۳۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث

۴۔ ابوالطاہر مدنی

۵۔ شیخ ابراہیم کردی

۶۔ احمد قشاشی

۷۔ الشمس محمد بن احمد الرملی

۸۔ الزین زکریا الانصاری

۹۔ حافظ ابن حجر العسقلانی

۱۰۔ ابراہیم بن احمد التنوخی المعروف بالبرہان الشامی

۱۱۔ الشیخ احمد بن ابی طالب الحجاج

۱۲۔ ابو عبداللہ الحسین بن مبارک الزبیدی البغدادی

۱۳۔ ابوالوقت عبدالاول بن عیسیٰ بن شعیب بن اسحاق السنجری الصوفی الہروی

۱۴۔ جمال الاسلام ابوالحسن عبدالرحمٰن بن محمد الداؤدی

۱۵۔ ابومحمد عبداللہ بن احمد بن حمویہ السرخسی ۱۶۔ ابوعبداللہ محمد بن یوسف مطر الفربری

۱۷۔ ابوعبداللہ محمد بن اسمٰعیل بن ابراہیم البخاری

سلسلۂ تلمذِ معقولات

۱۔ علامہ فضل حق خیرآبادی — المتوفی ۱۲۷۸ھ

۲۔ مولانا فضل امام خیرآبادی — 〃 ۱۲۴۰ھ

۳۔ مولانا عبدالواجد کرمانی خیرآبادی — المتوفی ۱۲۱۸ھ

۴۔ ملا محمد اعلم سندیلوی

۵۔ مولانا کمال الدین سہالوی واستاذالکل

ملا نظام الدین سہالوی فرنگی محلی — 〃 ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء

۶۔ ملا قطب الدین شہید سہالوی و — 〃 ۱۱۰۳ھ

ملا امان اللہ بنارسی — 〃 ۱۱۳۳ھ

۷۔ ملا دانیال جوراسی

۸۔ مولانا عبدالسلام دیوہی

۹۔ مولانا عبدالسلام لاہوری — 〃 ۱۰۳۷ھ

۱۰۔ امیر فتح اللہ شیرازی — 〃 ۹۹۷ھ

مولانا دانیال جوراسی وغیرہم کا سلسلہ علامہ جلال الدین محمد اسعد محقق دوانی المتوفی ۱۵۰۲ء (زمانۂ سلطان ابوسعید) صاحب شرح ہیاکل وحاشیہ شرح تجرید تک اور ان سے

---

[۱] علامہ خیرآبادی کے سلسلۂ اساتذہ کے اکبری عہد تک کے حالات مختصراً درج کئے جاتے ہیں۔ والد ماجد مولانا فضل امام اور ان کے استاد مولانا عبدالواجد کرمانی خیرآبادی کا ذکر اپنے مقام پر گزر چکا ہے۔ مولانا کرمانی کے استاد ملا اعلم سندیلوی اپنے عہد کے امام فن تھے تحصیل علم کے بعد دہلی پہنچے۔ محمد شاہ بادشاہ کے مقرب شاہ باسطہ کے ذریعہ دربار تک رسائی چاہی۔ شاہ باسطہ نے امتحاناً اپنے بھتیجے سے مناظرہ کرایا۔ کافی بحث ومباحثہ کے بعد مخالف کو زیر کر لیا اور جائے قیام پر واپس آکر عہد کیا کہ کبھی دنیاوی حاجت کسی کے سامنے پیش نہ کریں گے۔ چار روز رہ کر وطن مالوف سندیلہ آگئے اور وہیں متوکلانہ زندگی بسر کی۔ حاشیہ صدرا، رسالہ تشکیک، تعلیقات بر میر زاہد ملا جلال، حاشیہ دائرہ، قسط العبیب تصانیف یادگار ہیں۔ وفات کے وقت تلامذہ واحباب کو بلا کر اپنے مذہب حنفی طریق چشتی اور عقائد نسفی پر گواہ بنایا۔ یہ شعر پڑھا ؎

مابین دو حرف آمد ایں راہ — اللہ محمد محمد اللہ

(البقیہ بر صفحۂ آئندہ)

سید شریف ابوالحسن علی علامہ جرجانی المولود ۷۴۰ھ مطابق ۱۳۳۹ء المتوفی ۸۱۶ھ مطابق ۱۴۱۳ء تک پہنچتا ہے۔ علامہ جرجانی سے شیخ الرئیس بوعلی بن سینا المتوفی ۴۲۷ھ مطابق ۱۰۳۷ء تک

(بقیہ صفحہ گذشتہ) اس کے بعد کلمۂ طیبہ پڑھ کر ۴۵ سال کی عمر میں داخلِ حلقۂ بقا ہوئے۔ شاگرد پر بڑی شفقت کرتے تھے۔ اسی شفقت نے شاگرد کو مرتبۂ کمال تک پہنچایا تھا۔ احاطۂ درگاہ مخدوم شیخ سعدالدین خیرآبادی میں مدفون ہیں ملا اعلم سندیلوی کے استاد مولانا شیخ کمال الدین، ملا نظام الدین سہالوی کے بنی اعمام سے ہیں۔ فتح پور میں (جو سہالی سے تھوڑے سے فاصلہ پر واقع ہے) مخدوم زادگان کے یہاں شادی کی۔ اسی جگہ قاضی بھی ہوئے۔ ان دو وجوہ سے وہیں اقامت گزیں ہو گئے۔ ملا نظام الدین کے ابتدا تا آخر شاگرد تھے۔ صاحب مآثر الکرام کے زمانے میں حیات تھے۔ نہایت آب و تاب کے ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا۔ علم کلام میں العروۃ الوثقیٰ اور حاشیہ شرح عقائد جلالیہ تصانیف سے ہیں۔ ملا اعلم نے ملا نظام الدین سے بھی پڑھا ہے۔

ان دونوں بزرگوں کے استاد ملا نظام الدین سہالوی صاحب درس نظامیہ تھے۔ پورب کے قصبات میں تحصیل علم کر کے جناب شیخ غلام نقشبند لکھنوی سے بقیہ تحصیلی کتب پڑھیں، لکھنؤ ہی میں مقیم ہو گئے۔ تدریس و تصنیف میں مشغول ہو کر بڑی شہرت و عزت کے مالک بنے۔ فارغ التحصیل علماء حاضر ہو کر شریک حلقۂ درس ہوتے۔ حضرت مخدوم شیخ عبدالرزاق ہانسوی سے بیعت ہوئے۔ حاشیہ صدرا اور شرح مسلم الثبوت تصنیف کیں۔ صاحب مآثر الکرام سے ۱۹ ذی الحجہ ۱۱۴۸ھ کو لکھنؤ میں ملاقات ہوئی تھی۔ ۹ رجمادی الاولیٰ ۱۱۶۱ھ کو سفرِ آخرت اختیار فرمایا۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے تاریخ کہی ہے ؎

عالم کامل امام عصر استاذ جہاں   طائر روحش بہ سیر جنت الماوی شتافت
سالِ تاریخ وفاتِ او بطور تعمیہ   گفتہ شد ملا نظام الدین دل فردوس تفت

نصابِ درس نظامیہ آپ ہی کی طرف منسوب ہے۔ فرنگی محل لکھنؤ کے خاندانِ علماء کے آپ ہی مورثِ اعلیٰ ہیں۔ ملا نظام الدین کے والد اور استاد ملا قطب الدین شہید سہالوی تھے۔ سہالی مضافات لکھنؤ میں شیخ زادگان کی قدیم بستی ہے۔ حضرت ابو ایوب انصاری مشہور میزبانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد سے ہیں اسی بستی میں عثمانی شیخ زادگان بھی آباد تھے۔ ملا دانیال جوراسی شاگرد ملا عبدالسلام دیوی اور قاضی گھاسی سے تلمذ حاصل ہے۔ آخر الذکر ہی سے بیعت بھی ہوئے تھے۔ یہ شیخ محب اللہ الٰہ آبادی کے تلمیذ و خلیفہ تھے۔ ملا شہید کا دریائے فیض پورے زور شور کے ساتھ جاری رہا۔ اکثر علماء ہندوستان کا سلسلہ موصوف تک پہنچتا ہے۔ شیخ زادگان عثمانی نے شرکتِ زمینداری کی نزاع کی وجہ سے اسد اللہ خان زادہ بہنتی پور سے ساز باز کر کے ملا قطب الدین پر شبخون مار کر شربتِ شہادت نوش کرایا۔ ۱۱۰۳ھ میں یہ حادثہ ہوا۔ قتل کے بعد مکان میں آگ بھی لگا دی۔ اثاث البیت کے ساتھ ملا شہید کی لاجواب تصنیف حاشیہ شرح عقائد دوانی بھی نذرِ آتش ہو گئی۔ "قطب عالم شد شہید اکبر" ۱۱۰۳ھ مصرعِ تاریخ ہے۔

ملا نظام الدین کے دوسرے استاذ حافظ ملا امان اللہ بن نور اللہ بن حسین بنارسی ہیں۔ معقول و منقول کے امام اور علم اصولِ فقہ میں شہرتِ تام رکھتے تھے۔ بیضاوی، عضدی، توضیح، شرح مواقف، شرح حکمۃ العین، شرح عقائد دوانی، رشیدیہ پر حواشی لکھے۔ محکم الاصول کے نام سے اپنی ہی تصنیف علمِ اصول کی شرح بھی لکھی۔ مسئلہ حدوث دہری پر ملا محمود جونپوری نے میر باقر داماد استرآبادی پر معارضہ کیا۔ اس پر محاکمہ لکھا۔ ملا محب اللہ بہاری صاحب سلم و مسلم جب لکھنؤ میں قاضی تھے، ملا بنارسی صدر بلدہ تھے۔ علمی مباحثہ بھی دونوں میں رہا۔ حضرت شیخ خوب اللہ الٰہ آبادی سے سلسلۂ نقشبندیہ میں بیعت ہوئے۔ ۱۱۳۳ھ میں انتقال ہوا۔ بنارس میں مدفون ہیں۔ ملا نظام الدین کے دادا استاد مولانا دانیال جوراسی تھے۔ ان کے استاد ملا عبدالسلام دیوی تھے۔ موصوف نے تحصیلِ علم کی منزلیں مکان پر طے کرنے کے بعد لاہور پہنچ کر اپنے ہمنام ملا عبدالسلام لاہوری کی خدمت میں زندگی گزاری۔ جتنا پڑھا تھا استاد سے اس کی تصدیق کی۔ شاہجہان بادشاہ نے منصبِ افتاءِ عسکر عطا کیا۔ آخر میں لاہور پہنچ کر سلسلۂ فیض جاری کیا۔ تفسیر بیضاوی پر حاشیہ لکھا۔

ملا عبدالسلام لاہوری معدنِ عقلیات و نقلیات تھے۔ فنونِ ادب، فقہ اور اصول میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ تفسیر بیضاوی پر حاشیہ بھی لکھا۔ ۹۰ سال کی عمر میں ۱۰۳۷ھ میں انتقال ہوا۔

موصوف امیر فتح اللہ شیرازی المتوفی ۹۹۷ھ شاگرد خواجہ جمال الدین محمود و مولانا کمال الدین شروانی و مولانا کرد و میر غیاث الدین منصور شیرازی کے تلمو شاگرد تھے۔ (امیر موصوف کا ذکر پہلے گزر چکا ہے)

ان سے معلمِ ثانی ابونصر فارابی المتوفی ۳۴۳ھ مطابق ۹۵۴ء تک ، معلمِ ثانی سے ارسطاطلیس یونانی
استادِ سکندر ذوالقرنین تک اور ارسطو سے حکیمِ ثانی فیثاغورس یونانی شاگرد اصحابِ حضرت سلیمان
علیہ السلام تک اور ان سے ادریس علیہ السلام صاحبِ معجزاتِ منطقیہ تک پہنچتا ہے۔ ان میں
سے ہر ایک اپنے وقت کا امام اور یگانۂ روزگار تھا اور حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ارسطو خاتمِ حکماء
مجتہدینِ یونان تھا اسی طرح علامہ فضلِ حق خاتمِ حکماءِ مجتہدینِ ہندوستان تھے۔ اور جس طرح ارسطو
کے بعد سارے حکماءِ یونان اسی کے خوشہ چین بنے اسی طرح فضلِ حق کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند
ہو کر مقلدین کا سلسلہ جاری ہوا اور اب تو اس دورِ کساد بازاریٔ علومِ قدیمہ اور ناقدریٔ شاہان و
امراء میں مجتہد درکنار کسی کامل مقلّد کا پیدا ہونا بھی دشوار ہے۔

تصانیف

علامہ نے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ ہمیشہ جاری رکھا۔ خاص اور اہم
مجبوریوں کے سوا کبھی اس سے تساہل نہ برتا۔ علامہ کی تصانیف درجنوں ہیں جن میں سے مشہور
حسبِ ذیل ہیں :-

۱۔ الجنس الغالی شرح جواہر العالی
۲۔ حاشیۂ افق المبین[۱]
۳۔ حاشیۂ تلخیص الشفا
۴۔ حاشیۂ شرح سلّم قاضی مبارک
۵۔ الہدیۃ السعیدیہ
۶۔ رسالہ تشکیکِ ماہیات
۷۔ رسالہ کلّی طبعی
۸۔ رسالہ علم و معلوم
۹۔ الروض المجود فی تحقیق حقیقۃ الوجود
۱۰۔ رسالہ قاطیغوریاس
۱۱۔ رسالہ تحقیق حقیقۃ الاجسام
۱۲۔ رسالہ ثورۃ الہندیہ
۱۳۔ قصائد فتنۃ الہند
۱۴۔ مجموعۃ القصائد
۱۵۔ امتناع النظیر
۱۶۔ تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ

---

[۱] یہ حاشیہ علامہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ۱۶۰/۵ نمبر پر سبحان اللہ اورنٹیل لائبریری محفوظہ، لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی علیگڈھ میں محفوظ ہے۔

چار پانچ مصنفات کے سوا سب غیر مطبوعہ ہیں۔ ہدیہ سعیدیہ اور حاشیہ سلم قاضی مبارک[1] کی جو شان ہے اس سے طلبا، و علماء بخوبی واقف ہیں۔ ہدیہ سعیدیہ آجتک مدارسِ ہند و بیرونِ ہند میں داخلِ نصاب ہے۔ ہندستان میں متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، مصر میں بھی چھپ چکی ہے۔ خلف الرشید مولانا عبدالحق کو ریزیڈنسی آتے جاتے وقت ہاتھی یا پالکی میں جو سبق دئے جاتے تھے ہدیہ سعیدیہ انہیں کا مجموعہ ہے۔ علامہ روز ایک سبق تحریر فرما لیتے تھے وہی راستہ میں صاحبزادے کو پڑھا دیتے تھے، فلکیات تک یہی سلسلہ رہا۔ جب معتدبہ حصہ ہو گیا تو تلامذہ نے کتابی شکل دینے پر اصرار کیا۔ علامہ نے طلبہ کی آرزوؤں کو پامال نہ کرتے ہوتے تصنیفی حیثیت سے قلم اٹھایا۔ اہلِ علم مایعم الاجسام اور عنصریات کے اس فرق کو بخوبی محسوس کر سکتے ہیں۔ فلکیات تک یہ معلوم ہوتا ہے کہ مبتدیوں کے لئے کتاب لکھی گئی ہے لیکن عنصریات میں شہبازِ قلم کی بلند پروازی کچھ اور ہی کہہ رہی ہے۔ سعادت مند فرزند کی مناسبت ہی سے ہدیہ سعیدیہ نام بھی رکھا گیا ہے۔ نواب محمد سعید خان والیٔ رام پور کے نام کا لحاظ بھی ضمناً پیشِ نظر تھا۔ اس کتاب میں زمین کی حرکت پر کافی دلائل قائم کر کے موجودہ سائنس کی تحقیقات کو غلط ثابت کیا ہے۔

اس دور میں زمین کی گردش کا مسئلہ موجودہ تحقیق کی رو سے اتنا عام ہو گیا ہے کہ اس کے خلاف آواز اٹھانا اپنی نادانی کا اقرار کرنا ہے۔ اسکول کے ابتدائی طالب علم سے لے کر یونیورسٹی کے گریجویٹ اور یورپ کے بڑے سے بڑے سائنسدان تک سب اسی رنگ میں رنگے نظر آئیں گے۔

اہلِ مغرب جو کچھ کہتے ہیں یہ ان کی تحقیق ہے لیکن ہندستان کورانہ تقلید ہی میں مبتلا ہے علامہ فضل حق کے کانوں میں یہ صدا پہنچی۔ انگریزی اقتدار ملک میں اپنے قدم جما چکا تھا۔ انگلش علوم و فلسفہ کی داغ بیل پڑ چکی تھی، موصوف کے لئے یہ کوئی نئی آواز نہ تھی۔ قدماء فلسفہ میں ایک گروہ

---

[1] قاضی مبارک بن قاضی دائم ادہمی گوپاموی سلطان ابراہیم بن ادہم کی اولاد سے ہیں، ابتدائی تعلیم اپنے والد مولانا دائم ادہمی اور قاضی شہاب الدین گوپاموی سے پائی۔ مولوی حکیم عبدالحی مرحوم نزہتہ الخواطر میں لکھتے ہیں " وتلقی العلم فی عصرہ عن القاضی شہاب الدین الکوفاموی " خیرآباد جاکر حاجی محمد عفت اللہ محدث سے سند حدیث حاصل کی، اکبرآباد جاکر میر زاہد بن سید اسلم ہروی سے معقولات کی تکمیل کی۔ مولانا فضل امام خیرآبادی آمد نامہ میں لکھتے ہیں " قاضی مبارک ذہن رسا و طبیعت عالی داشت و در موعامہ دانی مشہور بود اول کسیکہ حاشیہ بر میر زاہد نوشت و سلم را شرح کرد او بود۔ تتبع طرز میر باقر داماد است در عبارت۔ شرح سلم پیروی مسر اختیار کردہ۔" ۱۱۶۲ھ میں بعہد احمد شاہ بادشاہ دہلی میں انتقال ہوا۔ " حسن خاتمہ " مادہ تاریخ ہے۔ جنازہ گوپامؤ لاکر جد امجد کے مدرسہ میں دفن کئے گئے۔ قاضی محمد امیر اور قاضی حکیم علی خان دو صاحبزادے تھے۔ آخر الذکر اہل علم سے تھے۔

اس کا قائل ہو چکا تھا جو اس دور میں ناقابلِ التفات سمجھا گیا تھا صدیوں کے بعد پھر یورپ کی سرزمین سے یہ آواز بلند ہوئی چونکہ علامہ کے نزدیک یہ مسلک غلط تھا، مرعوبیت کے تمام قید و بند توڑ کر ہدیہ سعیدیہ میں شرح و بسط کے ساتھ حرکتِ زمین کو باطل کیا ہے اور مخالفین کے دلائل کو پاش پاش کر دیا ہے۔ اس بحث کو علامہ نے حسبِ ذیل الفاظ میں شروع کیا ہے :۔

" الثالث فهو مما ذهب اليه قوم من قدماء اليونانيين و اختاره من في زماننا من اهل الفرنج فهم يزعمون ان الارض تتحرك بالاستدارة حول المركز من المغرب الى المشرق وهى الحركة اليومية التى بسببها ترى الكواكب طالعة و غاربة فيظهر من جانب المشرق من الكواكب ما كان محجوبا عنا بعد بتها الى ان قال وهذا الرأى ايضا باطل بوجوه الخ "

(ہدیہ سعیدیہ)

حاشیۂ شرح سلّم قاضی مبارک کی اہمیت اس کے معرکۃ الآراء مباحث کی فہرست سے کیجیے :۔

۱۔ تحقیق لفظِ سبحٰن

۲۔ علم باری میں تمام مذاہب پر تنقید اور احقاق مذہبِ صوفیہ۔

۳۔ جعل بسیط کا احقاق

۴۔ تحقیق معنیٔ بحث و اتفاق

۵۔ بحث مقدمۃ العلم و مقدمۃ الکتاب

۶۔ تحقیق مقسم تصور و تصدیق

۷۔ بیان حصول الاشیاء بانفسھا و باشباحھا

۸۔ علم کے تیرہ مذاہب کا بیان

۹۔ تحقیق متعلق تصدیق

۱۰۔ بحث اجتماعِ مثلین

۱۱۔ بارہ مذاہب معلوم کا بیان

۱۲۔ بداہت و نظریت کے صفت علم و معلوم ہونے کی تحقیق

۱۳۔ تحقیق موضوعِ علم

۱۴۔ معقول ثانی کی لاجواب بحث

۱۵۔ تحقیق ظرفِ اتصاف

۱۶۔ تحقیق حیثیتِ موضوع

۱۷۔ بیان امہاتِ مطالب

۱۸۔ تحقیق ہل

۱۹۔ تحقیق قضیۂ زید معدوم

۲۰۔ نسبتِ تامہ کے علاوہ قضیہ میں دوسری نسبت کا بیان۔

۲۱۔ تعداد اجزاءِ قضیہ
۲۲۔ بیان موردِ قسمۃ
۲۳۔ بحث مفصل بابت متعلق تصدیق
۲۴۔ بحث وجودِ ذہنی اور شبہات کے جوابات
۲۵۔ جاعل کی طرف احتیاج کی علت امکان ہے یا حدوث۔
۲۶۔ بحث کلی طبعی

جزیرۂ انڈمان میں بعض اسیرِ فرنگ علماء نے دریافت کیا کہ ہندستان میں کیا یادگار چھوڑی ہے؟ فرمایا دو یادگاریں چھوڑ آیا ہوں ایک حاشیۂ شرح سلم قاضی مبارک اور دوسری یادگار برخوردار عبدالحق۔ اس جملہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ساری تصانیف میں حاشیۂ قاضی پر علّامہ کو کتنا فخر تھا۔ اور ساری اولاد میں مولانا عبدالحق پر کتنا ناز تھا۔

کامل باپ کے کامل بیٹے کا انداز بھی دیکھ لیجئے۔ علامہ کے حاشیۂ قاضی کے بعض مسائل کی تشریح کے لئے مولانا عبدالحق سے اصرار کیا گیا۔ مولانا نے ایک ضخیم حاشیہ از سرِنو لکھ ڈالا (جو مدت ہوئی مولانا حکیم برکات احمد صاحب ٹونکی نے چھپوایا تھا) لیکن علامہ کے حاشیہ پر قلم اٹھانا سوءِ ادبی میں داخل سمجھا۔ اسی طرح نواب صاحب رامپور کے شدید اصرار پر علامہ کے نامکمل حاشیۂ افق المبین کی تکمیل سے گریز کرتے ہوئے فرمایا :۔

"یہ ہو سکتا ہے کہ حاشیۂ قاضی کی طرح دوسرا حاشیۂ افق المبین بھی لکھ دوں
لیکن اس ہیں اضافہ ریشم میں ٹاٹ کا پیوند لگانا ہے۔"

ویسے تو مولانا عبدالحق کی قابلیت کا اندازہ اس سے لگائیے۔ مولوی حاجی ظہیر احمد فاروقی خیرآبادی کا بیان ہے کہ میں نے مولوی عبدالعزیز اور لالو ملازم مولانا عبدالحق سے سنا ہے کہ جب علّامہ قاضی کا حاشیہ تصنیف فرمارہے تھے تو ایک روز کسی ضرورت سے اٹھ کر کاغذات یونہی چھوڑ کر چلے گئے۔ مولانا عبدالحق جن کی عمر اس وقت ۱۴ سال تھی باپ کے کمرے میں داخل ہوئے اور عبارت کے آگے ایک صفحہ اپنے قلم سے تصنیف کر گئے۔ جب علامہ نے آکر دیکھا تو دریافت کیا کہ کیا ابن میاں کمرے میں آئے تھے؟ معلوم ہوا کہ آئے تھے۔ وہ صفحہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اس صفحہ کو بجنسہٖ رہنے

۱؎ یہ حاشیہ اب نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ جب چھپا تھا تو دو روپیہ قیمت تھی، جنگ سے قبل پندرہ بیس روپیہ میں مل جانا بھی غنیمت سمجھا جاتا تھا۔ خود میں نے اطلاع ملنے پر ۴۳ء میں دہلی سے بذریعہ تار پچیس روپیہ میں منگایا تھا اور اب تو ملنا ہی دشوار ہے۔

دیا (یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کس مقام کی عبارت ہے) اس حاشیۂ قاضی سے حضرت الاستاذ مولانا اجمیری مرحوم کو عشق تھا۔ سفر و حضر ہر جگہ اپنے ساتھ رکھتے تھے اور وقتاً فوقتاً مطالعہ کرتے رہتے تھے۔

مولانا حکیم احمد علی خیر آبادی فرماتے ہیں کہ ایامِ طالب علمی میں قاضی مبارک کا جتنا سبق ہم پڑھتے تھے اس کے متعلق پورا حاشیہ دیکھ ڈالتے تھے خواہ کتنا ہی وقت صرف کرنا پڑتا بعض دن آٹھ آٹھ ورق دیکھنا پڑتے تھے۔

اس حاشیہ کی خوبی یہ ہے کہ مسلمانوں نے جب سے فلسفۂ یونان کو اپنایا ہے اسوقت سے لے کر علامہ کے عہد تک متقدمین و متاخرین و معاصرین کے درمیان جو مسائل مناظرہ و مکالمہ و مباحثہ کا اکھاڑا بنے رہے ہیں ان پر مجتہدانہ انداز میں تبصرہ فرمایا گیا ہے جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علم و تحقیق کا دریا موجیں مار رہا ہے بعض علماء کی رائے ہے کہ یہ حاشیہ علوم معقولات کا فتاوے ہے۔

مولانا عبد الحق فرمایا کرتے تھے کہ میرے والد ماجد (علامہ) اور مولانا عبد العلی بحر العلوم فرنگی محلی بن ملا نظام الدین سہالوی صاحب درسِ نظامیہ کے درمیان "عام خاص من وجہ" کی نسبت ہے معقولات میں تو مادۂ اجتماع ہے، فقہ و ادب میں مادۂ افتراق پایا جاتا ہے۔ اول کے ماہر مولانا بحر العلوم اور ثانی کے والد ماجد تھے۔

علامہ کی تصانیف سے خاندانی طریق تعلیم اور طرزِ تدریس صاف نظر آتا ہے۔ عام طور سے اساتذہ کا یہ طریقہ ہوتا ہے کہ طالب علم سے عبارت پڑھوا کر تحت اللفظ ترجمہ کرا دیا، پھر کچھ مطلب توضیح کے لئے بتا دیا گیا۔ حضرت العلامہ مفتی محمد لطف اللہ لکھنوی علیگڈھی کے متعلق مشہور ہے کہ ترجمہ ایسا کراتے تھے کہ مطلب سبق ادا ہونے کے ساتھ ساتھ سارے اعتراضات و شبہات بھی دفع ہو جایا کرتے تھے۔

مولانا عبد الحق ایک بار حیدر آباد میں مفتی صاحب کی ملاقات کو پہنچے تو سلسلۂ درس جاری تھا مفتی صاحب کے اس کمال کو دیکھ کر بے حد تعریف کی۔

سلسلۂ خیر آباد میں عبارت پڑھوا کر خلاصۂ مطلب بیان کیا جاتا ہے اس کے بعد ترجمہ کرا کے لفظی مباحث کے بجائے تحقیقِ مسائل پر زور دیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ زیادہ نافع اور باعثِ تسکینِ خاطر

طلبہ ہے۔ اسی طرزِ تعلیم اور شفقت کا یہ نتیجہ ہے کہ شاگرد اپنے استاد کا عاشق وفدا کار نظر آتا ہے ایک جاں نثار مرید کو اپنے پیر سے اتنی ہی عقیدت ہو سکتی ہے جتنی سلسلۂ خیرآباد کے تلامذہ کو اپنے اساتذہ سے ہوا کرتی ہے۔ علامہ کے شاگرد رشید مولانا ہدایت اللہ خان جونپوری (استاد مولانا سید سلیمان اشرف مرحوم سابق صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڑھ و مولانا امجد علی اعظمی) کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ استاد زادہ مولانا عبد الحق کا ملازم وخادم لالو جب کبھی جونپور پہنچ جاتا تھا اور مُلّانا اس کی آواز سن پاتے تھے تو پیرانہ سالی اور ضعف بصارت کے باوجود تعظیم کو کھڑے ہو جاتے۔ کھانا ساتھ کھلاتے اور سفر خرچ وغیرہ دیکر عزت و مسرت کے ساتھ رخصت فرماتے۔

مولانا حکیم برکات احمد بہاری ٹونکی طبیبِ خاص ریاست ٹونک (استاذ حضرت الاستاذ مولانا اجمیری مرحوم) کو زمانۂ تعلیم و قیامِ خیرآباد میں اپنے استاذِ گرامی مولانا محمد عبد الحق کے خدام کو بسا اوقات پورے مہینے کے مصارف کی رقم نذر کر دینا پڑتی تھی اور ٹونک سے دوسری بار روپیہ منگانا پڑتا تھا۔ مولانا حکیم دائم علی صاحب بہاری ریاست کے طبیبِ خاص تھے اور سو روپیہ ماہانہ مصارف کے لئے بیٹے کو روانہ کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اکثر رقمیں آتی رہتی تھیں۔

علامہ خیرآباد کے رؤسا میں سے تھے۔ انقلاب، ۱۸۵۷ء کی شورش میں بغاوت کے الزام میں سزائے عبور دریائے شور کے ساتھ ضبطیٔ جائداد بھی ہو چکی تھی۔ مولانا عبد الحق چونکہ رئیس بن رئیس بن رئیس تھے اور ناز و نعم کی گود میں پرورش پائی تھی، ہاتھی اور پالکی پر بیٹھ کر حصولِ علم کیا تھا، شاہزادگانِ دہلی کے ساتھ قلعۂ معلّٰی میں کھیلے کودے تھے، بے سروسامانی کے باوجود شاہانہ دماغ اور امیرانہ شان باقی تھی۔ خدام اور حلقہ بگوشوں کا اجتماع رہتا تھا، خادم جس طالب علم سے ناراض ہو جاتے مولانا سے شکایت کر دیتے۔ مولانا مغلوب الغضب بھی تھے فوراً حلقۂ درس سے نکال دیتے اور شرکتِ درس کی اجازت معافی تک نہ ہوتی تھی۔ عرب و عجم کے قدردان اور شوقین طلبہ جو ایک سبق کی آرزو میں ہفتے اور مہینے گذار دیتے تھے یہ کیسے گوارا کر سکتے تھے کہ اس نعمتِ عظمٰی سے ایک دن بھی محروم رہیں۔ حسبِ استطاعت خادم متعلق کو خوش کرتے وہ سفارش کر کے عفوِ تقصیر کرا تا مولانا برکات احمد چونکہ امارت میں دوسرے طلبہ سے ممتاز تھے اس لئے ان کے لئے یہ مصیبت آئے دن آتی رہتی تھی۔

یہ دو ایک مثالیں یہ سمجھانے کے لئے پیش کی ہیں کہ اس خاندان کا طریقۂ تعلیم ہی ایسا تھا کہ شاگرد گرویدہ اور رہبر بے دام ہو جاتا تھا۔ قدر دانانِ علم ہزار ذلتوں کے باوجود بھی اس آستانۂ عالیہ سے روگردانی کفرِ تعلیمی سمجھتے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ دوسری جگہ یہ تسکینِ خاطر اور اطمینانِ قلب حاصل ہو بھی نہ سکتا تھا۔

بحث و مناظرہ

ایرانی مجتہد سے علامہ کے صغرسنی میں مباحثہ کا حال مختصراً گزر چکا ہے۔ قدرت کی طرف سے ذہن رسا اور طبع وقّاد لے کر دنیا میں آئے تھے۔ جس نے تیرہ برس کی عمر میں تمام علوم درسیہ اور حفظِ قرآن مجید سے فارغ ہو کر مسندِ درس کو رونق بخشنا شروع کر دی ہو اس کی ذہانت اور مافوق الفطرت طباعی کا کیا ٹھکانا ہو سکتا ہے۔ یہ عمر تو بچوں کے کھیلنے کودنے کی ہوتی ہے۔ غلامستانِ ہند میں اس عمر کے بچے گلی کوچوں میں شور مچاتے، گالیاں بکتے اور کیچڑ اچھالتے نظر آتے ہیں خصوصاً نونہالانِ قومِ مسلم کی حالت ہر مقام پر دیدنی ہے۔ اس قسم کی تمام بیہودگیوں میں اختراع و ایجاد کے وہ جوہر دیکھنے میں روزانہ آتے رہتے ہیں کہ توبہ ہی بھلی!

ان نونہالانِ عزیز کو کیا معلوم کہ اسی غلام ملک میں دورِ اقبال و عروج میں نہیں عہدِ زوال و پستی میں ایسے بچے بھی پیدا ہو چکے ہیں جو تمام سامانِ عیش و عشرت اور جاہ و حشم کی موجودگی میں بھی اسلامی شان اور آبائی آن بان کو چاند لگاتے رہے اور فلکِ علم و عمل پر شمس و قمر بن کر چمکا کئے پچھلی صدی میں علامہ اور موجودہ صدی میں مولانا ابوالکلام آزاد[ع] اس کی روشن و تابناک مثالیں ہیں ؎

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

آخر الذکر اگرچہ ہندستان کے بجائے مکہ مکرمہ میں ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے لیکن ہیں تو ہندی نژاد اور پھر ہوش و آگہی کے زمانے میں ہندستان آ بھی گئے تھے۔ جوانی بھی یہیں گزری اور اب بڑھاپا بھی یہیں گزر رہا ہے اسی لئے ہندستانی ہی کہا اور سمجھا جا سکتا ہے۔

علامہ کا دور اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کا دور تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا راج قائم ہو چکا تھا ہندستان بیرونی طاقت کا غلام بن چکا تھا بادشاہِ دہلی کی حالت کٹھ پتلی کی حیثیت رکھتی تھی۔

ع مسٹر مودی شاہ احمد رضا بریلوی یا مولانا حکیم سید برکات احمد ٹونکی کا نام دیا ہوتا ، ابوالکلام کو علامہ کے مقابلے کھڑا کرنا ظلم عظیم ہے محمد موسیٰ عفی عنہ

قوموں کے عروج و زوال کی یہ داستان بھی کتنی المناک ہے کہ زمانۂ اوج و بلندی میں بے شمار خوبیاں پیدا ہو جایا کرتی ہیں اور دورِ زوال میں خوبیوں کا پیدا ہونا تو درکنار جو محاسن مذہبی و قومی و ملکی خصوصیات کا درجہ رکھتے ہیں وہ یا تو فنا ہو جاتے ہیں یا ان کی شکل و صورت مسخ ہو جاتی ہے۔ برائیاں جونک بن کر چمٹ جاتی ہیں اس سے اولوالعزم پیغمبروں کی امتیں بھی محفوظ نہ رہ سکی ہیں۔

دو جلیل القدر پیغمبروں کی امت کی تاریخ ہمارے سامنے ہے قومِ موسیٰ اور قومِ ابراہیم علیہما وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام کے کردار و اعمال و کردار عہدِ نکبت و مذلّت میں کتنے بدل چکے تھے۔ ان دونوں برگزیدہ ہستیوں نے اپنی امتوں کے دماغوں میں خدا پرستی کی تعلیم راسخ کردی تھی۔ بڑی بڑی مصیبتیں اٹھا کر، آلام کا شکار ہو کر فرعون و نمرود جیسے عویدارانِ الوہیّت اور جابر و ظالم بادشاہوں کا مقابلہ کرکے قوموں کے سامنے زندہ مثال اور نمونہ بنے تھے۔ جو چیز تکلیف و دشواری سے حاصل ہوتی ہے قابلِ وقعت اور مستحقِ عزت ہوا کرتی ہے۔ جب عہدِ اقبال ختم ہو کر بنی اسرائیل اور قومِ ابراہیم پر دورِ ادبار مسلط ہوا تو خدا پرستی کی جگہ گوسالہ پرستی اور بت پرستی نے لے لی۔ محاسنِ اخلاق کے بجائے بدکرداری اور سوءِ اعمالی نے قبضہ جمایا۔ خدائی خطاب اِنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعَالَمِیْنَ سلب کرکے ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ کا لقب دیدیا گیا۔ انسان کے لئے سب سے بڑی تباہی غلامی ہے۔ یہ غلامی کسی اپنی جیسے انسان کی ہو یا شہوت رانی و ہوس پرستی کی۔

عالمگیر اورنگ زیب نور اللہ مرقدہ کے بعد شاہانِ مغلیہ بھی عیش و ہوس پرستی کے غلام بن چکے تھے۔

اس مجاہد و متقی بادشاہ کے پوتے جہاندار شاہ کا تختِ سلطنت پر بیٹھ کر سب سے پہلا کارنامہ یہ تھا کہ اپنی آشنا رنڈی کے بھائی کو دہلی کا کوتوال بنا کر شرفاء کے دلوں کو چھلنی کر ڈالا پر پوتے محمد شاہ رنگیلے کی رنگ رلیوں سے سارا زمانہ واقف ہے۔ ۱۱۵۱ھ مطابق ۱۷۳۷ء میں:

"شامتِ اعمالِ ما ایں صورتِ نادر گرفت"

نادر شاہ درّانی کا قتلِ عام بھی اس کا شاہد ہے۔

ان سب سے مجاہدانہ جذبہ اور جفاکشی کا حوصلہ جاتا رہا تھا۔ عیش و عشرت کی گرم بازاری نے امورِ سلطنت سے غافل بنا دیا تھا۔ طوائف الملوکی کا دور دورہ ہو جانا قدرتی امر تھا اف اللہ

لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسہم کا فرمانِ صریح اپنا رنگ لایا۔ ایک غلامی برضا و رغبت اختیار کرلی تھی دوسری انسانی وغیر ملکی غلامی اس کے پاداش میں بہ جبر و اکراہ سر پر مسلط کر دی گئی۔ اس طرح صدیوں کی جمی جمائی سلطنت اور حاکمانہ عزت و سطوت کا ۱۷۵۷ء میں خاتمہ ہو گیا جبکہ انگریزوں نے پلاسی کا میدان عیاری یا بہادری سے جیت کر بنگالہ میں قدم جما لئے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد شاہزادہ عالی گوہر عرف شاہ عالم سے صوبۂ بہار و بنگال کی دیوانی بمعاوضہ اکیس لاکھ روپیہ سالانہ حاصل کرلی جس کی رُو سے الٰہ آباد سے بنگال و آسام کے آخری کنارے تک انگریزی تسلط باقاعدہ تسلیم کرلیا گیا۔ میر جعفر نے بھی اس سلسلے میں اپنا پارٹ خوب ادا کیا۔

۱۸۰۳ء میں رہی سہی عزت و شان بھی ختم ہو گئی جبکہ لارڈ لیک نے دہلی پر حملہ کرکے شاہ عالم کو گرفتار کرنے کے بعد ایک شرمناک معاہدہ کیا جس کی رُو سے شاہِ دہلی کی حکومت شہر و قلعہ اور اطرافِ دہلی تا قطب صاحب، میں محدود کرکے مسلمانوں کے حقوق (فارسی زبان، تقررِ فاضیان وغیرہما) کی حفاظت اپنے ذمہ لی۔ شاہ عالم کے قتل و جلاوطنی میں اشتعال کا اندیشہ تھا اس لئے معاہدہ ہی کو مناسب سمجھا گیا۔

۱۸۰۶ء میں شاہ عالم کے انتقال اور اکبر شاہ ثانی کی تخت نشینی کے موقعہ پر شہر و قلعہ پر ہی نمائشی حکومت باقی رکھی گئی۔ یہی حالات تھے جن سے متاثر ہو کر خاندانِ ولی اللّٰہی کے چشم و چراغ، سرگروہِ علماء و صلحاء، شاہ عبد العزیز محدث دہلوی نے ہندستان کے دار الحرب ہونے کا فتویٰ دے دیا تھا۔ اسی زمانے میں احمد شاہ ابدالی کے پوتے زمان شاہ نے ہندستان پر حملہ کیا مگر ایران کی بغاوت کی وجہ سے لدھیانہ ہی سے کابل کو پلٹنا پڑا۔ جاتے جاتے رنجیت سنگھ کو پنجاب کا گورنر بناتا گیا۔ بعد میں اس نے مستقل حکومت کا اعلان کرکے ملتان، کشمیر اور سرحد کے تمام اضلاع پر قبضہ جمایا۔

اس طرح اٹھارویں صدی عیسوی کے نصفِ آخر میں چار طاقتیں نمایاں رہیں :۔

۱۔ مرہٹے، صوبہ بمبئی، گجرات، صوبجات متوسط اور راجپوتانہ پر قابض تھے۔ دہلی، بنگال اور آسام پر حملہ بھی کرتے رہتے تھے۔

۲۔ فرانسیسی طاقت مدراس میں

۔۔ نظام حیدر آباد دکن میں

۴۔ ٹیپو سلطان   میسور میں

۱۷۶۱ء میں جنگِ پانی پت نے مرہٹوں کے حوصلے پست کر دئے تھے اور ۱۷۹۹ء میں میر صادق نے جنگِ میسور کا پانسہ پلٹ کر شیرِ ہندستان سلطان ٹیپو کو شہید کرا ڈالا تھا۔ اٹھارویں صدی کے خاتمہ تک صرف ایک طاقت ایسٹ انڈیا کمپنی کا کوس " انا و لا غیری " بجنے لگا تھا۔ ۱۸۰۳ء و ۱۸۰۶ء میں یہ کمپنی بالکل ہی قسمتِ ہندستان کی مالک بن گئی۔

یہ تھی آخری تاجدارانِ مغلیہ کی عیش پرستیٔ لامتناہی اور کفرانِ نعمتِ الٰہی کی شرمناک داستان جس کا خمیازہ نہ صرف مسلمان قوم بلکہ پورے ہندستان کو ڈیڑھ صدی سے بھگتنا پڑ رہا ہے۔ علامہ اقبال مرحوم نے کیا خوب کہا ہے ؎

تجھ کو بتاؤں میں تقدیرِ امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

میں کہہ رہا تھا کہ غلامی بُری بلا ہے۔ اس سے قوموں کی خصوصیات، ان کے خصائل و عادات یا تو فنا ہو جاتے ہیں یا مسخ ہو جاتے ہیں۔ ہندستان کے مسلمان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں رہے۔ ان میں بھی ہمسایہ اقوام اور غلامی کی " برکات " کی وجہ سے شرکیہ و بدعیہ مراسم رواج پا گئے۔

محرم کے ماتمی جلوسوں کو یزیدی فوج کی شان و شوکت اور براقوں کے مجسّموں کو زیور پہنا کر مورتیوں کی شکل و صورت دے دی گئی۔ بتوں کی طرح قبروں پر جبیں سائی ہونے لگی۔ جامع مسجد کے اندر حوض پر خوانچہ بیچنے والوں کا جمگھٹا رہنے لگا۔ بیع و شرا کے مسجد میں دروازے کھل گئے بی بی کی صحنک، شیخ سدّو کا بکرا اور اسی قسم کے دوسرے خرافات نے مذہبی شکل اختیار کر لی۔ بی بی کی صحنک کے لئے عجیب   قیود تھے۔ بیوہ، کنواری اور دوبارہ شادی شدہ عورت اس طعامِ فاتحہ کو نہیں کھا سکتی تھی۔ اسی طرح مرد بھی ہاتھ نہیں لگا سکتے تھے۔ اس کی مثال ۲۲ رجب کے موجودہ مروجہ کونڈوں سے سمجھ لیجئے[عہ]۔ کونڈوں کی میٹھی پوریاں معیّن احاطے سے باہر نہیں جا سکتیں ہاتھ بھی وہیں ایک برتن میں دھونے ضروری ہیں، غسل کر کے کھانا فرائض میں شامل ہے حقیقت اس کی صرف اتنی ہے کہ امام جعفر صادق کی روح کو اس کا ایصالِ ثواب کیا جاتا ہے۔ ایصالِ ثواب کے لئے کھانا تقسیم کرنا زمان و مکان کی قید سے بالاتر ہے۔ رسمی قیود بڑھا کر جائز کو ناجائز

عہ ہمارے نزدیک ۲۲ رجب کو حضرت امام جعفر صادق کے ساتھ ساتھ حضرت امیر معاویہ کا بھی ایصال کرنا چاہئے کیونکہ حضرت امیر معاویہ کی تاریخ وفات یہی ہے، البتہ بے جا قیود ناجائز ہیں ۱۲ محمد موسیٰ عفی عنہ

بنا دینے کی کوشش کی گئی ہے یہی حال بی بی کی صحنک اور دوسری خرافات کا ہے۔

زوال پذیر اور مردہ اقوام میں عزم و جہاد کی جگہ گوشہ نشینی و بزدلی لے لیتی ہے۔ خدا پرستی کے بجائے شیطان پرستی گھر کر لیتی ہے، اوہام باطلہ اپنا قبضہ جما لیتے ہیں، خود اعتمادی کا خاتمہ ہو جاتا ہے دنیا کی ہر شے کو حاجت روا اور تنکے کو ڈوبتوں کا سہارا سمجھا جانے لگتا ہے۔

برائے نام بادشاہوں کی عیش پرستیوں نے قوم پر جمود طاری کر دیا تھا۔ مولانا شاہ اسمٰعیل بن شاہ عبد الغنی بن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور علامہ فضل حق بن مولانا فضل امام خیر آبادی نے اسی پر آشوب دور میں آنکھیں کھولی تھیں۔ دونوں حضرت شاہ عبد العزیز کے تربیت یافتہ اور ایک ہی ماحول میں پرورش پانے والے تھے۔ دونوں کا علمی خاندان سے تعلق تھا۔ پندرھویں پشت میں جدِ اعلیٰ شیر الملک بن عطاء الملک شاہِ ایرانی میں دونوں کا نسب جا کر مل جاتا ہے۔ دونوں بے انتہا ذہین و فطین تھے۔ ایک نے تیرہ سال اور دوسرے (شاہ اسمٰعیل) نے سولہ سال کی عمر میں علومِ نقلیہ و عقلیہ میں مہارتِ تامہ حاصل کر لی تھی (شاہ صاحب علامہ سے ۱۸ سال بڑے تھے اس لحاظ سے علامہ کی پیدائش اور شاہ صاحب کی مسند نشینیٔ درس و تدریس کا سال تقریباً ایک ہی ہو جاتا ہے)

مسلمانوں کی گمراہی اور بے راہ روی مولانا اسمٰعیل سے نہ دیکھی گئی۔ درس و تدریس کے ساتھ وعظ و تبلیغ کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ عم محترم شاہ عبد القادر دہلوی کے بعد ۱۸۱۷ء میں ان کی جگہ سنبھالی۔ جامع مسجد کو مرکزِ رشد و ہدایت بنایا۔ پہلا وعظ وحدانیتِ باری تعالےٰ اور دوسرا فقر و تصوف پر کہا۔ ان دونوں وعظوں کو منشی ہیرا لال نے بجنسہٖ نقل کیا ہے حیاتِ طیبہ میں مفصل درج ہیں۔ "الحق مرّ ولوکان در" کے مطابق جو تمام مصلحین کے ساتھ ہمیشہ ہوتا آیا ہے ان کے ساتھ بھی ہوا جذبات و خواہشات کے خلاف اٹھائی ہوئی آواز کی مخالفت ہوئی اور پوری طاقت سے ہوئی۔ لوگوں نے غلط فہمیاں پھیلانی شروع کیں، الزامات تراشنا اور بہتان باندھنا اپنا شعار بنا لیا۔ خدا کے پیغام پر عمل کرنے کو کہا جاتا تو آبائی رسم و رواج کا حوالہ دے دیا کرتے تھے وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا کے سر تا سر مصداق بن گئے تھے۔

مسلمانوں کی شدتِ مخالفت کی بنا پر قدرتی طور پر شاہ صاحب کا جذبۂ اصلاح بھی غلو کی

شکل اختیار کر گیا۔ ایک طرف تفریط تھی تو دوسری جانب افراط، شاہ صاحب نے مسلمانوں کی ہر غلط روی کو شرک سے تعبیر کرنا شروع کیا، مقصد نیک اور نیت بخیر تھی "مرگش بگیر تا بہ تپ راضی آید" کے اصول پر اہتمام کار رہتا۔ وعظ و تبلیغ کے ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ پہلے عربی میں پھر اردو میں تقویۃ الایمان لکھی۔ اس میں حدِ اعتدال سے تجاوز کیا گیا اس کا خود مصنف کو بھی احساس تھا۔ جب حج کو جانے کا ارادہ کیا تو اپنے پیر و مرشد سید احمد بریلوی، مولانا عبد الحی، مولانا شاہ محمد اسحٰق، مولانا محمد یعقوب، حکیم مومن خان مومن، مولوی فرید الدین مرادآبادی، ملا عبد اللہ خان علوی (استاذِ امام بخش صہبائی شہید) کو جمع کر کے ایک مبسوط تقریر کی۔ آپ نے کہا:۔

"میں جانتا ہوں کہ اس (تقویۃ الایمان) میں بعض جگہ ذرا تیز الفاظ بھی آ گئے ہیں اور بعض جگہ تشدد بھی ہو گیا ہے مثلاً ان امور کو جو شرک خفی ہیں شرک جلی لکھ دیا گیا ہے۔ ان وجوہ سے مجھے اندیشہ ہے کہ شورش ضرور پھیلے گی"[۱]

اس تمہید کے بعد اس مقتدر کمیٹی سے ترمیم و اصلاح کی درخواست کی۔ حکیم مومن خان، عبد اللہ خان علوی اور بعض دوسرے احباب نے مولانا کی دلداری کے لحاظ سے ترمیم کی مخالفت کی اور کتاب اصلی حالت پر چھوڑ دی گئی۔ (اس کتاب کا پرانا ایڈیشن کہیں دستیاب ہو تو تمام جذبات عقیدت و نفرت سے بالاتر ہو کر پڑھنے سے ہر انصاف پسند مسلمان اندازہ لگا سکے گا کہ الفاظ و عبارات نے نامناسب لب و لہجہ اختیار کیا ہے یا نہیں)

اس افراط و غلو کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا کے جذبۂ اصلاح اور وعظ و ارشاد کی قدر کرنے والے اور پرانے ساتھی بھی مولانا کی مخالفت کئے بغیر نہ رہ سکے۔ انھیں میں سے علامہ فضل حق خیرآبادی بھی تھے۔ علامہ کی دُور بین نگاہوں نے تاڑ لیا تھا کہ یہ تو آسمان سے گر کر کھجور پر اٹکا ہوا۔ تفریط گئی تو افراط پیدا ہو کر رہے گا۔ ایسے مواقع پر پہلو تہی اور خاموشی گناہ عظیم ہے۔

علامہ ریزیڈنسی میں سررشتہ دار تھے اپنے استاد بھائی مفتی صدر الدین خان آزردہ صدر الصدور کی طرح حکام و رعایا میں مقبول خاص و عام اور ڈپٹی کمشنر کے برابر با اقتدار تھے قلعہ معلی میں بھی بادشاہ و شہزادگان کی نظر میں باوقعت تھے (جس کا مختصر حال اوپر گزر چکا ہے) علامہ نے پہلے

---

[۱] سیرت سید احمد شہید ص ۳۵۴ ... [illegible]

[illegible] "سید احمد شہید کی صحیح تصویر" مصنف مولانا حمید احمد مسعود بدایونی ... [illegible]

توبھی کوشش کی کہ دونوں طرف کے اس ہنگامہ اور مسلمانوں کی باہم جنگ وجدال کو قانونی طور پر روک دیا جائے تاکہ ایک طرف عوام بھی مطمئن ہو جائیں اور دوسری جانب شاہ صاحب کے لئے بھی بارِ خاطر نہ ہو۔ اس میں مستقل طور پر کامیابی نہ ہو سکی تو ایسے اختلافی مسائل کو علمی طریقہ پر باہمی طے کرنا مناسب سمجھا تاکہ عوام میں علمی مسائل کھلونا بن کر مزید گمراہی کا سبب نہ بنیں اور جس طرح مولانا شہید نیک نیتی سے زلتہ العالم کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔ علامہ زلتہ العالِم کو بر بناء اخلاص گوارا نہ کر سکتے تھے۔ مشترک اساتذہ کے فیضِ صحبت نے دونوں ہی کو حق گوئی اور صداقت شعار بنا دیا تھا۔ علم وفضل میں دونوں باکمال جذبۂ اخلاص وحمیت میں بے عدیل وبے مثال، میدانِ قرطاس پر اشہبانِ قلم نے دوڑنا شروع کیا سمند ہائے خامہ نے وہ وہ جولانیاں دکھائیں کہ مخالف وموافق سبھی دادِ روانی دئے بغیر نہ رہ سکے علمی موشگافیاں، فنی باریکیاں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہونے لگیں۔ رفعِ یدین، آمین بالجہر وغیرہ پر خامہ فرسائی ہونے لگی۔ موافق ومخالف علما بھی میدان میں اتر آئے۔ بڑا مسئلہ امکانِ نظیر اور امتناعِ نظیر کا چھڑ گیا۔

اس مسئلہ میں شاہ صاحب کی رائے تھی کہ خاتم النبیین کا مثل ممکن بالذات اور ممتنع بالغیر ہے۔ علامہ ممتنع بالذات مانتے تھے (اس مسئلہ پر علامہ کی مستقل کتاب مناظرانہ انداز پر امتناع النظیر کے نام سے ۱۹۰۸ء میں موصوف کے تلمیذ التلمیذ مولانا سید سلیمان اشرف بہاری مرحوم سابق صدر دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے زیر اہتمام شائع ہو چکی ہے) علامہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا اصلی مسودہ کتاب خانہ حبیب گنج میں موجود ہے۔ اس کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظیر کے ممتنع بالذات ہونے پر جو دلائل وبراہین قائم کیے ہیں انہیں دیکھ کر بے ساختہ "مرحبا واحسنت" زبان پر آتا ہے علمی وفنی حیثیت سے وہ وہ گلکاریاں کی ہیں کہ صفحاتِ کتاب تختۂ چمنستان بن گئے ہیں۔ اسی ایک کتاب پر کیا موقوف ہے تمام مصنفات کو دیکھ کر یہی کہنا پڑتا ہے ؎

لیس للّٰہ بمستنکر ان یجمع العالَم فی واحد

یہ تو پہلے گذر ہی چکا ہے کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب سے علامہ کے بڑے گہرے تعلقات تھے۔ علامہ کا رجحانِ طبع دیکھ کر اسی موضوع پر ایک مثنوی لکھ ڈالی جو کلیاتِ غالب میں مثنویات کے سلسلے میں چھٹی مثنوی ہے۔ غالب کے اندازِ بیان کا یہ کچھ کم کمال نہیں کہ ایسے مشکل مسئلہ کو

ع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی ہو گئی نہیں بدبختی ہے [illegible]

ایسی روانی اور خوبی سے سمجھا دیا علامہ اور دوسرے اہلِ فضل و کمال کی صحبت نے غالب کو فی الواقع غالب بنا دیا تھا، لکھتے ہیں :-

یک جہاں تا ہست یک خاتم بس است — قدرتِ حق را نہ یک عالم بس است
خواہد از ہر ذرہ آرد عالمے — ہم بود ہر عالمے را خاتمے
ہر کجا ہنگامۂ عالم بود — رحمۃ للعالمینے ہم بود
کثرتِ ابداعِ عالم خوب تر — یا بیک عالم دو خاتم خوب تر
در یکے عالم دو تا خاتم مجوئے — صد ہزاراں عالم و خاتم بگوئے
غالب! ایں اندیشہ نپذیرم ہمی — خردہ ہم برخویش می گیرم ہمی
اے کہ ختم المرسلینش خواندۂ — دانم از روئے یقینش خواندہ
ایں الف لامے کہ استغراق راست — حکم ناطق معنئ اطلاق راست
منشأ ایجاد ہر عالم یکے است — گر دو صد عالم بود خاتم یکے است
منفرد اندر کمالِ ذاتی است — لاجرم مثلش "محالِ ذاتی" است

زیں عقیدت برنگردم والسلام
نامہ را درمی نوردم والسلام

غالب نے ان اشعار میں سے ابتدائی پانچ شعروں میں اپنی قابلیت سے ایک حل نکالنے کی کوشش کی جس میں دونوں اکابر کی بات رہ جاتی تھی اور وہ یہ کہ خاتم النبیین اللہ جل شانہ نے اس عالم کے لئے بنایا ہے اس عالم میں تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظیر پیدا ہونا محال اور ممتنع بالذات ہے لیکن خدا دوسرا عالم بنا کر آدم سے عیسیٰ تک اس عالم کے لئے پیغمبر پیدا کر کے آخر میں محمد رسول اللہ علیٰ نبینا و علیہم الصلوٰۃ والسلام کو خاتم النبیین بنا سکتا ہے۔ اس طرح امکانِ نظیر کی صورت نکل سکتی ہے۔ آخری چھ اشعار میں اس خیال کو رد کرتے ہوئے علامہ کی رائے سے اتفاق کرنا پڑا ہے اور اسی رائے سے اپنی موافقت ظاہر کرتے ہوئے جس مدلل طریقہ پر اسے ثابت کیا ہے۔ یہ غالب ہی کا حصہ ہے

سوانح نگاروں نے اپنی نادانی اور جانبداری کی بنا پر اتنی سی[عہ] بات کو افسانہ بنا دیا۔ ان

عہ فاضل مرتب "باسلماں اللہ اللہ بار ہمن رام رام" کے مسلک کے ہیں، جبھی ایک اصولی اور اعتقادی اختلاف کی اہمیت گھٹانے کے لئے "اتنی سی بات" کہہ کر اپنی بات منوانے کی سعی کرتے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون! دونوں کو حق پر کہنا، حق پر ظلم کرنا ہے۔" محمد موسیٰ عفی عنہ

علمی بحثوں کو جانبین کے رشک وحسد کا نتیجہ قرار دیا۔ دونوں کے معتقدین نے دونوں باکمال بزرگوں کی تنقیص کرنے میں کسر نہیں اٹھا رکھی۔ میں نے دونوں گروہوں کے مضامین پڑھے۔ ہر جگہ یہی جذبہ کارفرما دیکھا۔

چوں نہ دیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

مرزا حیرت دہلوی صاحب حیوٰۃِ طیبہ نے تو محوِ حیرت ہی بنا دیا۔ نہ صرف علامہ بلکہ علامہ کے والدِ ماجد مولانا فضل امام کو بھی پڑھا لکھا ماننے میں تامل کیا ہے جن کے تلامذہ میں علاوہ علامہ کے مفتی صدر الدین خان آزردہ صدر الصدور دہلی وغیرہ جیسے گرامی قدر فضلائے عہد بھی موجود ہوں کہ جن کے ادنیٰ حلقہ بگوش وشاگرد نواب صدیق حسن خان قنوجی بھوپالی اور سر سید احمد خاں بانیٔ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ جیسے اکابر ومشاہیرِ وقت نظر آتے ہوں۔ حیرت ہوتی ہے کہ انسان معاندانہ روش اختیار کرتے وقت نابینا کیوں ہو جاتا ہے۔

سر سید احمد خاں مرحوم نے مولانا فضل امام کے متعلق جن تاثرات کا اظہار آثار الصنادید میں کیا ہے وہ مولانا کے حالات میں پیچھے گزر چکا ہے علامہ کے متعلق بھی چند سطریں ملاحظہ کرتے چلئے:

"مستجمع کمالاتِ صوری ومعنوی، جامع فضائلِ ظاہری و باطنی، بنّا بنا فضل و افضال، بہار آرائے چمنستان کمال، منکی ارائکِ اصابتِ رائے، مسند نشینِ دیوان افکار رسائے، صاحب خلقِ محمدی، موردِ سعادتِ ازلی وابدی، حاکم محکمِ مناظرات، فرماں روائے کشورِ محاکمات، عکس آئینۂ صافی ضمیری، ثالثِ اثنین بدیعی وحریری، المعیٔ وقت ولوذعیٔ اوان، فرزدقِ عہد ولبیدِ دوران مبطلِ باطل ومحقِ حق، مولانا محمد فضل حق۔ یہ حضرت خلف الرشید ہیں جناب مستطاب مولانا فضل امام غفر اللہ لہ المنعام کے اور تحصیلِ علومِ عقلیہ ونقلیہ کی اپنے والدِ ماجد کی خدمت بابرکت میں کی ہے۔ زبانِ قلم نے ان کے کمالات پر نظر کر کے فخرِ خاندان لکھا اور فکرِ دقیق نے جب سرّ کار کو دریافت کیا فخرِ جہاں پایا۔

جمیع علوم وفنون میں یکتائے روزگار ہیں اور منطق وحکمت کی تو گویا انہیں کی فکرِ عالی نے بنا ڈالی ہے۔ علمائے عصر بل فضلائے دہر کو کیا طاقت ہے کہ اس

سرگروہ اہلِ کمال کے حضور میں بساطِ مناظرہ آراستہ کرسکیں۔ بارہا دیکھا گیا کہ جو لوگ آپ کو یگانۂ فن سمجھتے تھے جب ان کی زبان سے ایک حرف سنا، دعوائے کمال کو فراموش کر کے نسبت شاگردی کو اپنا فخر سمجھے بایں ہمہ کمالات علم ادب میں ایسا علمِ سرفرازی بلند کیا ہے کہ فصاحت کے واسطے ان کی عبارت شستہ محضر عروج معارج ہے اور بلاغت کے واسطے ان کی طبع رسا دست آویز بلندی مدارج ہے۔

سحبان کو ان کی فصاحت سے سرمایہ خوش بیانی اور امرأ القیس کو ان کے افکار بلند سے دستگاہ عروج معانی، الفاظ پاکیزہ ان کے رشک گوہر خوش آب اور معانی رنگیں ان کے غیرت لعل ناب، سرو ان کی سطور عبارت کے آگے پابہ گل اور گل ان کی عبارت رنگین کے سامنے خجل۔۔۔۔۔۔۔۔

مولوی رحمٰن علی لکھتے ہیں :

"در علوم منطق و حکمت و فلسفہ و ادب و کلام و اصول و شعر فائق الاقران و مستحضار فوق البیان داشت"[۱]

منشی امیر احمد مینائی انتخاب یادگار میں تحریر فرماتے ہیں :

"افضل الفضلاء، اکمل الکملاء، فضائل دستگاہ، فواضل پناہ جناب مولانا مولوی فضل حق صاحب فاروقی بردا اللہ مضجعہ فنونِ حکمیہ میں مرتبۂ اجتہاد، بڑے ادیب، بڑے منطقی، نہایت ذہین، نہایت ذکی، طلیق و ذلیق، انتہا کے صاحبِ تدقیق و تحقیق۔۔۔۔۔۔۔۔ جس شہر میں آپ رونق افروز ہوئے صدہا آدمی بہرہ اندوز ہوئے۔ شاہجہان آباد میں اگرچہ عدالتین کے سررشتہ دار تھے مگر بڑے ذی اقتدار اور صاحبِ اختیار تھے۔ جھجر میں مشاہرہ جلیلہ پہ نوکر رہے۔ الور اور سہارنپور اور ٹونک سب جگہ مؤقر و معزز رہے۔ لکھنؤ میں صدر الصدور رہے تھے اور اس دار الریاست رامپور میں پہلے محکمۂ نظامت اور پھر مرافعۂ عدالتین پہ مامور تھے جناب مستطاب نواب فردوس مکان کو بھی آپ سے تلمذ رہا ہے اور

---

[۱] تذکرہ علمائے ہند۔

بندگانِ حضور (نواب خلد آشیاں) نے بھی کچھ پڑھا ہے۔ آٹھ برس بہت اعزاز و اکرام کے ساتھ رہے پھر یہاں سے تشریف لے گئے [1]"

مفتی انعام اللہ خاں بہادر شہابی گوپاموی سررشتہ دار سراڈورڈ کوبرک ریزیڈنٹ دہلی متوفی ۱۲۷۴ھ لکھتے ہیں:

"برادرم مولوی فضل حق خیرآبادی از فحول علمائے زماں و یگانۂ دوراں است خصوصاً در علومِ عقلیہ گوئے سبقت ربودہ و بوفورِ علم و دانش در اطرافِ عالم بغایت دریں وقت مشہور است۔" [2]

مولوی اکرام اللہ شہابی گوپاموی نے شمس العلماء مولانا عبدالحق خیرآبادی سے پوچھا بھائی صاحب! دنیا میں حکیم کا اطلاق کن کن پر ہے؟ مولانا کہنے لگے بھیا! ساڑھے تین حکیم دنیا میں ہیں:

"ایک معلمِ اول ارسطو، دوسرے معلمِ ثانی فارابی، تیسرے والدِ ماجد مولانا فضلِ حق اور نصف بندہ۔" [3]

۱۲۵۶ھ مطابق ۱۸۴۰ء میں نواب سید محمد سعید خاں بہادر مسند نشین ریاست بن کر انتظامی امور سے فارغ ہوئے اور سرپرستیٔ علم و ادب کی طرف قدم اٹھایا تو مولانا فضل حق خیرآبادی، ملک الشعراء ذکی مرادآبادی، حکیم احمد خاں فاخر رامپوری وغیرہم کو تالیف و ترجمۂ کتب پر مامور فرمایا لیکن یہ پودا پروان نہ چڑھنے پایا تھا کہ ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۵ء میں نواب جنت آرام گاہ نے وفات پائی۔ [4]

ان مشتے نمونہ از خروارے، اکابر معاصرین کی شہادتوں کے بعد مرزا حیرت کی جرأت و جسارت پر حیرت ہوتی ہے اور غور کیجئے تو حیرت کی کوئی بات بھی نہیں۔ جو واقعۂ کربلا اور حادثۂ شہادتِ امام حسین رضی اللہ عنہ سے انکاری ہو وہ فضل و کمالِ فضلِ حق کا منکر بن جائے تو حیرت کیوں ہو؟ کیا شہرت خانۂ خدا میں پہنچ کر دادو دہش، خیرات و مبرّات سے ہی حاصل ہوتی ہے؟ چاہِ زمزم میں نجاست ڈالنے سے مشہور نہیں ہو سکتا؟

مرزا حیرت کی علمی قابلیت کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے کہ علامہ شبلی مرحوم نے سیرۃ النعمان صفحہ ۴۰،

---

[1] انتخابِ یادگار ص ۲۹۱۔ [2] خزینۃ الاولیاء۔ [3] ذکر علماء مولوی اکرام اللہ شہابی (قلمی)۔ [4] دیباچۂ مکاتیب غالب ص ۲ از امتیاز حسین زیدی۔

۴۱ و ۵۰ پر امامِ اعظم ابو حنیفہ کی فوقیت دوسرے ائمۂ مجتہدین پر ثابت کرتے ہوئے کچھ اختلافی مسائل نقل کئے ہیں جن سے امامِ اعظم کی ذہنی رسائی اور ارتقاءِ دماغی کا اچھی طرح حال معلوم ہوتا ہے۔ انھیں میں سے مسائل نصابِ سرقہ اور عدمِ قطعِ یدِ نبّاش بھی ہیں۔ مرزا جی نے حیاتِ طیبہ (سیرتِ مولانا شہید) میں اس بحث کو چھیڑ کر ان دونوں مسئلوں پر بلا ضرورت خامہ فرسائی بھی ضروری سمجھی ہے۔ علامہ شبلی مرحوم کے ساتھ امامِ اعظم کو بھی نہیں بخشا گیا ہے۔ پھر خیرآبادی بزرگانِ کرام پر طبع آزمائی کا شکوہ کیوں؟

مردہ قوموں اور بد طینت گروہوں کا خاصہ یہ بھی رہا ہے کہ اسلاف پر نکتہ چینی او بہتان تراشی شعار بنا یا گیا ہے۔ خلفاءِ راشدین میں کیسا خلوص و اتحاد تھا تاریخی واقعات اس کے شاہد اور سیر کی روایات اس پر گواہ ہیں۔ صحابۂ کرام میں باہمی اخلاص و محبت ضرب المثل تھا۔ حضرت امیر معاویہ کا جنگِ صفّین کے موقع پر بادشاہِ روم کو جواب رہتی دنیا تک سنہرے حرفوں سے لکھا جائے گا۔ حضرتِ علی کرم اللہ وجہہ کی جنگِ جمل میں ام المؤمنین عائشہ صدیقہ کے اونٹ اور ہودج کی حفاظت و نگہداشت کبھی نہ بھولنے والا واقعہ ہے۔ ان حضرات کا اختلاف بھی ذاتی مخالفت سے بالاتر ہوتا تھا۔ ایک دوسرے کا ادب و احترام پورا ملحوظ رکھتا تھا۔

اس کے باوجود بھی تیرہ سو سال سے روافض و خوارج باہم دست و گریباں ہیں۔ وہ کونسا الزام ہے جو ایک گروہ دوسرے کے بزرگوں پر نہیں لگاتا اور وہ کونسا بہتان و افتراء ہے جو ان صدقاءِ رسول پر نہیں تراشا جاتا، العیاذ باللہ!

توچہ دانی سرِّ حق اے جاہلی توگرفتارِ ابوبکر و علی

علامہ و مولانا شہید کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ آپڑا ہے۔ جو لوگ دونوں کے فضل و کمال اور مہارتِ علوم و فنون سے ناواقفِ محض ہیں انہوں نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھا کر تفضیل و تنقیص کے ساتھ موازنہ شروع کر دیا۔ کاش وہ دونوں کے مرتبے کو پہچانتے اور دونوں کی صدق دلی اور حق گوئی کے انجام کو دیکھتے انما العبرة بالخواتیم اور انما الاعمال بالنیات کو ملحوظ رکھتے۔

ایک (مولانا شہید) نے جہاد بالسیف کر کے بالاکوٹ کے مقام پر ۱۲۴۶ھ میں شہادتِ جہری حاصل کی تو دوسرے (علامہ فضل حق) نے افضل الجهاد کلمة حق عند

سکھوں کے عذاب سے نجات دلانے آئے اور مسلمانوں ہی کے ہاتھوں سے "شہید" ہو کر خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ (المیہ سرحد کے عوامل روزنامہ نوائے وقت ۱۵ اگست)

محمد موسیٰ عفی عنہ

سلطان جائر" پرعمل پیرا ہو کر فتوے دیکر جہادِ لسانی و قلمی کرتے ہوئے ۱۲۷۸ھ میں جزیرۂ انڈمان میں بحیثیت اسیرِ فرنگ، مرتبۂ شہادتِ سِرّی پایا۔

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

دوسری طرف دیکھئے تو ایک مجاہدِ اعظمِ وقت سید احمد شہید بریلوی کا دامنِ عقیدت تھامے ہوئے نظر آرہا ہے تو دوسرا سرآمدِ اولیا، عہد حضرت دھومن شاہ دہلوی کا خرقۂ ارادت زیبِ تن کئے ہوئے جلوہ آرا ہے۔ ایک اگر تقویۃ الایمان اور صراطِ مستقیم لکھ کر اپنے خیال کے مطابق حلقہ بگوشانِ اسلام کی مذہبی خدمت انجام دے رہا ہے تو دوسرا روض المجود فی تحقیق وحدۃ الوجود تصنیف کر کے اہلِ عرفان کے ایمان و ایقان کو مستحکم بنا رہا ہے اور صدہا قصائدِ نعتیہ زادِ راہِ آخرت اور توشۂ جادۂ عاقبت بن رہے ہیں۔

امام الہند مولانا ابوالکلام مدظلہ نے ۱۴رجون ۱۹۴۶ء کی صبح کو بوقتِ ملاقات اپنے استاذِ مکرم مولانا نظیرالحسن انبیھٹوی (تلمیذ مولانا محمد عبدالحق خیرآبادی) کی نسبت سے یہ روایت بیان کی کہ علامہ نے وحدۃ الوجود پر جب رسالہ لکھا تو اہلِ علم و صاحبِ عرفاں حضرات شدِّ رحال کر کے علامہ کی زبان سے اس کو سننے کے لئے حاضرِ خدمت ہوتے تھے اور اس معرکۃ الآراء مسئلہ کے حقائق و دقائق سنکر ان پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ اس رسالہ کے آخر میں جو توصیت فرمائی ہے اس سے خشیتِ باری اور قلبی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان خیر ما یتواصی بہ ان یتقی اللہ فی العلانیۃ والسرو ان کنت فی ہذہ التوصیۃ ممن نسی نفسہ وامر غیرہ بالبر فیا لھفی علی امرا تلفتہ و زمن فی الھوی اسلفتہ و سوء عمل اخلفتہ و قدر بالخلاعۃ وضعتہ و قدر من البضاعۃ اضعتہ و ریعان فی الزھو قبضتہ و عیش لباب فی اللھو امضیتہ عفا اللہ عنی و عنک واذھب عنا بواسعۃ رحمتہ الضیق والضنک و وفقنا لصالح الاعمال وجمیل الفعال

توفیقا وجعلنا مع الذین انعم علیھم من النبیین و
الصدیقین والشھداء والصالحین وحسن اولئک رفیقا

اس کا لفظ لفظ اعترافِ قصور اور خشیتِ ربِ غفور پر دلالت کرتا ہے فرماتے ہیں :۔
" بہترین وصیت یہی ہو سکتی ہے کہ خدا سے ظاہر و باطن دونوں حالتوں میں ڈرتا رہے
اگرچہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو اپنے آپ کو بھول کر دوسروں کو نیکی کی ہدایت
کرتا ہے۔ کس قدر افسوس ہے کہ میں اپنی عمر خواہشات میں برباد اور اپنی زندگی
بداعمالی میں تباہ کرتا رہا۔ اپنی عزت و توقیر واہیات باتوں کی وجہ سے گراتا اور
اپنی پونجی کی بڑی مقدار مٹاتا رہا۔ حیات کے خوشگوار دن اترانے میں اور
بہترین ایام لہو و لعب میں گزارتا رہا۔ خدا مجھے اور تمہیں معاف کرے اور
اپنی رحمت کاملہ سے ان لغزشوں سے درگزر ے۔ ہم سب کو اعمال نیک کی توفیق
دے اور اپنے مقبول بندوں، انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کا رفیق بنائے"

یہ تھے ان دونوں بزرگوں کے کارنامے! اختلاف کس میں نہیں ہوا صحابہ کرام ؓ،
مجتہدین عظام، علماء و اولیاء، ذوی الاحترام، کب اس سے محفوظ رہے۔ یہ اختلاف تو رحمت ؑ
ہے اختلاف امتی رحمۃ ایسے ہی اختلاف کو کہا گیا ہے۔

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

روحانی وجسدی معراج، قراۃ خلف الامام، وحدۃ الوجود و وحدۃ الشہود، یہ اور اسی قسم
کے صدہا مسائل زیرِ بحث رہے ہیں۔ دونوں طرف اکابر واعاظم حضرات نظر آتے ہیں۔ ہمارے
لئے سبھی قابلِ احترام ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہماری رائے کسی ایک طرف ہو۔ اسی طرح امکانِ
نظیر و امتناعِ نظیر میں بھی اختلاف ہو سکتا ہے علمی مسئلہ ہے، فلسفیانہ نکات و حقائق کا
حامل ہے۔ خواص کے سوا عوام سے اس کا تعلق کیا۔ پھر بھی ہر کس و ناکس اس پر طبع آزمائی کرنے
بیٹھ جاتا ہے جو لوگ امکان کے معنی اور اس کی اصطلاحی تقسیم و تعریف سے بھی بے بہرہ ہیں
وہ بھی اس پر قلم اٹھا رہے ہیں اللھم احفظنا من شرور انفسنا۔

؎ علامہ اور مولوی اسمٰعیل دہلوی کے اختلافات کو صحابہ کے مشاجرات سے تشبیہ دینا اسلام کی روح سے ناواقفیت کی دلیل ہے ۔ محمد موسیٰ عفی عنہ

علامہ کے رد و مناظرہ کی مہارت کا اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ جب لکھنؤ میں صدر الصدوری کے فرائض انجام دے رہے تھے تو منشی نول کشور نے بکمال ادب عرض کیا کہ اوقاتِ فرصت میں عربی کتب کی کاپی ملاحظہ فرما کر مطبع کی عزت دوبالا فرمائیں تو عین بندہ نوازی ہوگی۔ از راہِ اخلاق منظور کرنا پڑا۔ مجتہد العصر کی ایک کتاب مناظرہ مطبع میں طبع ہونے آئی۔ اس کی کاپیاں ملاحظہ کے لئے آپ کی خدمت میں بھیجی گئیں۔ آپ تصحیح عبارت کے ساتھ ہی ساتھ حاشیہ پر اعتراضات کے جوابات بھی لکھتے جاتے تھے۔ جب کتاب چھپ کر ان مجتہد صاحب کے پاس پہنچی تو اسے دیکھ کر سر پیٹ لیا کہ تمام عمر کی محنت برباد گئی۔ دریافت پر منشی نول کشور نے اصل حقیقت ظاہر کردی آخر ش کتابوں کے انبار میں آگ لگوادی گئی۔ [عہ] [۱]

بیعت

علامہ عقیدۃً سنی حنفی ماتریدی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مولانا اسمٰعیل شہید سے "رفع یدین" اور "آمین بالجہر" "امکانِ نظیر و امتناعِ نظیر" پر مناظرہ چھڑ گیا تھا جو عرصہ تک جاری رہا۔ دونوں طرف سے تحریروں کا سلسلہ چلتا رہا۔ تحقیق الفتوی فی ابطال الطغوی، کتب خانہ مولوی سید نجم الحسن رضوی خیرآبادی میں موجود ہے۔ اس میں شفاعت و امتناعِ نظیر پر بحث ہے۔ یہ پہلی تحریر ہے اور رسالہ امتناع النظیر جواب الجواب ہے۔ سلسلہ عالیہ چشتیہ میں حضرت شاہ دھومن دہلوی سے بیعت ہوئے مرید شاہ دھومن دہلوی بود۔ [۲]

مولوی فیض الحسن کہتے تھے کہ میرے استاد مولوی فضل حق رامپوری کا بیان ہے کہ علامہ فرماتے تھے کہ میں حضرت مجدد صاحب کے سلسلے کا زیادہ معتقد نہ تھا لیکن جب سے میں نے شاہ عبد القادر صاحب کو دیکھا اس سلسلہ کا بہت معتقد ہوگیا کیونکہ اگر وہ سلسلہ فی الواقع ناقص ہوتا تو ایسے لوگ اس سلسلے میں داخل نہ ہوتے۔ [۳]

علامہ باایں ہمہ علم و فضل و ریاست و امارت، شریعت و طریقت پر کس درجہ عمل پیرا تھے مولانا عبد اللہ بلگرامی کے الفاظ میں سنیئے:

---

[۱] تذکرہ فضلائے ہند [۲] تذکرہ علمائے ہند [۳] امیر الروایات ص ۳۵۔

[عہ] جناب عرشی رامپوری نے اس واقعہ کو غلط ثابت کیا ہے، ملاحظہ ہو غالب نامہ آور دم، طبع لاہور ص ۱۱۳ (محمود احمد عفی عنہ)

" ولا یشغله مارزقه الله من الافیال والجلاد والصافنات
من الجیاد عن طاعة الله فیما امره ونهاه فکان من رجال
لا تلهیهم تجارة ولا بیع عن ذکر الله وکان مواظبا علیٰ ختم
القرآن فی کل اسبوع من الایام والصلوٰة النافلة فی
جوف اللیل والناس نیام فمن کان مواظبا علی المتطوعات
فما ظنک به فی المکتوبات وکان رحمه الله رؤفا بالطلاب
حریصا علیٰ تدریس اولی الافهام والالباب فکان دیدنه
الافهام بالفاظ سهلة الافهام ولا یستفهم مهما یستفهم
عن التفهیم ویسوّی بین ولده وفلذة کبده وبین احد
من الطلبة فی الارشاد والتعلیم [1]

" اللہ کے دیئے ہوئے ہاتھی، اونٹ اور عمدہ قسم کے گھوڑے اوامر ونواہی میں اطاعت
خداوندی سے نہ روکتے تھے۔ آپ ان میں سے تھے کہ تجارت اور خرید و فروخت اللہ
کے ذکر میں حارج نہ ہو سکتی تھی۔ ہر ہفتہ ختم قرآنِ پاک فرماتے۔ تہجد کی نماز کی پابندی فرماتے
جو نوافل پر اس درجہ مواظبت کرتا ہو اس کے فرائض کا حال خود سمجھ میں آتا ہے۔ طلبہ پر
شفیق اور ذہین تلامذہ کے پڑھانے پر حریص تھے۔ آسان اور سہل الفاظ میں سمجھاتے۔
کسی کے سمجھانے سے بات نہ سمجھتے بلکہ خود تہ تک پہنچتے۔ تعلیم و تدریس میں اپنے جگر گوشہ
اور عام طالب علم میں ذرہ برابر فرق نہ کرتے "

---

[1] حصہ بدیر سعیدیہ۔

اخلاق وعادات

علامہ بڑے فیاض اور رحمدل واقع ہوئے تھے۔ دوسروں کی تکلیف دیکھ نہ سکتے تھے۔ داد و دہش کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا۔ دوستوں اور ساتھیوں کے ساتھ حسن سلوک آپ کا طرۂ امتیاز تھا ایک بار حکیم مومن خاں مومن شطرنج کھیلنے سے کسی بات پر ناخوش ہو کر اٹھ کر چلے گئے تو دوسرے وقت ان کے یہاں جا کر انہیں منا لائے۔

شاہ غوث علی صاحب شاگرد مولانا فضل امام خیر آبادی ایک مرتبہ دوران قیام رامپور میں نظر پڑ گئے۔ سرائے میں قیام تھا۔ علامہ نے بے انتہا اصرار سے اپنے پاس ٹھیرانے کی کوشش کی لیکن شاہ صاحب جو اکثر استغراق میں رہتے تھے اور تخلیہ کے خوگر تھے آمادہ نہ ہوئے تو مالک سرائے سے کہلا بھیجا کہ شاہ صاحب کے تمام مصارف کا بل ہمارے پاس آئے اور جس قدر بھی خرچ ہو ان سے کچھ طلب نہ کیا جائے۔ [۱]

علامہ دوستوں کے فائدے کی نئی نئی صورتیں پیدا کیا کرتے تھے۔ مخلص احباب میں مرزا اسداللہ خاں غالب سب سے زیادہ ضرورت مند تھے۔ مولوی امتیاز علی خاں عرشیؔ رامپوری ناظم کتب خانہ ریاست، مکاتیب غالب میں غالب نوازی کا حال لکھتے ہیں:

"حسن اتفاق سے مولانا فضل حق خیرآبادی رامپور میں فروکش تھے۔ انہوں نے حق دوستی ادا کیا اور وقتاً فوقتاً سرکار (نواب سید یوسف علی خاں والیٔ رامپور) کے روبرو میرزا صاحب کی اس قدر تعریف و توصیف کی کہ سرکار اُن کے کلام کے مشتاق ہو گئے۔ جب حالات سازگار نظر آئے تو مولانا نے میرزا صاحب کو لکھا کہ سرکار کی خدمت مبارک میں نامۂ بندگی اور قصیدۂ مدحیہ ارسال کریں۔ مولانا کا نامۂ گرامی میرزا صاحب کو ۲۷ جنوری ۱۸۵۷ء کو موصول ہوا۔ ۲۸ جنوری کو انہوں نے بہ تعمیل ارشاد نواب فردوس مکان کی خدمت میں پہلا عریضہ ارسال کیا۔ اس کے جواب میں سرکار نے ۵ فروری کو اپنے کچھ اشعار بغرض اصلاح بھیجا و ان

---

[۱] تذکرہ غوثیہ۔

کے ساتھ تحریر فرمایا :

" نمیقۂ انیقۂ بلاغت آگیں مشعر رسید خط مولوی صاحب مخدوم محمد فضل حق صاحب بادیگر مراتب محبت و اشفاق بعبارت رنگین و دقیق ، در عین انتظار سرمہ کش عیون ، وصول نشاط شمول گردیدہ باطلاع خیریتہا سرمایۂ سرورنا محصور افزودہ از مزید شفقت و ائتلاف قلبی متصوّر شد۔

مشفقا ! ہر چند کہ کاتب را اتفاق موزونیت یک مصرعہ ہم اتفاق نشدہ بود لیکن محض بجہت سماعت کلام سامی زبانی مولوی صاحب صدر الوصف دلم خواست کہ طریقۂ رسل و رسائل جاری شود ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

اس فرمان نے میرزا صاحب میں نیا ولولہ پیدا کیا اور انہوں نے ۱۱ر فروری کو سرکار کی مدح میں قصیدۂ مدحیہ نظم کر کے بذریعہ ڈاک ارسال کیا۔ اس کی ایک نقل میرزا صاحب نے مولانا کی خدمت میں بھیجی تھی جو انہیں الور میں موصول ہوئی۔ وہاں سے ۱۰ر ماہ اپریل کو مولانا نے سرکار کو تحریر کیا :

" بعز عرض میرساند کہ خیر سگال ، با فضال ایزد بیہمال ، بصحت و اعتدال بہ الور رسیدہ ملاطفۂ مرزا صاحب مشفق نجم الدولہ مرزا اسد اللہ خاں صاحب متخلص بغالب مع قصیدۂ میمیہ کہ در مدحِ حضور فیض معمور منظوم کردہ اند از ڈاکخانہ یافت مرزا صاحب موصوف در ثنا و ستائش موزونی طبع اقدس و توصیفِ غزلہائے کہ نزد نشان شرف ارسال یافتہ بودند و شکر و سپاس عطائے مبلغ پانصد روپیہ کہ بدو دفعہ بمرزا صاحب موصوف عنایت شدند اسہاب در تحریر فرمودہ اند حالانکہ طبع اقدس در علومِ عقلیہ و فنونِ حکمیہ آنچناں دقیقہ رس کہ عدیلِ آں در مملکتِ ہندستان کہ حال علمائے آں تفصیلاً معلوم است کمتر بلکہ معدوم است۔ نظمِ شعر و فہمِ آں و ابداعِ معانی تازہ و مضامین مبتکرہ و سردِ الفاظِ فصیحہ و تراکیبِ بلیغہ بحسب اوزان عروض نسبت بعلوِ طبعِ اقدس و بلندی افکارِ صائبہ از ادنی مراتب است۔

مرزا صاحب ازیں حال لاعلم اند طبع عالی و فکرِ صائب در دقائق حکمیہ و معضلات فلسفہ بجائے میرسد کہ رسیدن افہام علام اعلام تا آں مقام معلوم الانتفاء است دریں سخن ہیچ مبالغہ و اغراق نیست حضور لامع النور بنفسِ نفیس امتحانات فرمودہ اند و تکریر امتحان ہم سہل است و نظر بہ ہمت والا در جود و سخا بذل آلاف الوف را اقل قلیل تواں پنداشت مرزا صاحب حق سپاس گزاری ادا کردہ اند نظم قصیدۂ مدحیہ در غایت بلاغت و انسجام است غالباً شرف اندوز ملاحظہ والا شدہ باشد۔"

مولانا کی اس تحریر نے مرزا صاحب کے سابقہ تعلقات از سرِ نو استوار کر دئے اور ایک مخلص دوست کی کوشش سے میرزا صاحب کی یہ تجویز کہ "آیندہ ریاستوں میں پیرانہ استاد بن کر رسوخ حاصل کرنا چاہیے" ریاست رامپور میں کامیاب ہو گئی، [1]

جس قصیدہ میمیہ کا علامہ نے اپنے خط میں ذکر کیا ہے اس کا مطلع یہ ہے۔ اس قصیدہ میں اہم اشعار ہیں:

ہمانا اگر گوہرِ جاں فرستم — بہ نواب یوسف علی خاں فرستم

آگے چل کر علامہ کے متعلق لکھتے ہیں:

بتوقیعِ فضلِ حق آں عینِ معنی — کہ آباد بہروئے فراواں فرستم

گذشت اندیشہ کز خامہ رشح — بداں قلزمِ فیض و احساں فرستم

- - - - - - - - - - - - - - - - - -

دو ہفتہ تک ڈاک سے جواب نہ ملنے پر ۱۱ر فروری کو ایک عریضہ اور ارسال کیا۔ اسی روز شام کو نواب صاحب کا گرامی نامہ مع دو سو پچاس روپیہ برائے شیرینی بمطابق دستورِ شاگردی ملا۔ ۱۲ر فروری کو دوسرا خط لکھتے ہیں:

"......... سہ شنبہ ۲۷ر جنوری نامۂ مولانا و بالفضل اولٰنا (علامہ فضل حق) بمن رسید، چہار شنبہ ۲۸ر جنوری عرضداشت رواں داشتم" [2]

---

[1] دیباچہ مکاتیبِ غالب ص۶۴ و ۶۵ ۔ [2] مکاتیبِ غالب ص۲ ۔

علامہ کی تعریف و توصیف کا نتیجہ یہ نکلا کہ مرزا صاحب سے ریاست کے پشتینی تعلقات قائم ہو گئے۔ بشیر حسین زیدی چیف منسٹر ریاست رامپور دیباچہ مکاتیب غالب میں لکھتے ہیں:۔

"...... نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خان بہادر غالبؔ دہلوی کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ آغاز ۱۸۵۷ء میں مولانا فضل حق خیر آبادی کی وساطت سے نواب فردوس مکان نے انہیں فن سخن میں اپنا مشیرِ خاص مقرر فرمایا تھا ابتداءً نواب فردوس مکان (نواب یوسف علی خان) وقتی عطیات سے میرزا صاحب کی امداد فرماتے رہتے تھے لیکن غدر کے بعد ان کی پنشن بند ہو گئی تو نواب صاحب نے جولائی ۱۸۵۹ء سے سو روپیہ ماہوار تنخواہ جاری فرما دی تھی جو ان کے انتقال کے بعد نواب خلد آشیاں کے خزانہ سے ملتی رہی اور مرزا صاحب کی وفات پر ان کے متبنّٰے حسین علی خاں شاداں کے وظیفہ کی شکل میں تبدیل ہو گئی"۔[1]

سیاست

رگ و پے میں جب اترے زہرِ غم تب دیکھئے کیا ہو
ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش ہے

یہ تو مختصراً گزر ہی چکا ہے کہ علامہ کا دور مسلمانوں کے لئے پُر فتن دور تھا۔ سات سو سال سے ہندوستان جنت نشان پر مسلمان ایک فاتح قوم کی حیثیت سے مستقلاً حکمرانی کرتے آ رہے تھے۔ تین سو سال سے سلاطینِ مغلیہ کا ڈنکا بج رہا تھا۔ مسلمانوں کی آنکھوں دیکھتے یہ تقریباً ہزار سالہ پر شان و شکوہ سلطنت کلی طور پر نذرِ اغیار ہو رہی تھی۔ ۱۷۵۷ء کی جنگِ پلاسی کے بعد سے اسے گھن لگ چکا تھا۔ ۱۷۹۹ء میں جنگِ میسور اور سلطان ٹیپو کی شہادت نے مسلمانوں کا حوصلہ پست کر دیا تھا۔ ۱۸۰۳ء میں فتح دہلی کے موقع پر لارڈ لیک کے معاہدہ سے اس کے خاتمہ کی نوبت آ ہی چکی تھی۔ رہی سہی شان و عزت ۱۸۰۶ء میں اکبر شاہ ثانی کی برائے نام تخت نشینی پر جاتی رہی۔ علماء و اولیاءِ اسلام اپنی روحانیت اور علم و عمل کے ذریعہ استحکامِ سلطنت

---

[1] دیباچہ مکاتیبِ غالب ص۸۔

اور قمع ضلالت و غوایت میں ہمیشہ پیش پیش رہے تھے۔ اس وقت سر برآرائے سلطنتِ علم خاندانِ ولی اللّٰہی تھا۔ نہ صرف ہندستان بلکہ بیرونِ ہند بھی اس کا سکہ چل رہا تھا جس فتوے پر اس خاندان کی مہرِ تصدیق ثبت نہ ہوتی تھی وہ زیادہ باوقعت نہ سمجھا جاتا تھا۔

ادھر نشۂ حکومت میں چُور، انگریزوں کی قومِ مغرور مسلمانوں کی تباہی و بے عزتی پر تُلی ہوئی تھی، سلبِ اختیاراتِ بادشاہ، انہدامِ مساجد اور تذلیل و تحقیرِ مسلماناں اس کا محبوب مشغلہ تھا حضرت شاہ عبدالعزیز بن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جو علّامہ اور "شہیدین" کے استاد بھی تھے۔ انہیں حالات کی بنا پر ہندستان کو دارالحرب قرار دے چکے تھے۔ پورا فتوےٰ درجِ ذیل ہے:

"دریں شہر حکمِ امام المسلمین اصلاً جاری نیست و حکمِ رؤساءِ نصاریٰ بے دغدغہ جاری است و مراد از اجراءِ احکامِ کفر ایں است کہ در مقدمہ ملک داری و بند و بست رعایا و اخذِ خراج و عشور اموالِ تجارت و سیاست قطاع الطریق و سراق و فصلِ خصومات و سزائے جنایات کفار بطورِ خود حاکم باشند آرے اگر بعض احکامِ اسلام را مثل جمعہ و عیدین و اذان و ذبحِ بقر تعرض نہ کنند، نکردہ باشند لیکن اصل الاصول ایں چیزہا نزد ایشاں ہبا و ہدر است زیرا کہ مساجد را بے تکلف ہدم می نمائند و ہیچ مسلمان یا ذمی بغیرِ استیمانِ ایشاں دریں شہر و در نواحِ آں نمی تواند آمد۔ برائے منفعتِ خود از واردین و مسافرین و تجار مخالفت نمی نمایند اعیان و دیگر مثل شجاع الملک و ولایتی بیگم بغیرِ حکمِ ایشاں دریں بلاد داخل نمی توانند شد و ازیں شہر تا کلکتہ عملِ نصاریٰ جاری است۔"[1]

اس فتوے کے بعد دو ہی چارۂ کار تھے۔ یا تو جہاد کیا جائے یا بصورتِ عدمِ قدرت ہجرت اختیار کی جائے۔

مولانا سید احمد بریلوی، مولانا اسمٰعیل، مولانا عبدالحی جیسے شاگردانِ رشید نے پہلے فرض پر عمل کیا۔ ان کی شہادت کے بعد مولانا شاہ محمد اسحاق محدث مولانا محمد یعقوب وغیرہما دوسرے فرض پر عمل پیرا ہوئے یعنی ۱۲۶۲ھ میں ہجرت کر گئے۔ جہاد کی ایک دوسری صورت افضل

---

[1] فتاوےٰ عزیزیہ جلد ا صفحہ ۱۷ مجتبائی۔

الجہاد کلمۃ حق عند سلطان جائر رہ گئی تھی۔ اس کی تکمیل تلمیذ سعید علامہ فضل حق خیر آبادی نے کر دی۔ غرض یہ ہے کہ حلقہ بگوشانِ دائرۂ ولی اللّٰہی پر سیاست کی چکی گھومتی رہی اور ان بہادر سپوتوں نے اپنی ہستیاں مٹا کر علماءِ ہندستان کی شان کو چار چاند لگائے۔

مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گلِ گلزار ہوتا ہے

یہ تو گزر ہی چکا ہے کہ علامہ دہلی سے بد دل ہو کر جھجر، الور، ٹونک، سہارنپور اور رامپور میں باعزت عہدے سنبھالتے ہوئے ۱۸۴۸ء میں لکھنؤ میں حضور تحصیل کے مہتمم و صدر الصدور ہو گئے تھے۔ بالاکوٹ کے حادثہ نے قلب و دماغ پر بڑا اثر ڈالا تھا اور مسلمانوں کے انحطاط و بے بسی پر آنسو بہانا پڑ رہے تھے۔ ساری ریاستوں میں والیانِ ریاست کے اصرار پر پہنچنے سے بھی غرض یہی تھی کہ ان مسلمان اور ہندو والیوں کی نبضوں کی حرارت کو ٹٹولیں۔ انہیں تاریک مستقبل اور بھیانک ظلمت کا صحیح اندازہ کرائیں۔

لکھنؤ پہنچنے پر کچھ دن کے بعد ہی ہنومان گڑھی متصل اجودھیا (فیض آباد) حادثہ فاجعہ پیش آگیا۔ وہاں کے مہنتوں نے مسجد میں اذان دینا روک دیا۔ مسجد کے ایک حصے کو نقصان بھی پہنچایا۔ کوئی بھولا بھٹکا مسافر مسجد میں جا نکلتا اور وقت ہونے پر اذان دے دیتا تو مار پیٹ کر نکال دیا جاتا۔ ہنومان گڑھی لکھنؤ سے تھوڑے فاصلہ پر واقع تھی۔ نوابی میں اطلاعیں پہنچائی گئیں مگر صدائے برنخاست۔

۱۳ ذیقعدہ ۱۲۷۱ھ مطابق جولائی ۱۸۵۵ء شاہ غلام حسین اور مولوی محمد صالح اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر جہاد پر آمادہ ہو کر ایک جمعیت کے ساتھ ہنومان گڑھی پہنچے۔ بیراگیوں سے مقابلہ ہوا مسجد ہی میں سب کے سب ذبح کر دیئے گئے۔ قرآن شریف پرزہ پرزہ کر کے پاؤں سے مسلا گیا جوتے پہنکر داخلِ مسجد ہو کر سنکھ بجائے گئے۔ ۲۶۹ مسلمان شہید ہوئے۔ [1]

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۱۱۲۔

عصائل مصنف کی ذہنی اختراع ہے محمد موسیٰ عفی عنہ

کسی نے تاریخ لکھی :

پئے سالش کمر چوں ہمت بست
ملہم غیب گفت "یافت شکست"
۱۲۷۱ھ

اس خونیں حادثہ اور ہتک ناموسِ اسلام کے بعد مولانا شاہ امیر علی ساکن امیٹھی سے نہ رہا گیا۔ تقریریں کر کے مسلمانوں کو جہاد پر آمادہ کیا۔ جب قوم میں ہیجان پیدا ہوا اور پانی سر سے اونچا نکل چکا تب واجد علی شاہ والی لکھنؤ کو ہوش آیا۔ ۱۸۴۷ء میں عنانِ حکومت سنبھالی تھی۔ ۴۸ء میں لارڈ ہارڈنگ گورنر جنرل ہند کی تنبیہ پر حضور کونسل قائم کی گئی تھی جس کے صدرِ مہتمم علامہ فضل حق بنائے گئے تھے۔ حکام کے مظالم اور رعایا کی ابتری کی ویسے ہی شکایت تھی۔ اس عزمِ جہاد اور شاہ صاحب کے اعلان پر مسلمانوں کے جوش وخروش نے ہوش و حواس گم کر دیے۔ شاہ صاحب کے سمجھانے کے لئے علماء و امراء کو بھیجا۔ علامہ نے بھی عہدے کی ذمہ داری اور بسہولت مطلب براری کی بنا پر گفتگو میں حصہ لیا۔ تحقیقات و بناء مسجد کا وعدہ بھی کیا لیکن شاہ صاحب نے ایفاءِ وعدۂ بادشاہ پر بھروسہ نہ کرتے ہوئے صاف انکار کر دیا اور کئی ہزار کی جمعیت لے کر ہنومنتوں کی سرکوبی کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ ردولی جاتے ہوئے راہ میں ۲۶ صفر ۱۲۷۲ھ مطابق ۷ نومبر ۱۸۵۵ء بروز چہار شنبہ نوابی فوج اور گوروں کی پلٹن نے گھیر کر نمازِ ظہر باجماعت ادا کرنے میں توپ کے گولوں سے ۱۸ افراد کو شہید کر دیا۔ جو بچ رہے تھے ان کا تعاقب راجہ شیر بہادر سنگھ کے آدمیوں نے دس بارہ کوس تک کر کے بارلو صاحب کے حکم سے ۶۰۰ آدمیوں کا سر اڑا دیا۔ صرف ایک میر عباس کوتوال لشکر بہ ہزار خرابی اپنے گھر بچ کر پہنچے۔ لڑائی سے چار گھنٹے بیشتر شاہ صاحب یہ مصرع بار بار پڑھتے تھے :

سرِ میداں کفن بر دوش دارم

شہادت کے بعد حساب لگایا گیا تو یہی مادۂ تاریخ تھا۔ کسی نے تین مصرعے لگا کر قطعہ کر دیا :

بذکرِ حق سراپا گوش دارم
مئے حبِّ علی در جوش دارم
شدہ تاریخ او قبلِ شہادت
سرِ میداں کفن بر دوش دارم[1]
۱۲۷۲ھ

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۱۲۵ تا ص ۱۲۸

رسولی کے ایک مجذوب نے وانہ علیٰ ذٰلک لشہید سے تاریخ نکالی۔ مولوی امام بخش صہبائی شہید نے ۱۸ اشعار میں تاریخ لکھی۔ آخری شعر یہ ہیں:

چوں ز قتل سید مسکیں کہ خلدش باد جائے | شد لگد کوب مطاعن اعتبارِ لکھنؤ
از پئے نفریں او ہاتف ز روئے درد دل | گفتہ باد افتنہ مقروں باد یار لکھنؤ
آنچہ در ادنیٰ شرارِ کلکِ صہبائی فگند | تا ابد مشتعل نیابی در دیار لکھنؤ[1]

کپتان بارلو اور مرزا شیخ حسین علی کمیدان بٹالن گلابی کی فوجوں نے مقابلہ کیا فوجِ سلطانی کے ۱۲۵۰ آدمی مقتول و مجروح ہوئے۔ یہ مرزا حسین علی شاہ صاحب کے سالے تھے ایک صاحب نے تاریخ کہی:

گفت از روئے ہمت ازلی | قتل شد مولوی امیر علی
۱۲۷۲ھ

دوسری تاریخ یوں نکالی:

سر بجاؤ تنش بجائے دگر[2]
۱۲۷۲ھ

"اسلامی" حکومت میں خالص اسلامی مسئلہ پر مسلمانوں کی اس بے دردی سے خونریزی!

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں

آسمان تھرّا اٹھا۔ زمین کو زلزلہ آگیا۔ خدا کا قہر لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل ہند کی شکل میں نمودار ہوا۔ دوشنبہ ۴ فروری ۱۸۵۶ء کو جنرل اوٹرم ریزیڈنٹ۔ کپتان ہیز اور جنرل ویلا کمان افسر فوج، گورنر جنرل کا عہد نامہ لے کر بادشاہ اودھ واجد علی شاہ اختر کے پاس آئے اور معزولی کا حکم سنا کر عہد نامہ پر دستخط کرنے کا حکم دیا۔ اس عہد نامہ میں سلطنتِ اودھ بخوشی سرکار کمپنی کے حوالہ کر دینے کا ذکر تھا۔ بادشاہ نے دستخط کرنے سے انکار کرتے ہوئے ہزار منت سماجت کی۔ ایک پیش نہ گئی۔ لندن تک کوششیں کیں سب بے سود ثابت ہوئیں۔ کلکتہ لے جا کر مٹیا برج میں نظر بند کر دیا گیا۔ "لکھنؤ شد خراب واویلا" تاریخ ۱۲۷۲ھ

---

[1] تاریخ اودھ حصہ پنجم صفحہ ۲۲۴۔ [2] ایضاً صفحہ ۲۲۳۔

نکالی گئی۔ رائے پورن چند عاجز نے ۲۹ اشعار قطعۂ تاریخ کے لکھے۔ آخری دو شعر یہ ہیں ؎

دلِ عاجز از شورشِ ناگہاں ۔۔۔ ز فرطِ الم بود غوغا کناں

چو از دستِ شہ رفت تاج و کلاہ ۔۔۔ بگفتم شدہ منتزع ملکِ شاہ ۱۲۷۲ھ

پانچ اشعار میں تاریخِ عیسوی لکھی ؎

رقم بنمود عاجز عیسوی سال ۔۔۔ سعادت رفتہ از نجم سعادت ۱۸۵۶ء[1]

حادثۂ شہادت سے تین ماہ کے اندر ہی "ان بطش ربک لشدید" کا منظر سامنے آگیا۔ دیوانِ حافظ سے فال نکالی گئی تو یہ شعر نکلا ؎

دیدی کہ خونِ ناحقِ پروانہ شمع را
چنداں اماں نداد کہ شب را سحر کند

یہ بھی روایت ہے کہ جس دن واقعۂ شہادت ہوا ہے اسی دن پارلیمنٹ لندن میں شاہِ اودھ کی معزولی کے فرمان پر دستخط ہوئے تھے۔ سچ ہے خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔ اسطرح والیانِ اودھ کی مدتِ وزارت ۱۴۳ سال ۳ ماہ ۲۴ دن اور مدتِ بادشاہت ۴۱ سال رہی اور اپنے پیچھے ہزاروں عیش پرستیوں کی داستانیں چھوڑ گئی۔

سید کمال الدین حیدر حسینی عرف میر زائر نے قیصر التواریخ جلد دوم میں چشم دید راویوں کے حوالہ سے لکھا ہے کہ کئی دن تک شہداء کے لاشے یونہی پڑے رہے لیکن نہ پرندوں نے ان کو چھوا نہ درندوں نے بخلاف اس کے دوسرے مقتولین کے جسموں کو جانوروں نے کھا لیا تھا۔ گنّے کے کھیت کو وہاں کے زمیندار نے دو ماہ کے بعد کٹوایا تو ایک مجاہد تمام ہتھیار لگائے بندوق ہاتھ میں لئے بیٹھا نظر آیا۔ قریب جا کر دیکھا تو گولی سے جاں بحق ہو چکا تھا۔ اس کے دیکھنے کے لئے میلہ لگ گیا۔ بعد میں انہیں دفن کر دیا گیا۔ اس دو ماہ میں جسم ذرا بھی خراب نہ ہوا تھا۔ ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء و لکن لا تشعرون ٥

---

[1] تاریخ اودھ حصہ پنجم ص ۲۶۴۔

سلطنت اودھ کی بربادی میں سب سے بڑا ہاتھ نواب میر علی نقی وزیرِ اعظم سلطنت اور خسرِ بادشاہ کا تھا۔ میر جعفر اور میر صادق کی طرح انگریزوں سے سازباز رکھ کر مسلمانوں کی حکومت کو تباہ کرنے کی مسلسل سازشیں جاری رکھی۔ یہ امین الدولہ کی معزولی کے بعد ۱۹ر رجب ۱۲۶۳ھ مطابق ۹ر جولائی ۱۸۴۷ء کو وزیرِ اعظم بنایا گیا تھا۔ اس کی اندرونی سازش ہی کی بنا پر واجد علی شاہ کو یہ روزِ بد دیکھنا پڑا۔ ریزیڈنٹ نے بلا کر اس سے کہا کہ بادشاہ سے عہد نامہ پر دستخط کرا دے تو قصبہ مچھر ہٹہ نسلاً بعد نسلٍ تمہارے حوالہ کر دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ انعام واکرام کے علیحدہ مستحق ہوگے ورنہ سرکاری مجرم قرار دئے جاؤگے۔ [1]

وزیرِ "باتدبیر" نے لاکھوں جتن کئے لیکن بادشاہ اپنی ضد پر اڑے رہے۔ اس طرح دونوں طرف سے منہ کالا ہوا۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ہندستان کی اسلامی سلطنتوں کی تباہی انھیں "میروں" کی بدولت ہوئی ہے جنگ پلاسی ۱۷۵۷ء کے بعد میر جعفر نے شاہ عالم کے ساتھ یہی ڈرامہ کھیلا تھا اور اس طرح صوبہ بنگال ہاتھ سے نکلا۔ دکن میں میر صادق نے ۱۷۹۹ء میں شیرِ میسور سلطان ٹیپو کو دغا دیکے شہید کرایا اور ہندستان کی غلامی کا دائمی پٹہ انگریزوں کو لکھ دیا۔

جعفر از بنگال وصادق از دکن
ننگِ آدم، ننگِ دیں، ننگِ وطن

علامہ نے حادثۂ بالاکوٹ، اور واقعۂ ہنومان گڑھی دیدۂ عبرت سے دیکھا۔ اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کی بے بسی اور واجد علی شاہ اختر والیٔ اودھ کی معزولی وبے کسی کی علت پر نظر جمائی۔ دہلی اور لکھنؤ کے ان حالات سے ایک حق آگاہ وحساس انسان کو اثر پذیر ہونا ہی چاہیئے تھا۔

دوسری طرف عمّالِ حکومت ہندستانی تہذیب وکلچر ہندستانیوں کے مذہب کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ تبلیغِ عیسویت کا ڈنکا بجنے لگا تھا۔ عیسائی مشنریاں، مدارس، ہسپتال اور دوسرے پبلک اداروں سے مذہبی اشاعت، اپنا فرضِ منصبی سمجھ رہی تھیں۔ ان کی دریدہ دہنی کا شکار مقامی مذاہب بن رہے تھے۔ مذہبِ اسلام پر خصوصیت سے نظرِ توجہ تھی۔ پادری

---

[1] تاریخ اودھ حصہ پنجم صـ ۲۵

فنڈر اور مولوی رحمت اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی وغیرہم کے مناظروں سے ہلچل مچی ہوئی تھی۔ عوام کو خیال ہونے لگا تھا کہ حکومت تو گئی ہے اب مذہب پر بھی ہاتھ صاف کیا جارہا ہے۔ ہندستانیوں کی اصل متاع مذہب ہی ہے۔ یہ تمام نقصان اور مصیبتیں برداشت کرسکتا ہے لیکن مذہب پر آنچ نہیں آنے دیتا۔ صحیح مذہبی حمایت تو علیحدہ رہی غلط جوش مذہبی پر بھی جان دے دیتا ہے چنانچہ آج بھی اس کی ہزاروں مثالیں ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں۔ سرسید احمد خاں اسباب سرکشی ہندستان میں لکھتے ہیں :

"۱۸۵۵ء میں کلکتہ سے پادری صاحبان امی ایڈمنڈ نے تمام سرکاری ہندستانی عہدیداروں کے نام گشتی چٹھی بھیجی تھی کہ :

"برٹش راج میں تمام ہندستان میں ایک عملداری ہوگئی ہے۔ تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہوگئی۔ ریلوے سڑک سے سب جگہ کی آمد و رفت ایک ہوگئی مذہب بھی ایک چاہئے اس لئے مناسب ہے کہ تم لوگ بھی عیسائی ایک مذہب ہوجاؤ۔"

علامہ کا بچپن، جوانی اور کہولت دہلی میں گزرے۔ آخر میں لکھنؤ پہنچے وہاں کی حالت دہلی سے بھی بدتر پائی۔ بادشاہ دہلی اور والیٔ اودھ برائے نام حکمران تھے۔ آخرالذکر نے تو لٹیا ہی ڈبو دی تھی۔ مسجد ہنومان گڑھی شہید ہوئی۔ مسلمان مجاہدین کفار کے ہاتھوں خاک و خون میں لتھڑے۔ امیر علی شاہ توپ دم ہوئے۔ مجاہدین سرکاری فوج کے ہاتھوں کشتہ ہوئے۔ ناموسِ اسلام کی بے عزتی اور اسلامی شعائر کی بربادی پر بھی واجد علی شاہ کو عیش و عشرت کی پڑی تھی۔ علامہ صدر الصدور تھے۔ ان واقعات سے متاثر ہوکر لکھنؤ چھوڑ کر ۱۸۵۶ء میں الور چلے گئے مگر دل بے چین رہا کہ اتنے میں کچھ شورش اٹھتی نظر آئی۔ دربار دہلی سے راجاؤں کے نام خطوط بھی روانہ ہوئے۔ علامہ نے راجہ الور سے بھی گفتگوئیں کیں وہ رام نہ ہوا۔ وہاں سے چل کھڑے ہوئے راہ میں زمینداروں کو تلقین کرتے ہوئے چلے۔ اس سے قبل مولوی احمد اللہ شاہ دلاور جنگ

مدراسی سے سرگوشیاں ہو چکی تھیں۔ دلاور جنگ فیض آباد چلے گئے تھے اور ہنگامہ ہوتے ہی لکھنؤ پر آکر قابض ہو گئے۔

شاہِ اودھ کی معزولی، بادشاہِ دہلی کے نام نہاد خطابات سے منصوبۂ محرومی اور مذہب عیسوی کی بہ جبر نشر و اشاعت نے فرنگیوں کو بالکل بے نقاب کر دیا تھا۔

کارتوسوں کی چربی سے دل کا غبار آتش فشاں بن کر پھوٹ پڑا۔ اس نے بارود پر فلیتہ کا کام دیا۔ لکھنؤ میں ۱۲؍ ذیقعدہ ۱۲۷۳ھ مطابق ۵؍ جولائی ۱۸۵۷ء بروز یکشنبہ مرزا رمضان علی عرف برجیس قدر بن واجد علی شاہ کو حضرت محل کی منظوری سے ممّو خاں کی سرکردگی میں فوجی سالاروں نے باقاعدہ تخت نشین کر دیا۔[1] احمد اللہ شاہ مدراسی دلاور جنگ پہلے قابض ہو کر شہر کا بندوبست کر چکے تھے۔ اب تلنگے جا بجا متعین ہوئے۔ شاہ جی سخت سست کہہ کر چپ ہو گئے۔ بیلی گارد پر انگریزوں سے چھ روز تک لڑائی ہوتی رہی۔ ۱۰؍ جولائی کی شام کو جمعہ کے دن پسپا ہو کر ہٹ آئے۔[2]

علامہ الور سے نشر و اشاعت کرتے ہوئے اگست ۱۸۵۷ء میں دہلی پہنچے۔ میرٹھ اور دوسری چھاؤنیوں میں کارتوسوں کا قضیہ ورپکڑ چکا تھا۔ گائے اور سور کی چربی کی آمیزش کی خبر سے ہندو اور مسلمان فوجی بگڑ بیٹھے تھے۔ روٹی کی ٹکیا کی تقسیم کسی خاص اسکیم کے ماتحت گاؤں گاؤں پہلے سے ہو ہی چکی تھی۔

میرٹھ سے دہلی پر "باغی" فوج نے ۱۱؍ مئی ۱۸۵۷ء کو حملہ کر دیا۔ قتل و غارتگری کا بازار گرم ہوا۔ بادشاہِ دہلی سرگرمیوں کا مرکز بنے۔ علامہ بھی شریکِ مشورہ رہے۔ منشی جیون لال اپنے روزنامچہ میں لکھتے ہیں:

۱۶؍ اگست ۱۸۵۷ء — مولوی فضل حق شریکِ دربار ہوئے انہوں نے اشرفی نذر میں پیش کی اور صورتِ حالات کے متعلق بادشاہ سے گفتگو کی۔

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۲۲۵ مصنفہ میر محمد زائر۔ [2] ایضاً ص ۲۲۳۔

۲ ستمبر ۱۸۵۷ء	بادشاہ دربارِ عام میں تشریف فرما ہوئے۔ مرزا الٰہی بخش، مولوی فضل حق، میر سعید علی خان اور حکیم عبد الحق آداب بجالائے۔
۶ ستمبر ۱۸۵۷ء	مولوی فضل حق نے اطلاع دی کہ متھرا کی فوج آگرہ چلی گئی ہے اور انگریزوں کو شکست دینے کے بعد شہر پر حملہ کر رہی ہے۔
۷ ستمبر ۱۸۵۷ء	بادشاہ دربارِ خاص میں رہے۔ حکیم عبد الحق، میر سعید علی خاں، مولوی فضل حق، بدر الدین خاں اور دیگر تمام امراء و رؤسا شریکِ دربار رہے۔ [1]

اس روزنامچہ سے علامہ کی باخبری اور انقلابی سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ موجودہ صورتِ حالات کے متعلق بادشاہ سے گفتگو کی۔ بادشاہ سراسیمہ تھے۔ شہزادوں کی لوٹ کھسوٹ اور تختِ شاہی کی تمناؤں نے باہمی رقابت کا میدان گرم کر رکھا تھا۔ عمائدِ شہر میں دو گروہ تھے۔ ایک بادشاہ کا ہمنوا اور دوسرا حکومت کمپنی کا بہی خواہ۔ فوجوں میں طمع اور لالچ نے گھر کر لیا تھا۔ دو ایک جماعتیں مقصدِ اعلیٰ کو سامنے رکھے ہوئے تھیں۔ ایک جماعت مجاہدین کی تھی، دوسری روہیلوں کی۔ یہ جنرل بخت خان کی سرداری میں دادِ شجاعت دے رہی تھی۔ علامہ سے جنرل بخت خاں ملنے پہنچے۔ مشورہ کے بعد علامہ نے آخری تیر ترکش سے نکالا۔ بعد نمازِ جمعہ جامع مسجد میں علماء کے سامنے تقریر کی۔ استفتاء پیش کیا۔ مفتی صدر الدین خاں آزردہ صدر الصدور دہلی، مولوی عبد القادر، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولانا فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبر آبادی، سید مبارک شاہ رامپوری نے دستخط کر دیے۔ اس فتوے کے شائع ہوتے ہی ملک میں عام شورش بڑھ گئی۔ دہلی میں نوّے ہزار سپاہ جمع ہو گئی تھی۔ [2]

جنرل بخت خاں کی اسکیموں میں مرزا مغل آڑے آتے تھے۔ مرزا الٰہی بخش نے بادشاہ سے

---

[1] غدر کی صبح و شام۔ روزنامچہ منشی جیون لال صفحہ ۲۱۷، ۲۳۰، ۲۳۶، ۲۴۷۔ [2] تاریخ ذکاء اللہ۔

سرکار میں معافی کا خط بھی بھجوا دیا تھا، کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ مرزا مغل کی وجہ سے فوج میں پھوٹ پڑ گئی جنرل بخت خاں سے لوگ بگڑ گئے۔ کمپنی کی فوج نے ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو شہر دہلی پر حملہ کر دیا اور ۱۹ ستمبر کو مکمل طور پر انگریز قابض ہو گئے۔

بادشاہ جو اس درمیان میں قلعہ سے نکل کر مقبرۂ ہمایوں میں پناہ گزیں ہو چکے تھے مع متعلقین گرفتار کر کے قلعہ میں نظر بند کر دیئے گئے۔ تین شاہزادوں کو قلعہ میں داخل ہوتے ہی گولی کا نشانہ بنایا گیا اور ان کے سروں کو خوان پوش سے ڈھک کر خوان میں لگا کر بادشاہ کے سامنے بطور تحفہ پیش کیا گیا انھیں میں مرزا مغل بھی تھے۔ جنرل بخت خاں اپنی فوج اور توپخانہ کو نکال لے گئے۔ بادشاہ سے کہا آپ بھی میرے ساتھ چلیں مگر وہ زینت محل اور مرزا الٰہی بخش کے ہاتھ میں کھلونا بن چکے تھے آمادہ نہ ہوئے جنرل بخت خاں، ڈاکٹر وزیر خاں، مولوی فیض احمد وغیرہم سب لکھنؤ چلے گئے۔

یہ سب لوگ لکھنؤ پہنچکر احمد اللہ شاہ دلاور جنگ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے خوب خوب مقابلے رہے۔ بالآخر شکست کھا کر شاہجہانپور روانہ ہو گئے۔ محمدی پور میں اسلامی حکومت قائم کر لی گئی۔ نانا صاحب پیشوا مولوی عظیم اللہ کانپوری، شہزادہ فیروز شاہ وغیرہم سب یہیں جمع ہو گئے۔ آخری جنگ انگریزوں سے شاہجہانپور میں ہوئی۔ یہاں بھی شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور یہ سب لوگ نیپال چلے گئے۔ دلاور جنگ کو راجہ پوائیں بلدیو سنگھ نے دعوت کے بہانے سے بلا کر دھوکہ سے ۱۵ جون ۱۸۵۸ء مطابق ۲ ذیقعدہ ۱۲۷۴ھ کو شہید کر دیا۔ دریا پار محلہ جہان آباد متصل احمد پورہ مسجد کے پہلو میں سر دفن ہوا۔

علامہ دہلی سے ۲۴ ستمبر کو روانہ ہو گئے تھے[۱] اس طرح ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی و ۱۷۹۹ء

---

[۱] علامہ نے رسالہ ثورۃ الہندیہ میں لکھا ہے کہ انگریزوں کے قبضے کے بعد پانچ یوم تک بھوکے پیاسے مکان کے اندر بند رہے۔ پانچویں روز اہل و عیال اور ضروری سامان لیکر شب میں چھپ کر نکلے، دریا عبور کئے، میدان قطع کئے۔ نواب صدر یار جنگ بہادر کا بیان ہے کہ علامہ مع متعلقین بھیکن پور ضلع علیگڈھ آکر ۱۸ روز رہے۔ صاحبزادہ مولانا عبد الحق بھی ساتھ تھے۔ ۱۸ یوم کے بعد موصوف کے عم محترم نواب عبد الشکور خاں رئیس بھیکن پور نے سالکہ کے گھاٹ سے جو بھیکن پور سے آٹھ میل ہے اور موصوف اور ان کے عزیزوں کی علداری میں واقع تھا اور اب بھی ہے، اپنے انتظام سے بدایوں اور بریلی کی طرف اتروا دیا تھا۔ نواب صدر یار جنگ بہادر نے مجھے وہ کمرہ بھی بتایا جس میں علامہ فروکش ہوئے تھے۔ بھیکن پور کی گڑھی میں برج پر جانب مشرق واقع ہے اب سر عبد الصبور خاں شروانی بی اے علیگ کے تصرف میں ہے۔ نواب صدر یار جنگ ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے۔ علامہ کے ورود اور ہنگامۂ ۵۷ء کے ۹ سال بعد۔ بچپن میں والد ماجد اور عم محترم سے یہ واقعات سنے اور فطرت خداداد کی بنا پر انھیں یاد رکھا۔ موصوف نے یہ بھی بیان کیا کہ والد ماجد (محمد تقی خاں) اور مولانا عبد الحق میں کافی تعلقات بھی ہو گئے جو بعد میں خط و کتابت کی شکل میں جاری رہے۔ موصوف ہی کی یہ بھی روایت ہے کہ علامہ، صاحبزادہ کو سبق بھی پڑھاتے رہتے۔ بھیکن پور نواب صدر یار جنگ بہادر اور راقم السطور کا مولد و منشاء طفولیت بھی ہے۔

کی جنگِ میسورؔ کی طرح ۱۸۵۷ء کی یہ جنگِ آزادی بھی ہندستانیوں کی شکست اور انگریزوں کی فتح پر ختم ہوئی ؎

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میرؔ　　مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

۱۹ ستمبر کے بعد ہندستانیوں پر جو مصائب کے پہاڑ ٹوٹے اسکی نظیر تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ یوں تو دہلیؔ نے بہت سے ہنگامے دیکھے تھے۔ نادر شاہ درّانی کا ایام عیدالاضحیٰ میں قربانی کے جانوروں کی جگہ انسانوں کا ذبح عام اور شہر کی نالیوں میں پانی کے بجائے خون کی روانی دیکھی تھی" ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت" کے مطابق شہر کا اجڑنا اور دوسری جگہ آباد ہونا، دارالسلطنت پر حملہ آوری اور اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْا اَعِزَّةَ اَهْلِهَا اَذِلَّةً کے بموجب شرفاء کی ذلت وخواری بھی نظر سے گزری[1] تھی مگر ایسے مظالم !

---

[1] دہلی اصل میں دہلو ہے۔ حضرت امیر خسرو نے ایک شعر میں جلال الدین فیروز شاہ کو شکارگاہ میں مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا ؎

باکہ ایں ہم بخشش یاز آخور لغر باد ستگیر　　یا لغرماں دہ کہ گردوں شیئم و دہلو روم

سب سے پہلے اس شہر کو راجہ یدہشٹر نے ۱۴۵۰ ق م آباد کیا اور اندرپت کے نام سے شہرت دی۔ اب اس کے آثار بھی مفقود ہو چکے ہیں۔ جہاں شہر تھا اب کاشت ہوتی ہے۔ ۳۲۸ ق م راجہ قنوج دہلو نے از سر نو شہر آباد کر کے اپنے نام سے مشہور کیا۔ ۵۰۷ھ میں راجہ انکپال تنور نے قلعہ تعمیر کرایا جو دہلی سے بجانب جنوب "پرانا قلعہ" کے نام سے مشہور ہے۔ (ہمایوں بادشاہ نے ۹۴۰ھ میں اس کی مرمت کرا کے شہر دین پناہ نام رکھا اور شیر شاہ نے اپنے زمانے میں اس کی ترمیم کر کے شیر گڑھ نام رکھ دیا) راجہ رائے پتھورا نے ۵۲۰ھ میں بارہ دروازہ کا قلعہ بنایا۔ ایک دروازہ کا نام "دروازہ غزنی" تھا۔ قطب الدین ایبک نے ۶۰۲ھ میں اس قلعہ میں قصر سفید اور غیاث الدین بلبن نے ۶۶۵ھ میں لال محل بنوایا۔ اسی بادشاہ نے ایک قلعہ بنوایا جس کا نام غیاث پور رکھا جہاں آجکل سلطان المشائخ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی آسودہ خواب ہیں۔ سلطان معزالدین کیقباد نے ۶۸۰ھ میں کیلوکھری (جسے قصر معزی بھی کہتے تھے اور اب جس جگہ مقبرۂ ہمایوں ہے) کی بنیاد ڈالی۔ جلال الدین فیروز شاہ خلجی نے ۶۸۸ھ میں لال محل اور اس میں سبز مکان بنوایا جسے نیا شہر کہا جانے لگا۔ علاء الدین خلجی ۷۰۳ھ میں دہلی علائی، قلعہ علائی، کوشک سیری، اور قصر ہزار ستون بنوایا۔ غیاث الدین تغلق شاہ نے ۷۲۱ھ میں تغلق آباد، آباد کیا، اور محمد عادل تغلق نے ۷۲۸ھ میں عادل آباد بنایا جسے محمد آباد کو عمارت ہزار ستون بھی کہا جاتا تھا۔ جہاں پناہ (درمیان دہلی علائی و دہلی کہنہ) اور بدیع منزل بھی تعمیر کرائی۔ فیروز شاہ نے ۷۵۵ھ میں کوٹلہ فیروز شاہ بنایا۔ شہر فیروز آباد متصل کوٹلہ اور کوشک شکار بھی بنائی۔ خضر خاں نے ۸۲۱ھ میں خضر آباد، قطب الدین مبارک شاہ نے مبارک آباد اور اسلام شاہ نے اسلام گڑھ ۹۵۳ھ میں بنایا جس کو نورالدین جہانگیر نے اپنے زمانے میں اس کے سامنے ایک پل تعمیر کرا کے نورگڑھ کے نام سے موسوم کر دیا۔ شیر شاہ نے ۹۴۸ھ میں دہلی شیر شاہ تعمیر کرائی۔ آخر میں شاہجہاں بادشاہ نے ۱۰۶۰ھ میں شاہجہاں آباد، آباد کیا جواب تک دہلی کے نام سے تمام دنیا میں مشہور اور اپنی حالت پر قائم ہے۔ اس کی سر بفلک ولاجواب مسجد اور عالیشان وبے نظیر قلعہ معلیٰ دورِ سلطنت کی شان وشکوہ پورے آن بان

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

"لا عینٌ رأت ولا اذن سمعت و لا خطر علیٰ قلب بشرٍ" نہ آنکھوں نے دیکھے، نہ کانوں نے سُنے، نہ انسان کے دل میں کبھی ان کا خطرہ بھی گزرا، الامان والحفیظ!

مرکنم گریہ اگر تاب شنیدن داری
سینہ بشگافم اگر طاقتِ دیدن داری

ان مظالم کو لکھتے ہوئے دل لرزتا ہے، سینۂ قلم شق اور جگرِ قرطاس پارہ پارہ ہوا جاتا ہے۔ انتقام کی کوئی حد ہوتی ہے۔ اگر ہندستانی فوجیوں نے مذہبی جوش اور ملکی جذبے میں مجنون بن کر اپنی جہالت و حماقت سے کچھ یورپین بچوں اور عورتوں کو قتل کر ڈالا تھا تو یہ کوئی نئی چیز نہ تھی، عوام جوش میں کر ہمیشہ اسی قسم کی حرکتیں کرتے رہے ہیں۔

ابھی ۱۶/ اگست ۱۹۴۶ء کو مسلم لیگ کی جانب سے ڈائرکٹ ایکشن (براہِ راست اقدام) کا دن منانے پر کلکتہ میں کیا کچھ نہ ہوا۔ مسلم لیگی وزارت کے ہوتے ہوئے ہزارہا ہندو مسلمان باہمی جنگ وجدال کی نذر ہو گئے۔ سینکڑوں عورتیں اور بچے سڑکوں پر اعضا بریدہ پڑے ملے۔ وحشت و بربریت، درندگی و شیطنت کا وہ کونسا مظاہرہ تھا جو نہ کیا گیا۔ ایک ہفتہ تک غدر مچا رہا۔ مقتولین و مجروحین کی تعداد چوتھائی لاکھ سے متجاوز ہو گئی۔ یہی "مہذب" ملکوں میں بھی ایسے ہنگامی مواقع پر ہوتا رہتا ہے۔ [۱]

(بقیہ)

سے ظاہر کر رہا ہے۔ دیوارِ شہر پناہ بھی ایک لاکھ پچاس ہزار صرف کر کے تعمیر کرائی جو بارش کے سبب اکثر جگہ سے گر گئی پھر ۱۰۶۹ھ میں چار لاکھ روپیہ میں اس کی عمارت جدید بنوائی جس کا طول چھ ہزار چھ سو چونسٹھ گز، عرض چار گز اور بلندی ۹ گز اور ستائیس برج رکھے گئے۔ انگریزی عملداری میں اس کی مرمت کی گئی۔ اب ۱۹۱۲ء میں لارڈ ہارڈنگ گورنر جنرل ہند کے دورِ نیابت میں شاہجہان آباد سے تین میل جانب شمال نئی دہلی کی بنیاد رکھی گئی جو رائے سینا کے نام سے ۱۹۲۸ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ وائسریگل لاج، کونسل چیمبر اور فوارہ وغیرہ قابلِ دید ہیں۔ اسطرح

ساڑھے تین ہزار برس میں اس خطۂ دہلی نے ۱۴۲ ہندو راجہ اور ۷۶
مسلمان بادشاہوں کا دورِ سطوت وجبروت دیکھا اور بار بار شہر اہلیانِ
شہر کی تباہی و بربادی دیکھی اور پانچ سلاطینِ برطانیہ کا عہدِ حکومت
بھی دیکھا۔ (ارمغانِ ہندستان و آثار الصنادید)

---

[۱] کلکتہ کے بعد نوآکھالی (بنگال)، گڈھ مکتیسر (یوپی) اور پٹنہ صوبہ (بہار) میں جو کچھ ہوا اس درندگی و بہیمیت کی مثال نہیں مل سکتی اور ۴۶ء کا یہ خونی ڈرامہ تاریخِ ہندوستان میں اپنی نظیر پیش نہیں کر سکتا۔

۱۸۵۷ء میں انگریز جیسی دعویدارِ تمدن و تہذیب قوم نے یہ شرمناک اور انسانیت سوز حرکات جوش میں نہیں، ہوش میں کیں۔ غلامی کی لعنت سے متاثر ہو کر نہیں، فاتح و قابض ہونے کے بعد کیں۔ جہالت و حماقت سے نہیں، بزعمِ خود دانشمندی و فرزانگی کے ماتحت کیں۔ غفلت و نادانستگی سے نہیں بلکہ قصداً اور دانستہ کیں۔ خصوصیت سے مسلمانوں کے ساتھ جو ذلت اور جگر خراش برتاؤ کیا وہ بیان سے باہر ہے۔

زندہ مسلمانوں کو سؤر کی کھال میں سلوا کر گرم تیل کے کڑھاؤ میں ڈلوانا، سکھ رجمنٹ سے علی رؤس الاشہاد اغلام کرانا، فتحپوری مسجد سے قلعہ کے دروازے تک درختوں کی شاخوں پر مسلمانوں کی لاشوں کا لٹکانا، مساجد کی بے حرمتی خصوصاً شاہجہانی جامع مسجد دہلی کے حجروں میں گھوڑوں کا باندھنا، عبادت کی جگہ دفاتر قائم کرنا اور حوض میں وضو کے پانی کی جگہ گھوڑوں کی لید ڈالنا، ناقابلِ معافی اور غیر ممکن التلافی جرم ہے۔

منصف مزاج انگریز بھی اس کی مذمت کئے بغیر نہ رہ سکے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے "انقلاب ۵۷ء کا دوسرا رخ" مرتبہ شیخ حسام الدین بی۔ اے امرتسری سابق صدر مجلس احرار اسلام ہند۔

تاریخ عالم شاہد ہے کہ مسلمان قوم کو بھی فتح و ظفر کے ایسے مواقع پیش آئے ہیں لیکن انکا دشمنوں کے ساتھ کیا سلوک رہا۔ اپنوں کا نہیں غیروں کا بیان سنئے، دوستوں کی نہیں دشمنوں کی تحریریں دیکھئے:

کوئی نہیں جانتا کہ چودہ سو سال قبل ۸ھ میں جب مکہ فتح ہوا تو خدا کے آخری برگزیدہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دشمنوں کے ساتھ کیا طرزِ عمل اختیار فرمایا جنہوں نے ذلت و رسوائی اور مصائب و آلام پہنچانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی، تالیاں بجائی تھیں، پتھر مارے تھے، ڈھول اڑائی تھی، آوازے کسے تھے، ساحر، سودائی، مجنون اور دیوانہ خطابات دئے تھے، راستے میں کانٹے بچھائے تھے، پشت پر اونٹ کا اوجھ لادا تھا۔ گردن میں چادر کا پھندا ڈال کر کھینچا تھا

قتل کے منصوبے باندھے تھے اور سب نے آخر یہ کہ وطن سے نکال کر بے گھر اور بے در بنایا تھا۔ اس شاہِ دوجہاں نے فتح کے بعد اعلان کیا جو ہتھیار رکھ دے اسے امان، جو معابد میں مشغولِ عبادت ہو وہ محفوظ، جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے وہ مامون۔ جب دشمنوں کا سامنا ہوتا ہے دریافت فرماتے ہیں مجھ سے کیا توقع رکھتے ہو؟

یک زبان ہو کر کہتے ہیں شریف بھائی اور شریف بھتیجے سے جو توقع ہو سکتی ہے وہی ہم بھی رکھتے ہیں۔

جواب ملتا ہے جاؤ تم سب آزاد ہو!

کئی سو سال کے بعد اسی قسم کا واقعہ اس شاہِ دوسرا کے ادنیٰ غلام سلطان صلاح الدین ایوبی کو بیت المقدس میں پیش آتا ہے۔ اس خطۂ پاک (فلسطین) پر خلیفۂ دوم حضرت امیر المؤمنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے خود بہ نفسِ نفیس صلح و آشتی کے ساتھ قبضہ فرمایا تھا۔ اس وقت سے تقریباً ساڑھے چار سو سال تک پرچمِ اسلام لہراتا رہا۔ ۱۰۹۹ عیسوی میں عیسائیوں نے اس پر تسلط قائم کر لیا مگر کس شان سے؟ ایک انگریز مؤرخ ہی کے قلم کے رشحات دیکھئے:

"جب گوڈفرے اور ٹنکرو، یروشلم کے کوچہ و بازار سے گزر رہے تھے تو وہاں مردے پڑے اور جاں بہ لب زخمی لوٹتے تھے جبکہ بے گناہ اور لاچار مسلمانوں کو ان صلیبیوں نے سخت اذیتیں دے کر مارا تھا اور زندہ آدمیوں کو جلایا تھا جہاں قدس کی چھتوں اور برجوں پر جو مسلمان پناہ لینے چڑھے تھے وہیں ان صلیبیوں نے اپنے تیروں سے چھید کر گرایا تھا۔" [1]

۹۰ برس کے بعد ۲۶ ستمبر ۱۱۸۷ مطابق ۲۷ رجب ۵۸۳ھ کو سلطان نے فوج کشی کر کے اور شاہ رچرڈ وغیرہ سے لڑائیاں لڑ کر فلسطین پر علمِ اسلام لہرا دیا۔ مدتوں کی جنگ کے

---

[1] اردو ترجمہ سلطان صلاح الدین ایوبی ص۲۰۲ مصنفہ انگریز مؤرخ سٹینلے لین پول۔ [2] اردو ترجمہ سلطان صلاح الدین ایوبی ص۲۰۳ تا ۲۰۵۔

بعد اس عظیم الشان فتح پر اعلانِ عام کر دیا کہ دس اشرفی زرِ فدیہ دیکر ہر عیسائی اپنے مال و سامان لیکر امن و امان کے ساتھ شہر چھوڑ سکتا ہے۔ چالیس دن کی مہلت بھی دی گئی۔

جو لوگ غریب تھے ان میں سے سات ہزار کو شاہِ انگلستان کی رقم سے فدیہ ادا کر کے رہا کرایا گیا۔ کوکبری نے شہر الرہا کے ایک ہزار آرمینیوں کو فدیہ دیکر آزاد کرایا۔ برادرِ سلطان ملک العادل نے شاہ رچرڈ کی دوستی کی بنا پر سلطان سے ایک ہزار غلام مانگ کر اپنی طرف سے آزاد کر دئے۔ بطریق اعظم اور بلیان سفیر نے بھی جرأت کر کے سلطان سے ملک العادل کے برابر غلام مانگے جو اجازت ملنے پر آزاد کر دئے گئے۔ باقیماندہ عیسائیوں کو سلطان نے اپنی طرف سے آزاد کر دیا امراء اور شہسواروں کی بہو بیٹیوں نے فریاد کی کہ ہمارے شوہر اور سرپرست یا تو مارے گئے یا قید و بند میں ہیں، ہماری دستگیری کی جائے۔ سلطان نے ان کی آہ و زاری سے متأثر ہو کر قیدیوں کو رہا کیا اور جو مارے گئے تھے ان کے پسماندگان کو خزانے سے اس قدر روپیہ دلایا کہ سب مطمئن اور خوش خوش واپس گئیں۔ ؎

یہ تھا مسلمانوں کا انتقام! اور یہ تھی بدترین دشمنوں کے ساتھ رواداری! "غیر متمدن" دنیا کے ان تاریخی حقائق کے بعد دورِ تہذیب و تمدن کے علمبردار یورپ کے ان کرتوتوں پر کون انصاف پسند انسان شرم سے گردن نہ جھکا لے گا؟

علماء، وامراء، خواص و عوام کی تباہی و بربادی کی داستان بڑی طویل ہے۔ قابل ذکر کچھ نام ذکر کئے جاتے ہیں:-

"غدر" ۵۷ء کے بعد پھانسی پانیوالے یا گولیوں سے اڑائے جانیوالے

۱۔ نواب عبدالرحمٰن خاں والیٔ جھجر (مع ضبطیٔ جائداد)

۲۔ راجہ ناہر سنگھ رئیس بلب گڑھ

۳۔ نواب مظفر الدولہ

۴۔ نواب میر خاں پنشن دار و جاگیر دار پلول

۵۔ نواب اکبر خاں بن فیض اللہ خاں بنگش

۶۔ احمد مرزا

۷۔ میر محمد حسین

۸۔ حکیم عبد الحق بن حکیم بخش

۹۔ قاضی فیض اللہ کشمیری سرشتہ دار
صدر الصدور

۱۰۔ میر پنجہ کش مشہور خوشنویس

۱۱۔ مشہور شاعر مولوی امام بخش صہبائی

۱۲۔ نواب احمد قلی خاں (جیل میں موت واقع ہوگئی)

۱۳۔ نواب محمد حسین خاں

۱۴۔ نظام الدین خاں بن حکیم شرف الدین خاں

۱۵۔ خلیفہ اسمٰعیل خلف استاد ذوق

۱۶۔ محمد لعل خاں خلف نواب شیر جنگ خاں

۱۷۔ عبد الصمد خاں بن علی محمد خاں
رسالدار شاہی فوج

۱۸۔ دلدار علی خاں کپتان

۱۹۔ میاں حسن عسکری صوفی

۲۰۔ غلام محمد خاں عم نواب احمد علی خاں رئیس فرخ نگر

دہلی چھوڑ کر غریب الوطنی کی زندگی بسر کرنیوالے

۱۔ میاں غلام نظام الدین

۲۔ نواب غلام محی الدین خاں پنشن دار

۳۔ حکیم محمود خاں والد مسیح الملک حکیم اجمل خاں
۴۔ حکیم مرتضیٰ خاں
۵۔ نواب یعقوب علی خاں
(گوجروں نے لوٹ کر قتل کر ڈالا)
۶۔ مرزا فاضل بیگ
۷۔ عبدالحکیم خاں نائب کوتوال (مع ضبطی جائداد)
۸۔ منشی آغا جان محرر الجنبشی
۹۔ صفدر سلطان بخشی
۱۰۔ نواب سید حامد علی خاں رئیس بریت
۱۱۔ مرزا معین الدین خاں
تھانیدار پہاڑ گنج
۱۲۔ محمد حسین خاں تھانیدار بدرپور
۱۳۔ راجہ رام جیداس گڑھ والے
۱۴۔ ضیاء الدولہ خلف حکیم رکن الدولہ
۱۵۔ موسیٰ خاں بن حافظ عبدالرحمٰن خاں
مختار مرزا نیلی
۱۶۔ عبدالصمد خاں خسر نواب جھجر
۱۷۔ حکیم امام الدین خاں بن حکیم غلام رضا خاں
۱۸۔ نواب حسن علی خاں برادر نواب جھجر
۱۹۔ سعادت علی خاں خلف حسن علی خاں

۲۰۔ میر نواب نائب کپتان

۲۱۔ نواب عبدالرحمٰن خاں

۲۲۔ نواب علی محمد خاں عم والیٔ جھجر

۲۳۔ راجہ جیت سنگھ عم راجہ نریندر سنگھ رئیس پٹیالہ

۲۴۔ غلام فخرالدین خاں تحصیلدار ڈٹ قاسم۔

ان کے علاوہ حیدر خاں اور اشرف خاں مخبران نے ایک سوسات نوجوانوں کو الور سے گرفتار کرا کے دہلی بھیجا۔ آدھے گوڑگاؤں میں قتل کر دیئے گئے باقی کو دہلی میں پھانسی دی گئی۔ اسی طرح کے بیسیوں حادثات ہیں کہاں تک بیان کئے جائیں۔

مفتی صدرالدین خان آزردہ صدر الصدور، مرزا اسداللہ خاں غالب اور نواب مصطفیٰ حسین خاں شیفتہ وغیرہم بھی دھر لئے گئے۔ ان اکابر کو بڑی دشواریوں کے بعد نجات مل سکی۔ پنشنوں اور جاگیروں پر زد پھر بھی باقی رہی۔

سید اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی، مولانا مفتی عنایت احمد کاکوروی، مفتی مظہر کریم دریا بادی وغیرہم کو بجرم بغاوت کالے پانی کی سزا ہوئی۔

علامہ فضل حق کو بھی "باغی" قرار دیا گیا، اسیر فرنگ ہو کر بند ہوئے۔ ۱۲۷۵ھ مطابق ۱۸۵۹ء میں لکھنؤ میں مقدمہ چلا۔ علامہ کے ثبات واستقلال، صداقت وحقانیت اور بلند ہمتی وشیر دلی کے لئے سیرالعلما کی یہ عبارت کافی ہے:

"۱۸۵۹ء میں سلطنت مغلیہ کی وفاداری یا فتوئے جہاد کی پاداش یا بجرم بغاوت میں مولانا ماخوذ ہو کر سیتاپور سے لکھنؤ لائے گئے۔ مقدمہ چلا۔ مولانا موصوف کے فیصلے کے لئے جیوری بیٹھی۔ ایک اسیسر نے واقعات سنکر بالکل چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ سرکاری وکیل کے مقابل خود مولانا بحث کرتے تھے بلکہ لطف یہ تھا کہ چند الزام اپنے اوپر خود قائم کئے اور پھر خود ہی مثل تار عنکبوت عقلی وقانونی ادلہ

سے توڑ دئے۔ جج یہ رنگ دیکھ کر پریشان تھا اور ان سے ہمدردی بھی تھی۔ جج نے صدرالصدوری کے عہد میں مولانا سے کچھ عرصہ کام بھی سیکھا تھا۔ وہ مولانا کی عظمت و تبحر سے بھی واقف تھا۔ وہ دل سے چاہتا تھا کہ مولانا بری ہو جائیں۔ کرے تو کیا کرے۔ ظاہر یہ ہو رہا تھا کہ مولانا بری ہو جائیں گے۔ سرکاری وکیل لاجواب تھے۔ چنانچہ پیروکار مقدمہ منشی کرم احمد خیرآبادی نے لکھنؤ سے سید اعظم علی کے نام خیرآباد یہ خط لکھا:

"مدت یک دو روز است کہ جناب مخدوم الاخوان بحسب تقدیر مبتلائے حبس شدہ از سیتاپور بہ لکھنؤ برائے روبکاری صفائی روانہ کردہ شدہ اند، زبانی آیندہ ہرگاہی ہم از تحریرات آنجا ہر روزہ منکشف میشود کہ امروز فردا بفضلہ تعالےٰ رہائی خواہد شد۔ روز بنا برادائے شہادت صفائی، مولوی صاحب مکرم مولوی نبی بخش صاحب، مشفقی مولوی قادر بخش صاحب و برخوردار مولوی سید ضامن حسین بموجب درخواست مولوی عبدالحق (خلفِ علامہ) بہ معیتِ ایشاں روانہ لکھنؤ شدہ اند و ہمگیاں را امید از خدائے کریم است دیگر روز بالضرور مخلصی یافتہ وارد بر دولتخانہ خواہد شد۔ او تعالیٰ ہم چنیں کند۔ ہمہ ہا از خورد و کلاں و ذکور و اناث چشم براہ انتظار کشادہ می باشند و رنج و قلقے عظیم دارند۔ ایزد جل و علا بر جمیع کساں رحم خود فرمایند۔"

دوسرا دن آخری دن تھا۔ مولانا نے اپنے اوپر جس قدر الزام لئے تھے ایک ایک کر کے سب رد کر دئے۔ جس مخبر نے فتوے کی خبر کی تھی اس کے بیان کی تصدیق و توثیق کی۔ فرمایا:

"پہلے اس گواہ نے سچ کہا تھا اور رپورٹ بالکل صحیح لکھوائی تھی اب عدالت میں میری صورت دیکھ کر مرعوب ہو گیا اور جھوٹ بولا: "وہ فتویٰ صحیح ہے۔ میرا لکھا ہوا ہے اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے۔"

جج بار بار علّامہ کو روکتا تھا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، مخبر نے عدالت کا رخ اور علّامہ کی بارعب و پُروقار شکل دیکھ کر شناخت کرنے سے گریز کرتے ہوئے کہہ ہی دیا تھا کہ یہ وہ مولانا فضل حق نہیں وہ دوسرے تھے۔ گواہ حسنِ صورت اور پاکیزگی سیرت سے بے انتہا متاثر ہو چکا تھا مگر

بن گئے تھے۔ تاریخی یادداشت، ترتیبِ واقعات، قواعدِ فنون، ضوابطِ علوم سبھی حیرت انگیز کرشمے دکھارہے ہیں۔ ایک انگریز کی فرمائش پر تقویم البلدان کا ترجمہ کیا جو دو برس میں ختم ہوا اور وہی رہائی کا سبب بنا۔ واپسیٔ ہندستان پر شاگردِ رشید مفتی لطف اللہ علیگڈھی نے تاریخ لکھ کر پیش کی:

چوں بفضلِ خالقِ ارض و سما — اوستادم شد زقیدِ غم رہا

بہرِ تاریخ خلاصِ آنجناب — بر نوشتم "اِنَّ اُستاذی نجا" [۱]

مفتی مظہر کریم نے میجر جان ہاٹن بہادر کمشنر جزائر دریائے شور کی فرمائش پر "مراصد الاطلاع" کا ترجمہ کیا۔ سید اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی نے ۱۵ اشعار میں تاریخ لکھی۔ آخری شعر یہ ہے:

منیر اس کی کہی تاریخ یوں سالِ مسیحی میں

یہی سیرِ جدید بوستانِ ہفت کشور ہے [۲]

علامہ نے بھی کئی مفید تصانیف لکھیں۔ انہیں میں سے رسالہ الثورۃ الہندیہ اور قصائد فتنۃ الہند ہیں۔ یہ رسالہ اور قصائد جہاں تاریخی ہیں، عربی ادبیت کے بھی شاہکار ہیں۔ علامہ کا کمال یہ ہے کہ اشعار اور جملوں میں ایک مادہ کے مختلف صیغے متعدد معنوں میں بے تکلف استعمال کرتے چلے جاتے ہیں۔ نظم و نثر دونوں اصناف میں اس کا ظہور برابر نظر آتا ہے۔ مثال کے لیے حسبِ ذیل عبارت و اشعار کافی ہیں۔ یہ رسالہ مع قصائد علامہ نے مفتی عنایت احمد کاکوری کے ذریعہ ۱۲۷۷ھ میں خلف الصدق مولانا عبدالحق کے پاس بھیجا تھا کہ اُن میاں کو جاکر یہ تحفہ دے دینا۔ پنسل اور کوئلہ سے لکھے ہوئے مختلف پرچے تھے جن کو کئی ماہ کی محنت کے بعد درست و مرتب کر پائے تھے:

الحمد للہ عظیم الرجاء، للہ نجد، من دون الارجاء، من البلوی والبلی والبلاء، وایلاء حسن البلاء، بایتاء الآلاء، لمن دعاہ باسنی الاسماء، لاسیما لمن ظلم واضطر عند الابتلاء، بالاسواء والادواء۔

ما ناح اورق فی اوراق اشجان — الا وھیج اشجانی واشجانی

---

[۱] استاذ العلماء مؤلفہ نواب صدر یار جنگ بہادر [۲] کلیاتِ منیر شکوہ آبادی

عودی فعودی مریضادانہ عادی | اشفی علی الحین حتی عادہ العادی
دائی عضال وابجدی لعائدۃ | عود لداء لعود الداء عوّاد

علامہ اور ان کے ساتھیوں کو کیا کیا تکالیف اٹھانا پڑیں اور انڈمان میں کیسے ذلّت آمیز برتاؤ سے سابقہ رہا، رسالہ وقصائد میں اس کا مفصل ذکر موجود ہے۔ سپرنٹنڈنٹ ایک شریف انگریز تھا۔ مشرقی علوم سے واقف اور فنِ ہیئت کا بڑا ماہر تھا۔ اس کی پیشی میں ایک سزا یافتہ مولوی بھی تھے اپنی ایک فارسی کی کتاب ہیئت ان کو دی کہ اس کی عبارت صحیح و درست کر دیں۔ مولوی صاحب سے تو کام چلا نہیں، علامہ نئے نئے گئے تھے۔ ایک سال ہی گذرا تھا، ان کی خدمت میں وہ کتاب پیش کر کے تصحیح کی گذارش کی، علامہ نے نہ صرف عبارت درست کی بلکہ مباحث میں بہت کچھ اضافہ کر کے حاشیہ پر بہت سی کتب کے حوالے لکھ دیئے۔ یہ کتاب وہ مولوی صاحب سپرنٹنڈنٹ کے پاس لے گئے۔ وہ دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا۔ کہنے لگا مولوی صاحب! "تم بڑا لائق آدمی ہے مگر جن کتابوں کے حوالے ہیں اور ان کی جو عبارتیں نقل ہیں یہاں کہاں ہیں؟"

مولوی صاحب مسکرائے اور اصل واقعہ علامہ کا کہہ سنایا۔ وہ اسی وقت مولوی صاحب کو لیکر بارک میں آیا۔ علامہ موجود نہ تھے۔ کچھ دیر انتظار کے بعد دیکھا کہ ٹوکرا بغل میں دبائے چلے آرہے ہیں وہ یہ ہیئت دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ معذرت کے بعد کلرکی میں لے لیا۔ گورنمنٹ میں سفارش بھی کی۔ ادھر علامہ کے صاحبزادے مولوی شمس الحق اور خواجہ غلام غوث بے خبر میر منشی لفٹیننٹ مغربی وشمالی صوبہ اودھ سرگرم سعی تھے۔ پروانۂ رہائی[ع] حاصل کر کے مولوی شمس الحق انڈمان روانہ ہو گئے۔ وہاں جہاز سے اتر کے شہر میں گئے تو ایک جنازہ نظر پڑا۔ اس کے ساتھ بڑا اژدھام تھا

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کل ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء کو علامہ فضل حق خیرآبادی کا انتقال ہو گیا ہے۔ اب سپردِ خاک کرنے جا رہے ہیں۔ یہ بھی بصد حسرت و یاس شریکِ دفن ہوئے اور بے نیلِ مرام واپس لوٹے۔

قسمت کی بدنصیبی کہاں ٹوٹی ہے کمند | دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

[ع] پروانۂ رہائی دستی لے جانے کا واقعہ بے اصل ہے۔ ۱۲ محمد موسیٰ عفی عنہ

افسوس! ہمیشہ کے لئے یہ آفتاب علم و عمل دیارِ غربت میں غروب ہوگیا۔ اب تک مزار مرجعِ انام اور زیارت گاہِ خاص و عام ہے اور آج بھی قبر بزبانِ حال کہہ رہی ہے :

تلك آثارنا تدل علينا فانظروا بعدنا الى الآثار

مولانا عبد اللہ بلگرامی لکھتے ہیں :

"فادرج الفضل فی اثناء اکفانه و دفن العلم بانه فانه" [ع]

(ع فضل ان کے کفن میں مکفون اور علم ان کے ساتھ مدفون ہوگیا)

دوسری جگہ لکھتے ہیں :

تبحر فی العلوم العقلية والنقلية و اناف على المهرة الكملة بالنفس القدسية حتى امتلأت الآفاق بصيت كماله و شحنت الاقطار بفضله وجلاله و كان الغالب عليه من العلوم المعقول ومن المنقولات العلوم الادبية والكلام والاصول اما المعقولات فرزق فيها نفسا قدسية وملكة ملكوتية كان يرى الطالبين نظرياتها ببيانه الصافي كالمحسوسات المرئية و اما ارتجاله بالخطب والاشعار العربية مع التجنيس والاشتقاق وحسن البراعة والطباق وغيرها من الصنائع الادبية. فلم يخلق مثله فى البلاد ولم يأت عديله فيما افاد واجاد ۔ [1]

ترجمہ : علومِ عقلیہ و نقلیہ کے متبحر اور ماہرین کاملین پر نفسِ قدسیہ کے باعث فائق تھے ، آپ کے کمال کی شہرت سارے زمانے میں پہنچی ہوئی تھی۔ اور آپ کے فضل و جلال سے سارا آفاق گونج رہا تھا۔ علوم میں فنِ معقول کا غلبہ تھا اور منقولات میں ادب ، کلام اور اصول پر توجہ خاص تھی۔ معقولات میں نفسِ قدسیہ اور ملکۂ ملکوتیہ کو درج فرمایا طلبہ ان کے بیانِ صافی کی وجہ سے نظریاتِ معقولات کو بالکل محسوس و مرئی پاتے تھے

---

[1] خطبۂ مدیہ سعیدیہ ۔

خطبات واشعار فی البدیہہ فرماتے تھے۔ تمام صنائعِ ادبیہ تجنیس، اشتقاق، حسن براعت اور صنعتِ طباق کا ارتجال کے باوجود پورا پورا مظاہرہ ہوتا تھا۔ انھیں کمالات کے پیشِ نظر اپنے علم وفضل میں بے نظیر اور افادہ و تلقین میں بے عدیل تھے۔"

مصائب کا خاتمہ علامہ کی ذات ہی پر نہیں ہو جاتا، اولاد واحفاد کو بھی پریشانیوں کا سامنا رہا۔ سب سے بڑی مصیبت ضبطیِ جائداد واملاک کی تھی۔ علامہ بڑے امیر کبیر تھے۔ دولتِ دنیا ودین دونوں سے بہرہ ور اور صاحبِ عزو وقار تھے۔ حکامِ وقت، شاہزادگانِ عالی تبار، امراء ورؤسا، اور علماء وصلحا سبھی عزت کرتے تھے۔ شاہانہ زندگی گذاری۔ ہاتھی، گھوڑے، پالکی، فینس اور دوسری شان وشوکت کی سواریاں ہر وقت دروازے پر موجود رہتیں۔ جب مولانا عبد الحق پیدا ہوئے تو دہلی کے خواص وعوام اور برادرانِ وطن نے بھی بطور اظہارِ خوشی نذرانے اور تحفے لاکھوں روپیہ کے پیش کیے۔ [1]

تحدیث بالنعمۃ کے طور پر خود علامہ نے اپنے قصیدہ ہمزیہ میں اپنے ترفہ وفراغت کا ذکر فرمایا ہے:۔

کانت لفضل الحق فضل مثالۃ ۔۔۔ منہا علی الامثال لی استعلاء
ووجاہۃ بین الوجوہ وجاہۃ ۔۔۔ تعنو لہا الاعیان و الرؤساء
وبراعۃ وبراعۃ ورفاہۃ ۔۔۔ ونزاہۃ و نباہۃ وعلاء

جرمِ بغاوت ثابت ہو جانے پر خیر آباد کا سنگین وعالیشان دیوانخانہ اور محل سرا ضبط کر کے بہ صلۂ خیر خواہی سردار محمد ہاشم شیعی سیتاپوری (مورثِ اعلیٰ آغا فتح شاہ مشہور پلیڈر سیتاپور) کو دیدیے گئے انہوں نے رئیس کمال پور ضلع سیتاپور راجہ جواہر سنگھ کے ہاتھ پانچ سات ہزار میں کوڑیوں کے مول فروخت کر ڈالے۔ عرصۂ دراز تک راجہ جواہر سنگھ اور ان کے بعد ان کے بیٹے راجہ سورج بخش سنگھ نے اپنی جگہ پر قائم رکھے۔ مولوی حکیم ظفر الحق بن مولانا اسعد الحق بن مولانا عبد الحق فرماتے ہیں کہ خود راجہ مذکور نے مجھ سے کہا کہ صرف علامہ کی یادگار میں میں نے سے محفوظ رکھا ہے۔ جب بارش کی کثرت اور غیر آباد حالت میں پڑے رہنے سے آثار شکست و

[1] ۔ ق، علماء بوفاۃ شمس العلماء مؤلفہ مولانا حکیم برکات احمد ٹونکی۔

رخیت نمودار ہونے لگے تو ایک انجینئر کو درستی کے لئے بھیجا۔ تخمینۂ درستی تیس پینتیس ہزار روپیہ بتایا گیا تو راجہ نے مجبوراً پتھر کھدوا کر کمال پور منگوا لئے اور کچھ سامان حکیم سید انور حسین خیرآبادی مشہور طبیب و معالج خاص تعلقدارانِ اودھ کو دے دیا۔ دروازہ بطورِ یادگار باقی رہنے دیا جو آج بھی صاحبِ مکان کی عظمت و جلالت کا مرثیہ زبانِ حال سے پڑھ رہا ہے اور دیکھنے والوں کے لئے عبرت و موعظت کا سامان مہیا کر رہا ہے۔

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہو

یہ مکان موسومہ "نیا محل" "منشی نیاز احمد فاروقی بانی مدرسہ نیازیہ و رئیس خیرآباد کے مکان کی نقل تھی۔ فرق اتنا تھا کہ اس میں دو تہ خانے تھے اور منشی صاحب کے مکان میں ایک ہے۔ آگرہ وغیرہ سے پتھر منگوائے گئے تھے۔ تقریباً بیس سال ہوئے جب یہ مکان کھدوایا گیا تھا دروازے پر ہاتھی بھی جھوم رہے تھے۔ وہ بھی لیلائے حریت پر نچھاور ہو گئے۔ مولانا حکیم احمد علی صاحب خیرآبادی فرماتے ہیں کہ علامہ کا کتب خانہ بھی ضبط کر لیا گیا تھا۔

جب خلف الرشید مولانا عبدالحق خیرآبادی کو دلداری کے پیشِ نظر ۱۶ فروری ۱۸۸۷ء میں لارڈ ڈفرن گورنر جنرل ہند کے دستخط سے سندِ خطاب "شمس العلماء" بلا کسی طلب و کوشش کے ملی تو علامہ کے ضبط شدہ دیہات میں سے کچھ دیہات بھی واپس دئے جانے کا حکم دیا گیا۔ مولانا فرمایا کرتے تھے باپ کو کالا پانی کیا اور بیٹے کی خطاب سے اشک شوئی کی۔

مولانا عبدالحق رامپور میں تھے۔ خیرآباد کے ایک باشندے یار علی نے علامہ فضل حق کا بیٹا بن کر وہ دیہات قبضے میں لے لئے۔ اندھیر نگری اور چوپٹ راج کی مثال اس سے بڑھ کر اور کیا مل سکے گی۔ مولانا عبدالحق نے عذرداری وغیرہ کسرِ شان سمجھ کر خاموشی اختیار فرمائی۔ بعد میں یار علی نے یہ دیہات بیچ ڈالے۔

ان میں سے ایک موضع زین پور ہے جو حضرت مولانا شاہ سید محمد اسلم خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ سجادہ نشین آستانہ حافظیہ المتوفی ۱۳۲۰ھ نے ایک ہزار میں خرید کر اپنے پیر و مرشد حافظ سید

۵؎ [illegible] دنی و بیرونی منظر کا فوٹو لے لیا ہے جو شاملِ کتاب ہے۔

محمد علی شاہ خلیفہ حضرت شاہ محمد سلیمان تونسوی کے مصارفِ درگاہ کے لئے وقف کر دیا جس کا انتظام سجادہ نشینانِ درگاہ کرتے رہے ہیں۔ حافظ سید امتیاز حسین سجادہ نشین کے انتقال کے بعد اب میاں سید ماجد حسین حال سجادہ نشین، اس کا انتظام کرتے ہیں۔

دوسرا موضع نند و پورہ لالہ نند و لال نے ایک ہزار میں خرید لیا۔ اس طرح علامہ کے اخلاف پریشانِ روزگار رہے۔ آج بھی علامہ کے پرپوتے، مولانا عبد الحق کے پوتے اور مولانا اسد الحق کے صاحبزادے مولوی حکیم محمد ظفر الحق خیرآبادی عسرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ سرکار نظام حیدر آباد سے پچاس روپیہ ماہانہ آتے ہیں اور بس! ریاست رامپور سے قدیمی تعلقاتِ خاندانی کی بنا پر تیس روپیہ ماہانہ پہنچتے تھے وہ موجودہ والیٔ رامپور نواب رضا علی خاں کے تخت نشین ہوتے ہی بند ہو گئے۔ خلد آشیاں نواب حامد علی خاں مرحوم نے نہ صرف مشاہرہ جاری رکھا بلکہ وقتاً فوقتاً داد و دہش سے بھی نوازا۔ حکیم صاحب کو اکثر طلب فرما کر سرکاری مہمان رکھتے۔ ابتدا میں آپ کے تعلیمی مصارف کے لئے سو روپیہ ماہانہ زمانۂ دراز تک عطا کرتے رہے۔ نواب موصوف خود صاحبِ علم تھے اور اپنے اسلاف کی طرح اسی خاندانِ خیرآباد کے شاگرد اور قدردان تھے اسی لئے استاد زادگان کی قدر و منزلت بھی فرماتے تھے۔ حکیم صاحب خاندانی ذہانت کے مالک ہیں۔ فنِ طب میں مہارتِ تامہ رکھتے ہیں، تشخیصِ مرض و نبض شناسی میں امتیازِ خاص حاصل ہے، کثیر الاولاد ہوتے ہوئے کساد بازاریٔ فنِ قدیم کا شکار ہیں۔

علامہ کی اس خاندانی شاہانہ زندگی کے ساتھ جب انقلاب ۱۸۵۷ء کے روح فرسا اور صبر آزما حالات کے پیش آنے کا تصور ہوتا ہے تو موصوف کی شخصیت، استقلال، ثباتِ قدم اور مجاہدانہ عزم کا اندازہ ہوتا ہے۔ خصوصاً جب اِس زمانہ کے عیش و راحت میں پلنے والے مجاہدوں پر نظر پڑتی ہے تو علامہ کا مرتبہ کتنا بلند ہو جاتا ہے۔

ہندستان کی صد سالہ مکمل غلامی میں کتنی مرتبہ مسلمانوں پر مصائب و شدائد کے پہاڑ توڑے گئے۔ اسی حکومتِ برطانیہ کے ہاتھوں سرزمینِ حجاز و شام و مصر کے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے۔ اسی کے ہاتھوں ٹرکی کا مردِ بیمار گرفتارِ آزار رہا۔ اسی نے قبلۂ اول بیت المقدس (فلسطین) جیسے پاکستان کو نا پاکستان بنانے کی تجویز کی، اسی کی بدولت ٹرکی و عرب کے مسلمانوں پر ہندستانی فوجوں

نے گولیاں چلائیں۔ موپلہ قوم کی بربادی کی ذمہ دار بھی یہی بدنام حکومت تھی۔ انڈونیشیا (جاوا) اور وزیرستان
پر بمباری و فوج کشی کرنے والی یہی سلطنت تھی۔ خلافت کی چادر کو ٹکڑے ٹکڑے اسی دولت برطانیہ نے کیا تھا۔
ان تمام دردناک مصائب کے باوجود ہندستان کا یہ مسلمان عیش پرست وجاہ پسند طبقہ امراء
خوابِ راحت میں سوتا رہا، سوتا ہی رہتا تو بھی زیادہ شکوہ نہ تھا، جاگا اور مسلمانان ہند و مقاماتِ مقدسہ
کے سینوں کو چھلنی کرانے کے رنگروٹوں کی بھرتی کرائی حیثیت سے زیادہ چندے دیئے۔ وفاداری کا
پورا پورا مظاہرہ کیا۔ بڑے بڑے عہدے اور خطابات حاصل کئے، انعامی جاگیریں پائیں، مختصر یہ کہ
وہ سب کچھ کیا جو نہ کرنا چاہئے تھا اور وہ کچھ نہ کیا جو کرنا چاہئے تھا۔

علامہ کی سیاسی بصیرت اور فطری فہم و فراست کا اندازہ رسالہ الثورۃ الهندیہ کی تمہید عبارت
کے بعد آنے والی عبارت سے لگائیے جس کی ابتداء من قصتها کے جملہ سے ہوتی ہے۔
علامہ نے اس میں بتایا ہے کہ ہندستان پر تسلط کے بعد انگریز بقاءِ سلطنت کے لئے دو اسکیموں پر
عمل کرنے کی تدبیریں سوچ رہا تھا:
اول یہ کہ پچھلے زمانہ کے علوم و معارف اور مدارس و مکاتب مٹانے کے بعد اسکولوں کی یکساں
تعلیم کا رواج جس سے ہر مذہب و ملت کے افراد ایک ہی رنگ میں رنگ جائیں، دوم یہ کہ غلّہ پہ
کنٹرول کرکے خدا کی مخلوق کو سر جھکانے پر مجبور کر دیا جائے۔ علامہ لکھتے ہیں:-

"انگریزوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مذہبی بنیاد پر فرقوں کا اختلاف تسلط و
قبضہ کی راہ میں سنگِ گراں ثابت ہوگا اور سلطنت میں انقلاب پیدا کر دے گا
اس لئے پوری تندہی اور جانفشانی کے ساتھ مذہب و ملت کے مٹانے کے لئے
طرح طرح کے مکر و حیلہ سے کام لینا شروع کیا۔ انہوں نے بچوں اور ناسمجھوں کی
تعلیم اور اپنی زبان و مذہب کی تلقین کے لئے شہروں اور دیہات میں مدرسے
قائم کئے، پچھلے زمانہ کے علوم و معارف اور مدارس و مکاتب کے مٹانے کی پوری
کوشش کی۔"

"دوسری ترکیب یہ سوچی کہ مختلف طبقات پر قابو اس طرح حاصل کیا جائے کہ
زمینِ ہند کے غلّہ کی پیداوار کاشتکاروں سے لے کر نقد دام ادا کئے جائیں، اور

سے توڑ دیئے۔ جج یہ رنگ دیکھ کر پریشان تھا اور ان سے ہمدردی بھی تھی۔ جج نے صدر الصدوری کے عہد میں مولانا سے کچھ عرصہ کام بھی سیکھا تھا۔ وہ مولانا کی عظمت و تبحر سے بھی واقف تھا۔ وہ دل سے چاہتا تھا کہ مولانا بری ہوجائیں۔ کرے تو کیا کرے۔ ظاہر یہ ہو رہا تھا کہ مولانا بری ہوجائیں گے۔ سرکاری وکیل لاجواب تھے، چنانچہ پیروکار مقدمہ منشی کرم احمد خیرآبادی نے لکھنؤ سے سید اعظم علی کے نام خیرآباد یہ خط لکھا :

" مدت یک دو روز است کہ جناب مخدوم الاخوان بحسب تقدیر مبتلائے حبس شدہ از سیتاپور بہ لکھنؤ برائے روبکاری صفائی روانہ کردہ شدہ اند۔ زبانی آیندہ ہرگاہی ہم از تحریرات آنجا ہر روزہ منکشف میشود کہ امروز فردا بفضلہ تعالےٰ رہائی خواہد شد۔ روز بنا برادائے شہادت صفائی، مولوی صاحب مکرم مولوی نبی بخش صاحب، مشفقی مولوی قادر بخش صاحب و برخوردار مولوی سید ضامن حسین بموجب درخواست مولوی عبدالحق (خلفِ علامہ) بہ معیتِ ایشاں روانہ لکھنؤ شدہ اند و ہمگیاں را امید از خدائے کریم است دیگر روز بالضرور مخلصی یافتہ دارد دولتخانہ خواہد شد۔ او تعالیٰ ہم چنیں کند۔ ہمہ ہا از خورد و کلاں و ذکور و اناث چشم براہ انتظار کشادہ می باشند و رنج و قلقے عظیم دارند۔ ایزد جل و علا بر جمیع کساں رحم خود فرمایند"

دوسرا دن آخری دن تھا۔ مولانا نے اپنے اوپر جس قدر الزام لئے تھے ایک ایک کر کے سب رد کر دیئے۔ جس مخبر نے فتوے کی خبر کی تھی اس کے بیان کی تصدیق و توثیق کی، فرمایا :

" پہلے اس گواہ نے سچ کہا تھا اور رپورٹ بالکل صحیح لکھوائی تھی اب عدالت میں میری صورت دیکھ کر مرعوب ہوگیا اور جھوٹ بولا : " وہ فتویٰ صحیح ہے، میرا لکھا ہوا ہے اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے۔ "

جج بار بار علّامہ کو روکتا تھا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، مخبر نے عدالت کا رخ اور علّامہ کی بارُعب و پُروقار شکل دیکھ کر شناخت کرنے سے گریز کرتے ہوئے کہہ ہی دیا تھا کہ یہ وہ مولانا فضل حق نہیں وہ دوسرے تھے۔ گواہ حسنِ صورت اور پاکیزگی سیرت سے بے انتہا متاثر ہوچکا تھا مگر

علامہ کی شانِ استقلال کے قربان جائیے !

خدا کا شیر گرج کر کہتا ہے :

"وہ فتوے صحیح ہے ، میرا لکھا ہوا ہے اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے"

نالہ از بہرِ رہائی نہ کمند مرغِ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود

شیرِ میسور سلطان ٹیپو کے رزمگاہِ شہادت کا یہ آخری فقرہ کبھی نہیں بھلایا جا سکتا :

"شیر کی یک روزہ زندگی گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے بہتر ہے"

علامہ کے اقرار و توثیق کے بعد گنجائش ہی کیا باقی رہ گئی تھی۔ بے حد رنج کے ساتھ عدالت نے حبسِ دوام بہ عبورِ دریائے شور کا حکم سنایا۔ آپ نے کمالِ مسرت اور خندہ پیشانی سے سنا۔ خط مذکور میں اس کا ذکر اس طرح ہے :

"برادرِ من تا دہ عشرہ بسبب عدم بہمرسی حامل این لفافہ افتادہ ماند۔ حالیہ آدمی خاص مقرر کردہ فرستادہ می شد کہ جوابِ شافی یابد و حالِ پر ملال مولوی (فضل حق) صاحب از لکھنؤ دریں عرصہ نوشتہ آمد لائق گریستن و واویلا کردن است یعنی حبسِ دوام از پیش گاہ حکم صدور یافت ، فواویلا واحسرتا ۔ او تعالیٰ رحم فرماید" [1]

(محررہ ہفتم فروری مطابق ۱۷ رجب ۱۲۷۵ھ)

علامہ کے ساتھی اور رفیقِ خاص مفتی صدرالدین خاں آزردہ صدر الصدور دہلی نے بھی علامہ کی خاطر سے فتویٰ پر "شہدت بالجبر" لکھ کر دستخط کر دیئے تھے۔ گرفتاری کے بعد مفتی صاحب نے بتایا کہ میں نے تو پہلے ہی لکھ دیا تھا کہ جبراً دستخط کرنا پڑ رہے ہیں۔ "بالجبر" پہ نقطے نہ لگائے تھے۔ علامہ بروقت نے اسے "بالخیر" پڑھا اور مفتی صاحب نے "بالجبر" بنا کر جان چھڑائی [عہ] البتہ جائداد و املاک کا کافی حصہ ضبط کر لیا گیا۔

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

---

[1] سیر العلماء [عہ] اس روایت کی حیثیت لطیفہ سے زیادہ نہیں۔
محمد موسیٰ عفی عنہ

بلند ہمتی کی سعادت ہر شخص کے حصے میں نہیں آیا کرتی :

نہ ہر درخت تحمل کند جفائے خزاں

غلام ہمتِ سروم کہ ایں قدم دارد

آخرش جزیرۂ انڈمان روانہ کر دیئے گئے ۔ ادھر مولانا عبدالحق اور مولوی شمس الحق نے علامہ کے قریبی عزیز خان بہادر مفتی انعام اللہ خاں شہابی گوپاموی کے داماد خواجہ غلام غوث خاں بہادر ذوالقدر میر منشی لفٹیننٹ مغربی و شمالی کی معاونت سے اپیل دائر کر دی ۔

مرزا غالب یوسف مرزا کو لکھتے ہیں :

" مولانا (فضل حق) کا حال کچھ تم سے مجھ کو معلوم ہوا، کچھ مجھ سے تم معلوم کرو۔ مرافعہ حکم دوامِ حبس بحال رہا بلکہ تاکید کی گئی کہ جلد دریائے شور کی طرف روانہ کرو چنانچہ تم کو معلوم ہو جائے گا۔ ان کا بیٹا ولایت میں اپیل کیا چاہتا ہے ، کیا ہوتا ہے ، جو ہونا تھا وہ ہو چکا ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون !

میاں داد خاں سیّاح سیر کرتے ہوئے کلکتہ پہنچے تو مرزا غالب نے انہیں لکھا :

" ہاں خاں صاحب ! آپ جو کلکتہ پہنچے ہو اور سب صاحبوں سے ملے ہو تو مولوی فضل حق کا حال اچھی طرح دریافت کر کے مجھ کو لکھو کہ اس نے رہائی کیوں نہ پائی ؟ وہاں جزیرہ میں اس کا کیا حال ہے ؟ گزارہ کس طرح ہوتا ہے ! " [۱]

علامہ جزیرۂ انڈمان پہنچے ، مفتی عنایت احمد کاکوروی صدر امین بریلی و کول، مفتی مظہر کریم دریابادی اور دوسرے مجاہد علماء وہاں پہلے پہنچ چکے تھے ۔ ان علماء کی برکت سے یہ بدنام جزیرہ دارالعلوم بن گیا۔ ان حضرات نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ وہاں بھی قائم رکھا۔ خرابیٔ آب و ہوا ، تکالیفِ شاقہ اور دردِ جدائیٔ احبّاء و اعزہ کے باوجود علمی مشاغل جاری رہے ۔ مفتی صاحب نے علم الصیغہ جیسی صرف کی مفید کتاب جو آج تک داخلِ نصاب ہے وہیں لکھی ۔ سرکاری ڈاکٹر حکیم امیر خاں کی فرمائش سے تواریخ حبیب الٰہ بھی تالیف کی (یہی تاریخی نام بھی ہے) ۱۲۷۵ھ

ان دونوں کتابوں کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان حضرات کے سینے علم کے سفینے

---

[۱] اردوئے معلّٰی ۔

بن گئے تھے۔ تاریخی یادداشت، ترتیبِ واقعات، قواعدِ فنون، ضوابطِ علوم سبھی حیرت انگیز کرشمے دکھا رہے ہیں۔ ایک انگریز کی فرمائش پر تقویم البلدان کا ترجمہ کیا جو دو برس میں ختم ہوا اور وہی رہائی کا سبب بنا۔ واپسیِ ہندستان پر شاگردِ رشید مفتی لطف اللہ علیگڈھی نے تاریخ لکھ کر پیش کی،

چوں بفضلِ خالقِ ارض و سما　　اوستادم شد ز قیدِ غم رہا

بہرِ تاریخِ خلاصِ آنجناب　　بر نوشتم "اِنّ اُستاذی نجا" [1]

مفتی مظہر کریم نے میجر جان ہاٹن بہادر کمشنر جزائر دریائے شور کی فرمائش پر "تمر اصدا الاطلاع" کا ترجمہ کیا۔ سید اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی نے ۱۵ اشعار میں تاریخ لکھی۔ آخری شعر یہ ہے:

منیر اس کی کہی تاریخ یوں سالِ مسیحی میں

یہی سیرِ جدید بوستانِ ہفت کشور ہے [2]

علامہ نے بھی کئی مفید تصانیف لکھیں۔ انہیں میں سے رسالہ الثورۃ الہندیہ اور قصائد فتنۃ الہند ہیں۔ یہ رسالہ اور قصائد جہاں تاریخی ہیں، عربی ادبیت کے بھی شاہکار ہیں۔ علامہ کا کمال یہ ہے کہ اشعار اور جملوں میں ایک مادہ کے مختلف صیغے متعدد معنوں میں بے تکلف استعمال کرتے چلے جاتے ہیں۔ نظم و نثر دونوں اصناف میں اس کا ظہور برابر نظر آتا ہے۔ مثال کے لیے حسبِ ذیل عبارت و اشعار کافی ہیں۔ یہ رسالہ مع قصائد علامہ نے مفتی عنایت احمد کاکوری کے ذریعہ ۱۲۷۷ھ میں خلف الصدق مولانا عبد الحق کے پاس بھیجا تھا کہ اپنے میاں کو جا کر یہ تحفہ دے دینا پنسل اور کوئلہ سے لکھے ہوئے مختلف پرچے تھے جن کو کئی ماہ کی محنت کے بعد درست و مرتب کر پائے تھے:

الحمد للہ عظیم الرجاء، للذ تجلہ من دون الارجاء، من البلوی والبلی والبلاء، وایلاء حسن البلاء، بایتاء الآلاء، لمن دعاہ باسنی الاسماء، لاسیما لمن ظلم واضطر عند الابتلاء، بالاسواء والادواء۔

ماناح اورق فی اوراق اشجان　　الاوھیج اشجانی واشجانی

---

[1] استاذ العلماء مؤلفہ نواب صدر یار جنگ بہادر　[2] کلیاتِ منیر شکوہ آبادی

عودی فعودی مریضادائہ عادی　　اشفی علی الحین حتی عادہ العادی
دائی عضال والایجدی لعائدۃ　　عود لداءٍ لعود الداء عواد

علامہ اور ان کے ساتھیوں کو کیا کیا تکالیف اٹھانا پڑیں اور انڈمان میں کیسے ذلت آمیز برتاؤ سے سابقہ رہا، رسالہ و قصائد میں اس کا مفصل ذکر موجود ہے۔ سپرنٹنڈنٹ ایک شریف انگریز تھا۔ مشرقی علوم سے واقف اور فنِ ہیئت کا بڑا ماہر تھا۔ اس کی پیشی میں ایک سزا یافتہ مولوی بھی تھے اپنی ایک فارسی کی کتاب ہیئت ان کو دی کہ اس کی عبارت صحیح و درست کر دیں۔ مولوی صاحب سے تو کام چلا نہیں، علامہ نئے نئے گئے تھے۔ ایک سال ہی گذرا تھا، ان کی خدمت میں وہ کتاب پیش کر کے تصحیح کی گذارش کی۔ علامہ نے نہ صرف عبارت درست کی بلکہ مباحث میں بہت کچھ اضافہ کر کے حاشیہ پر بہت سی کتب کے حوالے لکھ دیئے۔ یہ کتاب وہ مولوی صاحب سپرنٹنڈنٹ کے پاس لے گئے۔ وہ دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا۔ کہنے لگا مولوی صاحب! "تم بڑا لائق آدمی ہے مگر جن کتابوں کے حوالے ہیں اور ان کی جو عبارتیں نقل ہیں یہاں کہاں ہیں؟"

مولوی صاحب مسکرائے اور اصل واقعہ علامہ کا کہہ سنایا۔ وہ اسی وقت مولوی صاحب کو لیکر بارک میں آیا۔ علامہ موجود نہ تھے۔ کچھ دیر انتظار کے بعد دیکھا کہ ٹوکرا بغل میں دبائے چلے آ رہے ہیں وہ یہ ہیئت دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر لایا، معذرت کے بعد کلرکی میں لے لیا۔ گورنمنٹ میں سفارش بھی کی۔ ادھر علامہ کے صاحبزادے مولوی شمس الحق اور خواجہ غلام غوث بے خبر میر منشی لفٹینٹ مغربی و شمالی صوبہ اودھ سرگرم سعی تھے۔ پروانۂ رہائی[ع] حاصل کر کے مولوی شمس الحق انڈمان روانہ ہو گئے۔ وہاں جہاز سے اتر کے شہر میں گئے تو ایک جنازہ نظر پڑا۔ اس کے ساتھ بڑا اژدھام تھا

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کل ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء کو علامہ فضل حق خیر آبادی کا انتقال ہو گیا ہے۔ اب سپردِ خاک کرنے جا رہے ہیں۔ یہ بھی بصد حسرت و یاس شریکِ دفن ہوئے اور بے نیلِ مرام واپس لوٹے۔

قسمت کی بدنصیبی کہاں ٹوٹی ہے کمند　　دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

[ع] پروانۂ رہائی دستی لے جانے کا واقعہ بے اصل ہے۔ محمد موسیٰ عفی عنہ

افسوس! ہمیشہ کے لئے یہ آفتاب علم و عمل دیارِ غربت میں غروب ہو گیا۔ اب تک مزار مرجعِ انام اور زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔ اور آج بھی قبر بزبانِ حال کہہ رہی ہے:

تلك آثارنا تدل علينا فانظروا بعدنا الى الآثار

مولانا عبداللہ بلگرامی لکھتے ہیں:

"فادرج الفضل فی اثناء اکفانه و دفن العلم باند فانه" [له]

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

تبحر فی العلوم العقلية والنقلية واناف على المهرة الكملة بالنفس القدسية حتى امتلأت الآفاق بصيت كماله و شحنت الاقطار بفضله وجلاله و كان الغالب عليه من العلوم المعقول ومن المنقولات العلوم الادبية والكلام والاصول اما المعقولات فرزق فيها نفسا قدسية وملكة ملكوتية كان يُري الطالبين نظرياتها ببيانها لصاف كالمحسوسات المرئية و اما ارتجاله بالخطب والاشعار العربية مع التجنيس والاشتقاق وحسن البراعة والطباق وغيرها من الصنائع الادبية۔ فلم يخلق مثله فی البلاد ولم يأت عديله فيما افاد واجاد۔ [له]

ترجمہ: علومِ عقلیہ و نقلیہ کے متبحر اور ماہرین کاملین پر نفسِ قدسیہ کے باعث فائق تھے، آپ کے کمال کی شہرت سارے زمانے میں پہنچی ہوئی تھی۔ اور آپ کے فضل و جلال سے سارا آفاق گونج رہا تھا۔ علوم میں فنِ معقول کا غلبہ تھا اور منقولات میں ادب، کلام اور اصول پر توجہ خاص تھی۔ معقولات میں نفسِ قدسیہ اور ملکۂ ملکوتیہ کو درج فرمایا طلبہ ان کے بیانِ صافی کی وجہ سے نظریاتِ معقولات کو بالکل محسوس و مرئی پاتے تھے

[له] فضل ان کے کفن میں لپیٹا گیا اور علم ان کے ساتھ مدفون ہو گیا

[له] خطبۂ ہدیہ سعیدیہ۔

خطبات واشعار فی البدیہہ فرماتے تھے۔ تمام صنائع ادبیہ تجنیس، اشتقاق، حسن براعت اور صنعتِ طباق کا ارتجال کے باوجود پورا پورا مظاہرہ ہوتا تھا۔ انھیں کمالات کے پیشِ نظر اپنے علم وفضل میں بے نظیر اور افادہ وتفہیم میں بے عدیل تھے۔

مصائب کا خاتمہ علامہ کی ذات ہی پر نہیں ہو جاتا، اولاد واحفاد کو بھی پریشانیوں کا سامنا رہا۔ سب سے بڑی مصیبت ضبطیٔ جائداد واملاک کی تھی۔ علامہ بڑے امیر کبیر تھے۔ دولتِ دنیا ودین دونوں سے بہرہ ور اور صاحبِ عزو وقار تھے۔ حکامِ وقت، شاہزادگانِ عالی تبار، امراء ورؤساء اور علماء وصلحا سبھی عزت کرتے تھے۔ شاہانہ زندگی گذاری۔ ہاتھی، گھوڑے، پالکی، فینس اور دوسری شان وشوکت کی سواریاں ہر وقت دروازے پر موجود رہتیں۔ جب مولانا عبدالحق پیدا ہوئے تو دہلی کے خواص وعوام اور برادرانِ وطن نے بھی بطورِ اظہارِ خوشی نذرانے اور تحفے لاکھوں روپیہ کے پیش کئے۔[۱]

تحدیث بالنعمۃ کے طور پر خود علامہ نے اپنے قصیدہ ہمزیہ میں اپنے ترفّہ وفراغت کا ذکر فرمایا ہے:-

کانت لفضل الحق فضل ھثالۃ　　　منھا علی الامثال لی استعلاء

ووجاھۃ بین الوجوہ وجاھۃ　　　تعنولھا الاعیان و الرؤساء

وبراعۃ ورفاعۃ ورفاھۃ　　　ونزاھۃ و نباھۃ وعلاء

جرمِ بغاوت ثابت ہو جانے پر خیرآباد کا سنگین وعالیشان دیوانخانہ اور محل سرا ضبط کرکے بصلۂ خیر خواہی سردار محمد ہاشم شیعی سیتاپوری (مورثِ اعلیٰ آغا فتح شاہ مشہور پلیڈر سیتاپور) کو دیدیے گئے۔ انھوں نے رئیس کمال پور ضلع سیتاپور راجہ جواہر سنگھ کے ہاتھ پانچ سات ہزار میں کوڑیوں کے مول فروخت کرڈالے۔ عرصۂ دراز تک راجہ جواہر سنگھ اور ان کے بعد ان کے بیٹے راجہ سورج بخش سنگھ نے اپنی جگہ پر قائم رکھے۔ مولوی حکیم ظفرالحق بن مولانا اسعدالحق بن مولانا عبدالحق فرماتے ہیں کہ خود راجہ مذکور نے مجھ سے کہا کہ صرف علامہ کی یادگار میں میں نے محفوظ رکھا ہے۔ جب بارش کی کثرت اور غیر آباد حالت میں پڑے رہنے سے آثارِ شکست و

---

[۱] ۔ قرۃ العیون بوفاۃ شمس العلماء مؤلفہ مولانا حکیم برکات احمد ٹونکی۔

رنجیت نمودار ہونے لگے تو ایک انجینئر کو درستی کے لئے بھیجا۔ تخمینۂ درستی تیس پینتیس ہزار روپیہ بتایا گیا تو راجہ نے مجبوراً پتھر کھدوا کر کمال پور منگوا لئے اور کچھ سامان حکیم سید انور حسین خیرآبادی مشہور طبیب و معالج خاص تعلقداران اودھ کو دے دیا۔ دروازہ بطورِ یادگار باقی رہنے دیا جو آج بھی صاحبِ مکان کی عظمت و جلالت کا مرثیہ زبانِ حال سے پڑھ رہا ہے اور دیکھنے والوں کے لئے عبرت و موعظت کا سامان مہیا کر رہا ہے۔

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہو

یہ مکان موسومہ "نیا محل" "منشی نیاز احمد فاروقی بانی مدرسہ نیازیہ و رئیس خیرآباد کے مکان کی نقل تھی۔ فرق اتنا تھا کہ اس میں دو تہ خانے تھے اور منشی صاحب کے مکان میں ایک ہے۔ آگرہ وغیرہ سے پتھر منگوائے گئے تھے۔ تقریباً بیس سال ہوئے جب یہ مکان کھدوایا گیا تھا دروازے پر ہاتھی بھی جھوم رہے تھے۔ وہ بھی لبلائے حریت پر نچھاور ہو گئے۔ مولانا حکیم احمد علی صاحب خیرآبادی فرماتے ہیں کہ علامہ کا کتب خانہ بھی ضبط کر لیا گیا تھا۔

جب خلف الرشید مولانا عبدالحق خیرآبادی کو دلداری کے پیشِ نظر ۱۶ فروری ۱۸۸۷ء میں لارڈ ڈفرن گورنر جنرل ہند کے دستخط سے سندِ خطاب "شمس العلماء" بلا کسی طلب و کوشش کے ملی تو علامہ کے ضبط شدہ دیہات میں سے کچھ دیہات بھی واپس دیئے جانے کا حکم دیا گیا۔ مولانا فرمایا کرتے تھے باپ کو کالا پانی کیا اور بیٹے کی خطاب سے اشک شوئی کی۔

مولانا عبدالحق رامپور میں تھے۔ خیرآباد کے ایک باشندے یار علی نے علامہ فضل حق کا بیٹا بن کر وہ دیہات قبضے میں لے لئے۔ اندھیر نگری اور چوپٹ راج کی مثال اس سے بڑھ کر اور کیا مل سکے گی۔ مولانا عبدالحق نے عذرداری وغیرہ کسرِ شان سمجھ کر خاموشی اختیار فرمالی۔ بعد میں یار علی نے یہ دیہات بیچ ڈالے۔

ان میں سے ایک موضع زین پور ہے جو حضرت مولانا شاہ سید محمد اسلم خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ سجادہ نشین آستانہ حافظیہ المتوفی ۱۳۲۰ھ نے ایک ہزار میں خرید کر اپنے پیر و مرشد حافظ سید

۵ [illegible] ونی وہیروئی منظر کا فوٹو لے لیا ہے جو شاملِ کتاب ہے۔

محمد علی شاہ خلیفہ حضرت شاہ محمد سلیمان تونسوی کے مصارفِ درگاہ کے لئے وقف کر دیا جس کا انتظام
سجادہ نشینانِ درگاہ کرتے رہے ہیں۔ حافظ سید امتیاز حسین سجادہ نشین کے انتقال کے بعد اب
میاں سید ماجد حسین حال سجادہ نشین، اس کا انتظام کرتے ہیں۔

دوسرا موضع نند و پورہ لالہ نند و لال نے ایک ہزار میں خریدا۔ اس طرح علامہ کے اخلاف
پریشانِ روزگار رہے۔ آج بھی علامہ کے پرپوتے، مولانا عبد الحق کے پوتے اور مولانا اسد الحق کے
صاحبزادے مولوی حکیم محمد ظفر الحق خیرآبادی عسرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ سرکار نظام حیدر آباد
سے پچاس روپیہ ماہانہ آتے ہیں اور بس! ریاست رامپور سے قدیمی تعلقاتِ خاندانی کی بنا پر
تیس روپیہ ماہانہ پہنچتے تھے وہ موجودہ والئ رامپور نواب رضا علی خاں کے تخت نشین ہوتے ہی بند
ہو گئے۔ خلد آشیاں نواب حامد علی خاں مرحوم نے نہ صرف مشاہرہ جاری رکھا بلکہ وقتاً فوقتاً داد و
دہش سے بھی نوازا۔ حکیم صاحب کو اکثر طلب فرما کر سرکاری مہمان رکھتے۔ ابتدا میں آپ کے تعلیمی
مصارف کے لئے سو روپیہ ماہانہ زمانۂ دراز تک عطا کرتے رہے۔ نواب موصوف خود صاحبِ
علم تھے اور اپنے اسلاف کی طرح اسی خاندانِ خیرآباد کے شاگرد اور قدردان تھے اسی لئے استاد زادگان
کی قدر و منزلت بھی فرماتے تھے۔ حکیم صاحب خاندانی ذہانت کے مالک ہیں۔ فنِ طب میں مہارتِ
تامہ رکھتے ہیں، تشخیصِ مرض اور نبض شناسی میں امتیازِ خاص حاصل ہے، کثیر الاولاد ہوتے ہوئے
کساد بازاریِ فنِ قدیم کا شکار ہیں۔

علامہ کی اس خاندانی شاہانہ زندگی کے ساتھ جب انقلاب ۱۸۵۷ء کے روح فرسا اور صبر آزما حالات
کے پیش آنے کا تصور ہوتا ہے تو موصوف کی شخصیت، استقلال، ثباتِ قدم اور مجاہدانہ عزم کا اندازہ
ہوتا ہے۔ خصوصاً جب اِس زمانہ کے عیش و راحت میں پلنے والے "مجاہدوں" پر نظر پڑتی ہے تو
علامہ کا مرتبہ کتنا بلند ہو جاتا ہے۔

ہندستان کی صد سالہ مکمل غلامی میں کتنی مرتبہ مسلمانوں پر مصائب و شدائد کے پہاڑ توڑے
گئے۔ اسی حکومتِ برطانیہ کے ہاتھوں سرزمینِ حجاز و شام و مصر کے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے۔ اسی کے
ہاتھوں ٹرکی کا مردِ بیمار گرفتارِ آزار ہوا۔ اسی نے قبلۂ اول بیت المقدس (فلسطین) جیسے پاکستان
کو ناپاکستان بنانے کی تجویز کی، اسی کی بدولت ٹرکی و عرب کے مسلمانوں پر ہندستانی فوجوں

نے گولیاں چلائیں۔ موپلہ قوم کی بربادی کی ذمہ دار بھی یہی بدنام حکومت تھی۔ انڈونیشیا (جاوا) اور وزیرستان پر بمباری و فوج کشی کرنے والی یہی سلطنت تھی۔ خلافت کی چادر کو ٹکڑے ٹکڑے اسی دولت برطانیہ نے کیا تھا۔

ان تمام دردناک مصائب کے باوجود ہندستان کا یہ مسلمان عیش پرست وجاہ پسند طبقۂ امراء خواب راحت میں سوتا رہا، سوتا ہی رہتا تو بھی زیادہ شکوہ نہ تھا، جاگا اور مسلمانان ہند و مقامات مقدسہ کے سینوں کو چھلنی کرانے کے رنگروٹوں کی بھرتی کرائی۔ حیثیت سے زیادہ چندے دیئے۔ وفاداری کا پورا پورا مظاہرہ کیا۔ بڑے بڑے عہدے اور خطابات حاصل کئے، انعامی جاگیریں پائیں، مختصر یہ کہ وہ سب کچھ کیا جو نہ کرنا چاہیئے تھا اور وہ کچھ نہ کیا جو کرنا چاہیئے تھا۔

علامہ کی سیاسی بصیرت اور فطری فہم وفراست کا اندازہ رسالہ الثورۃ الہندیہ کی تمہید عبارت کے بعد آنے والی عبارت سے لگتا ہے جس کی ابتداء من قصتہا کے جملہ سے ہوتی ہے۔ علامہ نے اس میں بتایا ہے کہ ہندستان پر تسلط کے بعد انگریز بقاء سلطنت کے لئے دو اسکیموں پر عمل کرنے کی تدبیریں سوچ رہا تھا:

اول یہ کہ پچھلے زمانہ کے علوم ومعارف اور مدارس ومکاتب مٹانے کے بعد اسکولوں کی یکساں تعلیم کا رواج جس سے ہر مذہب وملت کے افراد ایک ہی رنگ میں رنگ جائیں۔ دوم یہ کہ غلہ پر کنٹرول کر کے خدا کی مخلوق کو سر جھکانے پر مجبور کر دیا جائے۔ علامہ لکھتے ہیں:۔

"انگریزوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مذہبی بنیاد پر فرقوں کا اختلاف تسلط و قبضہ کی راہ میں سنگِ گراں ثابت ہوگا اور سلطنت میں انقلاب پیدا کر دے گا اس لئے پوری تندہی اور جانفشانی کے ساتھ مذہب وملت کے مٹانے کے لئے طرح طرح کے مکر وحیلہ سے کام لینا شروع کیا۔ انہوں نے بچوں اور ناسمجھوں کی تعلیم اور اپنی زبان ومذہب کی تلقین کے لئے شہروں اور دیہات میں مدرسے قائم کئے۔ پچھلے زمانہ کے علوم ومعارف اور مدارس ومکاتب کے مٹانے کی پوری کوشش کی۔"

"دوسری ترکیب یہ سوچی کہ مختلف طبقات پر قابو اس طرح حاصل کیا جائے کہ زمین ہند کے غلہ کی پیداوار کاشتکاروں سے لے کر نقد دام ادا کئے جائیں۔ اور

ان غریبوں کو خرید و فروخت کا کوئی اختیار نہ چھوڑا جائے۔ اس طرح نرخ کے گھٹانے بڑھانے اور منڈیوں تک اجناس پہنچانے اور نہ پہنچانے کے خود ہی ذمہ دار بن بیٹھیں۔ اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ خدا کی مخلوق، مجبور و معذور ہو کر ان کے قدموں میں آپڑے اور خوراک وغیرہ نہ ملنے پر ان کے ہر حکم کی تعمیل اور ہر مقصد کی تکمیل کرے۔"

پہلی اسکیم کے متعلق لارڈ میکالے کے یہ جملے کافی سند ہیں:

"ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیئے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہیئے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق اور رائے، زبان اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو۔"

دوسری اسکیم پر جب عمل ہوا ہو یا نہ ہوا ہو لیکن اس چار سالہ زمانۂ جنگ کے کنٹرول علی الآمد نے باشندگانِ ہند کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ غلہ کا ملنا دشوار، کنٹرول کی دکانوں سے لینے میں عزت و آبرو اور وقتِ عزیز کی بربادی۔ شہر میں ذرا سی گڑبڑ، دکانوں اور گوداموں کی قفل بندی، ان سب مصیبتوں کا مستقل ہر کہ و مہ کو سامنا رہا ہے۔

۱۱ جولائی ۱۹۴۶ء سے پوسٹ مینوں اور کم تنخواہ والے ملازمین پوسٹ آفس کی جائز احتجاجی ہڑتال پر راشن کی سہولتیں چھین لینے کی، مرکزی حکومت کی طرف سے دھمکی نے علامہ کے بیان کو بالکل سچ کر دکھایا، کیا سچا ارشاد ہے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا:

اتقوا فراسۃ المؤمن فانہ ینظر بنور اللہ

"مومن کی فراست سے ڈرتے رہو یہ اللہ کے نور سے سب کچھ دیکھا و سمجھ لیتا ہے۔"

کہاں ہیں اس قول کے قائل کہ "مولوی کو سیاست نہیں آتی" آئیں اور رسالہ الثورۃ الہندیہ پڑھیں۔ مولوی کی سیاست غلام دماغ نہیں سمجھ سکتا، انگریز سمجھتا ہے، سوچو اور غور کرو، ۹۰ سال قبل سارے دفاتر پر اسی طبقہ کا قبضہ تھا۔ علماء، مشاہیرِ وقت سرکاری و شاہی محکموں پر قابض تھے۔

مولانا فضل امام خیرآبادی صدر الصدور دہلی، مفتی صدر الدین خاں آزردہ صدر الصدور دہلی، مفتی عنایت احمد کاکوروی منصف و صدر امین کول و بریلی، مولوی فضل رسول بدایونی سرشتہ دار

کلکٹری صدر دفتر سہسوان، مفتی انعام اللہ گوپاموی قاضیٔ دہلی و سرکاری وکیل الٰہ آباد، مولانا مفتی لطف اللہ علیگڈھی سرشتہ دار صدر امین بریلی، علامہ فضل حق خیرآبادی سرشتہ دار ریزیڈنسی دہلی و صدر الصدور لکھنؤ و مہتمم حضور تحصیل اودھ، مولوی غلام قادر گوپاموی ناظر سرشتہ دار عدالت دیوانی و تحصیلدار گوڑگاؤں، مولوی قاضی فیض اللہ کشمیری سرشتہ دار صدر الصدور دہلی وغیرہم۔ یہ سب اپنے وقت کے بے نظیر و عدیم المثال اکابر علماء تھے۔ حکومت کی باگ ڈور انھیں کے ہاتھ میں تھی، مسلمانوں کی سلطنت کی بربادی ان کے لئے ناقابلِ برداشت تھی، موقع کا انتظار تھا۔ ۱۸۵۷ء کا وقت آیا تو سب میں پیش پیش یہی حضرات تھے۔ والیانِ ریاست اور ارکینِ دولت میں ناقوسِ حرّیت پھونکنے والے یہی تھے۔ عوام کو ابھارنا اور فتویٔ جہاد جاری کرنا انھیں کا کام تھا اور انقلاب ۵۷ء کے بعد سب سے زیادہ مصائب اٹھانے اور آتشِ حریت میں جلنے والے یہی شمعِ شبستانِ آزادی کے پروانے تھے۔ انگریز نے ان کو جانا اور پہچانا۔ ایک ایک کرکے تمام عہدوں سے اس طبقہ کو سبکدوش اور اس گروہ کے خلاف پورا محاذ قائم کیا۔ اپنی ایک مخصوص جماعت چھوڑی جس کا سب سے بڑا مقصد علماء کی تذلیل و توہین، ان کو سیاست سے نابلد بتاکر اور دقیانوسیت کا الزام لگاکر قوم کی زمامِ قیادت پر قبضہ کرنا تھا۔

یہی روح کارفرما تھی جب کہ اسی قسم کے ایک "میر اعظم" نے ۱۹۴۰ء میں کلکتہ سے فخریہ انداز میں اعلان کیا کہ:

"ہم نے علماء کے وقار کو ختم کر دیا ہے"۔

وہ یہ نہ سمجھا کہ "پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا"

اس نے یریدون لیطفؤا نور اللہ بافواھھم واللہ متم نورہ" شاید یہ آیت نہیں سنی تھی۔

اے کاش مسلمان قوم سوچتی کہ وہ انگریز کی صد سالہ اسکیم کو اس پردے میں عملی جامہ پہنا رہی ہے۔ وہ اپنے مجاہدین و سرفروش علماء کی توہین و تذلیل ان سرکاری ایجنٹوں کے اشارے پر نادانستگی سے نہیں کر رہی ہے بلکہ اپنے پاؤں میں اپنے ہی ہاتھوں سے کلہاڑی مار رہی ہے۔

وہ وقت دور نہیں جب افقِ ہندستان پر آفتابِ آزادی طلوع ہوگا۔ اس وقت اس ناسمجھ قوم کو پچھتانا اور کفِ افسوس ملنا پڑے گا۔ ہمیں فخر ہے کہ آج بھی ہندستان کی سیاست کے آسمان

عہ: یہ درست ہے کہ یہ تمام علماء دل سے انگریز کے خلاف تھے مگر ان سب نے عملی جہاد میں حصہ نہیں لیا۔ مولانا فضل امام تو ۱۸۵۷ء سے پہلے ۱۸۲۹ء میں وصال [illegible]

پرسب سے بلند مقام اسی طبقۂ علماء کے ایک فرد امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کا ہے۔ چھ سالہ صدارتِ مجلسِ وطنی کے تابناک و درخشاں دور نے ثابت کر دیا کہ کشتیٔ آزادی کو ساحلِ مقصود تک پہنچا دینا اسی جیسے باکمال ناخدا کا کام ہو سکتا تھا۔

ہمیں نیک شگون بیت المقدس پر قبضۂ نصاریٰ سے ملتا ہے۔ ۱۰۹۹ء سے ۱۱۸۷ء تک ۸۸ سال تسلط رہا جس میں ظلم و تعدی کی انتہا ہو چکی تھی۔ آخر سلطان صلاح الدین ایوبی نے پرچم اسلام لہرایا۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۵ء تک بھی ۸۸ سال ہی ہوتے ہیں، مظالم و مصائب کا یہاں بھی خاتمہ ہو چکا ہے۔ پہلی شملہ کانفرنس ۴۵ء میں ہی حکومتِ برطانیہ ہتھیار ڈال چکی تھی۔ دوسری شملہ کانفرنس ۱۹۴۶ء میں اسے شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور ۲ ستمبر ۱۹۴۶ء کی عارضی حکومت کے تقرر اور وزارتِ عظمیٰ پر پنڈت جواہر لال نہرو صدر انڈین نیشنل کانگریس کے تسلط سے آزادیٔ کامل کی بنیاد قائم ہو ہی گئی۔

یہ بھی حسنِ اتفاق تھا کہ ۲۷ رجب ۵۸۳ھ کو مسجدِ اقصائے بیت المقدس میں سلطان نے نمازِ شکر ادا کی جبکہ اسی تاریخ میں سرکارِ دو عالم نے شبِ معراج میں اسی مقام پر امامتِ انبیاء فرمائی تھی۔ اسی طرح یہ بھی حسنِ اتفاق ہے کہ یروشلم کی طرح ہندستان بھی اسی قوم کے ہاتھوں سے اسی مدت میں آزاد ہو رہا ہے۔

اخلاف

انسان کی یادگار دنیا میں مختلف چیزیں ہو سکتی ہیں لیکن نافع یادگار صرف تین ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے:

"انسان دنیا سے جاتا ہے تو اس کے اعمال منقطع ہو جاتے ہیں۔ تین عمل نفع بخش اور باقی رہنے والے ہیں علمِ نافع، وقف فی سبیل اللہ اور ولدِ صالح"

اس فرمانِ نبوی سے معلوم ہوا کہ نیک اولاد انسان کی یادگار بن سکتی ہے۔ بدعملی نے پسرِ نوح علیہ السلام کو "انه ليس من اهلك انه عمل غير صالح" کے حکم کی بنا پر خاندانِ پیغمبر سے خارج کرا دیا تھا۔ بداعمال اولاد باپ کی زندگی میں باعثِ ننگ و عار اور مرنے

کے بعد ذلیل وخوار ہوتی ہے۔ اسی خیال کے پیشِ نظر لسان الملک حضرت ریاض خیرآبادی نے کہا ہے ؎

میرے اللہ نے بخشی مجھے اولادِ سعید
میرے اشعار وہ ہیں جن سے مرا نام چلے

علامہ نے دو شادیاں کیں پہلی اہلیہ بی بی وزیرن دختر منشی فضل احمد بن حسین میاں تھیں۔ ان سے تین صاحبزادیاں بی بی سعید النسا، حرماں والدۂ خان بہادر افتخار الملک منشی افتخار حسین مضطر خیرآبادی مرحوم و محمد حسین بسمل خیرآبادی مرحوم، بی بی نجم النسا، والدۂ منشی ضمیر علی مرحوم فوجدار ریاست بجے پور، محمود النسا، زوجۂ منشی طفیل احمد (برادر منشی نیاز احمد بانی مدرسہ نیازیہ و رئیس خیرآباد) اور ایک صاحبزادے مولانا عبد الحق خیرآبادی تھے۔ موصوف نے والدِ ماجد کے نامِ نامی کو اور گرامی بنایا اور اس لائق شاگرد نے فائق استاد کو مزید بلند و بالا مقام پر پہنچایا۔ ۱۳۱۶ھ میں وفات پائی۔ درگاہ مخدوم شیخ سعد میں محوِ خواب ہیں۔ دو سال بعد سعادتمند فرزند مولانا اسد الحق، ربیع الثانی ۱۳۱۸ھ کو راہیٔ ملکِ بقا ہوئے۔ اب صرف مولوی حکیم ظفر الحق خیرآبادی بن مولانا اسد الحق اس دودمانِ عالی کے تنہا چشم و چراغ ہیں جو عمر کی تقریباً ساٹھ منزلیں طے کر چکے ہیں۔ اطباءِ خیرآباد کی صفِ اول میں آپ کا شمار ہے۔

علامہ کی دوسری اہلیہ دہلی کی تھیں۔ یہ شادی غیر کفو میں کی تھی۔ ان سے دو صاحبزادے مولوی شمس الحق اور مولوی علاء الحق ہوئے۔

اول الذکر کی دختری اولاد دہلی میں موجود ہے۔ مولوی علاء الحق سے مولوی ضمیر الحق، ان سے مولوی فیض الحق موجودہ ممبر مال ریاست بھوپال ہیں۔

تلامذہ

سچ پوچھئے تو اصلی اولاد، روحانی اولاد ہے، اسی لئے علماء کرام نے ہر نیک اعمال اور متبعِ سنت مسلمان کو سرورِ کائنات علیہ السلام والتحیات کی آل میں شامل مانا ہے یہی وجہ ہے کہ درود میں آل کے ساتھ صحاب کا لفظ نہ بھی آئے جب بھی صحابہ کرام داخل ہو جاتے ہیں۔

حضرت ابوعبداللہ مشرف بن مصلح سعدی شیرازی نے خوب کہا ہے ؎

پسرِ نوح با بداں بنشست — خاندانِ نبوتش گم شد
سگِ اصحاب کہف روزے چند — پئے نیکاں گرفت مردم شد

صدقۂ جاریہ میں علمِ نافع بھی ہے۔ تلامذہ و تصانیف یہی دو ذریعے بقاء و اجراءِ علم کے ہیں تلامذہ کا شمار اتنے عرصہ کے بعد ممکن نہیں۔ حکومتی و ریاستی عہدے کبھی مشغلۂ درس میں حارج نہ ہوئے ۱۸۰۹ء سے ۱۸۵۸ء تک مسلسل پچاس برس درس دیا۔ عرب، ایران، بخارا، افغانستان اور دوسرے دور دراز ملکوں سے شائقینِ علم آکر شریکِ حلقۂ تدریس ہوتے تھے۔ دہلی دارالسلطنت تھا۔ منقولات میں ولی اللّٰہی مدرسہ اور معقولات میں خیرآبادی مکتب کا سکّہ چل رہا تھا اس لئے مشتاقانِ علم و فن پروانہ وار دونوں شمعوں پر گر رہے تھے۔

کاش! کوئی قریب تر زمانے میں علامہ کے تلامذہ کی فہرست مرتب کر لیتا۔ ہزاروں شاگردوں میں سے چند مشہور تلامذہ جو اپنے وقت کے امام الفن سمجھے جاتے تھے حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ شمس العلماء مولانا محمد عبدالحق خیرآبادی۔
۲۔ مولانا ہدایت اللہ خاں جونپوری (استاد مولانا سید سلیمان اشرف مرحوم سابق صدر دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڑھ و مولانا امجد علی اعظمی صاحب بہارِ شریعت)
۳۔ ادیبِ جلیل مولانا فیض الحسن سہارنپوری (استاد علامہ شبلی نعمانی)
۴۔ مولانا جمیل احمد۔
۵۔ مولانا سلطان احمد بریلوی۔
۶۔ مولانا عبداللہ بلگرامی۔
۷۔ مولانا عبدالقادر بدایونی۔
۸۔ مولانا شاہ عبدالحق کانپوری۔
۹۔ مولانا ہدایت علی بریلوی (استاد مولانا فضل حق رامپوری مرحوم)
۱۰۔ مولانا غلام قادر گوپاموی (سبط مولانا فضل امام) ناظر سررشتہ دار عدالت دیوانی و تحصیلدار گوڑگاؤں۔
۱۱۔ مولانا خیر الدین[ع] دہلوی (والد امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد)

ع مولانا خیر الدین کے تلمذ کے بارے میں صرف ابوالکلام [illegible] ہے [illegible] بعض والے بھی دہلی کے نہیں۔
محمد [illegible] عفی عنہ

مولانا عبدالحق کے نامور تلامذہ میں سے مولانا حکیم سید برکات احمد بہاری ٹونکی المتوفی ۱۳۴۷ھ

تھے، موصوف سے علامۃ الہند مولانا معین الدین اجمیری المتوفی ۱۳۵۹ھ نے کسبِ فیض کیا اور مولانا

اجمیری کے نعلینِ مبارک اٹھانے کا راقم السطور کو بھی فخر حاصل ہے۔

پہنچا کہاں سے ہے کہاں سلسلۂ درازِ علم

تیرھویں اور چودھویں صدی کے اکثر فضلاءِ ہند خیرآبادی شجرِ علم کے خوشہ چیں ہوئے ہیں، موجودہ

دور کے صفِ اول کے مشاہیر امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر علامہ سید سلیمان ندوی وغیرہما کو

بھی نسبتِ تلمذ علامہ کے تلامذہ سے حاصل ہے۔ دنیا میں اہلِ کمال بھی زوال سے نہیں بچے، عالم کی ہر چیز کو فنا ہے

مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

اور پھر تماشا یہ ہے کہ جو جاتا ہے پھر مڑ کے نہیں دیکھتا، ابو طالب کلیم ہمدانی ملک الشعراء دربارِ شاہجہاں

نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

وضعِ زمانہ قابلِ دیدن دوبارہ نیست

رُو پس نہ کرد ہر کہ ازیں خاکداں گذشت

سلسلۂ تلامذہ

جیسا کہ گذر چکا ہے کہ علامہ کا سلسلۂ تلامذہ نہ صرف ہندستان بلکہ بیرونِ ہند حجاز، بخارا، افغانستان اور دوسرے دور دراز ممالک تک پھیلا ہوا ہے۔ ہندستان کے اکابر مشاہیر امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد، علامہ سید سلیمان ندوی وغیرہما اسی دریائے فیضان سے سیراب ہوتے ہیں۔

تلامذہ اور تلامذۃ التلامذہ کی فہرست میں ایسے ایسے نامور اور اہلِ فضل و کمال افراد گذرے ہیں کہ مستقل کتاب ان کے حالات میں مرتب ہو سکتی ہے۔ اس جگہ ان کے تفصیلی ذکر کا نہ موقعہ ہے اور نہ گنجائش، صرف علامہ سے لیکہ مجھ ہیچمداں تک اکابرِ سلسلہ کا مختصر تذکرہ درج کرنے پر اکتفاء کیا جاتا ہے:

شمس العلما مولانا محمد عبد الحق خیرآبادی

محققِ جلیل، مدقق نبیل، سرخیلِ علماءِ عصر، سرآمدِ کملاءِ دہر، شمس العلماء مولانا محمد عبد الحق خیرآبادی دہلی میں ۱۲۴۴ھ میں پیدا ہوئے۔ والدِ ماجد علامہ فضل حق خیرآبادی دلّی میں سررشتہ دارِ ریذیڈنٹ، عوام و رعایا میں ہر دلعزیز، اور حکام و دربارِ شاہی میں معزز و با اقتدار تھے۔ فرزندِ دلبند کے تولّد پر ہدایا و تحائف کے ڈھیر لگ گئے، لاکھوں روپیہ نذرانے میں پیش ہوا، خوش بخت و بلند طالع مشہور ہوئے۔ زمانۂ قیامِ خیرآباد میں رویتِ ہلال کے بعد فالِ نیک کے طور پر لوگ چہرہ آ آکر دیکھا کرتے تھے۔ [1]

ہوش سنبھالا تو باپ کی علمی مجلسوں کا رنگ دیکھا۔ مفتی صدر الدین خاں آزردہ صدر الصدور کا دربارِ علمی نظر سے گذرا۔

علماء میں: مولانا رشید الدین خاں، مولوی مخصوص اللہ بن مولانا شاہ رفیع الدین،

---

[1] مشہور احراری لیڈر مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی بھی مولانا عبد العزیز پنجابی تلمیذ مولانا محمد عبد الحق خیرآبادی کے شاگرد ہیں۔ مولانا عبد الحق جب اپنے والد ماجد کے ساتھ پنجاب گئے تھے تو مولوی عبد العزیز کو بچپن میں دیکھا تھا، عرصہ دراز کے بعد جب مولانا کی خدمت میں تعلیم کے لئے حاضر ہوئے تو پہلی نظر ہی میں پہچان لیا اور شریکِ درس کر لیا۔ [2] حرز العلماء بوفاۃ شمس العلماء۔

مولانا قطب الدین خاں، مولوی کریم اللہ، مولوی سید محبوب علی، مولوی نصیر الدین شافعی، مولانا محمد نور الحسن، مولانا مملوک علی، سراج العلما مفتی سید رفعت علی، آخون شیر محمد افغانی، مولوی سید امان علی، مولانا شاہ محمد اسحاق محدث۔

مشائخ میں:- مولانا شاہ غلام علی، مولانا شاہ ابو سعید، حضرت شاہ محمد آفاق مجددی، حضرت شاہ غلام نصیر الدین عرف کالے صاحب، خواجہ محمد نصیر۔

شعراء میں:- مرزا اسد اللہ خاں غالب، امام بخش صہبائی، حکیم مومن خاں مومن وغیرہم۔

انہیں باکمال اساتذہ کا ڈنکا بج رہا تھا۔ چاروں طرف علم و ادب کے چرچے تھے۔

والد گرامی نے تربیت کے ساتھ ساتھ تدریس و تعلیم کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ ہاتھی اور پالکی پر دربار آتے جاتے وقت درس دیتے، پڑھاتے بلکہ گھنٹوں۔ ۱۶ سال کی عمر میں تمام درسیات منقول و معقول سے فارغ کر دیا۔

مولانا کا آبائی وطن خیر آباد بھی علم و ادب کا گہوارہ تھا۔ شاہی زمانے میں کمشنری رہ چکا تھا۔ بڑے بڑے علماء و مشائخ، صاحب کمال اور اہل فن افراد ہر دور میں ہوتے رہے ہیں۔ ہندستان کے مردم خیز قصبوں کے صف اول میں اس کا شمار رہا ہے۔ [1]

---

[1] بیان کیا جاتا ہے کہ گیارھویں صدی عیسوی میں کھیرا پاسی نامی ایک شخص نے اس کی بنیاد ڈالی تھی بعد میں ایک کائستھ خاندان اس پر قابض ہوا اسلامی دور سلطنت میں "کھیر" کا "خیر" بن کر خیر آباد ہو گیا۔

عہد اکبری میں سرکاری کمشنری بنایا گیا یہاں نائب صوبہ دار یا ناظم رہا کرتا تھا۔ حدود علاقہ زیر حکومت کو سرکار کہتے تھے۔ ناظم کے ماتحت کئی نائب ناظم (چکلہ دار) ہوا کرتے تھے۔ ان کے زیر حکومت علاقہ کو چکلہ کہا جاتا اس نظام حکومت میں بائیس محال یا پرگنے شامل تھے۔ ان میں سے متعدد محال اضلاع کھیری و ہردوئی میں واقع تھے۔ خیر آباد خود محال بنام پرگنہ حویلی خیر آباد مشہور تھا۔ اس میں مزروعہ اراضی ۱۵۹۰۵۷۲ بیگھہ تھی اور مالگزاری ۲۱۶،۲۳۴ دام، زمیندار برہمن تھے، فوجی قوت، ۵ سوار، ۲۰۰۰ پیدل حکومت کے لیے مہیا رکھتے تھے۔ ابتداء عملداری انگریزی سے اس کی آبادی میں کمی ہو رہی ہے۔ ۱۹۰۱ء میں جب پہلی مردم شماری ہوئی، ۱۵۶۷۷ آبادی تھی۔ اب حالیہ مردم شماری میں ۱۳۶۴۴ ہے ۶۱ فی صدی مسلمان اور ۳۹ فی صدی غیر مسلم ہیں، دو چار محلوں کے سوا باقی محلے غیر آباد ہیں، مساجد سو سے متجاوز مگر غیر آباد و ویران زیادہ ہیں حسب ذیل ناظمان اودھ متعین خیر آباد ہوئے۔

۱۔ شیر علی

۲۔ مرزا عبد اللہ بیگ بانی مسجد صرکو ۱۲۰۹ھ

۳۔ مرزا بندے علی بیگ ۱۲۵۶ھ

۴۔ مولوی فرید الدین گوپاموی

۵۔ حکیم واجد علی والد ماجد حضرت مولانا ہادی علی خاں رحمۃ اللہ علیہ ۱۲۴۷ھ

۶۔ حکیم مرزا مہدی علی خاں ۱۲۴۸ھ

۷۔ وزیر بیگ عرف مینڈو خاں

۸۔ محمود علی خاں

۹۔ مرزا ابو الحسن

۱۰۔ مرزا محمد ہادی

۱۱۔ محمود علی خاں

۱۲۔ امرت لال پاٹھک ۱۲۴۰ھ

۱۳۔ گوردھن لال ۱۲۶۹ھ

۱۴۔ گردھاری لال

۱۵۔ گردھارا سنگھ

۱۶۔ راجہ درشن سنگھ

۱۷۔ ہر پرشاد ۱۲۶۶ھ

۱۸۔ ولی محمد خاں

۱۹۔ سید محمد حسین خاں بہادر سہسوانی ۱۸۵۷ء

۲۰۔ کنور فتح چند

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

خیرآباد و دہلی کی علمی صحبتوں نے کم عمری ہی میں مرتبۂ کمال کو پہنچا دیا تھا۔ علامہ کے ذکر میں گذر چکا ہے کہ ایک مرتبہ موصوف حاشیۂ قاضی کے اوراق لکھتے میں کہیں ضرورت سے اٹھ کر چلے گئے۔ مولانا عبدالحق اتفاق سے پہنچ گئے، ایک صفحہ پورا لکھ ڈالا۔ علامہ نے دیکھکر دریافت کیا اور اصل حقیقت معلوم ہوتے پر بے ساختہ مسرت کا اظہار فرمایا۔ اس وقت مولانا کی عمر ۱۴ سال تھی۔

والد ماجد کے ساتھ الور آنا جانا رہتا۔ مہاراجہ مولانا کی بول چال اور علم و فضل کے شیفتہ ہو گئے علامہ کے الور سے چلے جانے کے بعد ان کو عمائد ارکان سلطنت میں شامل کر لیا۔ ہنگامۂ ۱۸۵۷ء مطابق ۱۲۷۴ھ میں دہلی میں قیام تھا۔ باپ کی گرفتاری پر لکھنؤ پہنچکر پیروکاری کی۔ جزیرۂ انڈمان جانے کے بعد کچھ عرصہ خیرآباد میں گذارا، پھر نواب صاحب کی طلبی پر ٹونک چلے گئے۔ دو سال وہیں قیام فرمایا۔ فضل و کمال اور درس و تدریس کی شہرت ہندستان سے نکل کر بیرون ہند پہنچ چکی تھی۔ گورنمنٹ نے مدرسہ عالیہ کلکتہ کے لئے خدمات حاصل کر لیں۔ وہیں مولانا محمد اسمٰعیل اور مولانا ولایت حسین جیسے نامور شاگردوں نے تکمیلِ درسیات کی۔ کلکتہ کی آب و ہوا ناموافق ثابت ہوئی، نواب کلب علی خاں کے اصرار پر رامپور تشریف لے گئے۔ نواب نے شاگردی اختیار کی اور تعظیم و تکریم کا حق ادا کر دیا۔ بادشاہ تیمور نے علامہ تفتازانی کی جیسی آؤ بھگت کی تھی نواب نے بھی وہی برتاؤ کیا۔ ۱۲۸۱ھ سے ۱۳۰۰ھ تک حاکم مرافعہ اور پرنسپل مدرسہ عالیہ رامپور رہے۔ علاوہ گرانقدر مشاہرہ کے نواب وقتاً فوقتاً نذرانے کے طور پر بڑی بڑی رقمیں پیش کرتے رہتے۔ مولانا کی شاہانہ داد و دہش کے لئے یہ بھی ناکافی ہوتے۔ نواب خلد آشیاں کی رحلت کے بعد خیرآباد چلے آئے۔ کچھ دن بعد آصف جاہ نظام حیدرآباد نے بلا بھیجا۔ حیدرآباد پہنچنے پر امرا، و اراکین دولت نے استقبال کیا۔ وثیقہ جاری کیا گیا، تھوڑے دن قیام فرما کر وطن واپس ہوئے۔ تین سال کے

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

۲۱۔ راجہ نارائن دھن
۲۲۔ شیخ امام بخش
۲۳۔ مرزا ولی بیگ خاں
۲۴۔ مرزا منصور بیگ
۲۵۔ مولوی غلام یحییٰ خاں

شاہی گڑھی کے آثار اب تک محلہ میاں سرائے میں موجود ہیں۔ محمد فراشخانہ، توپخانہ بھی موجود ہیں۔ قابل دید عمارتوں میں مثلاً جمعدار کا امام باڑہ، منشی نیاز احمد بانی مدرسہ نیازیہ خیرآباد کا پتھر کا محل، علامہ فضل حق کی سنگین و عالیشان محل سرا، اور مدرسہ عربیہ نیازیہ کی بلند و بالا عمارت نے قصبہ کی شان کو دوبالا کر دیا تھا۔ علامہ کی محل سرا کے سوا باقی عمارتیں اب بھی موجود ہیں۔ یہ مدرسہ ۱۳۱۷ھ میں بن کر تیار ہوا۔ مولانا عبدالحق کی شایان شان بنایا گیا تھا۔ بانی مدرسہ کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ افسوس کہ اختتامِ تعمیر سے ایک سال قبل ہی یہ آفتاب علم غروب ہو گیا۔

بعد نواب حامد علی خاں نے رامپور میں قیام پذیر ہونے کی درخواست کی، ایک سال نواب کی خاطر سے گذار کر خیرآباد آگئے۔ یہاں ورم جگر، استسقاء اور ضیق نفس میں مبتلا ہو گئے۔ زبان و قلب سے ذکرِ الٰہی میں مشغول رہتے۔ حضرت شاہ اللہ بخش تونسوی سے سلسلۂ چشتیہ میں بیعت تھے۔ آخر عمر میں والدِ ماجد کی طرح تصوف کی طرف پوری توجہ مرکوز ہو گئی تھی۔

خلف الرشید صاحبزادہ مولانا اسد الحق نے حالت متغیر ہونے پر ہدایات طلب کیں، ارشاد ہوا۔

"دنیا سے احتراز اور دراہم و دنانیر سے اجتناب، حبِ مال تمام برائیوں کی جڑ ہے مسلمان کے لئے مال و دولت کی خواہش نازیبا اور اس کی ہوس بدترین گناہ ہے۔"

اسی شب (۲۳، شوال المکرم ۱۳۱۶ھ) میں عالمِ جاودانی کو رونق بخشی۔ احاطۂ درگاہ مخدوم شیخ سعد میں اپنے دادا مولانا فضل امام اور ان کے استاذ الاستاذ ملّا اعلم سندیلوی کے پاس مدفون ہوئے۔

خدائے سخن منشی امیر احمد امیر مینائی نے تاریخ کہی ؎

شمس العلماء زظلمتِ دہر — چوں تیر زابرِ تیرہ بر جست

برلوحِ مزار امیر بنویس — آرامگہِ امامِ وقت است ۱۳۱۶ھ

مولانا کے اس حادثۂ رحلت پر نہ صرف سارے ہندستان میں ماتم کیا گیا بلکہ بیرونِ ہند بھی علماء و اعیان نے سوگ منایا، خلیفۃ المسلمین سلطان ٹرکی نے بھی ایک ہفتہ تک مدرسۂ اظہریہ میں تعطیل رکھی ملکی اور غیر ملکی جرائد نے مقالات لکھے۔

امیر مینائی کے شاگردِ رشید لسان الملک ریاض خیرآبادی نے اپنے اخبار "ریاض الاخبار" میں آج سے ۸۴ سال قبل جو کچھ لکھا تھا اسے درج کیا جاتا ہے:

علم و فضل کا گھر بے چراغ ہوا

"جناب شمس العلماء مولانا عبد الحق صاحب قبلہ کے انتقال کا صدمہ ایسا نہیں ہے کہ ملک و قوم اس کو بھلا سکے، اس حادثہ سے صرف خیرآباد ہی دار العلم نہ رہا بلکہ ہندستان ہی سے یہ فخر معدوم ہو گیا اور ہندستان کے سامنے عرب و عجم سے بھی کچھ شک نہیں ایسے آفتابِ علم و فضل کے پنہاں ہونے سے دنیائے اسلام تاریک ہو گئی۔

مولانا علما اکابرِ اسلام کے عجب قابلِ قدر یادگار تھے۔ سچ پوچھئے تو شمس العلماء مولوی عبدالحق کیساتھ تمام زندہ نام علماء آج تہِ خاک ہوگئے۔ ایک ذاتِ واحد میں ایسے کمالاتِ غریبہ اور اوصافِ عجیبہ کا۔ جمع ہوجانا مرحوم مولانا کی ذاتِ بابرکات کے ساتھ گیا۔

زمانہ تو صرف صورتِ ظاہری کا معاوضہ بھی ادا نہیں کرسکتا وہ نورانی چہرہ، وہ خندہ روئی وہ زندہ دلی، وہ سراپا علم، وہ رعب کمال، وہ شانِ ادب، وہ فضل وجلال۔

دیکھنے والے کے لئے صورت ہی پکار اٹھتی تھی کہ دنیائے اسلام کو فخر و ناز آج اسی قدسی صفات بزرگ پر ہے۔

شمس العلماء کا بہت بڑا احسان دنیا پر یہ ہے کہ وہ دولتِ علم و کمال کو خاندانی اختصاص کے ساتھ بہت ہی محفوظ طور پر منتقل فرما کر ایک ایسے سینہ کو گنجینۂ علوم بنا گئے جو سلسلۂ فیض و برکت کے عدمِ انقطاع کا بہت ہی بااعتبار ضامن ہے۔

ہم امید کرتے ہیں کہ ہز ہائنس فرمانروائے رامپور اور اعلیٰ گورنمنٹ نظام شمس العلماء مرحوم کے وظائف ان کے صاحبزادہ مولانا اسدالحق صاحب کے نام منتقل فرمادینگے کہ مقاماتِ مختلف و ممالکِ دور و دراز کے طلباء بے آس نہ ہوں اور دارالعلوم خیرآباد دارالعلوم بنا رہے۔[1]

جی چاہتا ہے کہ ریاض ہی قلم سے مولانا کے استغناء، جرأت اور وقارِ علمی کا ایک منظر پیش کرتا چلوں، "دربارِ قیصری" کے زیرِ عنوان "ریاض آپ اپنے آئینے میں" کے سلسلۂ مضامین نگار میں لکھتے ہیں :-

دربارِ قیصری

جس زمانہ میں ریاض الاخبار ہفتہ وار اور گلکدۂ ریاض ماہوار خیرآباد سے شائع ہوتا تھا (جس کے مطبع کا تاریخی نام "لمعۂ رخشاں" ۱۲۹۶ھ تھا)

---

[1] نثرِ ریاض صفحہ ۲۱۱ مرتبہ عقیل احمد جعفری خیرآبادی۔

اعلیٰ حضرت نواب کلب علی خاں بہادر خلد آشیاں نے مجھے میرے استاذ حضرت امیر مینائی مرحوم و مغفور کے ذریعہ سے یاد فرمایا۔ میں اس وقت دربارِ قیصری میں شرکت کے لئے دہلی جانے کو شدت سے بیتاب تھا۔ اس سے پہلے دربارِ قیصری میں تمام اخبار نویس ہر صوبے سے مدعو تھے۔ ان کا کیمپ خاص تھا خیمے بہ کمال تزئین و تکلف نصب تھے۔ دو ایڈیٹروں کے لئے ایک خیمہ ضروری فرنیچر و اسباب آرام کے ساتھ مخصوص تھا۔ کھانے اور ناشتے کے لئے خاص سرکاری اہتمام تھا۔ پُر تکلّف چاء ، ہر وقت تیار رہتی تھی۔ چمن بندیاں ، اعلیٰ پیمانہ پہ تا حدِ نظر ہر طرف تھیں۔ میں مع نظام احمد مرحوم مالک ریاض الاخبار دہلی گیا۔ کیمپ کے سوا مولانا ابوالمنصور مرحوم امام فن مناظرہ کے دولت خانہ پر مہمان بننا پڑا۔ شب گذاری کا اتفاق وہیں ہوتا۔ کیمپ میں پنجابی اخبار کا خیمہ ہماری شرکت میں تھا۔ مولانا مرحوم کے بڑے صاحبزادے خاں بہادر سید ناصر علی صاحب غالباً موجود نہ تھے بعد کو آگئے۔ آپ کے چھوٹے بھائی سید نصرت علی صاحب مالک نصرت الاخبار دہلی کا زیادہ ساتھ رہتا۔ دن تو والیان ملک کے عالیشان پُر فضا فردوسی کیمپوں میں گزرتا جو دہلی کے باہر کوسوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ ہر طرف لہلہاتے ہوئے چمن زار سجے ہوئے بازار، ان کی وضع قطع ، ان کی آراستگی ، یہ بھولا ہوا خواب کہاں تک بیان کرسکتا ہوں۔ اسی گلگشت میں ظہیرا نور سے بھی شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ میری باریابی نواب مردان علی خاں صاحب بہادر خیر پور سندھ کے حضور میں بہ امتیازِ خاص ہوئی تھی۔ حضور نواب صاحب اور تمام دربار فارسی زبان کا استعمال کرتے تھے۔ مجھے مہاراجہ کشمیر کے کیمپ میں بھی جانے کا اتفاق ہوا تھا اس بنا پر کہ مہاراجہ اس سے پیشتر رونق افروزِ لکھنؤ تھے تو سیٹھ سیتا رام صاحب تعلقہ دار سیوان جن کے روابط مہاراجہ سے تھے مجھے بھی اپنے ہمراہ لے گئے تھے مگر اس وقت مہاراجہ بعزمِ واپسی سوار ہو رہے تھے۔ سرسری شرفِ تعارف حاصل ہو سکا۔ دربار دہلی کی تقریب میں سیٹھ صاحب موصوف بھی تشریف لائے تھے مجھے بھی مہاراجہ

کے کیمپ میں ہمراہ ہو گئے۔

دربار کیمپ کے قریب پہنچکر ہم نے دیکھا کہ درباری کیمپ سے شمس العلماء مولانا عبدالحق صاحب علامہ خیرآبادی کسی قدر منغص آ رہے ہیں۔ کشمیر کے ایک اعلیٰ افسر بھی لجاجت کناں ساتھ ہیں۔ مولانا اسی تنغص کے ساتھ فٹنس پر سوار ہو گئے۔ ہم لوگ ایڈی کانگ کے ہمراہ خیمے میں آئے ہر طرف خاموشی تھی۔

سیٹھ صاحب نے دریافت کیا کہ کیا واقعہ ہے؟ جواب ملا اس وقت واقعہ یہ پیش آگیا ہے کہ شمس العلماء کے تشریف لانے کے لئے یہ وقت مقرر کیا گیا تھا شمس العلماء تشریف لائے۔ مہاراجہ نے براہ تعظیم گوشہ مسند پر جگہ دی۔ مزاج پرسی فرمائی۔ ساتھ ہی حکم دیا کہ ولیعہد کے اتالیق کو تکلیف دو۔ وہ بھی تشریف لائے۔ مہاراجہ نے انہیں بھی شمس العلماء کے مقابل گوشہ مسند پر جگہ دی۔ ممکن ہے شمس العلماء کی نازک مزاجی نے اسے ناپسند کیا ہو، پھر مہاراجہ نے فرمایا مجھے مدت سے آرزو تھی کہ ایسے بلند پایہ علماء کا کسی مسئلہ پر مناظرہ دیکھوں۔ یہ سنتے ہی شمس العلماء نے برافروختگی کے ساتھ کہا:

"مہاراجہ! آپ نے مرغ اور بٹیر کی پالیاں دیکھی ہوں گی، علماء کی یہ شان نہیں ہے"

ساتھ ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ مہاراجہ کو عرق آگیا۔ ان پر اس ناگوار واقعہ کا زیادہ اثر تھا۔ ہم لوگ بھی بغیر ملاقات واپس آ گئے۔

دوسرے روز مجھے معلوم ہوا کہ مہاراجہ کشمیر نے افسر اعلیٰ کے ذریعہ سے گیارہ پارچہ کا خلعت اور نقد دو ہزار روپے معذرت کے ساتھ شمس العلماء کی خدمت میں بھیجے۔ شمس العلماء نے بجواب کہا مجھے افسوس ہے کہ مہاراجہ نے براہ قدردانی خلعت و نقد سے عزت افزائی کی مگر میں اس کے قبول کرنے سے معذور رہوں کیونکہ میں رئیس رامپور کا ملازم ہوں۔

یہ پرچہ نواب مشتاق علی خاں بہادر ولیعہد رامپور کو ان کے کیمپ میں گذرا۔

خلد آشیاں فرمانروائے رامپور بیماری کی وجہ سے دہلی آنے اور دربار قیصری میں
شرکت سے معذور رہے تھے۔ پرچہ گذرنے پر ولیعہد بہادر نے خلد آشیاں کو
اس واقعہ کی اطلاع تار پر دی۔ تار ہی پر جواب آیا، ہماری طرف سے گیارہ
پارچہ کا خلعت اور نقد دو ہزار پیش کرو۔

شمس العلماء جو کسی بات پر مدار المہام رامپور سے برہم ہو کہ دہلی اس غرض سے
آئے تھے کہ واپس نہ جائیں اور کسی ریاست میں ملازمت کر لیں اس قدر افزائی
پر دربارِ قیصری کے بعد رامپور چلے آئے اور پھر کبھی خلد آشیاں سے جدا نہ ہوئے۔"

مولانا کو دیکھنے اور برتنے والوں کی زبانی راقم الحروف نے سینکڑوں واقعے سنے جو مولانا
کے فضل و کمال، حسنِ اخلاق، استغناء، جرأت اور حق گوئی و صداقت شعاری پر دلالت کرتے ہیں۔
لسان الملک حضرت ریاض خیرآبادی مرحوم، نواب بشیر احمد فاروقی خیرآبادی مرحوم، سید خلاق الحسن
مرحوم رئیس خیرآباد، منشی نذر محمد خاں اختر مرحوم، مولوی محمد فاروق نیرّ مرحوم، مولوی ظہیر احمد فاروقی،
مفتی سید فخر الحسن، مولانا حکیم احمد علی، حکیم سید انوار حسین اور مولوی حکیم ظفر الحق وغیرہم راوی ہیں
کہ مولانا بے حد نفاست پسند اور نازک مزاج تھے۔ بڑے دبدبہ والے اور باوقار تھے۔ جو کوئی ملنے
جاتا تواضع سے پیش آتے۔ اوقاتِ مقررہ کے علاوہ ملنے کی اجازت نہ تھی۔ علمی دربار میں پورے
لباس کے ساتھ رونق افروز ہوتے۔ اہلِ مجلس پر چھائے رہتے۔ کوئی شور و غل نہ کر سکتا تھا۔ چیخ کر
بات کرنا ممنوع تھا۔ نشست گاہ پر مسند اور تکیہ لگا رہتا۔ ارد گرد قالین بچھے رہتے۔ باہر سے آنیوالے
مولانا کے دربار کو امیر کی مجلس سمجھتے۔ دن میں دو تین بار لباس تبدیل فرماتے۔ جس کمرہ میں نشست ہوتی
ہر دروازہ پر جوتا رکھا رہتا جس طرف سے کمرہ سے باہر ہوتے ادھر پہننے کے لئے پاپوش رکھی ملتی۔

لباس عمدہ اور اعلیٰ قسم کا زیبِ تن فرماتے۔ عبا بھی استعمال کرتے۔ لکھنؤ کے دکانداروں کو
تشریف آوری خیرآباد کا حال معلوم ہو جاتا تو پچاس میل کا سفر طے کر کے اچھی چیزیں لاتے اور
منہ مانگے دام پاتے۔

مولانا ملازمین کی چالاکیوں سے کما حقّہٗ واقف ہوتے ہوئے بھی تجاہل سے کام لیتے اور
اکثر و بیشتر چشم پوشی فرماتے۔ دوسروں پر اس کا اظہار اس انداز میں فرماتے کہ حقیقت ظاہر ہونے

پر بھی ناگوار نہ گذرے۔

مولانا کو ایسا عارضہ لاحق ہو گیا کہ بگلوں کا شوربہ استعمال کرایا گیا۔ اس لئے بطوں کے ساتھ بگلے بھی پالے گئے تھے۔ بٹیریں بھی غذا میں رہتی تھیں۔ کئی دن تک دسترخوان پر بٹیر نہ دیکھی تو دریافت کیا۔ شبراتی ملازم نے جواب دیا کہ بگلوں کے ساتھ مادات کو بند کر دی جاتی تھیں وہ کھا گئے۔ خاموشی اختیار فرمائی مگر جو آیا اس سے ذکر کیا کہ ہماری بٹیریں بگلے کھا گئے۔ فرزندِ سعید مولانا اسد الحق سے بھی یہ ذکر آیا۔ وہ کہنے لگے ابا جان! یہ کارستانی شبراتی کی ہے۔ خود کھا گیا، بگلوں کے سر تھوپ دیا مولانا نے منہ پھیر لیا اور کئی روز بات نہ کی۔ کئی دن کے بعد عفوِ تقصیر کے لئے دست بستہ آکھڑے ہوئے تو فرمایا میاں تم نے ہمیں نادان سمجھا ہے۔ شبراتی ابا صاحب کا پروردہ ہے ہم کیسے اس کو چور بناتے یہ تو تمہارا ہی جگر تھا کہ بزرگوں کے دیکھنے والے کے لئے ایسے الفاظ استعمال کر بیٹھے۔ میاں اگر اس نے کھا یا بھی تو ہم نے اتنا فضیحتہ کر لیا کہ وہ خود نادم نظر آتا ہے۔ زبان سے کہنے کی کیا ضرورت تھی بڑوں کے لئے بے ادبی کے الفاظ آئندہ استعمال نہ کئے جائیں۔

لکھنؤ کے ایک دکاندار مولانا کے لئے الوانیں لے کر آئے۔ مولانا نے ایک الوان اسّی روپیہ قیمت کی پسند فرمائی، قلمدان طلب کیا۔ کچھ رقم کی کمی تھی۔ دکاندار سے کہا تم جاؤ ہم روپیہ بھیجکر الوان منگالیں گے۔ طلبہ یہ حال دیکھ رہے تھے۔ انھیں میں سے حافظ محمد محسن خاں تھے جو کراری (از مضافات آگرہ) کے زمیندار کے لڑکے تھے۔ یہ ذہین ہونے کے ساتھ مولانا کے منہ لگے بھی تھے۔ تاجر جب چلنے لگا تو یہ اس کے ہمراہ ہو لئے اور باہر جا کر اس الوان کو چالیس روپئے میں خرید لائے۔ بعد عصر جب مولانا رونق افروزِ مجلس ہوئے تو الوان لا کر نذر کی۔ ساتھ ہی یہ بھی عرض کر دیا کہ حضور! چالیس میں خریدی ہے۔ آپ نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور اٹھا کر پھینک دیا۔ فرمایا یہ وہ تھوڑی ہی ہے بے وقوف ہم کو احمق سمجھتا ہے اور خود بڑا عقلمند کا بچہ بنا ہے۔ ہم گرہ کٹوا لیتے اور یہ اس کی گرہ کاٹ لائے۔ یہ کہہ کر دربار سے نکال دیا۔

پریشان ہو کر مولانا کے پرانے خدمتگار شبراتی کے پاس پہنچے، کچھ رقم دینے کا وعدہ کر کے اسے سفارش پر آمادہ کیا۔ وہ اٹھا اور الوان کو درست کر کے دھلی پر پلیٹ کرا کر ململ کے ٹکڑے میں باندھ کر حاضر خدمت ہوا، عرض کیا حضور! حافظ جی سے وہ الوان واپس کرا کے اور چالیس روپیہ مزید دیکر

پسندکردہ الوان لے آیا۔ مولانا نے الوان دیکھ کر فرمایا۔ حافظ جی! دیکھو کتنا فرق ہے یہ دکاندار ہمارا نام سن کر آتے ہیں، منہ مانگے دام نہ پائیں تو کوئی کاہے کو آئے۔ لوگوں میں یہ چرچا تو ہے کہ نوابوں کی مانند ایک بوریہ نشین علائے مکتبی ایسا ہے کہ امراء کی طرح دل رکھتا ہے۔

نفاست پسندی کا یہ عالم تھا کہ ایک روز ٹوکرے والا آم لے کر حاضر ہوا۔ آم بہت عمدہ تھے مگر آپ نے دور سے دیکھ کر ہی واپس کر دیا۔ کسی طالب علم نے آم والے سے کہا ان آموں کو دھو کر کپڑے سے پونچھنے کے بعد چھوٹی ٹوکری میں رکھ کر کسی دوسرے وقت حاضرِ خدمت ہو چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ منہ مانگی قیمت دیکر سب آم لے لیے گئے اور ہر آنے جانے والے سے اس کے سلیقہ کی تعریف کی۔

ایکبار کسی نے مجلس میں چمچہ کو چمچ کہدیا۔ مولانا کی طبع نازک پر یہ لفظ اتنا گراں گذرا کہ فوراً محفل برخاست کی اور کئی وقت تک اس کا اثر رہا۔

حضرۃ الاستاذ مولانا معین الدین اجمیری مرحوم کا بیان ہے کہ مولانا ٹونک میں اپنی قیام گاہ کے بالاخانہ پر تشریف فرما تھے۔ سڑک پر ایک بیل گذرا جس کے سینگ بہت بڑے اور بے تکے تھے۔ اسے دیکھ کر طبیعت میں تکدّر پیدا ہوا اور فوراً ملازم سے سامان درست کرنے کو کہا۔ ہر چند تمام عقیدتمندوں نے روکنا چاہا لیکن نہ رکے۔ فرمایا جس جگہ ایسے بیل رہتے ہوں وہاں عبدالحق کیسے رہ سکتا ہے۔

جرأت کا عالم یہ تھا کہ ایک قتل کے سلسلے میں آپ کے شاگردِ رشید مولانا حکیم برکات احمد ٹونکی پر الزام لگا دیا گیا۔ وہ مولانا کے پاس تھے کہ کوتوال رامپور وارنٹ لے کر حاضر ہو گیا۔ واقعہ معلوم ہونے پر کوتوال کے ساتھ نواب کی بھی خوب خبر لی کہ اسے بھی ساتھ لے کر آتا جب مزا معلوم ہوتا کہ طالب علم پر یہ جرأت کیسے کی جاتی ہے۔ کوتوال طیش میں بھرا ہوا نواب کے پاس پہنچا اور سارے الفاظ دہرا دیئے۔ نواب مولانا کے ناز بردار اور قدر دان تھے۔ الٹے کوتوال پر ناراض ہوئے مولانا نے میری توہین نہیں کی بلکہ تو نے کی۔ تو ایسے شخص کے پاس کیوں پہنچا جو نواب کو بھی برا بھلا کہہ سکتا ہے۔ اس توہین کا صرف تو ذمہ دار ہے۔

مولانا کی تصانیف داخلِ درس بھی ہیں اکثر چھپ گئی ہیں۔ حاشیۂ قاضی مبارک، حاشیۂ غلام یحییٰ، حاشیۂ حمد اللہ، حاشیۂ میر زاہد امورِ عامہ، شرح ہدایۃ الحکمۃ، شرح مسلم الثبوت، شرح کافیہ

تسہیل الکافیہ، شرح سلاسل الکلام، جواہر غالیہ، رسالہ تحقیق تلازم مشہور تصنیفات ہیں۔

تسہیل الکافیہ اور شرح ہدایۃ الحکمۃ داخلِ نصاب ہیں۔ مولانا کی تحریر کا کمال یہ ہے کہ شرح کو متن سے اس طرح ملاتے ہیں کہ ذرا تسلسلِ بیان میں فرق نہیں آتا اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود شارح ہی ماتن ہے اور یہ کہ متن و شرح نہیں ہے بلکہ مسلسل کتاب ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے مولانا ابوالکلام آزاد عربی، فارسی اور اردو کے اشعار جابجا اپنے مضامین و خطوط میں چسپاں کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ محسوس ہونا مشکل ہے کہ عبارت شعر کے لئے لکھی گئی تھی یا شعر اس عبارت کے لئے کہنے والے نے کہدیا تھا۔

مولانا نے اردو میں زبدۃ الحکمۃ بھی تحریر فرمائی جسے مولوی امداد حسین کے ذریعہ شائع کیا گیا تھا اب نایاب ہے۔

اس سے مولانا کی اردو دانی اور ادبیت کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ یہ کتاب تو میرے سامنے نہیں ہے جس کا حوالہ دیکھ کر کچھ بتا سکتا البتہ امیر اللغات پر مولانا نے جو تقریظ تحریر فرمائی تھی اسے تاریخ نثر اردو مرتبہ مولانا احسن مارہروی مرحوم سے نقل کرتا ہوں جس سے ۶۰ سال پہلے کی زبان اور مولانا کا حسنِ بیان دونوں کا پتہ چل جائے گا۔ ساتھ ہی یہ بھی محسوس ہو سکے گا کہ یہ علومِ قدیمہ کے ماہر و متبحر علماء علوم و فنون میں کتنا درک رکھتے تھے اور شے کی حقیقت و کُنہ تک کیسے پہنچے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی اردو لغت پر تقریظ نہیں ہو رہی ہے بلکہ کسی مسئلہ فلسفہ و حکمت کو حل کیا جا رہا ہے۔

"ہر زبان جو مافی الضمیر کی ترجمان ہے اپنے خصوصیات میں ضرور امتیاز رکھتی ہے اگرچہ وہی مفردات، وہی مرکبات، وہی کنائے، وہی تمثیلیں، وہی مقامِ استعمال، وہی مثلیں، وہی مقولے ہیں جو لغات میں مستعمل ہیں۔ لیکن خصوصیات لسانی کا بتانا نہایت مشکل اور نکتۂ لاینحل ہے۔ یہ مسلّم ہے کہ لغت کا موضوع لفظِ مفرد ہے۔ مفردات کے اصلی مادے کی جستجو، اشتراکِ لفظی یا معنوی، حقیقت یا مجاز کا بتانا اس کے عوارضِ ذاتی اور محلِ بحث ہیں لیکن اس کے موضوع کو (جو مختلف لفظوں سے مخلوط ہو کر ہر خاص و عام کی زبان پر آتا ہے) اس طور پر ملحوظ رکھنا کہ خاص زبان اور اس کے الفاظ اور مستعملات اخالیطِ ناگہانی سے الگ ہو کر ممتاز رہیں یا بحث

کے مقامات ان عوارض سے الگ ہوں جو عوارضِ ذاتی یا نوعِ عوارضِ ذاتی سے جدا
اور اعراضِ غریبہ ہیں داخل یا اس کے عین ہیں، کوئی آسان امر نہیں. کبھی کبھی اس عمومِ
موضوعیت کے علاوہ خاص خاص وہ پہلو بھی مبحوث عنہ ہو جاتے ہیں جو خاص ایک
زبان سے متعلق اور دوسری زبان کے موضوع یا عنوانِ موضوع کے خلاف ہوتے ہیں
مثلاً بعض جملے جو ہیئتِ ترکیبی کی وجہ سے مفردات کے کل ہیں اور مفردات اس کے
جزء ہیں، بظاہر موضوع کی نوعیت اور شخصیت سے الگ اور جدا ہوتے ہیں جس سے
یہ شبہ ہوتا ہے کہ کیوں یہ محلِ بحث اور موضوعیت میں داخل ہیں. لیکن اس مقام پر یہ
سمجھنا ضرور ہے کہ مفردات جن کو عام طور پر لوگ مفردات جانتے ہیں اُن سے یہ مفردات
عام ہیں مثلاً "زید" مفرد ہے اور "زید آیا" مفرد نہیں. لیکن ان مفردات پر غور کرنے
والوں یا موضوعیت کی نگاہ رکھنے والوں کو اس "زید آیا" کو اس وقت ہیں نحو و مباحث
مفردات میں داخل کرنا ہوگا جس وقت بصورتِ مقولہ یا مثل ظاہر ہو جس کا خاص منشا
یہ ہے کہ مقولے اور امثال بھی اپنے خاص معنی کے لحاظ سے مثل مفردات کے ہیں. اسی
لئے مطلق زبان کی خصوصیت جو اس کے اجزائے مادی یا ترکیبی سے پیدا ہو ملحوظ رکھنا
لغت کا مقصدِ اعلیٰ اور غایتِ قصویٰ ہے.

راقم کو اس وقت لغت کے پورے مقاصد کا بتانا، اس کے موضوع یا تعریفات
سے بحث کرنا منظور نہیں ہے بلکہ اس وقت صرف یہ بتانا اور ظاہر کر دینا ہے کہ "امیر
اللغات" نے کہاں تک اپنے مقاصد اور اغراض کے پورا کرنے میں کامیابی حاصل کی
ہے اور اس کے مصنف نے کہاں تک اس تالیف میں اصلی غرض کا خیال رکھا ہے؟
امیر اللغات کا اگرچہ ابھی ایک ہی حصہ نکلا جس میں الفِ ممدودہ ہے لیکن ان اغراض پر نظر
کرنے کے بعد جو لغت کے اہم مسائل ہیں اور امیر اللغات میں تحقیق کے ساتھ لکھے گئے
ہیں. یہ کہنا ضروری ہے کہ یہ لغت اپنی جامعیت کے لحاظ سے ایک نمونہ ہے جس نے
مصنف کی تدقیقِ نظر اور کتاب کی جامعیتِ مسائل کو اس طور پہ ظاہر کر دیا ہے جس کو
ملک اور قوم فخر اور مباہات کی نظر سے اگر دیکھے تو زیبا ہے اور مجھے معلوم ہوتا ہے

کہ ملک نے اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ اردو لغات کے اشتراک اور منقولات جو اعلیٰ سے اعلیٰ لغت نویس کی نگاہ سے کوسوں دور اور مخفی رہ سکتے تھے، ایک لغت کے معنوں کا انتہا سے انتہا باریک فرق حدِ تعمقِ نظر سے بھی حاصل نہیں ہو سکتا تھا، مفردات کی تحقیق اور مرکبات کی تدقیق (جو خصوصیات کے لحاظ سے مفردات میں داخل ہیں) کس شان سے بیان کی گئی ہے کہ اردو زبان بھی اس تصنیف کو دیکھتے ایک علمی زبان معلوم ہوتی ہے۔ اس کتاب کی عظمت اس شخص پر خوب ظاہر ہو سکتی ہے جس نے کبھی اس قسم کی دماغ سوزی کی ہو۔

ہرچند امیر اللغات کے مصنف (مولوی منشی امیر احمد مینائی مرحوم) کی استادیِ فنِ شاعری اور قابلیتِ علمی مسلّم الثبوت ہے لیکن یہ کتاب میری رائے میں اس عام اور خیالی تسلیم کے لئے برہانِ قوی ہے اور ہندستان کو ضرور مایۂ فخر ہے۔ دعا کرنا چاہیے کہ اہلِ کمال اس کتاب کی پوری قدر کریں اور مصنّف اس کو جیسا کہ چاہیے اور جیسا پہلا حصہ ہے اس سے عمدہ حالت پر پورا کر سکے کہ اردو زبان سے محتاجی اور عدمِ استقلال کا الزام رفع ہو اور یہ عمدہ یادگار زمانے میں رہ جائے۔

محمد عبد الحق العمری الخیرآبادی عاملہ اللہ بلطفہ الهادی فی العواقب والمبادی

۱۳۰۹ھ مطابق ۱۸۹۲ء

مولانا کی یہی تبحرِ علمی اور تمام اصنافِ علم پر قدرتِ تامہ، علمائے عصر سے فضل و کمال کا لوہا منوائے ہوئی تھی۔ وقت کا بڑے سے بڑا عالم مولانا کے کلمۂ خیر اور تعریف کو اپنے لئے سند سمجھتا تھا۔ استاذ العلماء مولانا مفتی محمد لطف اللہ علیگڈھی کے درس میں ایک بار تشریف لے گئے۔ مفتی صاحب نے حسبِ عادت درس بند کر کے سرو قد ہو کر پذیرائی فرمائی۔ مزاج پرسی وغیرہ رسمی مراتب گفتگو کے بعد فاضل خیرآبادی نے فرمایا کہ طلبہ کا وقت بہت عزیز ہے حرج نہ فرمائیے۔ قاضی مبارک کا درس ہونے لگا۔ مولانا سنتے رہے۔ ختم ہونے پر طلبہ سے کہا کہ تمہارے استاد کی تقریر ایسی ہے کہ اعتراض خود بخود دفع ہو جاتے ہیں۔ [۱] اس کا نتیجہ تھا کہ جو کتاب بھی تصنیف فرماتے اس کی ایک نقل مفتی صاحب کے پاس بھی بھیجتے۔

[۱] استاذ العلماء صفحہ ۳۸ مؤلفہ نواب صدر یار جنگ بہادر

موصوف کے کتب خانہ میں شرح ہدایۃ الحکمۃ اور دوسری تصانیف علامہ کی دستخطی اب بھی موجود ہیں۔
مولانا کی سیرچشمی اور استغنا کے ثبوت کے لئے یہ واقعہ بھی کچھ کم اہم نہیں کہ علامہ فضل حق کی ضبط شدہ جائداد میں سے پندرہ سال کے بعد سند خطاب شمس العلماء کے ساتھ جب کچھ گاؤں واپس ہوئے تو خیرآباد کا باشندہ مسمّٰی یار علی علامہ کا لڑکا بن کر ان پر قابض ہو گیا اور کچھ دن بعد انہیں بیچ ڈالا۔ مولانا رامپور میں مقیم تھے۔ اعزہ و احباب کے اصرار کے باوجود اس جھگڑے میں پڑ کر عذرداری تک گوارا نہ کیا۔ شمس العلماء ہونے کے باوجود کبھی اسے باعثِ فخر نہ سمجھا، نہ اس کے ذریعہ کوئی عزت و وقار حاصل کرنے کی کوشش کی۔

والد ماجد کی عالیشان و سنگین محل سرائیوں کے قبضے میں اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے مگر اس خطاب کو واسطہ بنا کر اس کے حصول کی سعی نہ فرمائی۔ کشمیر و رامپور کے دونوں واقعات نے ثابت کر دیا کہ مولانا نے علم کی عزت و شان کو کیسا بلند و بالا رکھا تھا۔ پریشان حالی کے باوجود طرزِ رہائش امیرانہ رکھا اور تھے بھی درحقیقت امیر بن امیر بن امیر، عالم بن عالم بن عالم بن عالم۔
مولانا کو بلا طلب گورنمنٹ برطانیہ نے ۱۸۸۷ء میں شمس العلماء کا خطاب بھی پیش کیا تھا۔ فرمایا کرتے تھے باپ کو کالے پانی کیا اور بیٹے کی خطاب سے اشک شوئی کی۔ جو سند دی گئی تھی اس کی نقل درج کی جاتی ہے:

Sanad

To,

Maulvi Abdul Haque
of Khair abad in Oudh
I hereby Confer upon
you the title of Shamsul-

Ulama as a personal
distinction

Dufferin
Viceroy & Governor
General of India

Fort William
The 16th February 1887

Seal
Supreme Goverment
British India
۱۸۲۱ سنہ عیسوی

امور ممالک دخیرا گرہند
انگریز بہادر مختار بالاطلاق درنظم ونسق
مہر سرکار اعظم واعلیٰ

مولانا نے دو شادیاں کیں۔ زوجہ اولیٰ بنت مولوی فضل الرحمٰن سے عائشہ بی بی زوجہ محمد حسین بسمل تھیں۔ زوجہ ثانیہ دختر جناب بوعلی سے مولانا اسد الحق تھے جو دختر احمد حسین سے منسوب تھے۔

مولانا کے ہزاروں تلامذہ میں سے نامور شاگرد حسبِ ذیل ہیں۔ ان میں سے اول الذکر چار، وہ عقیدتمند ہیں جنہوں نے مولانا کے دربارِ علمی میں پندرہ سال سے لیکر بیس سال تک تعلیم میں صرف کیے ہیں اور عمر کا بہترین حصہ استاد کی ناز برداری اور عتاب وغصہ کی برداشت میں گذارا ہے۔

۱. مولانا سید عبد العزیز سہارنپوری
۲. مولانا نادر الدین
۳. مولانا ماجد علی جونپوری
۴. مولانا حکیم برکات احمد بہاری ٹونکی
۵. مولانا ظہور الحسن رامپوری
۶. صاحبزادہ مولوی امیر محمد علیخاں رامپوری

۷۔ علامہ سیّد علی بلگرامی
۸۔ مولانا محمد طیب مکّی
۹۔ خلف الرشید مولانا اسد الحق خیرآبادی
۱۰۔ مولانا سید احمد بخاری (والد مولوی حکیم محمد احمد خیری علیگڈھی)

فرزند سعید مولانا اسد الحق کو فرمانروائے رامپور نے مولانا کی وفات کے کچھ دن بعد ہی مدرسہ عالیہ رامپور کا پرنسپل مقرر کر دیا۔ موصوف نے اپنی قابلیت سے اس جگہ کو پر کیا اور دریائے فیضِ علمی جاری فرمایا۔ افسوس یہ ہے کہ صرف ایک ہی سال اس عہدہ جلیلہ پر فائز رہے تھے کہ ۷، ربیع الاخر ۱۳۱۸ھ کو والد ماجد کی وفات کے پورے ڈھائی سال بعد اس سرائے فانی سے عالم جاودانی کی طرف رحلت فرمائی اور وہیں کٹرہ ملا محمد حسین لکھنوی میں سپردِ خاک ہوئے۔ تالیفات میں رسالہ حمیدیہ (فن منطق) یادگار ہے۔

اولاد میں مولوی حکیم ظفر الحق خیرآبادی بہ قیدِ حیات ہیں۔ عزیز الحق اور بی بی رقیہ زوجۂ حسن رضا سندیلوی جوارِ رحمتِ خداوندی میں پہنچ چکے۔

مولانا اسد الحق کی وفات پر حکیم عابد علی کوثر خیرآبادی مرحوم (والد مولانا حکیم احمد علی خیرآبادی) نے قطعۂ تاریخ لکھا ؎

حیف آں آفتابِ فضل و کمال — دفعتاً شد نہاں بزیرِ زمیں
بود در فلسفہ و منطق فرد — در اصول و فروع مہرِ مبیں
منتخب در حدیث و فقہ و ادب — فاتحِ قفلِ گنجِ دینِ متین
در ریاضی و ہندسہ، حکمت — فاضلے در جہاں نبود چنیں
ماہِ تابانِ عزّ و مجد و علا — مہرِ رخشانِ شوکت و تمکیں
وائے در رامپور گشت خزاں — باغِ شاداب و سبزِ شرعِ دیں
پس ہمانجا بخاک بسپردند — شد غروب آفتابِ علم و یقیں
اخت و امّ از ملال خاک بسر — ابن و زوجہ ملول و زار و حزیں
اقربا از فراق نالہ زناں — دوستاں در غمش نگار و غمیں
مدرسہ از غمش خمیدہ پشت — طلبہ از ملال خاک نشیں
کوثرِ زار سالِ فوتش گفت — اعلم، اکمل مقیمِ خلدِ بریں
۱۳۱۸ھ

مولانا اسد الحق کے ساتھ اس خاندانِ خیرآباد سے نسلی طور پہ علم کا خاتمہ بھی ہو گیا۔ مولانا کے بعد نواب صاحب رامپور نے اپنے استاد بھائی مولانا عبد العزیز سہارنپوری کو رامپور رکھا۔ مولوی حکیم ظفر الحق کو تعلیم کے لیے ان کے سپرد کیا۔ حکیم صاحب نے اپنی توجہ فنِ طب کی طرف مبذول رکھی اور اس خاندانی و وراثتی علم کو خاص اہمیت نہ دی۔ رامپور کے بعد کچھ دن ٹونک بھی جا کر رہے۔ مولانا حکیم سید برکات احمد اور مولانا معین الدین اجمیری سے بھی کچھ پڑھا۔ اواسطِ کتب تک پہنچنے پر ٹونک کو خیرباد کہہ کر خیرآباد آ گئے۔

حکیم صاحب نے ایک شادی خاندان میں کی۔ ان مرحومہ سے اولاد نہیں ہوئی۔ دو شادیاں غیر کفو میں کیں، دونوں سے اولاد ہے۔ کثرتِ اولاد اور ناسازگاریٔ زمانہ کی وجہ سے پریشانی میں زندگی گذرتی ہے یہی وجہ ہے کہ اولاد نعمتِ علم سے محروم ہے

تلک الایام نداولہا بین الناس ؕ

صلبی اولاد سے علم کا خاتمہ ہوا تو کیا ہوا روحانی اولاد کے دریائے فیض سے ایک عالم سیراب ہو رہا ہے۔ یوں تو مذکورہ بالا تلامذہ میں ہر فرد اپنی نظیر آپ تھا مگر سب سے زیادہ با فیض، نیک سیرت اور خوش صفات ہستی مولانا سید حکیم برکات احمد کی تھی۔

بدر الفضلاء مولانا حکیم سید برکات احمد ٹونکی

حاوی فروع و اصول، جامع منقول و معقول، آیت کردگار، یگانہ روزگار مولانا حکیم سید برکات احمد بہاری ٹونکی ۱۲۸۰ھ میں ٹونک میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد مولانا حکیم دائم علی طبیب خاص دربار ٹونک، مبز نگر، ضلع پٹنہ (بہار) کے خاندان سادات کے گرامی قدر فرد تھے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے عزیز اور بہار کے مشہور فاضل مولانا محمد احسن گیلانی سے حاصل کی۔ موصوف کے تعارف کے لئے محقق طوسی کی اقلیدس کے پہلے مقالہ کی تصحیح و تحشیہ کافی ہے۔ گیلانی سے لکھنؤ اور رامپور کے مدارس دیکھتے ہوئے تکمیل علم حدیث مولانا عالم علی مراد آبادی نگینوی سے کی۔ وہاں سے اجمیر ہوتے ہوئے فن طب کی تکمیل کے لئے ٹونک پہنچے۔ طبیب خاص والیٔ ٹونک سے پڑھنا شروع کیا۔ عسرت انتہا کو پہنچی ہوئی تھی کہ ایک شب حضرت سلطان الاولیاء خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے بشارت ہوئی کہ،

"میاں سید گھبراؤ نہیں خدا تمہاری مشکلات آسان کرے گا"۔

نواب محمد علی خاں کا زمانہ تھا۔ انہیں ولی عہد کے لئے ایک شریف، عالم، متقی اور طبیب اتالیق کی ضرورت تھی۔ ایسی ہمہ صفت موصوف ہستی سید مبز نگری ہی کی ہو سکتی تھی چنانچہ معالج خاص سے جب مشورہ کیا گیا تو سید صاحب ہی کو تجویز کیا گیا۔ اس طرح حضرت خواجہ بزرگ کی بشارت کے فوراً بعد عہدۂ اتالیقی ولیعہد پر فائز ہوئے اور ترقیوں کا دروازہ کھل گیا۔ جب ولیعہد (حافظ ابراہیم خاں خلیل) تخت نشین ہوئے تو سید صاحب نہ صرف طبیب خاص بنے بلکہ وزیر اعلیٰ کا درجہ بھی نصیب ہوا۔ خان کے خطاب سے بھی سرفراز ہوئے، جاگیر میں گاؤں بھی عطا ہوا۔

سید صاحب کی شادی ضلع مظفر نگر کے قصبہ پھلت کے اس شریف گھرانے میں ہوئی جس کا تعلق امام العلماء حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے تھا۔ انھیں بی بی صاحبہ سے سب سے پہلے وہ آفتاب علم طلوع ہوا جس نے ہند، کابل، بخارا، خیوا، کاشغر وغیرہ کے ذرات کو روشن و منور کر دیا اور جو آگے چل کر حقیقت میں برکات احمدی ثابت ہوا۔

ابتدائی تعلیم کے بعد سید صاحب نے اپنے ایک قدیم دوست اور صوبہ بہار کے مشہور عالم

مولانا لطف علی ڈھنچھوہوی کو صاحبزادہ کی تعلیم کے لئے ٹونک بلا لیا۔ حمد اللہ تک درسیات موصوف ہی سے پڑھیں۔ مولانا محمد حسن ٹونکی سے ہدایہ پڑھی۔ استاد کی توجہ اور ذاتی صلاحیت کی بنا پر طلب علم کا حقیقی جوش و ولولہ پیدا ہوا اور اس کے لئے ٹونک کا دامن صحرا تنگ نظر آیا۔ باپ جو لائق فرزند کو پل بھر کے لئے آنکھوں سے اوجھل کرنا گوارا نہ کرتے تھے اور اسی بنا پر ایک جید عالم کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں، بیٹے کے اشتیاق کو دیکھ کر اطلبوا العلم ولو کان بالصین کے مطابق اجازتِ شدِ رحال پر مجبور ہوئے۔ ہندستان کے طول و عرض کی طرف نگاہ اٹھی تو سب سے پہلے اسی حلقۂ درس پر نگاہ پڑی جو اس زمانے میں علوم عقلیہ کا گر مرکزِ وحید نہیں تو سب سے زیادہ ممتاز و نمایاں مرجع تھا۔ شمس العلماء مولانا محمد عبد الحق خیر آبادی کا قیام خیر آباد کے بجائے نواب کلب علی خاں کی نادر نوازیوں کی بدولت رامپور تھا۔ حمد اللہ اور ہدایہ کا فارغ شدہ یہ طالب علم ایساغوجی اور میزان منطق جیسی ابتدائی کتابوں کے درجہ میں سنئے سرے سے شریک کر دیا گیا۔

استاد کی خدمت میں شاگرد نے ۱۵ سال گذارے، وہ بھی کن صبر آزما حالات میں، یہ ناز و نیاز کی طویل داستان ہے۔ اس دور میں افسانوں سے زیادہ اس کی حقیقت سمجھنا دشوار ہے۔

شرح ہدایۃ الحکمۃ شروع ہوئی۔ ایک شوال میں اس کا پہلا سبق ہوا اور سالِ آئندہ کے دوسرے شوال میں جا کر دوسرا سبق۔ اس ایک سال کی مدت میں کیا لائق شاگرد کو یہ جرأت ہوئی کہ استاد سے اپنے تضییعِ اوقات کا گلہ کر سکے؟ اور بے التفاتی کا شکوہ زبان پر لا سکے؟ جانتا تھا کہ کامل استاد کی ایک نظر کیمیا اثر سالوں کی کسر ایک دن میں نکال دے گی اور مدتوں کی مسافت گھنٹوں میں طے کرا دے گی۔ یہ امتحان یہیں ختم نہیں ہو جاتا ہے۔ اسی کتاب کا سبق ہو رہا ہے۔ شاگرد عبارت پڑھ رہا ہے جب اس جملہ "تقتضی الردّ الیہ" پر پہنچتا ہے تو زبان سے دال مشدّد کے بجائے واؤ مشدّد نکل جاتا ہے اور الردّ الیہ کو الروّ الیہ پڑھ دیتا ہے۔ ادھر یہ لفظ منہ سے نکلا ادھر کتاب دور پڑی ہوئی تھی۔ استاد غصہ میں آپے سے باہر تھے، جو جی میں آیا کہہ رہے تھے۔ آخری حکم یہ تھا کہ

"میرے درس سے ابھی اٹھ جاؤ، ایسے کم سوادوں کو میں قطعاً نہیں پڑھا سکتا"

تعمیلِ حکم ہوئی۔ کئی دن کی روپوشی کے ساتھ حاضری کی اجازت چاہی گئی، نفی میں جواب ملا۔ بڑی بڑی سفارشیں بہم پہنچائیں، سب بیکار ہوئیں۔ دو تین ماہ انتظار کے بعد بصد حسرت و یاس ٹونک

واپس جانا پڑا۔

بار بار رامپور آتے اور نئی نئی سفارشیں پہنچاتے لیکن ساری کوششیں لاحاصل ثابت ہوتیں۔ استاد کی بے نیازیوں اور شاگرد کی نیاز مندیوں کا یہ سلسلہ دو سال تک جاری رہا۔

پُرسی کہ کرا خواہی از خیلِ بتاں جامی
چشمے است مرا آخر غیر از تو کرا خواہم

حضرۃ الاستاذ مولانا اجمیری مرحوم کا بیان ہے کہ جب مولانا ناراض ہو گئے اور رسائی کی کوئی تدبیر نظر نہ آئی تو درگاہِ خواجہ میں شاگرد نے استاد کی خوشنودی اور معافی خطا کے لئے ایک چلّہ کیا جس میں صرف ایک خشک روٹی کھاتے تھے۔ چلّہ سے فارغ ہو کر قطبِ وقت حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ موصوف نے دو روز قیام کا حکم دیا تیسرے روز قریب مغرب گھر سے ناشتہ پکوا کر بھیجا اور کہلا بھیجا کہ اب جاؤ۔

چنانچہ جب دردِ فراق کا مارا ہوا شاگرد خیرآباد پہنچا تو چلّہ کی ریاضت اور مولانا مرادآبادی کی دعا و برکت سے کامیابی کی شکل نظر آئی۔ خلاصہ یہ ہے کہ بالآخر مولانا کے خدمتگار نے ایک بیش قرار رقم لینے کے بعد کچھ ایسے موقعہ سے سفارش کی کہ پورے دو سال کے بعد پھر علم کے اس دیوانخانہ میں باریابی کا موقعہ ملا۔

علم کی وہ عزت کہ ایک غلطی نے ایک ہونہار شاگرد کو دو سال کی عقوبت کا مستحق قرار دیا اور انسانوں پر وہ شفقت کہ ادنیٰ خادم کی التجا پر اتنی قدیم خفگی زائل ہو جاتی ہے۔ یہ مولانا عبدالحق کی شاہانہ اور فقیرانہ طبیعت کے امتزاجی آثار کا عجیب و غریب نتیجہ تھا۔

اس سلسلے میں دو واقعے دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے۔ نواب کلب علی خاں کبھی کبھی مولانا سے مذاق بھی کر لیا کرتے تھے خصوصاً مولانا کی ذہانت اور حاضر جوابی سے لذت گیر ہونے کے لئے کوئی اس قسم کا واقعہ قصداً کرا دیتے تھے کہ مولانا کی زبان سے ایسی باتیں بے اختیار نکلنے لگیں۔ ایکدن موصوف نواب کے دسترخوان پر تھے۔ نواب نے خادم کو اشارہ کیا کہ ہڈیوں کو کسی رکابی میں جمع کر کے مولانا کے سامنے رکھ دو۔ رکابی سامنے آتے ہی یہ جملہ زبان پر جاری تھا:

"تم غالباً مستحق کو نہیں پہچانتے۔ اس رکابی کو نواب کے سامنے رکھو۔"

نواب کے نام کا پہلا جز، کالب ۔ کُتّا، تھا اسی کی طرف لطیف اشارہ فرمایا گیا۔ نواب اس قسم کے لطائف کے منتظر رہتے تھے، ندامت میں ڈوبی ہوئی تحسین کرتے۔

امراء و روساء کے دربار میں جرأت کا یہ حال تھا لیکن غریبوں کے ساتھ مسامحت و چشم پوشی کی یہ حد تھی کہ ایک زمانے میں یہی لائق شاگرد مولانا کے باورچی خانہ کا حساب لکھا کرتے تھے ملازم حساب لکھانے میں گڑبڑ کرتے۔ ایک دن استاد کی خدمت میں ماجرا کہہ سنایا کہ حساب میں ایک آنہ کے پان بھی لکھائے ہیں اور پنواڑی کے نام پر بھی ایک آنہ لکھایا ہے۔ ارشاد ہوا۔ تم بڑے نادان ہو، حکمت کی بنیاد حیثیات و اعتبارات پر قائم ہے۔ پان کی حیثیت سے اس نے ایک آنہ لیا اور بہ حیثیت پنواڑی کے دوسرا آنہ۔ لولا الاعتبارات لبطلت الحکمۃ

بٹیریں کھا جانے پر اسی ملازم نے جب مولانا کو بگلوں کا بٹیریں کھا جانا باور کرایا تو ہر آنے جانے والے سے اس واقعہ کا ذکر کر کے فرماتے کہ فلاسفہ تداخل کو محال سمجھتے ہیں لیکن میرے نوکر کا مشاہدہ ہے کہ بٹیریں بگلوں میں کچھ اس طرح در آئیں کہ بگلوں کا نہ جحم بڑھا نہ اس کے حیز میں کچھ تبدیلی ہوئی۔

باخبری کے ساتھ بے خبری کے یہ عجیب نظائر ہیں جن کی مولانا کی ذات گرامی حامل تھی۔

بہرحال سعادتمند شاگرد نے پندرہ سال استاذ کی خدمت میں اس طرح گزارے کہ جس کتاب حمداللہ کو گھر سے پڑھ کر آئے تھے جب وہاں تک کئی سال میں پہنچے تو ایک بار نہیں کئی بار سمعاً و قراءۃً اسے پڑھا اور سنا۔ نہ صرف نصاب درس نظامیہ بلکہ قدماء کی کتابیں بھی پڑھیں جن میں شفاء ابن سینا، شرح اشارات طوسی، افق المبین میر باقر داماد، حواشی دوانی، حواشی مرزا جان، خوانساری، مولفات قوشجی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ خود مولانا کی تصانیف خارج از نصاب "جواہر غالیہ" وغیرہا بھی پڑھیں۔

تکمیل معقولات کے بعد استاد کی اجازت حاصل کر کے اپنے حقیقی خالو اور خاندان ولی اللّٰہی کے ایک غیر مشہور مگر معتبر و مستند محدث مولانا محمد ایوب پھلتی قاضی ریاست بھوپال کی خدمت میں حصول علم حدیث نبوی کے لئے حاضر ہو گئے۔

ٹونک کے طلبہ کی ایک جماعت بھی جن میں مولوی نصیر احمد، مولوی خلیل الرحمٰن اور مولوی عبدالسمیع

بھی تھے۔ اس خیرآبادی شاگرد اور ٹونکی استاد کے ساتھ بھوپال گئے۔ بھوپالی طلبہ بھی شریکِ درس ہوئے۔ بھوپال جانے والے تینوں طلبہ فاضل بن کر نکلے۔ ایک مدرسہ خلیلیہ ٹونک کے صدر مدرس اور دوسرے محکمہ شرعیہ ٹونک کے مفتی اور تیسرے شیخ الفقہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد بنے۔ ایک سال سے زیادہ بھوپال میں رہ کر مراجعت فرمائے ٹونک ہوئے۔

زمانۂ طالب علمی میں اپنے والدِ ماجد اور حکیم رضی الدین دہلوی کے خاندان کے کسی فرد سے طب کی تکمیل بھی کر لی تھی۔ حکمت و طب دونوں اصطلاحوں کے لحاظ سے واقعۃً حکیم تھے اور یہ لقب اتنا غالب رہا کہ بعد وفات بھی حکیم صاحب ہی کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔

زمانۂ طالب علمی ہی میں شادی بھی ہو گئی تھی اور رامپور کے کسی بزرگ سے بیعت بھی ہو گئے تھے۔

حکیم صاحب تحصیلِ علم سے فارغ ہوتے تو والدِ ماجد حکیم دائم علی کی عمر پچاس بہاریں دیکھ چکی تھی، قویٰ مضبوط تھے، چاہتے تو فرائضِ ملازمت انجام دے سکتے تھے لیکن غلبۂ تصوف کی وجہ سے ذکر و شغل اور عزلت و گوشہ نشینی کی طرف طبیعت مائل تھی۔ نواب صاحب سے اصرار کر کے بلند اقبال فرزند کو اپنی جگہ مقرر کرا دیا۔ مولانا حکیم برکات احمد چاہتے تو اپنے والد کے اثرات اور اپنی اہلیت و صلاحیت کی بنا پر بڑے سے بڑا عہدہ حاصل کر سکتے تھے لیکن کبھی مال و جاہِ دنیا کی طرف توجہ نہ فرمائی۔ معالجِ خاص کے عہدہ ہی پر مدۃ العمر اکتفا کی۔ دنیا سے بے تعلقی کا یہ عالم تھا کہ حضرت الاستاذ مولانا معین الدین اجمیری مرحوم فرماتے تھے کہ تمام عمر روپیہ کے پیسے شمار نہ کر پائے۔ زندگی کا پہلا حصہ درس و افادہ تھا، دوسرے حصہ میں تالیف و تصنیف کا ذوق غالب ہوا، آخر عمر میں ہر چیز سے الگ ہو کر صرف اس مشغلہ میں ڈوب گئے جس کے لئے بنائے گئے تھے۔ کل عمر ۶۷ سال کی ہوئی۔ شروع میں مدرس تھے پھر مصنف ہوئے اور آخر میں وہ ایک صوفی صافی درویش نیک اندیش تھے۔

بھوپال میں طلبہ کی جو جماعت مستفید ہو رہی تھی انھیں میں کچھ طالب علم ہمراہی میں ٹونک پہنچے۔ یہاں باضابطہ درس کا آغاز ہوا۔ ابتداءً آپ کے پاس کچھ مقامی اور بیرونی طلبا کا اجتماع تھا، رفتہ رفتہ آپ کی درسی عظمت کا احاطہ وسیع ہونے لگا۔ ہندستان بلکہ عالمِ اسلام کے طلبہ آپ پر ٹوٹ پڑے

یہاں تک نوبت تھی کہ ایک زمانے میں صبح پانچ بجے سے لے کر رات کے گیارہ بجے تک مسلسل سبق پڑھاتے رہتے تھے۔ طلبہ کی کثرت کو دیکھ کر ریاست نے ایک شکستہ مکان میں قلیل تنخواہ پر چند مدرسوں کو رکھ لیا۔ یہ مدرسین تحتانی طلبہ کو درس دیتے تھے۔ والی ٹونک نواب محمد ابراہیم خاں خلیل کے تخلص کی مناسبت سے اس مدرسہ کا نام مدرسہ خلیلیہ رکھا گیا جو خدا کے فضل سے اب تک اسی شان سے چل رہا ہے۔ اس وقت حکیم صاحب کے تلمیذ التلمیذ مولوی منتخب الحق بہاری (شاگرد علامۃ الهند مولانا الحاج معین الدین الاجمیری) صدر مدرس ہیں۔ ابتداء میں اس مدرسہ کی وسعت صرف ایک دالان تک محدود تھی جس پر چھپر پڑا تھا جس میں دری کا بھی نہیں صرف جاجم کا فرش تھا۔ اس میں حکیم صاحب کے بیٹھنے کے لئے روئی کا چھوٹا سا گدا تھا۔ سامنے لکڑی کی ایک تپائی پڑی رہتی تھی جس پر ایساغوجی سے لے کر شفا تک، قدوری سے لے کر ہدایہ تک اور مشکوٰۃ سے لے کر بخاری تک درس ہوتا تھا جس کے غلغلہ سے بخارا، مصر اور افغانستان وغیرہ کی علمی مجلسیں گونج اٹھی تھیں۔ اس مدرسہ کے فارغین، ہندستان کے بڑے بڑے مدرسوں کے مدرس اور صدر مدرس ہوئے۔ جادا، سرحد کے کوہستانوں میں، کابل کی پہاڑیوں میں، بخارا کے مرغزاروں اور کوقند، خیوہ، تاشقند کی مسجدوں میں خدمت علم کرتے نظر آئیں گے۔

بیرونی طلبہ کے کھانے کے دو انتظام تھے۔ پہلی صورت یہ تھی کہ طلبہ کی ایک بڑی جماعت حکیم صاحب ہی کی ذاتی مہمان تھی۔ چار سو روپیہ ماہانہ تنخواہ ریاست سے ملتی تھی۔ جاگیر میں ایک گاؤں بھی تھا دفعتاً فوقتاً مسہل وغیرہ کے موقع پر ریاست خطیر رقم بھی پیش کرتی رہتی تھی۔ برسوں دیکھا گیا کہ بیس پچیس آدمیوں کا کھانا پک کر الگ خوانچوں میں طالب علموں کے پاس آتا تھا۔ گھر میں بجز ایک ماما بریہ کے مشکل سے کوئی خادمہ رہتی تھی لیکن یہ حکیم صاحب کی کرامت تھی یا بیگم صاحبہ کی غیر معمولی محنت کہ تازہ تازہ گرم گرم چپاتیاں، بکرے کے گوشت کا سالن صبح ۸ بجے تک طلبہ کو مل جاتا تھا۔ اسی طرح شام کو مغرب کی نماز پڑھ کر تازہ کھانا کھایا جاتا تھا۔ کچھ طلبہ حکیم صاحب کے علم دوست احباب کے مکان پر کچھ بعض مساجد شہر میں رہتے تھے۔ تھوڑی جماعت مدرسہ خلیلیہ سے وظیفہ پاتی تھی۔

طلبہ پر بے انتہا شفقت فرماتے تھے۔ درس و تدریس کے وقت پورا رعب و جلال رہتا تھا۔ عام مجلسوں میں پُر لطف گفتگوئیں رہتی تھیں۔ سب کو خطابات سے بھی نوازا جاتا تھا۔ ایک سرحدی

طالب علم جو فارغ التحصیل ہو کر شفا و اشارات پڑھنے کے لئے حاضر ہوا تھا اور تنومند و قد آور تھا اس کا نام "ابوالبشر" رکھ دیا گیا۔ پانی پت کے ایک معمر طالب علم "مولوی چچا صاحب" کے لقب سے ملقب ہوئے۔ ایک ذہین طالب علم مولوی عبدالواحد بدایونی مرحوم کو جو پست قد تھے "ملا مختصر" کا خطاب عطا ہوا۔ بہار کے ایک زیادہ بولنے والے طالب علم کو "بالسٹر" کے نام سے یاد کیا جاتا۔

بغیر مطالعہ کے قطبی و شرح جامی بھی نہ پڑھاتے تھے۔ جو طلبہ شروح و حواشی کی مدد سے مطالعہ دیکھتے ان پر سخت ناراض ہوتے۔ غیر درسی مجالس میں تحصیلِ علم اور قیمتِ علم کے متعلق ایسے واقعات سناتے کہ خود بخود طلبہ علم کی تشنگی سے مملو ہو جاتے۔ تقریروں، حاشیوں، شرحوں اور قلمی نسخوں کی نقل میں رغبت کا عجیب سلسلہ جاری رہتا۔ ایک مرتبہ فلسفہ کی ایک کتاب کی نقل کے سلسلے میں دو طالبعلموں میں کشمکش یہاں تک بڑھی کہ دونوں کے ہاتھ میں چھری دیکھی گئی۔ ایک مرتبہ خوانساری کا حاشیہ[1] شفا اور مولانا فضل امام خیرآبادی کا حاشیہ ملا جلال جنہیں آپ کسی کو نہ دکھاتے تھے اپنے شاگرد مولانا مناظر احسن گیلانی کو جلد بندھوانے کے لئے دیا کہ دو روز میں جلد بندھوا کر داخل کر دینا۔ مولانا مناظر احسن نے دو شبانہ روز لگاتار محنت کر کے انہیں نقل کر لیا اور چند گھنٹوں میں جلد ساز کو زیادہ اجرت دے کر جلد بندھوا کر حاضرِ خدمت کر دئے۔

علاوہ درسیات کے طب اور مثنوی مولانا روم کا بھی درس رہتا۔ فلسفہ شروع کراتے تو شمس العلماء مولانا عبدالحق کی تصنیف زبدۃ الحکمۃ (جو اردو میں ہے) سے ابتدا فرماتے۔

آپ کے یہاں کے طلبہ امتحان کے لئے ہر وقت تیار رہتے۔ جب کبھی سال میں باقاعدہ امتحان لینا ہوتا تو سوالات پہلے سے بتا دیتے پھر امتحان لیتے، اعتراضات کرتے، جرح فرماتے۔ جب اس میں کامل نکلتا تب پاس فرماتے۔ شعبان، رمضان اور شوال میں عموماً تعلیم بند رہتی۔ ہفتہ میں منگل اور جمعہ کو اسباق بند رہتے۔

---

[1] مولوی حکیم احمد علی خیرآبادی راوی ہیں کہ لکھنؤ سے مولانا عبدالحق کے نام خط آیا کہ فاضل خوانساری کا حاشیہ دستیاب ہو گیا ہے اس کی قیمت پچاس روپیہ ہے۔ حکیم صاحب نے وہ خط دیکھ لیا، لکھنؤ پہنچ کر حاشیہ خرید لیا اور ٹونک روانہ ہو گئے۔ مولانا نے روپیہ لیکر آدمی لکھنؤ بھیجا تو معلوم ہوا کہ کوئی شاگرد موصوف ہی کے لئے حاشیہ خرید کر لے جا چکا ہے۔ مولانا سمجھ گئے کہ برکات ہی کی یہ حرکت ہو سکتی ہے۔ فوراً ٹونک خط لکھا کہ اگر حاشیہ فوراً حاضر نہ کیا تو عاق کر دونگا حکیم صاحب نے قسموں سے مؤکد کر کے لاعلمی کا سرٹفکٹ روانہ کیا اور بعد میں کفارہ و توبہ سے کام لیا۔ یہ وہی حاشیہ تھا۔

فلسفہ ومنطق کے متعلق فرماتے کہ ان کتابوں کی حیثیت ایسی ہے جیسے پہلوان مگدر وغیرہ ہلائے کہ مقصد مگدر نہیں بلکہ پٹھے اور قویٰ مضبوط کرنا ہیں تاکہ اکھاڑہ میں کام آئیں ۔ ان کتابوں سے بھی ذہنی قویٰ کو مضبوط کرنا ہے تاکہ اسلام کی تائید میں مخالفین کی سرکوبی کی جائے ۔ یہی مقصد پیش نظر تھا اسی کے ماتحت ایک روز خوش ہو کر فرمایا کہ میں نے اپنا درس چند نشتروں کی تیاری کے لئے قائم کیا تھا ۔ سو الحمد للہ دو نشتر تو مجھے مل گئے ۔ اِن شاءاللہ ان سے بڑا کام نکلے گا ۔

حکیم صاحب سے متعلق جو کچھ لکھا جا رہا ہے اس کا بڑا حصہ شاگردِ رشید مولانا مناظر احسن گیلانی پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کے ان مضامین سے ماخوذ ہے جو موصوف نے حکیم صاحب کے انتقال کے بعد نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی ہدایت پر، ۱۳۴۷ھ مطابق ۱۹۲۹ء میں معارف اعظم گڈھ کے مسلسل تین نمبروں میں لکھے تھے ۔ موصوف نے ٹونک میں آٹھ سال گذار کر حکیم صاحب کے دریائے فیض میں شناوری کی ہے ۔ اس لئے اکثر و بیشتر واقعات و حالات چشم دید ہیں ۔ کہیں کہیں حضرت الاستاذ مولانا اجمیری اور دوسرے اکابر سے سنے ہوئے حالات بھی میں نے درج کر دئے ہیں ۔ اب میں مولانا مناظر احسن کے قائم کردہ عنوانات کے ماتحت انھیں کی عبارت، حسبِ موقعہ حذف و اضافہ کے ساتھ درج کرتا ہوں ۔

دورِ تالیف

تقریباً بیس سال تک مختلف علوم و فنون کی مسلسل تعلیم و درس کے بعد ادھر پچھلے دس پندرہ سال سے حضرت نے اپنی توجہ درس سے زیادہ تصنیف و تالیف کی طرف پھیر دی تھی ۔ ان کی کل کتابیں عربی زبان میں ہیں جن میں بعض تو چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں اور مختلف مضامین، درسی کتابوں کے مشکل مقامات کے حل سے متعلق ہیں ۔ ایک ضخیم کتاب آپ نے الحجۃ البازغہ کے نام سے لکھی جس میں مابعد الطبعیات کے چند اہم ابواب پر مجتہدانہ انداز سے گفتگو فرمائی گئی ہے ۔ نواب فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خاں مرحوم (استاد حضورِ نظام) نے اس کو حکومتِ آصفیہ کی جانب سے شائع بھی کرا دیا ہے ۔

ایک کتاب آپ نے فارسی سے عربی میں ترجمہ کی، یہ مولانا بحر العلوم کی شرح منار فارسی کا عربی ترجمہ ہے ۔ کاش شائع ہو جاتی تو نصاب کے لئے بہترین کتاب ہے ۔

آخر عمر میں آپ پر تصوف کا غلبہ ہوگیا اور چند اہم کتابیں اس موضوع پر لکھیں جو سب کی سب غیر مطبوع ہیں۔ آپ نے دیانند سرستی کے فلسفیانہ اصول کی تردید میں بزبانِ اردو کچھ نوٹ کرائے تھے جس کو باضابطہ مرتب کرکے صدقۂ جاریہ فی ردّ آریہ کے نام سے حضرت کے خلف رشید مولانا حکیم محمد احمد نے شائع بھی کرا دیا ہے۔ اردو میں اگر حضرت کی کوئی یادگار ہے تو یہی ہے۔ بعض نزاعی جزئیات کے متعلق چھوٹے چھوٹے رسائل بھی ہیں۔ ترمذی شریف کی ایک ضخیم شرح کا بھی آپ نے آغاز کیا تھا۔ بہرحال حدیث و تصوف کے سوا آپ کی تمام تالیفی کوششوں کا تعلق ایسے مسائل سے ہے جس کی مانگ علم کے دورِ جدید میں مشکل سے ہوگی۔

ایک رسالہ تار کی خبر پر اعتماد یا عدمِ اعتماد اور دوسرا نوٹوں کے ہنڈی کی طرح ہونے یا نہ ہونے پر بھی تصنیف فرمایا گیا ہے۔ اول الذکر رسالہ چھپ چکا ہے۔ دونوں میں دلائل و براہین میں کافی زور صرف کیا گیا ہے۔

مجاہدات و ریاضات

حضرت میں تقویٰ، انابت، اخلاص باللہ اور عشقِ نبوی کے جوہر ابتدا سے منور تھے لیکن ان میں آب و تاب اس وقت آئی جب علم و عقل سے آپ بالکل تھک کر بیٹھ گئے۔ یہ تو آپ کا ہمیشہ سے معمول تھا کہ رات کے تین بجے ساڑھے تین بجے اٹھ جاتے، تہجد کی نماز پڑھتے، پھر جہر کے ساتھ صبح تک ذکر کرتے۔ صبح کی نماز مبتوکی مسجد میں باجماعت ادا کرکے ایک خاص منظر قابلِ دید اس کے بعد یہ ہوتا تھا کہ نماز کے بعد طلوعِ آفتاب تک مسلسل زور زور سے دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر ادعیۂ ماثورہ کا ایک سلسلہ نہایت لجاجت سے شروع فرماتے تھے، مسجد سے اٹھ کر گھر آتے تانگہ تیار رہتا تھا علی الصباح نذر باغ نواب صاحب کو دیکھنے جاتے اور راستہ میں قرآنِ مجید اور دلائل الخیرات کے اوراد ختم کرتے۔

آپ پر حج و زیارت کا شوق مسلط ہوا اور حجاز کے سوا شام و فلسطین اور مصر ہوتے ہوئے آپ ہندستان آئے۔ اس کے بعد آپ کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ فقراء اور درویشوں کے یوں تو ہمیشہ سے معتقد تھے لیکن اس کے بعد اس جماعت کی دامن آویزی کا جذبہ بہت تیز ہوگیا۔ اسی عرصہ میں ایک ضرورت سے حیدرآباد جانا ہوا۔ وہاں تلاشِ فقراء میں آپ کی نگاہ ایک ایسے فقیر پر پڑی جو اپنی ظاہری شکل و صورت میں ایک معمولی سے آدمی تھے اور رسمی علوم میں بھی ان کا پایہ کچھ بلند نہ تھا لیکن فلسفہ و

منطق کا یہ نہنگ جب اس فقیر کے آستانہ پر حاضر ہوا تو پچاس سال کے سامنے سرمایہ کو ان کے قدموں پر نثار کر دیا۔ ان کا نام حضرت کمال اللہ شاہ عرف مچھلی شاہ تھا۔ حضرت سے بعض لاہوتی مسائل پر گفتگو ہوئی۔ اس کے بعد حضرت آبدیدہ تھے۔ اپنی گذشتہ محنت پر پچھتاتے تھے۔ تقریباً ایک ماہ تک حیدرآباد قیام رہا۔ وقت کا اکثر حصہ انھیں بزرگ کی چٹائی پر متحیرانہ بسر کرتے تھے وہ کچھ کہتے جاتے اور حضرت سنتے رہتے تھے۔

یہ بزرگ مدراس کی جماعت صوفیہ کے ایک بڑے اصلاحی گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے سلسلہ کے بزرگوں نے عربی فارسی میں ایک خاص قسم کا ذخیرہ مختلف کتابوں کی شکل میں مہیا کیا ہے۔ حضرت نے ڈھونڈھ کر یہ کتابیں قلمی و مطبوعہ مہیا کیں اور شاہ صاحب سے اجازت لے کر مراجعت فرمائے ٹونک ہوئے۔ آخر زندگی میں ان کا مشغلہ ان ہی کتابوں کا مطالعہ اور ان سے مطالب استنباط کر کے کئی کتابوں کی تدوین رہ گیا تھا۔ مچھلی شاہ صاحب نے ایک بار فرمایا کہ میں حکیم صاحب کو عالم مثال میں دیکھتا ہوں کہ ان کے سر پر تاج زرنگار ہے اور وہ کسی منصب عالی پر سرفراز کئے گئے ہیں۔ یہ واقعہ حضرت مچھلی شاہ نے حکیم صاحب کی زندگی ہی میں بیان فرمایا تھا۔

سخاوت

حضرت کا سینہ نہایت وسیع اور چشم کشادہ تھی۔ طالب علموں کے ساتھ جو برتاؤ تھا معلوم ہو چکا۔ اس کے سوا غریبوں، بیواؤں اور دوستوں کے ساتھ مخفی طور پر آپ بہت سلوک فرماتے تھے خصوصاً اقربا کے ساتھ آپ کا سلوک بالکل غیر معمولی تھا۔ تنخواہ کا ایک بڑا حصہ ہر مہینہ ان عزیزوں کو مشاہروں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ اخیر میں عربوں کی مہمان نوازی کا جذبہ آپ پر بہت غالب ہو گیا تھا۔ محبتِ رسول کی آگ جوں جوں تیز ہوتی تھی۔ دیارِ محبوب کا ہر آنیوالا آپ کو بے چین کر دیتا تھا یہاں تک کہ اسی شوق کے پیشِ نظر آپ نے چند سال پہلے عربوں کے لئے ایک مستقل سرائے اپنے مصارف سے تعمیر کرائی تھی اور اس کا نام رباط رکھا تھا۔ جس میں ہر قسم کے آرام کا سامان آپ کی طرف سے تھا۔ ٹونک میں جو عرب آتا خصوصاً اگر مدینہ کا ہوتا تو اس کے سامنے معمولی خادم کی حیثیت سے اپنے کو پیش کرتے خود دیتے، امراء سے لاتے اور نواب صاحب

سے کچھ نہ کچھ وصول کر کے ان عربوں کو دلوانا اپنے اوپر لازم کر لیا تھا حیدر آباد اور دوسری ریاستوں کو اپنے اپنے تعلقات و اثرات کی بنا پر عربوں کی سفارش کے خطوط تحریر فرماتے۔ بہرحال آپ کی اخلاقی صفات میں جود و بخشش کی صفت آپ میں بہت نمایاں تھی۔

سادگی اور وارفتگی و استغراق

لباس اور سواری وغیرہ میں آپ بالکل سادہ تھے معمولی لباس زیب تن فرماتے مزاج میں وارفتگی حد سے گذری ہوئی تھی۔ درسگاہ میں کبھی کبھی الٹا پاجامہ پہنکر تشریف لے آتے۔ پان کھانے کی عادت بہت زیادہ تھی۔ کپڑے اور سامنے رکھی ہوئی کتابیں منہ سے چھالیاں اڑا کر خراب کر دیتیں۔ آپ کی وارفتگی کے قصے بہت مشہور ہیں۔ ایسا بھی اکثر دیکھا گیا کہ عربی یا حیدر آبادی رومال کے بجائے کندھے پر پچکا نہالچہ ڈال کر باہر چلے آئے۔ ایک دن عمامہ کے بجائے پاجامہ سر سے باندھ کر دربار میں پہنچ گئے۔ نواب صاحب کے ٹوکنے پر متوجہ ہوئے۔ یہ بھی بسا اوقات ہوتا کہ کسی نے فیس دی، رومال جو کندھے پر اکثر ڈالے رہتے تھے اس کے کونے میں باندھ دی لیکن اس طرح کہ رومال میں گرہ لگ گئی مگر روپیہ باہر ہی رہا جس کا جی چاہتا لے لیتا۔ کوئی دیانتدار ہوتا تو پیش کر دیتا۔ علمی انہماک اور فکری استغراق میں اس قسم کے معقولات امور میں ایسے افعال کا صادر ہونا نادر نہیں ہے۔

قناعت

مزاج میں حرص کا شائبہ مطلقاً نہ تھا۔ مہاراجہ اندور نے مختلف ذرائع سے آپ پر زور دیا۔ بارہ سو مشاہرہ دینا منظور کیا اس کے سوا کچھ بھی وعدے کئے لیکن آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ ان باتوں کا اثر نواب صاحب پر بہت پڑتا تھا۔ خود فرمایا کرتے تھے کہ نواب یہ خیال کرتے ہیں کہ میں ان کو چھوڑ دوں گا حالانکہ ان کا یہ عجیب خیال ہے۔ حیدر آباد دکن کسی ضرورت سے جانے لگے تو نواب صاحب لپٹ کر کہنے لگے کہ مولوی برکات احمد صاحب! جانے کو تو جاتے ہو لیکن مجھے نہ چھوڑ دینا، بھائی ٹونک سے تو تم مجھے دفن کر کے ہی جانا۔ کیا معلوم تھا کہ معاملہ بالعکس ہونے والا ہے۔ انہوں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔

ٹونک ہی میں ایک واقعہ آپ کی مالی آزمائش کا پیش آیا تھا۔ اس وقت چاہتے تو

چھ لاکھ روپے جائز طریقہ پر آپ کو مل جاتے لیکن بعض لوگوں کی مروت سے آپ نے اس روپیہ کو بُری طرح ٹھکرا دیا۔

جدال ومناظرہ سے نفرت

بے نظیر منطقی اور فلسفی ہونے کے باوجود آپ جدال ومناظرہ سے متنفر تھے کبھی کسی سے زبانی مناظرہ نہیں فرمایا۔ رئیس رامپور نواب حامد علی خاں کے بار بار طلب فرمانے پر صرف ایک بار مولوی عبدالوہاب بہاری سے کچھ مکالمہ ہوا اور بس! اس مناظرہ کی کیفیت حضرت الاستاذ مولانا اجمیری نے اپنے رسالہ "چہار تازیانۂ قہار" میں تفصیل سے لکھی ہے اور ان فنی مسئلوں کو بھی تحریر فرمایا ہے جن پر گفتگو ہوئی تھی۔ بعض عقلی اور چند مذہبی جزئیات پر آپ میں اور آپ کے بعض معاصرین استاذ الاساتذہ مولانا فضل حق رامپوری مرحوم پرنسپل مدرسہ عالیہ رامپور اور شمس العلماء مولانا عبداللہ ٹونکی وغیرہما میں نوک جھوک رہی۔ نیز بعض مسائل دیوبندیہ کے متعلق آپ نے کبھی کبھی کچھ لکھا۔

سر سٹھ برس کی عمر میں یہ چند شاذ مثالیں ہیں اور یہ بھی کسی خاص وقتی جوش یا ہیجان کا نتیجہ تھا ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کی چھوٹی باتوں سے اللہ نے آپ کو بہت ارفع و اعلیٰ پیدا کیا تھا۔

تلامذہ

وسط ایشیا، ترکستان کے شہروں خصوصاً بخارا، تاشقند وغیرہ سے لے کر بنگال کے آخری حدود تک تقریباً ہر بڑے شہر میں آپ کا کوئی نہ کوئی شاگرد ضرور نظر آئے گا اور اچھی حالت میں نظر آئے گا۔ بیرون ہند سے آپ کے پاس طلبہ خاص کر اس لئے زیادہ آتے تھے کہ علاوہ درس نظامیہ کے آپ خصوصیت کے ساتھ ابن سینا، طوسی، قوشجی، دوانی، خوانساری، میرباقر داماد وغیرہم عجم کی کتابیں پڑھاتے تھے جو اس زمانے میں ہندستان ہی میں نہیں بلکہ شاید دنیائے اسلام بھی اس انداز میں نہیں پڑھائی جاتی تھیں۔ ماوراء النہر کے طلبہ میں ان مصنفین کی کتابیں پڑھنے کا خاص شوق تھا۔

علمائے ہند میں مولانا معین الدین اجمیری، مولانا خلیل الرحمٰن ٹونکی، مولانا نعیم احمد بھیلتی،

مولانا عبدالرحمٰن چشتی حیدرآبادی، مولانا اشرف ملتانی، مولانا عبدالسبحان بہاری، مولانا مقبول احمد
دربھنگوی، مولانا محمود سندھی، مولانا عبیداللہ الاصم البہاری، مولانا عبدالحمید ترمتی، مولانا محمد شریف
مبارکپوری، مولانا عبدالقدیر بدایونی، مولانا فضل کریم بہاری، مولانا احمد کریم بہاری، مولانا عبدالواسع،
مولانا مناظر احسن گیلانی وغیرہم حضرات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں اکثر ہندستان کے مرکزی مدارس
کے صدر مدرس یا مدرس رہے ہیں۔ اسلامی علوم کے حلقۂ علمی میں وقعت وعزت کی نگاہ سے دیکھے
جاتے رہے ہیں۔ ان تمام حضرات کا دریائے فیض پورے شان کے ساتھ بہتا رہا۔ ان میں سے
اب جو باقی رہ گئے ہیں ان سے اجمیر، بہار، حیدرآباد وغیرہ کی مسندِ درس وافتاء رونق پا رہی ہے
ایک عالَم دریائے علم کی ان نہروں سے سیراب ہوتا رہا اور اب بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ سیراب
ہو رہا ہے۔

اہل وعیال

حضرت کی پہلی شادی میر نگر (آبائی وطن) میں ہوئی تھی۔ کچھ ہی دنوں کے بعد ان کا انتقال
ہو گیا۔ ان سے کوئی اولاد نہیں ہے۔ اس کے بعد بہار ہی کے ایک بزرگ مولانا عبدالرحمٰن
ساکن پترہٹہ ضلع مونگیر کی صاحبزادی سے آپ کا دوسرا نکاح ہوا۔ حضرت کی یہ بیوی صاحبہ حقیقت
یہ ہے کہ ان گراں قدر خواتینِ اسلام میں سے تھیں جنہوں نے اپنے کو علم ودین کی خدمت میں
اپنے شوہر کا دستِ راست ثابت کیا تھا۔ بیوی صاحبہ نے حضرت کے تمام علمی مہمانوں کی خاطر
مدارات میں نہ صرف ان کے قیام وطعام کا تیس پینتیس برس تک انتظام کیا بلکہ صحیح یہ ہے کہ
انہوں نے ان بچوں کو مہربان ماں کی طرح پالا۔ اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے کہ بعض دفعہ
انہیں غریب الدیار طلبہ کے مصارف کے سلسلے میں اپنے زیور خفیہ طور پر فروخت کرنے پڑتے
تھے۔ طلبہ کی کیسی ناز برداری کرتی تھیں اس واقعہ سے اندازہ ہو سکے گا:۔

مولوی حکیم ظفرالحق خیرآبادی کو حکیم صاحب تعلیم کے لئے ٹونک لے گئے۔ یہ استاد کے
پوتے تھے اور دودمانِ عالی کے تنہا چشم وچراغ، ان پر حکیم صاحب کی توجہ ومہربانی سب سے
سوا ہونا ہی چاہئے تھی۔ موصوف کے حصے میں بھی خاندانی جلال کافی آیا ہوا ہے اور وہ زمانہ تو
شہزادگی اور صاحبزادگی کا تھا ہی۔ لہذا اوقات ایسا ہوا کہ صاحبزادہ کو کھانا ناپسند ہوا یا دیر میں پہنچا

ؑ سلطان المسافرین مولانا قاضی عبدالسبحان کھلاپچی (ہزاروی) بھی آپ کے تلامذہ میں سے تھے ۱۲ محمد موسیٰ عفی عنہ

تو آپ نے سالن کی رکابی اٹھا کر باہر سے حویلی میں پھینک دی اور جو کچھ جی میں آیا کہہ سنایا۔ لیکن اس نیکبخت بیوی صاحبہ نے کبھی شکایت کا ایک حرف زبان پر لانا گناہ سمجھا اور ہر طرح معذرت و خوشامد سے رضامند کرنے کی کوشش کی۔

موصوف جب اپنی زبان سے اس قسم کے واقعات سناتے ہیں تو ان فرشتہ خصلت انسانوں کے تذکرہ پر آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ اگر یہ بیوی صاحبہ نہ ہوتیں تو شاید برکاتی سلسلے کے ان علمبرداروں کو علمی آبادیوں میں نہیں پایا جا سکتا تھا۔ آپ ہی حضرت کے خلفِ رشید مولانا حکیم محمد احمد مرحوم کی والدہ ماجدہ تھیں اور محمد میاں کے سوا کوئی دوسری نسلی نشانی موجود نہیں تھی لیکن جس کی علمی ذریت زمین کے کناروں تک پھیلی ہوئی ہو گیا ہوا اگر ایک اکلوتے بچے کے سوا اس نے اور کوئی اولاد نہیں چھوڑی ؎

از صدائے سخنِ عشق ندیدم خوشتر
یادگارے کہ دریں گنبدِ دوّار بماند

مولانا حکیم محمد احمد علماً و منصباً، دیناً و عملاً اپنے والد مرحوم کے سچے جانشین تھے۔ والد کے بعد والئ ٹونک کے معالج خاص مقرر ہوئے اور موصوف کی جگہ درس و تدریس کی باگ آپ نے ہاتھ میں لی تھی کہ دو تین سال کے بعد والد ماجد کی خدمت گذاری کے لئے عالمِ جاودانی کو سدھار گئے۔ اور یہ حادثۂ علمی بالکل اسی صورت سے واقع ہوا جیسا کہ حکیم صاحب کے استاذ شمس العلماء مولانا عبد الحق خیرآبادی کو پیش آیا تھا۔ شمس العلماء کے دو سال بعد ہی آپ کے صحیح جانشین مولانا اسد الحق اعزہ و اقارب کو داغِ مفارقت دیکر نسلی سلسلۂ علم کو منقطع کر گئے تھے۔

مولانا حکیم محمد احمد نے دو یادگاریں چھوڑی ہیں، مولوی محمود میاں[1] اور مولوی مسعود میاں، دادا کے شاگرد مولانا محمد شریف صدر مدرس دار العلوم معینیہ عثمانیہ اجمیر شریف کی خدمت میں رہ کر تحصیل علوم کر رہے ہیں اور یونیورسٹیوں کے امتحانات بھی دے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نہ صرف نسلی بلکہ علمی یادگار بھی ان دونوں کو بنائے۔ بعض مطبوعہ اردو و عربی علمی رسائل بھی مرحوم کی یادگار ہیں۔ انھیں میں سے "احسن الکلام فیما یتعلق بالاجسام" بھی ہے۔

---

[1] جناب حکیم محمود احمد برکاتی صاحب علمی شخصیت ہیں اور کراچی میں مطب کرتے ہیں۔ — محمد موسیٰ عفی عنہ

وفات

ستر برس کی عمر کے بعد یکایک آپ ہستی کی اس منزل پر پہنچ گئے جہاں انسان دنیا میں غروب ہو کر آخرت میں طلوع ہوتا ہے۔ حکیم صاحب کی وفات کے حالات کے متعلق مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے نجل سعید خلفِ ارشد مولانا حکیم محمد احمد مرحوم کے اس مطبوعہ خط کو نقل کر دیا جائے جسے انہوں نے اقطارِ ہند کے تعزیت ناموں کے جواب میں شائع فرما کر متعلقین کے پاس بھیجا تھا[۱]

جنابِ محترم .... السلام علیکم وعلیٰ جمیع من اتبع الہدیٰ

آنجناب کا تار و مکتوب گرامی بہ سلسلۂ تعزیت و بہ طلبِ حالات مفصل علالت و وفات والدی سراج الملۃ والدین حضرت مولانا برکات احمد صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ موجب ممنونیت و تسکینِ خاطرِ فقیرِ حقیر ہوا۔ جواباً التماس ہے کہ حضرت علیہ الرحمۃ کو دو سال سے کچھ زیادہ عرصہ ہوتا ہے کہ ضعفِ معدہ کی شکایت تھی۔ سالِ گذشتہ اسی حالت میں بے تابانہ و پروانہ وار زیارتِ سلطانِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم و حجِ ثانی کے لئے روانہ ہو گئے۔ چونکہ موسم نہایت تیز و تند تھا اور طبیعت پہلے ہی سے مضمحل تھی اس لئے اسہالِ معدی میں زیادتی پیدا ہو گئی۔ سفرِ مبارک سے معاودت فرمانے کے بعد برابر سلسلۂ اسہال جاری رہا۔ غذا بجائے دو وقت کے ایک وقت ہو گئی۔ ریاضت کی کثرت، درس و تدریس کی پوری محویت، تصنیف و تالیف میں کامل انہماک کا نتیجہ یہ ہوا کہ ضعف یوماً فیوماً بڑھتا گیا اور مرض الموت کی ابتدا، یوم عید الفطر ۱۳۴۶ھ سے اس طرح شروع ہوئی کہ شدت سے دفعۃً بخار ہو گیا اور کامل تئیس ۲۳ روز تک مفارق نہ ہوا۔ اور پھر ورمِ جگر اور سوء القنیہ کو نوبت باستسقاء رسید۔ امراض کا اس طرح ہجوم تھا مگر وہاں صحت جسمانی کی طرف تغافل اور بے توجہی کا وہی عالم تھا جو ہمیشہ رہا اور جس نے صحت کو بالآخر اس اخیر درجہ کو پہنچا دیا۔ تکالیف کے اخفا کی اسطرح کوشش جاری تھی۔ ذکر و شغل، حبسِ دم، پاس انفاس، کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ اسی وجہ سے دو مرتبہ قئ الدم بھی ہوئی

---

[۱] مکرمی مولوی حکیم ظفر الحق خیرآبادی نے ۷ر ستمبر ۱۹۶۴ء کو میری حاضری خیرآباد پر یہ خط عاریۃً مجھے عنایت فرمایا۔

ماہِ صفر کے اخیر عشرہ میں مرض کی انتہائی شدت ڈبل نمونیہ کی صورت میں ظاہر ہوئی جس کی کمزور جسمانیت تاب نہ لاسکی اور آفتابِ فضل وکمال غرّہ ربیع الاول ۱۳۴۷ھ کو شب کے ۳ بجے غروب ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وما کان قیس ھلکہ ھلک واحد
ولکنہ بنیان قوم تھدما

وفات شریف سے ایک شب پہلے وصیت فرمائی کہ :

"میرے مدرسہ[1] اور رباط[2] کا پوری طرح خیال رکھنا، درس وتدریس کا سلسلہ پوری قوت کے ساتھ قائم رکھنا۔ میرے والدِ ماجد حضرت مولانا حکیم دائم علی صاحب بہاری) رحمۃ اللہ علیہ کا عرس ضرور جاری رکھنا، میرے فاتحہ کا بہت خیال رکھنا۔"

دورِ علالت کامل پانچ ماہ قائم رہا مگر ایک روز بھی مشغلۂ علمی ترک نہ ہوا۔ جمعہ کے روز حضرت کی زندگی کا اخیر دن اور یوم الرحیل تھا۔ میں جمعہ کی نماز سے واپس ہوا تو "التعرف فی حقیقۃ التصوف"، کے مطالعہ میں مستغرق تھے۔ انھیں ایامِ علالت میں تین عمیق علمی تصانیف فرمائیں جن کا اختتام زندگی کے لمحات کے اختتام کے ساتھ ہوا ہے۔ اور جن کو حضرت علیہ الرحمۃ کے معلومات کا نچوڑ سمجھنا چاہیئے اور جن میں امتناع نظیر النبی صلی اللہ علیہ وسلم وامتناع کذب الواجب جل مجدہ کو ایسے قوی تر اور روشن دلائل و حجج ساطعہ اور براہین قاطعہ سے ثابت کیا گیا ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ جیسا امامِ وقت ہی کر سکتا تھا۔ اور تیسری کتاب تصوف کے مسائلِ مشکلہ کے حل میں بہترین کتاب ہے۔ ان ہر سہ کتب کی تصانیف شروع مرض میں اس امر سے مطلع ہونے کے بعد کہ اب دنیا سے کوچ ہے، شروع کی گئی اور وفات

---

[1] دار العلوم نظامیہ خلیلیہ ٹونک۔

[2] مسافر خانہ حضرت موصوف۔

حسرت آیات سے چند ساعت پیشتر اختتام کو پہنچائی گئیں[1]۔ یوم الرحیل میں برابر عصر سے مغرب تک عیادت کے واسطے جوق جوق لوگ آتے رہے، بنہایت تبسم چہرہ اور خندہ پیشانی سے بات چیت اور تلقینِ ارشاد میں مصروف رہے۔ نمازِ مغرب سے فارغ ہونے کے بعد عشاء تک درود و وظائف کا سلسلہ جاری رہا اور عشاء کے بعد خلافِ معمول مدتِ دراز کے بعد تناولِ طعام فرمایا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ دس بجے تک آرام فرمایا۔ پھر پوری قوت کے ساتھ بیدار ہو کر دو بجے تک اولاً تلاوتِ قرآن شریف اور پھر ذکر بالجہر میں مصروف رہے۔ دو بجے سے جہر کی شدت میں فرق آنا شروع ہوا اور یٰس شریف جو ایک مدت سے رات کو پڑھی جا رہی تھی ختم کرائی اور پھر ذکر میں مصروف ہوئے تا آنکہ ٹھیک تین بجے اسی حالت میں جاں بحق تسلیم ہوئے اور وہ زبان ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی جس کی تذکیر و تلقین سے عالم گونج اٹھا۔ خدا جانے یہ کیا اسرارِ الٰہی میں سے تھا کہ تین روز سے آنکھوں میں ایسی غیر معمولی چمک دمک اور دلآویزی اور جاذبیت پیدا ہو گئی تھی کہ عام عیادت کنندگان نے بھی اس کا احساس کر لیا تھا اور ایک دوسرے سے متعجبانہ تذکرہ کرتے تھے۔ آہ! وہ آنکھیں تین بجے شب کو ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں لیکن قلب برابر ۸½ بجے تک جاری رہا۔ عوام اس واقعہ کو بہ نظرِ استعجاب دیکھتے تھے اور حقیقت شناس حضرات کہتے تھے " للہ الحمد ٹھکانے لگی محنت ان کی "

حکامانِ ریاست نے تمام دفاترِ سرکاری میں جنازہ و نمازِ جنازہ میں شرکت کے واسطے عام اجازت دی اور دار العلوم خلیلیہ میں نمازِ اولیٰ ادا ہوئی اور چوک دفاتر کے قریب ترصحرا میں نمازِ ثانی ادا ہوئی۔ دوسرے روز حسبِ فرمانِ خسروی ریاست میں تعطیلِ ماتمی ۱۹ اگست ۱۹۲۸ء کو دی گئی۔ فقیر حقیر پر غم کا جو پہاڑ ٹوٹا اور سر سے جو سایۂ طوبیٰ اٹھا، ایک طرف ذمہ داریوں کا طوفان امڈ آیا وہ سب سے

---

[1] آپ کی مطبوعہ تصانیف یہ ہیں، الحجۃ البازغہ، اتقان العرفان فی تحقیق ماہیۃ الزمان، الصمصام القاضب لراس المفتری علی اللہ الکذب، ام الکلام فی تحقیق حقیقۃ الاسلام، فصل الخطاب فی اعلم بالغائب، التلغراف، حسرۃ العلماء بوفاۃ شمس العلماء۔ ۱۲ شاہد شروانی

بالاتر ہے۔ کمترین نے ایک ہفتہ بعد (یعنی ٹھیک اس روز سے جب اعلیٰ حضرت
سرکارِ عالی وقار دام ملکہم و اقبالہم نے تشریف ارزانی فرما کر ....
رسم تعزیت ادا فرمائی اور فرمایا کہ اب فرائض منصبی یعنی معالجۂ سرکاری و حلات حضنوی
انجام دو اور مدرسہ کا کام شروع کرو) سب کام شروع کر دیئے ہیں وعلی اللہ التوکل
وبہ الاعتصام ۔ سرکاری معالجہ کی خدمت اگرچہ باقاعدہ مع تنخواہ چہار صد روپیہ و
جاگیر موضع ٹھکہ بیہ اپریل ۲۶ء سے میرے نام منتقل ہو چکی ہے۔ میں ذمہ دارانہ
حیثیت سے کام کر رہا ہوں۔ نیز مدرسہ کا سلسلہ باقاعدہ ۳۲ھ سے حضرت
رحمۃ اللہ علیہ کے ایماء سے جاری کر رکھا تھا مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی موجودگی
کی وجہ سے عجیب بے فکری و استغناء تھا اور فرائض مستحب کا درجہ رکھتے تھے۔
اب فرائض فرائض ہیں۔ خدا کے فضل سے دارالعلوم کے کل طلبہ پورے جوش و
مصروفیت کے ساتھ تعلیم حاصل کر رہے ہیں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بعد مجھے اپنا
تدریسی نظام الاوقات بدل دینا پڑا۔ اپنے اکثر اسباق ماتحت مدرسین کے پاس
منتقل کرنا پڑے تاکہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق اسباق اپنے ذمہ لے سکوں
چنانچہ میں نے ایسا کیا۔ نیز میں نے حضرت موصوف کے بعد مولانا عبدالرحمٰن
چشتی (شاگرد رشید حضرت رحمۃ اللہ علیہ و مدرس مدرسہ فتحپوری دہلی) کو اپنا اسسٹنٹ
کر کے بلا لیا ہے اور وہ بھی مصروف تدریس ہیں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ اعظم
حضرت مولانا نصیر احمد صاحب مدظلہ خصوصیت کے ساتھ درس تفسیر و حدیث میں
مصروف ہیں مجھے امید ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فیض علمی انشاء اللہ ہمیشہ
اسی طرح جاری رہے گا اور آپ اس کے لئے اوقات مخصوصہ میں دعا فرمائیں گے
حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی یادگار میں ایک مسجد اور چاہ کا بھی سنگ بنیاد رکھا گیا ہے
امید ہے کہ آپ حسب مراسم قدیم کارلائقہ و خیریت مزاج سے یاد فرماتے رہیں گے
حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ کی غیر مطبوعہ تصانیف کا سلسلہ اشاعت عنقریب شروع
کیا جاوے گا اور انشاء اللہ جناب کے لئے اس کے مطالعہ کا موقعہ ہوگا۔ فقط

نیازمند

کمترین ابوالحسنات محمد احمد الہاشمی معالج خصوصی فرمانروائے ٹونک
ناظم اعلیٰ وصدر المدرسین دارالعلوم نظامیہ خلیلیہ ٹونک (راجستان)

علامۃ الہند مولانا معین الدین الاجمیری

۲۵ صفر ۱۲۹۹ھ ——— ۱۰ محرم ۱۳۵۹ھ

الحبر العلام والبحر القمقام، اللوذعی الفہامۃ، والمنطیق التکلامۃ، علامۃ الہند حضرت الاستاذ مولانا الحاج معین الدین الاجمیری رحمۃ اللہ علیہ کی وفات حسرت آیات کے بعد ہندستان کے مشہور فاضل علامہ سید سلیمان ندوی نے معارف اعظم گڈھ اپریل ۱۹۴۰ء میں تعزیتی مضمون سپرد قلم فرمایا تھا پہلے وہ نقل کرتا ہوں اس کے بعد اپنی معلومات و مشاہدات کا کچھ حصہ مختصر طور پر پیش کرنے کی سعادت حاصل کروں گا۔

۱۰ محرم الحرام ۱۳۵۹ھ عین عاشورہ کے دن علم وعمل، فضل وکمال، مجاہدہ و استقامت، اور تقویٰ وطہارت کی ایک ایسی مسند خالی ہوئی جو غالباً عرصۂ دراز تک خالی رہے گی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس سے ہماری مراد حضرت مولانا معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کا سانحۂ ارتحال ہے! یہ حادثہ محض مولانا کے اہل خاندان یا مسلمانان اجمیر ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ سارا اسلامی ہند اس سے متأثر اور اپنی کم نصیبی پر نوحہ کناں ہے۔

وماکان قیس هلکه هلك واحد
ولکنه بنیان قوم تهدما

مولانا ایک نومسلم گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ والد ماجد مولانا عبدالرحمٰن صاحب مرحوم بلیا کے رہنے والے نومسلم راجپوت تھے اور والدہ بھی داخل اسلام ہوئی تھیں

اور دانا پور (بہار) ان کا گھر تھا۔ تعلق راجپوتانہ سے اس طرح پیدا ہوا کہ مولانا عبدالرحمٰن صاحب ریاست ٹونک میں سیکرٹری کونسل تھے۔ چار پانچسو روپیہ ماہانہ تنخواہ تھی۔ اسی علاقہ میں دیلوی (راجپوتانہ) میں ۲۵ صفر ۱۲۹۹ھ کو پیدا ہوئے اور باپ کے زیر سایہ زندگی کی ابتدائی منزلیں طے ہوئیں۔ بچپن ہی سے سعادت و فیروزمندی کے آثار نمایاں تھے چنانچہ دولت و ثروت کی گود میں پلنے والے اس نوجوان نے ہمیشہ طالب علموں میں مساوات ہی کی زندگی بسر کی۔ امیرانہ ٹھاٹھ اور رئیسانہ شان کا کبھی مظاہرہ نہ کیا۔

قسمت کی خوبی اور نصیب کی بلندی نے خاتم المحققین حضرت مولانا سید برکات احمد صاحب (بہاری ثم ٹونکی) سے تلمذ کا رشتہ قائم کرایا۔ اس تعلق سے مولانا کا سلسلہ تلمذ یہ ہے:۔

حضرت مولانا معین الدین صاحب اجمیری رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا سید برکات احمد صاحب ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا عبدالحق صاحب خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا فضل امام صاحب خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت ملا عبدالواجد صاحب خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت ملا اعلم صاحب سندیلی[1] رحمۃ اللہ علیہ

استاذ الکل حضرت ملا نظام الدین صاحب سہالوی رحمۃ اللہ علیہ

جملہ معقول و منقول کی تکمیل مولانا برکات احمد صاحب ہی سے ہوئی۔ علم ریاضی حضرت مولانا لطف اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل فرمایا۔ بائیس سال کی عمر میں

---

[1] معارف: مشہور یہی ہے کہ ملا اعلم سندیلی ملا نظام الدین سہالوی کے براہ راست شاگرد تھے مگر میری تحقیق میں یہ صحیح نہیں ہے۔ ملا اعلم ملا کمال الدین سہالوی کے شاگرد تھے اور وہ ملا نظام الدین کے، "س ا" واقعہ یہ ہے کہ ملا اعلم سندیلی دونوں کے شاگرد ہیں۔ ملا کمال الدین ملا نظام الدین کے ابن لعم اور شاگرد رشید تھے۔ استاد کے زمانے ہی میں سلسلۂ درس و تدریس کمال کو پہنچ چکا تھا۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی کے تحریر مآثر الکرام کے وقت بقید حیات تھے۔ ۱۱۷۵ھ میں وفات ہوئی اور ملا نظام الدین نے قریبی زمانے میں یعنی ۱۱۶۱ھ میں صرف ۱۴ سال قبل رحلت فرمائی تھی۔ ملا اعلم کا دونوں کا شاگرد ہونا مولانا حکیم سید برکات احمد نے حسرۃ العلماء بوفاۃ شمس العلماء میں لکھا ہے۔ ۱۲ شاہد شروانی

علوم میں ایسا رسوخ ہو گیا کہ جس کی نظیر کم دیکھی گئی ہے۔ اس وقت سے درس تدریس کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ ہندستان اور ہندستان سے باہر بلخ، بخارا، چین، افغانستان اور دوسرے ممالک سے طلبہ جوق در جوق آنا شروع ہو گئے۔ اسی زمانہ میں ایک خاص واقعہ نے آپ کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا عبدالحق صاحب، صاحب تفسیر حقانی کے زیر اہتمام آریوں سے ایک مناظرہ ترتیب پایا تھا۔ آریوں کی طرف سے پنڈت واشنا نند جی بحث کر رہے تھے مسلمانوں کی طرف سے بھی بڑے بڑے مناظر گفتگو کر رہے تھے۔ تین دن سے سلسلہ جاری تھا جب مولانا کی باری آئی تو آپ نے روح، مادہ، پرمیشر کی قدامت کے سلسلے میں حدوث وقدم کی طویل بحث کو اس خوبی سے بیان فرمایا کہ صرف ۷ منٹ میں پنڈت جی لاجواب ہو گئے اور موافق و مخالف آپ کے تبحر علمی کے قائل ہو گئے۔

اسی قسم کا ایک مکالمہ ہز ہائنس نواب حامد علی خاں مرحوم والی رامپور کی تحریک پر مولانا عبدالوہاب صاحب منطقی بہاری مرحوم سے ایک خاص علمی مسئلہ پر ہوا تھا جس کا نتیجہ بصورت کتاب شائع ہو چکا ہے۔

ڈھائی سال مدرسہ نعمانیہ لاہور میں صدر مدرس رہنے کے بعد ۱۳۲۶ھ میں اجمیر کو شرف سکونت بخشا اور ۱۳۲۷ھ میں مدرسہ معین الحق قائم کیا۔ سرکار نظام جب اجمیر تشریف لائے اور حضرت مولانا کے درس میں مسلسل چھ وقت شریک ہوئے تو اس قدر متاثر ہوئے کہ خلعت شاہانہ سے سرفراز فرمایا اور مولانا انوار اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک پر مدرسہ معین الحق کو معینیہ عثمانیہ قرار دے کر ساڑھے بارہ سو روپیہ ماہانہ اس کے لئے جاری فرما دیا۔ مولانا اس مدرسہ کے صدر مدرس ہوئے اور پندرہ سال تک یہاں درس دیا۔ ۱۳۳۷ھ میں کارپردازان مدرسہ اور مولانا میں اختلاف ہوا۔ چنانچہ انہوں نے استعفا دے کر محرم ۱۳۳۸ھ میں دارالعلوم حنفیہ صوفیہ کے نام سے ایک دوسرا مدرسہ قائم فرمایا اور ۱۲ سال تک اس مدرسہ کے طلبہ کو اپنے فیوض علمی و عملی سے سرفراز فرمایا۔ یہ مدرسہ اب تک قائم ہے اور شہر کے غریب مسلمان اسکو

چلا رہے ہیں۔ دارالعلوم معینیہ عثمانیہ سے علیحدگی کے باوجود اس کے اراکین، مدرسین، طلبہ اور دیگر متعلقین سے تعلقات خوشگوار رہے۔ ۱۳۵۱ھ میں مدرسہ کے اراکین حضرت مولانا کو پھر اپنے یہاں واپس لائے لیکن سیاسی اختلافات کے نتیجہ کے طور پر ۱۲ مارچ ۱۹۳۹ء مطابق ۱۳۵۸ھ کو بحکم سرکار نظام دارالعلوم معینیہ عثمانیہ سے آپ الگ ہو گئے لیکن اس علیحدگی کے بعد بھی حلقۂ درس پوری آب و تاب کے ساتھ قائم رہا۔

اس زمانہ درس و تدریس میں دوسرے علمی مشاغل بھی جاری رہے چنانچہ مولانا نے تصانیف کا ایک معتد بہ ذخیرہ چھوڑا ہے جس کا اکثر حصہ ابھی طبع نہیں ہو سکا ہے، مثلاً ترمذی شریف کا ایک ناتمام حاشیہ، وجود علم و معلوم، کلی طبعی اور مسئلۂ دہر پر مکمل اور جامع تقریریں، حضرت خواجہ غریب نوازؒ کی محققانہ سوانحعمری[1] وغیرہ۔ یہ چیزیں انشاء اللہ جب اہلِ علم کے سامنے آئیں گی۔ اس وقت ان کو معلوم ہوگا کہ اجمیر کے اس بوریا نشین کی نگاہِ تحقیق کتنی بلند تھی۔

آخری زمانے میں درگاہ بِل کی اصلاح کے متعلق جو فتوے[2] مولانا نے مرتب فرمایا تھا وہ اس قدر جامع اور موثر تھا کہ ایک طرف تو ہندستان اور حرمین کے علماء نے اس کی تاکید کی اور دوسری طرف ممبران اسمبلی نے اس بل کے ان تمام نقائص کو دور کیا جن کا شریعتِ اسلام سے تصادم ہوتا تھا۔

یہ تھی مولانا کی علمی زندگی! عملی زندگی کا یہ حال تھا کہ اجمیر میں صدہا بدعات کا خاتمہ کیا۔ اسلامی نقطۂ نظر سے ملک کی صحیح رہنمائی میں باوجود چند در چند مشکلات کے کبھی مطلق کمی نہیں فرمائی۔

تحریکِ خلافت میں مذہبی فتوے کے جرم میں دو سال کی قید و بند کو اس پامردی اور عالی ہمتی سے برداشت کیا کہ علی برادران نے قدم چوم لئے۔ جس زمانہ ابتلاء میں مولانا کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ العلماء، اور مولانا احمد سعید صاحب ناظم

---

[1] نثار خواجہ کے نام سے جولائی ۱۹۶۶ء میں شائع ہو چکی ہے ۱۲۔ شاہد شروانی

[2] اسعاف کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے ۱۲۔ شاہد شروانی

جمعیۃ العلماء، قید و نظر بندی کی تکلیفیں اٹھا رہے تھے۔ اس وقت تحریک کی رہنمائی کے لئے آپ ہر ہفتہ دہلی تشریف لے جاتے اور جامع مسجد میں نماز جمعہ کے بعد مسائل حاضرہ پر تقریر فرماتے۔ جمعیۃ العلماء کے اجلاس امروہہ کی صدارت فرمائی اور مستقل نائب صدر رہے۔ صوبہ راجپوتانہ کی مجلس خلافت کو آپ کی صدارت کا ہمیشہ فخر حاصل رہا تحریک کشمیر کے زمانہ میں مجلس احرار اسلام کے ڈکٹیٹر رہے مسلمانوں کے سوا برادران وطن بھی آپ کی سیاسی بصیرت کے معترف اور اس سے متاثر تھے۔

ان علمی اور سیاسی مشاغل کے ساتھ ساتھ سلوک اور تزکیۂ باطن کی طرف بھی پوری توجہ تھی۔ مولانا کے والد شاہ عبدالرزاق صاحب فرنگی محلی سے بیعت تھے اور خود مولانا شاہ صاحب کے صاحبزادہ حضرت مولانا شاہ عبدالوہاب صاحب (والد حضرت مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی مرحوم) سے بیعت تھے۔

استغنا، رجوع الی اللہ، توکل وغیرہ آپ کی طبیعت ثانیہ بن چکے تھے۔ آخری سال تو بڑے ہی صبر و استقامت اور متوکلانہ زندگی کے تھے۔ فرائض تعلیم و افتاء اور رشد و ہدایات کی ادائیگی کے بعد کبھی لوگوں میں بلا ضرورت نہ جاتے۔ ارباب دولت، اہل دنیا، خصوصاً امراء و حکام سے ہمیشہ بے تعلق رہے لیکن جب کوئی خدمت والا میں حاضر ہوتا تو اپنے قلب میں مولانا کے اخلاق فاضلہ کا خاص اثر لیکر واپس جاتا۔

عبادت کا یہ حال تھا کہ فرائض کے سوا نوافل و مستحبات کے بھی ہمیشہ پابند رہے تادم واپسیں اپنے اوراد و اشغال میں فرق نہ آنے دیا۔ حق گوئی میں کسی بڑی سے بڑی طاقت سے بھی نہیں ڈرے۔ اسلاف کی سنت کے مطابق قید و بند کی مصیبت سے بھی دوچار ہوئے لیکن اس کو بھی ہنسی خوشی برداشت کیا اور ہمیشہ وہی کیا جو ایک مجاہد اور ربانی عالم کو کرنا چاہیئے۔

ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت و شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ بخاری وغیرہ میں جب یہ حدیث آتی کہ حضور کے مرض وفات کی تکلیف دیکھ کر حضرت فاطمہ

رضی اللہ عنہا بے اختیار پکار اٹھیں "یا ابتاہ" (اے میرے باپ) سرکارِ دوعالم نے فرمایا لا کرب علیٰ ابیک بعد الیوم (آج کے دن کے بعد تمہارے باپ پر مصیبت نہیں ہے)، تو اس جملہ پر حضرت مولانا بیتاب ہوجاتے۔ آنسو نکل آتے چیخ نکل جاتی، بسا اوقات غشی طاری ہوجاتی، مدرسہ میں درس دیتے وقت ہر مرتبہ یہ واقعہ پیش آیا ہے۔

طلبہ اور علماء سے بہت محبت فرماتے تھے۔ ہونہار طالب علم مولانا کا مرکزِ توجہ بن جاتا تھا۔ ہر سال موسمِ بہار میں طلبہ کا ایک تفریحی جلسہ جس کو اجمیر کی اصطلاح میں "گوٹ" کہتے ہیں، منعقد ہوتا۔ اس جلسہ میں ہر ملک کے طلبہ کے مروجہ کھیلوں کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ مولانا طلبہ کی خاطر اس تفریحی اجتماع میں بھی شرکت فرماتے۔ بیت بازی ہوتی، اس میں ایک فریق کی طرف مولانا بھی ہوتے۔ آپ ہی کا فریق اکثر غالب رہتا۔ اس لئے کہ مولانا کو اردو و فارسی کے ہزار ہا اشعار یاد تھے۔

یہ واقعہ حیرت کے ساتھ سنا جائے گا کہ ڈیڑھ سو روپیہ مشاہرہ پاتے تھے لیکن تیس روپیہ ماہوار کے سوا باقی پوری رقم طلبہ، سامانِ تعلیم اور نادر کتب کی فراہمی پر صرف کردیتے تھے۔ کتاب کتنی ہی قیمتی ہو لیکن امکان بھر اس کو ضرور خریدتے اور خواہ دوگنی، سہ گنی قیمت ادا کرنی پڑتی مگر بہتر نسخہ خریدتے قرآن پاک بہتر سے بہتر طباعت کے مہیا فرماتے، کلکتہ کے بہترین کارخانہ میں بھیجکر اعلیٰ قسم کی جلدیں بندھواتے تھے۔

۵ محرم الحرام ۱۳۸۵ھ کو ایسے بیمار ہوئے کہ آخر وقت تک پاؤں سے معذور رہے، دل و دماغ البتہ صحیح رہے اور اس حالت میں بھی سلسلۂ درس و تدریس جاری رہا۔ وفات سے دس یوم پیشتر تک حدیث کے اسباق ہوتے رہے زندگی ہی میں عرصۂ دراز سے گورِ غریباں کو اپنا مسکن بنا لیا تھا۔ احباب کے اصرار سے وہیں ایک مختصر مکان بن گیا تھا جس کی تکمیل دار العلوم کی اس رقم سے ہوئی جو کمیٹی نے بطورِ اعترافِ خدمات مولانا کو پیش کی تھی۔ اسی مکان میں مولانا کا انتقال ہوا،

ہزار ہا مسلمانوں نے جنازہ میں شرکت کی، جنازہ کی چارپائی میں لمبی لمبی بلیاں باندھی گئی تھیں۔ بیک وقت پچاسوں مسلمان کندھا دیتے تھے۔ پھر بھی ہجوم اور لوگوں کے اشتیاق کی کوئی حد نہ تھی۔ خواجہ اجمیری کی درگاہ میں مسجد شاہجہانی کے زیر سایہ تدفین ہوئی۔ قبر میں اتارتے وقت درودیوار اور درختوں پر انسانوں کا ہجوم تھا۔ پسماندگان میں دو بچے (مولوی عبدالباقی صاحب اور ایک صاحبزادی) اور ایک بیوہ ہیں۔

اجمیر کے قیام کی مدت ۴۳ سال اور کل مدتِ حیات ۶۰ سال ہے۔ یہ کیسا عجیب اتفاق ہے کہ ٹھیک عاشورہ محرم میں جب لوگ واقعۂ کربلا سے سوگوار تھے اس شہیدِ علم و عمل نے دنیا سے کوچ کیا۔ اور اجمیر میں اہلِ دل نے دوہرے محرم کا سوگ کیا۔"

میری باریابی و حاضری

علامہ سید سلیمان ندوی کی زبانی حضرۃ الاستاذ کی مختصراً ۶۰ سالہ کہانی آپ سن چکے۔ میں نے چاہا تھا کہ فاضل اجمیری کی وفات کے بعد معین اخبار اجمیر کا "مولانا معین الدین نمبر" نکل جائے تاکہ زندگی کے ہر پہلو پر مختلف اہلِ قلم روشنی ڈال سکیں۔ ادارۂ معین پہلے ہی سے تیار تھا۔ میری گفتگو کے بعد اس نے نمبر نکالنے کا اعلان کر دیا۔ میں نے حضرت الاستاذ کے تلامذہ اور عقیدت مند احباب کو توجہ دلائی۔ اکثر نے کچھ نہ کچھ لکھ کر بھیجا۔ ہندستان کے مشہور شعراء نے قطعاتِ تاریخ لکھے وہ بھی ایک جگہ جمع کئے۔ خود میں نے مفصل سوانحعمری لکھی۔ جب سب مواد اکٹھا ہو گیا تو مسٹر سعیدالدین پیشکار درگاہِ معلّٰی کے (جو اس وقت معین کے مہتمم خاص تھے) حوالہ کر دیا۔ اور ظاہر ہے کہ اجمیر میں قیام کی وجہ فاضل اجمیری سے استفادہ استفاضہ تھا۔ اس کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔ کچھ روز قبر پہ فاتحہ خوانی کے بعد وطن واپس چلا آیا۔ میں نے ادارۂ معین کو بار بار توجہ دلائی، دو ایک بار خود بھی جا کر گفتگو کی لیکن وعدوں کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگا۔ مجبور ہو کر جمع کردہ مواد کا مطالبہ کیا اور اسکا سلسلہ تا دمِ تحریر جاری ہے لیکن ہر بار ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ دو مرتبہ خود جا کر پیہم تقاضے کئے ہر طرح منت سماجت کی، مختلف دوستوں کو واسطہ بنایا لیکن لاحاصل رہا۔

پیشکار سعید الدین خدا جانے کیوں وہ مجموعہ دینے کو تیار نہیں حالانکہ ان کے شہر اور دیار کے ایک فاضل روزگار کے کمالاتِ علمی و عملی سے دنیا روشناس ہوتی جوان کے لئے بھی باعثِ افتخار ہوتا۔ اگر اس وقت وہ مواد پیشِ نظر ہوتا تو بعض اہم حصوں کا اور اضافہ ہوسکتا تھا۔

میں رجب ۱۳۵۴ھ کے پہلے ہفتے میں بسلسلۂ عرس حضرت خواجہ بزرگ رحمۃ اللہ علیہ اجمیر حاضر ہوا تھا۔ اس وقت خیرآباد میں ہدایہ، بیضاوی، میر زاہد رسالہ وغیرہا زیرِ درس تھے۔ دار العلوم معینیہ عثمانیہ کے دورۂ حدیث کے طلبہ کے امتحان اور دستار بندی کے سلسلے میں حضرت میر نثار احمد متولیٔ درگاہ و مہتمم دار العلوم کے دولتکدہ پر علماء و مشائخ کا اجتماع تھا۔ میں بھی حاضر ہوگیا۔ سب سے پہلے یہیں حضرت الاستاذ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ اس اجتماعِ افاضل میں علم و فضل کا یہ بلبل چہک رہا تھا، گفتگو میں سب پر چھایا ہوا تھا، ہر بات دلنشیں ہوتی چلی جاتی تھی۔ جی نے اسی ڈیوڑھی کی دریوزہ گری کی ٹھانی۔ دوسرے وقت درِ دولت پر حاضر ہوکر مدعا ظاہر کیا۔ بڑی خندہ پیشانی سے شرفِ پذیرائی بخشا گیا۔ میں خیرآباد واپس پہنچا اور وہاں سے رخصت ہوکر مکان اور مکان سے ۴ شعبان ۱۳۵۴ھ مطابق یکم نومبر ۱۹۳۵ء کی صبح کو وارِدِ اجمیر ہوا، دولتکدہ پر پہنچکر معلوم ہوا کہ ہسپتال میں صاحبِ فراش ہیں، ادیٹھہ پھوڑا گردن پر نکلا تھا جس کا آپریشن ہوچکا ہے۔ میں سیدھا ہسپتال پہنچا۔ حضرت چارپائی پر استراحت فرما تھے، اردگرد تلامذہ اور عقیدتمندوں کا ہجوم تھا۔ کچھ دیر بعد باریابی ہوئی۔ مسرت و شفقت کا اظہار فرماتے ہوئے وہیں قیام کا حکم دیا۔ تقریبًا دو ہفتے وہاں رہ کر خدمت کی سعادت نصیب ہوئی۔

اس پھوڑے کی رگیں مغزِ دماغ تک پہنچ گئی تھیں چنانچہ آپریشن کے وقت آلات سے ایک ایک رگ کو نکالا گیا اور یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ادویۂ بیہوشی وغیرہا کے بغیر آپریشن کرایا، فرماتے تھے کہ فلسفہ کا ایک مسئلہ سامنے رکھ لیا تھا اس کے حل کرنے میں منہمک ہوگیا اور اسکا پتہ بھی نہ چلا کہ گوشت کہاں سے اور کتنا کاٹا گیا جو لوگ موجود تھے وہ بھی حیرت زدہ تھے، یہ تھا علمی استغراق!

ہسپتال سے نکل کر کچھ دن کے لئے تبدیلِ آب و ہوا اور ضروریاتِ دار العلوم حنفیہ صوفیہ کے پیشِ نظر احمد آباد کا سفر فرمایا۔ میں بھی ہمرکاب رہا، رمضان میں واپسی ہوئی۔ شوال میں

میرے ہمدرس و رفیق عزیز مولوی سید نجم الحسن خیرآبادی کے پہنچ جانے پر سلسلۂ درس شروع ہوا
چنانچہ ۲۲ر شوال ۵۴ ۱۳ھ مطابق ۱۸ر جنوری ۱۹۳۶ء شنبہ کو حمداللہ، ہدایہ اولین، شرح ہدایۃ الحکمۃ
اور میر زاہد رسالہ کے اسباق شروع کرائے گئے۔ ہم دونوں کو اپنے دولتکدہ پر ہی رہنے کا
حکم دیا۔ اس وقت تارا گڑھ کے راستہ میں پہاڑی پر ایک مکان میں اہل وعیال کا قیام تھا
خود حضرت شہر سے دو میل دور گورِ غریباں کی ایک مسجد سے متصل حجرہ میں قیام فرماتے تھے۔
وہیں حضرت کا کتب خانہ تھا، دو تین طلبہ بھی وہاں رہتے تھے جن کا کھانا پہاڑی سے تیار ہو کر
وہیں پہنچتا تھا۔ صبح کی نماز اور تلاوت سے فارغ ہو کر دو میل چل کر دار العلوم معینیہ عثمانیہ درگاہِ معلّی
کی مسندِ تدریس کو رونق بخشتے۔ ۱۲ بجے تک سات آٹھ اسباق پڑھا کر ٹھیک دو پہر میں چار پانچ
فرلانگ چڑھائی کی مسافت طے کر کے پہاڑی پر تشریف لاتے۔ کھانا تناول فرما کر کچھ دیر قیلولہ
کر کے ظہر کی نماز جماعت سے ہم لوگوں کے ساتھ ادا فرماتے اور ہمیں عصر تک پڑھاتے رہتے
عصر کی نماز جماعت سے پڑھ کر اپنے مستقر گورِ غریباں چلے جاتے۔ شب کو وہیں مطالعۂ کتب،
فتویٰ نویسی اور دوسرے علمی مشاغل میں مصروف رہتے۔ یہ معمولات جاڑے، گرمی اور برسات
تینوں موسموں میں اسی التزام کے ساتھ پورے فرماتے۔ ان تین طلبہ کے ساتھ ہم دونوں کا
کھانا بھی اندر ہی پکتا۔ ایک خورد سال صاحبزادی اور بی بی صاحبہ کے سوا کوئی ملازمہ بھی نہ تھی۔
خلفِ رشید مولوی عبدالباقی سلّمہٗ جن کی عمر اس وقت چودہ پندرہ سال تھی کھانا لا کر ساتھ کھلاتے
اور اس کے بجائے کہ ہم خدمت کرتے اُلٹی ہماری خدمت کرتے۔ اس پر بھی حضرت کا اصرار یہی
تھا کہ ہمارے کھانے کا بار خود اٹھائیں۔ بڑی التجاؤں کے بعد یہ صورت گوارا فرمائی گئی کہ جتنے افراد
کا کھانا پکتا ہے اور جتنا اس پر صرف ہوتا ہے اسی حساب سے مصارف ادا کئے جائیں چنانچہ آخر
تک یہی سلسلہ رہا۔ اہل وعیال کی تربیت اس طرح فرمائی تھی کہ بچوں کو کبھی اچھا کھانے اور اچھا
پہننے کی طرف راغب نہ دیکھا۔ باقی میاں سلّمہٗ کے متعلق جب کبھی ہم لوگ توجہ دلاتے تو فرماتے
کہ ان کو طالب علم بن کر ہی رہنے دو۔ صاحبزادہ بنا کر رکھا گیا اور تم میں سے کبھی کوئی میرے بعد ادھر
آنکلا تو کوئی بات پوچھنے والا بھی نہ ملے گا۔

بیوی صاحبہ کا یہ عالم تھا کہ دونوں وقت اپنے ہاتھ سے کھانا تیار کر کے ہم پانچ طلبہ کو

اوقاتِ مقررہ پر بھیجتیں۔ صبح کو ناشتہ نماز کے بعد ہی تیار کر دیتیں۔ مہینوں ایسا ہوا ہے کہ حضرت الاستاذ نے صبح کی نماز گورِ غریباں سے آگر درگاہ کی اکبری مسجد میں پڑھی ہے اور ہم دونوں نے بھی پہاڑی سے اتر کر وہیں جاکر نماز ادا کی ہے۔ اس کے فوراً بعد بیضاوی یا کسی دوسری کتاب کا سبق شروع ہو گیا ہے۔ ان ایام میں ہمارے چلنے سے پہلے جبکہ کافی اندھیرا ہوتا تھا ہمیں چاء اور ناشتہ تیار ہو کر اندر سے آجاتا تھا۔ لانے والے باقی میاں سلمہ ہوتے تھے۔ باقی میاں تنہا صاحبزادے تھے۔ ان سے پہلے دو بھائی سنِ شعور کو پہنچکر عالمِ آخرت کو سدھار چکے تھے۔ اس پر باپ کے دربار میں طالب علم بیٹے کی یہ قدر تھی کہ معمولی کھدّر کا لباس استعمال کراتے اور کوئی موجودہ فیشن کی چیز نہ استعمال کرنے دیتے۔ ہم بیرونی کمرے میں تین سال سے زیادہ رہے۔ اس درمیان میں کبھی بیوی صاحبہ یا صاحبزادی صاحبہ کی آواز باہر سننے میں نہیں آئی حالانکہ صرف چند گز کا مشکل سے فاصلہ تھا۔

آپ کو سنکر حیرت ہوگی کہ زمانۂ علالت و نزاعی کیفیت میں بھی رونے کی آواز نہ سنی جاسکی بلکہ اس شہیدِ علم و عمل کی وفات اور روانگیٔ جنازہ پر بھی جبکہ ہم تمام حلقہ بگوش اور اعزہ و احباب دامنِ صبر ہاتھ سے چھوڑ چکے تھے وہ پیکرِ استقامت اور جانشینِ رسول کی تربیت یافتہ خواتین بدستور کوہِ عزم و وقار بنی رہیں اور خدا شاہد ہے کہ گھر کے اندر بھی آوازِ گریہ کسی مرد نے نہ سنی۔ یہ تھی صحیح تعلیم اور سچی تربیت !

عزیزوں کے ساتھ حسنِ سلوک کا برتاؤ رہتا۔ میرے علم میں ہے کہ بعض غریب عزیز اکثر آکر ہفتوں رہتے، کتنے ایسے بھی تھے جن کی مستقل امداد کرتے۔ تین ہمشیرگان میں سے دو بقیدِ حیات تھیں جن میں سے ایک بیوہ اور ضرورت مند تھیں ان کی ہر ماہ مستقل طور پر خبرگیری فرماتے۔ یہ سب سے بڑی بہن تھیں۔ ۲۹ ذلیقعدہ ۱۳۵۶ھ مطابق یکم فروری ۱۹۳۸ء کو ان کا انتقال ہوا۔

دوستوں کے ساتھ جس اخلاص سے پیش آتے اس کی نظیر کم دیکھنے میں آتی ہے دوستی تعلقہ داروں، نوابوں، ساہوکاروں سے نہیں بلکہ غریب طبقہ کے افراد سے تھی حکیم سید انظار الحسن خیرآبادی عرف سید میاں، بابو عبد الحکیم، مستری رمضان بخش اور حاجی عبد الستار۔ یہ چار مخصوص مخلصانِ باوفا اور محبانِ بے ریا تھے۔ دوسرے تیسرے روز ان کا حاضرِ خدمت ہونا۔ دکھ درد میں

شریک رہنا اور مشوروں پر عمل کرنا ان کے لئے لازمی تھا۔ مولانا کے قائم کردہ دارالعلوم حنفیہ صوفیہ کا خوش اسلوبی سے چلانا اور اس کے لئے سرمایہ کا انتظام کرنا۔ انھیں حضرات کے سپرد تھا انھوں نے آخر وقت تک حقِ رفاقت ادا کیا۔ نزاعی کیفیت میں پلنگ کی پٹی سے جدا نہ ہوئے۔ روح نے قفسِ عنصری سے انھیں کے ہاتھوں پر پرواز کی۔ یہ تھا اخلاص و محبت اور دوستوں کا حقِ رفاقت! [1]

رشتہ داروں سے بڑی محبت سے پیش آتے۔ آپ کا دومنزلہ عالیشان آبائی مکان درگاہ کے بالکل متصل ہے۔ اب برادرِ خرد شفاءالملک حکیم نظام الدین کی قیامگاہ ہے۔ مولانا چونکہ شہر کے شور و شر کو علمی مشاغل کے لئے مضر سمجھتے تھے اور فطرۃً تنہائی پسند واقع ہوئے تھے اس لئے کرایہ کے مکان میں شہر کی چپقلشوں سے دور پہاڑی پر سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ برادر زادہ حکیم نصیرالدین ندوی سے غیر معمولی محبت کرتے تھے اس لئے اپنا حصہ مکان ان کے نام کر دیا اور خود عمر بھر کرایہ کے مکان میں رہے۔ صرف آخری ایک سال اپنے معمولی تیار کردہ مکان میں شہر سے دو میل دور گورِ غریباں میں مع اہل و عیال گذارا۔

آپ کے دو علاتی بھائی بھی تھے۔ ان دونوں کی پرورش و تعلیم و تربیت اولاد کے مثل کی۔ مولوی غازی محی الدین اجمیری عرف پیارے میاں اور محمد میاں آپ ہی کے پاس رہے۔ آخرالذکر کا انتقال مولانا کے دو سال بعد مولانا ہی کے مکان پر ہوا۔ اول الذکر خلافت کمیٹی کے سیکریٹری بننے کی وجہ سے بمبئی چلے گئے تھے اور وہاں سے آنے پر متاہل ہونے کے بعد علیحدہ اقامت گزیں ہو گئے۔ اچھے مقرر اور انشا پرداز ہیں، اجمیر کی سیاست میں کافی ہاتھ رہتا ہے۔ درگاہ کمیٹی اجمیر کے ممبر بھی ہیں۔

اعلاءِ کلمۃ اللہ اور اعلانِ حق میں بڑے جری تھے۔ حکومتِ ہند، برادرانِ وطن اور فُسّاق مسلمانان سے حرمتِ امورِ شرعیہ و ملکیہ پر مقابلے رہے۔ احاطۂ درگاہ میں فاحشہ عورتوں کا ناچ ہوتا رنڈیوں کا اجتماع رہتا، مولانا نے اس کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا، مسلمانوں کی ایک دیندار جماعت کو ساتھ لے کر آواز اٹھائی، دنیادار اور عیش پرست طبقہ آڑے آیا۔ بالآخر حق کی فتح

---

[1] مولوی محمد اللہ خطیب جامع مسجد جے پور، مسٹر عبدالرحمن نصیر آبادی اور مولوی سیٹھ ظہور محمد قریشی رئیس پیپاڑ سے بھی مولانا کو بڑی خصوصیت تھی اور یہ تینوں حضرات بھی آخر تک جاں نثار رہے۔

ہوئی اور جناب میر نثار احمد متولی درگاہِ معلٰی نے یہ اعلان کردیا کہ زنانِ فاحشہ بھی نقاب کے بغیر داخلِ احاطہ نہیں ہوسکتیں اور ان کا گانا وغیرہ سب بند کرادیا۔ میرے قیامِ اجمیر کے زمانے میں ایک مرتبہ عاشورۂ محرم جمعہ کو پڑا، عین جمعہ کی نماز کے وقت درگاہ کے متصل بازاروں میں نقارول اور شور و شغب کا طوفان برپا ہوا۔ جمعہ کی نماز کے بعد خدا کا یہ شیر کھڑا ہوا اور جامع شاہجہانی میں تحفظِ ناموس اسلام پر ایسی مدلل و پُرجوش تقریر کی کہ ہزارہا مسلمانوں کا یہ اجتماعِ عظیم زار قطار رو رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مولانا بھولا ہوا سبق قوم کو یاد دلا رہے ہیں۔ عوام کے رجحان کے خلاف آواز اٹھانا بھی بڑا جہاد ہے۔

ایک مرتبہ شب کو ایک جلسہ میں شاہجہانی مسجد میں تقریر فرما رہے تھے کہ اطلاع ملی کہ دہائمنڈی سے متصل محلہ میں مسلمان ناچ دیکھنے میں مشغول ہیں۔ کسی تقریب میں ایک مسلمان صاحب نے رنڈی کا ناچ کرایا تھا۔ تقریر سے فارغ ہوکر کچھ مسلمانوں کو لے کر چل پڑے۔ مولانا کو آتا دیکھ کر بعض مسلمان وہاں سے ٹل گئے۔ بعض اپنے مشاغلِ تفریح میں خلل انداز دیکھ کر آمادۂ پیکار ہوئے۔ ایک بلند مقام پر پہنچ کر مولانا نے پیغامِ حق پہنچانا شروع کیا اس طرح وہ مجلسِ رقص و سرود محفلِ وعظ و نصیحت سے بدل گئی۔

اس معاملہ میں مولانا کسی بڑی سے بڑی شخصیت کے سامنے بھی نہیں جھکتے تھے۔ ۱۳۵۲ھ میں جب حج کے لیے روانہ ہوئے تو آپ کو اسی جہاز پر جگہ ملی جس پر ملکۂ دکن سفر کر رہی تھیں۔ نگراں کار کے طور پر خطاب یافتہ ایک بڑے عہدیدارِ ریاست ان کے ہمرکاب تھے۔ ایک مجلس میں کسی نے مولانا کا تعارف نواب صاحب سے کرایا۔ مولانا کے علم و فضل اور بلند شخصیت کا اظہار کرنے پر بھی نواب صاحب نے کوئی خاص اہمیت نہ دی لیکن جب مولانا کا اجمیری ہونا معلوم ہوا تو بڑی تعظیم و تکریم کے ساتھ دست بوسی کی۔ مولانا کو جلال آہی تو گیا۔ ارشاد ہوا ہم نے ۱۴ برس حصولِ علمِ قرآن و حدیث میں آنکھیں پھوڑیں، اللہ و رسول کا علمِ دین حاصل کیا لیکن یہ علم کسی عظمت کا مستحق نہ ٹھیرا، صرف اجمیری ہونا سب سے بڑی کرامت ہوگئی۔ اجمیر میں تو کافر و فاسق کلب خنزیر سبھی بستے ہیں، اگر صرف اجمیری ہونا عزت کی نشانی ہے تو بد دین و کافر، کتا اور سور سبھی قابلِ تعظیم ہوئے۔ نواب صاحب بڑے خجل و شرمسار ہوئے۔

ایک دوسری مجلس میں بھی نواب صاحب پرانے نظام تعلیم پر تبصرہ فرمار ہے تھے اس کی فرسودگی پر دلائل پیش کر رہے تھے۔ مولانا سے نہ رہا گیا فرمایا کہ یہ ہم تو اسی نظام تعلیم پر مجبور ہیں آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ اگر تمام پرانی چیزیں بدلوا دیں۔ نماز، روزہ، حج، اور زکوٰۃ سب پرانی چیزیں ہو چکیں، جب تک یہ جاری رہیں گی۔ ہدایہ، شرح وقایہ اور قدوری وغیرہ کا درس بھی جاری رہے گا۔ آپ ان سب چیزوں کو بدل دیں ہم نیا نظامِ تعلیم خود بخود بنا لیں گے۔ اسی طرح وہ نواب صاحب خاموش ہوئے۔

مولانا کا سیاسی مسلک تحریک خلافت سے لے کر آخر وقت تک ایک ہی رہا، غیر ملکی حکومت کا خاتمہ اور استخلاص وطن کی جدوجہد میں تمام اقوامِ ہندوستان سے اشتراکِ عمل، مجلس احرارِ اسلام، جمعیۃ العلماء ہند، آل انڈیا خلافت کمیٹی، انڈین نیشنل کانگریس، ہر آزادی پسند جماعت کے رکن رکین تھے، صوبائی اور مرکزی صدر و ڈکٹیٹر رہے۔ آخر عمر میں جبکہ ۲۰ مارچ ۱۹۳۸ء مطابق ۱۸ محرم ۱۳۵۷ھ کو وجع الورک میں مبتلا ہو کر پاؤں سے معذور بھی ہو چکے تھے اور اس معذوری کے باوجود سیاسی سرگرمیاں حسب دستور جاری بھی تھیں، حریفان حرص وآز اور خواہشمندان اقتدار نے آخری حربہ استعمال کیا۔ ایک دہلوی مرزا جو منافقت کی مکمل تصویر تھا بظاہر مولانا کی شاگردی اور عقیدتمندی کا مدعی لیکن بہ باطن مولانا کو اپنے منصوبوں کی تکمیل میں سب سے بڑا سنگ گراں سمجھتا تھا ایک طرف حکومت سے ساز باز اور دوسری طرف مسلمانوں کا سیاسی وکیل بنے رہنے کی کوشش کرتا رہتا بعض اہل غرض افراد کو شریک سازش بنا کر حکومتِ نظام سے مراسلت کا سلسلہ شروع کیا کہ حضور نظام جس دار العلوم (معینیہ عثمانیہ اجمیر) کے کفیل ہوں اس کا صدر المدرسین "یار وفادار" کے حلیف کی بیخ کنی میں مصروف رہے تحقیقاتی وفد رجب ۱۳۵۷ھ میں اجمیر پہنچا۔

اس وفد نے مولانا سے عقیدتمندانہ انداز میں ریاست کی مجبوریاں ظاہر کرتے ہوئے سیاست سے کنارہ کشی اور علمی خدمات ہی میں توجہات کے انحصار کی التجا کی مولانا نے بات کی تہ تک پہنچ کر فرمایا جہاں تک علمی خدمات کا تعلق ہے، حصول علم کے بعد سے کوئی دور ایسا نہیں گذرا کہ اس سے غفلت برتی گئی ہو۔ تحریک خلافت کی دو سالہ قید میں جیل خانہ کی چار دیواری میں بھی دوسرے فنون کے ساتھ دورۂ حدیث بھی ہوتا رہا تھا۔ مولانا کے ساتھ بعض تلامذہ بھی شریک سجن ہو گئے

تھے، جو اصول مقصدِ زندگی بن چکا ہو اسے اس حیاتِ مستعار میں کیونکر چھوڑا جا سکتا ہے۔ وفد واپس چلا گیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۲ مارچ ۱۹۳۹ء مطابق ۲۰ محرم ۱۳۵۸ھ کو بحکم دولت نظام مولانا کو مدرسہ کی خدمات سے سبکدوش کرنے کی اطلاع متولی درگاہِ معلّی اور معتمدِ مدرسہ میر نثار احمد صاحب مرحوم کے پاس آگئی۔ مولانا کی زندگی کا یہ آخری سال تھا۔ پورا سال بھی نہ گذرنے پایا تھا کہ دس روز قبل ہی ۱۰ محرم الحرام ۱۳۵۹ھ کو سفرِ آخرت اختیار فرمایا۔ یہ آخری سال مولانا کا بڑی عسرت کے ساتھ گذرا۔ پاؤں سے معذوری اور مسلسل علالت کے ساتھ یہ مالی پریشانی ناقابل برداشت تھی۔

حق وصداقت اور اصول پروری کی پاداش میں یہ صعوبتیں خندہ پیشانی سے برداشت کیں اور یہ سنکر حیرت ہوگی کہ وفات کے وقت کل خزانۂ عامرہ سولہ روپیہ کچھ آنہ خاص صندوقچہ سے نکلا تھا۔

سبکدوشی کے بعد دار العلوم کی جانب سے قاعدہ کے مطابق غالباً بارہ سو روپیہ ملا تھا۔ ہم سب کے اصرار اور حاجی عبد الستار کے اہتمام سے گور غریباں کی افتادہ زمین پر مختصر مکان تعمیر ہوا جس کا نام مولانا نے "زاویہ" رکھا۔ دنیاوی جائداد میں اولاد کے لئے صرف یہی ترکۂ پدری تھا۔

کتابوں سے عشق تھا۔ بہترین المباریاں اور درازیں بنواتے اور ترتیب سے کتابیں رکھتے مضمون کے علاوہ کتاب کی عمدہ کتابت وطباعت بھی پسند آنے کے لئے کافی تھی۔ کتاب پسند آنے پر ہر ممکن قیمت پر خرید فرماتے۔ مولوی سید نجم الحسن خیرآبادی کے پاس استنبولی طباعت کی دسوقی شرح مختصر معانی تھی جس کے حاشیہ پر مختصر اور حوض میں شرح تھی۔ مولانا کے پاس جو دسوقی تھی اس میں کئی کتابیں تھیں۔ مولانا کی خواہش تھی کہ ایسی دسوقی مل جائے جس کے ساتھ اور کتابیں نہ ہوں۔ مولوی نجم الحسن نے اپنی کتاب دکھلائی تو پھڑک گئے۔ فرمایا کہیں ایسی دسوقی مل جائے تو مجھے ضرور منگا دو۔ شاگرد تھے مزاج شناس، کہنے لگے اگر حضرت اپنے مجموعۂ شروح تلخیص کے ساتھ مصفّٰی شرح مؤطا عنایت فرمائیں تو کتاب حاضر ہے۔ فوراً معاملہ ہو گیا۔ خود راقم السطور کی مسلم شریف کے عوض جو سبز کاغذ پر عمدہ چھپی ہوئی تھی اپنی مسلم شریف وألف لیلہ (عربی) کی دونوں جلدیں عنایت فرمائیں بعد میں کسی وجہ سے اقالہ فرما لیا تھا۔

۲۷ جنوری ۱۹۳۹ء کو جامع مسجد جے پور کے درد… کی توسیع کے سلسلے میں جب گولی چلی

او بیسیوں مسلمان خاک وخون میں لتھڑ کر شہید ہوئے اور وہاں کے مسلمانوں نے پچے پورے
ہجرت کی ٹھانی تو حضرت الاستاذ ، ۲ ، مارچ ۱۹۳۹ء کو معذوری کے باوجود افہام وتفہیم کے
لئے دوسری بار جے پور تشریف لے گئے ۔ ہم دونوں بھی ہمرکاب تھے ۔ عبدالرحمٰن شورگر کے
مکان میں قیام ہوا کہ یہی امیر جماعت مہاجرین تجویز ہوئے تھے ۔ عبدالرحمٰن مذکور کے پاس
کعبہ معظمہ کا ایک نقشہ تھا جس میں ایک ایک چیز وہاں کی دکھلائی گئی تھی ۔ دوران قیام میں
میزبان نے وہ سب سامان باقاعدہ مرتب کرکے دکھایا اور اس کے ساتھ حدیقہ حکیم سنائی
کا ایک قلمی نسخہ دکھلایا جو ایران کے کسی خوشنویس کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا ۔ دریافت کرنے پر
ایک ہزار قیمت بتائی گئی ۔ مولانا دیکھ کر پھڑک اٹھے تھے ۔ اجمیر پہنچنے پر کئی بار فرمایا کہ اگر ہزار روپے ہوتے
تو ابھی خرید لیتا ۔ اور شوق کے بے پناہ جذبہ کے ماتحت مولوی محمد اللہ خطیب جامع مسجد جے پور و
معتقد خاص کو خط لکھ دیا کہ کسی صورت سے وہ نسخہ حاصل کرو لیکن ایک ہزار سے کم پر عبدالرحمٰن
رضامند نہ ہوئے ۔

ایک بار جے پور کا کتب خانہ دیکھنے تشریف لے گئے ۔ اسفار اربعہ کی چار جلدیں مطالعہ کے لئے
باضابطہ لائبریری سے حاصل کیں اور ان کو لیکر اجمیر آگئے ۔ سیکریٹری لائبریری نے تار دیا کہ یا تو کتاب
بھیجئے ورنہ دو سو روپیہ وصول کیا جائے گا ۔ مولانا نے فوراً ہی تار کے ذریعہ رقم مطلوبہ روانہ کردی اور کتاب
پر قبضہ کرلیا ۔ فرماتے تھے کہ اگر پانچسو طلب کرتے تو بھیجتا ۔

قرآن شریف عمدہ کاغذ اور بہتر کتابت وطباعت کے ہدیہ کرتے ۔ اس قسم کے تمام قرآن پاک
زینت کتب خانہ تھے ۔ فرمایا کرتے تھے کہ میرے کتب خانہ سے اگر ایک کتاب بھی چلی جائے چاہے
وہ کتنی ہی معمولی ہو تو میں سمجھوں گا کہ سارا کتب خانہ چلا گیا ۔ ہر سال کتابوں کو دھوپ دلواتے اور
باقاعدہ جائزہ لیتے ۔ کتابیں سب موجود ہوتیں تو شیرنی وغیرہ سے متعلقہ طلبہ کو نوازتے ۔

اصطرلاب سے متعلق بست باب کی شرح برجندی قلمی مولانا کے کتاب خانہ میں تھی ۔ میں
نے اس کی نقل کی اجازت چاہی جو خوشی سے مل گئی ۔ میں نے نقل شروع کی ہی تھی کہ رمضان کا
مبارک مہینہ آگیا ۔ اسی مہینے ہم لوگوں کو اپنے وطن جانے کی اجازت مل جاتی تھی جب میں چلنے
لگا تو برجندی کے متعلق دریافت کیا (عرض کیا) کہ رمضان کے اوقات فرصت میں خوب نقل کرلوں گا ۔

التجا منظور نہ ہوئی۔ بار بار اصرار پر بھی نفی میں جواب ملا۔ میں نے عرض کیا آپ مجھ پر اطمینان نہیں کرتے۔ فرمایا تم پر بیٹے سے زیادہ بھروسہ ہے لیکن تمہاری زندگی پر بھروسہ نہیں۔ خدانخواستہ تمہارا انتقال ہو جائے تو تمہارے وارثوں سے کون لڑے گا۔ ہاں اگر اپنی زندگی کا اطمینان دلا دو تو کتاب کا اطمینان بھی کر لوں گا۔

کتابوں کی طباعت و کتابت کی طرح عمدہ جلدوں سے بھی شغف تھا۔ کلکتہ کی بندھی ہوئی جلدوں کا بہت شوق تھا۔ علی العموم دہلی جلد بندھوایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جلد کی خوبصورتی کا ذکر ہو رہا تھا۔ مولوی محمد عباس بہاری نے دو جلدیں کلکتہ کی بندھی ہوئی دکھلائیں۔ دیکھتے ہی گرویدہ ہو گئے۔ فرمایا افسوس میرے کتب خانہ میں ایک جلد بھی ایسی نہیں ہے۔

انتقال سے تین چار ماہ پیشتر بمبئی اور سورت سے کتابیں منگوائیں۔ اس کے کلکتہ جلد بندھنے کے لئے بھیجیں جس کا بے چینی سے انتظار رہتا۔ روزانہ مولوی نجم الحسن کو اسٹیشن پر پتہ لگانے کے لئے بھیجتے۔ خدا خدا کر کے پارسل آیا۔ جلدیں واقعۃً قابلِ دید تھیں۔ الماری میں اپنے سامنے ترتیب سے رکھوائیں پھر فرمایا اب دیکھو میرا کتب خانہ کیسا معلوم ہوتا ہے۔ مولوی نجم الحسن نے تعریفوں کے پل باندھ دئے تو بہت خوش ہوئے۔ میں نے بھی شرح جامی اور فرائد کی جلدیں ساتھ ہی بندھوا کر منگوائیں اور مولوی محمد عباس بہاری کی وہ دونوں کتابیں بھی خرید لیں جن کی جلدیں مولانا کو دکھائی گئی تھیں۔ یہ کتابیں حاشیۂ عبدالغفور اور اس کا ضمیمہ تھیں افسوس مولانا ان خوشنما جلدوں سے زیادہ عرصہ تک محظوظ نہ ہو سکے اور نہ ان مجلد کتابوں کے مطالعہ کا موقعہ ہی ملا کیونکہ ایک ماہ بعد دنیائے فانی سے عالمِ جاودانی کو تشریف لے گئے۔

احادیث میں کنز العمال اور لغتِ حدیث میں مجمع البحار بہت پسند فرماتے تھے۔ تفیراتِ احمدیہ، رسائل الارکان الاربعہ، آبِ حیات اور حاشیۂ قاضی علامہ فضل حق خیر آبادی اکثر و بیشتر مطالعہ میں رکھتے۔ آخر الذکر کے متعلق فرماتے تھے کہ حاشیۂ فضل حق کا میں نے برسوں سفر و حضر میں اس طرح مطالعہ کیا ہے جس طرح کوئی قصہ کہانی کی کتاب پڑھتا ہے۔ نصب الرایہ فی تخریج احادیث الہدایہ کا بہت اشتیاق تھا۔ فرماتے کہ مدینہ منورہ میں مولانا عبدالباقی فرنگی محلی لکھنوی مہاجر مدنی مرحوم نے مجھ سے فرمائش کی تھی موصوف کی مخصوص قابلیت اور

کمال علمی کے مولانا معترف تھے۔ فرماتے تھے کہ حکیم صاحب (مولانا برکات احمد ٹونکی بہاری) بھی ان کی تعریف کیا کرتے تھے۔ ایک روز مولوی نجم الحسن نے نصب الرایہ کے زیر طبع ہونے کی خوشخبری سنائی تو بہت مسرور ہوئے۔

فقہاء کے بہت مدّاح تھے۔ ہدایہ جلد ثالث خاص ذوق اور توجہ سے پڑھاتے تھے۔ امام صاحب کی دلیل بیان فرماتے وقت چہرہ جوش سے سرخ ہو جاتا تھا۔ فرماتے تھے کہ ایسا شخص کوئی دوسرا پیدا ہی نہیں ہوا۔ عام طور پر فقہاء کی نکتہ رسی اور دقیقہ سنجی کے بہت مداح تھے۔ فقہاء کے خلاف اگر کسی کی زبان یا تحریر سے کوئی بات آپ کے علم میں آتی تو سخت برہم ہوتے تھے۔

ہدایہ جلد ثالث، ترمذی شریف، قاضی مبارک، شرح چغمنی اور بیضاوی شریف بڑی دلچسپی سے پڑھاتے تھے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ بڑی کتابیں پڑھانے والے اساتذہ ابتدائی کتابوں میں وہ ذوق اور مہارت نہیں رکھتے جو بالائی کتابوں میں ہوتی ہے لیکن مولانا کو یکساں کمال تھا فرزندِ سعید مولوی عبد الباقی سلّمہ کو سمجھانے اور یاد کرانے کے لئے مرقات اور سکندر نامہ کی سماعت پر مولوی نجم الحسن کو مامور فرما دیا تھا۔ موصوف کا بیان ہے کہ اس خوبصورتی اور سہولت سے سمجھاتے تھے کہ بہ آسانی ذہن نشین ہو جاتا تھا۔ لطف یہ ہے کہ فارسی میں بھی پورا پورا تبحر تھا چنانچہ سکندر نامہ میں اکثر مولوی نجم الحسن سوالات بھی کرتے رہتے تھے۔ برادرِ عزیز محمد زاہد خاں سلّمہ کو میری استدعا پر انوار سہیلی شروع کرا دی تھی۔

جب موجودہ نظامِ حیدر آباد سلطان العلوم میر عثمان علی خاں بالقابہ اجمیر شریف حاضر ہوئے اور مدرسہ معین الحق (قائم کردہ مولانا) میں اپنے استاذ نواب فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خاں صدرِ امورِ شرعیہ دکن کے ہمراہ پہنچے تو مولانا کی درس گاہ میں جاری سبق کو دلچسپی سے سنا اور نور الانوار (اصولِ فقہ کی اوسط کتاب مصنفہ ملّا احمد جیون رحمۃ اللہ علیہ استاذِ عالمگیر بادشاہ) کے درس کی فرمائش کی۔

مولانا نے اس کے سبق کی ایسے مدلّل طریقہ پر تقریر کی کہ نظام صاحب کو وجد آ گیا۔ دوران قیام میں چھ مرتبہ شریکِ درس ہوئے اور فرمائشی اسباق کی سماعت کی۔ خلعتِ شاہانہ اور ایک ہزار روپیہ سے نوازا۔ اور مدرسہ معین الحق کو دار العلوم معینیہ عثمانیہ میں تبدیل کر کے ایک ہزار سے زیادہ

مشاہرہ مقرر فرمایا جو آج تک بدستور جاری ہے۔

مولانا نقلی و عقلی مسائل میں اپنی مستقل رائے رکھتے تھے اور کافی تلاش و جستجو اور تحقیق و تدقیق کے بعد نتائج پر پہنچتے تھے۔ مختلف فیہ مسائل کو چھوڑ کر باقی مسائل میں امام ابن تیمیہ کے فضل و کمال کے مداح تھے۔ حدیث "لا تشد الرحال" وغیرہ پڑھاتے وقت ان کے مسلک کا رد بلیغ فرماتے کلام پاک کی آیات کے سلسلے میں فرمایا کرتے تھے کہ ہر آیت علیحدہ علیحدہ ہے لہٰذا ربط پیدا کرنے کی کوشش بے سود ہے۔

سورۂ یوسف کی آیت فلما رأینہ اکبرنہ وقطعن ایدیھن وقلن حاش للہ ما ھذا بشرًا ان ھذا الا ملک کریم میں عام اہل تفسیر کی رائے سے اختلاف تھا۔ فرماتے تھے کہ زنان مصر کی یہ کیفیت حسن یوسف کی بنا پر نہیں بلکہ ان کی عظمت و جلالت و عفت کی بنا پر ہوئی تھی ورنہ "ملک کریم" کہنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ بس باب میں بخاری شریف کی کتاب التفسیر سے بھی استشہاد فرماتے تھے اور یوں بھی بہترین تفسیر بخاری کی کتاب التفسیر ہی کو سمجھتے تھے۔

حوض کے بارے میں دہ در دہ کو ضروری نہ سمجھتے تھے احادیث اور سرزمین عرب میں پانی کی قلت سے دلائل پیش کرتے تھے۔ فرماتے تھے امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کسی مسجد میں بیٹھے تھے۔ ماء کثیر سے متعلق سوالات کئے جا رہے تھے۔ آپ نے اس مسجد کے حوض کی طرف اشارہ کر دیا، بعد میں جب اس کی پیمائش کی گئی تو اتفاق سے دہ در دہ نکلا۔ لوگوں نے اسی کو دلیل بنا لیا۔

جمعہ صحیح ہونے کے لئے فقہاء حنفیہ نے مصر کی شرط لگائی ہے۔ پھر مصر کی تعریف میں فقہاء کے مختلف اقوال ہیں۔ مولانا نے ملا نظام الدین استاذ الکل کا مسلک اختیار فرمایا تھا جو رسائل الارکان الاربعہ میں مولانا عبد العلی بحر العلوم فرنگی محلی سے منقول ہے کہ مصر وہ ہے جہاں انسانی ضروریات میسر آسکیں۔

ما اھل بہ لغیر اللہ میں حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی نے حرمت کے دائرہ میں ان جانوروں کو بھی داخل کر لیا ہے جو کسی بزرگ کے فاتحہ وغیرہ کے نام سے موسوم و متعین ہو جائیں۔ مولانا کا مسلک شاہ صاحب کے مخالف تھا اس پر ایک مبسوط محققانہ مضمون

بھی لکھا تھا جو ضائع ہوگیا اور روز افزوں صحت کی خرابی نے دوبارہ لکھنے کا موقعہ نہ دیا۔

مسئلہ تشکیک میں جہاں مولانا عبدالحق خیرآبادی نے شرح مرقات میں وجود و واجب میں تشکیک، باعتبار شدت وضعف مانتے ہوئے ایک توجیہ کی ہے۔ مولانا نے اپنے استاذ الاساذ سے اختلاف کیا ہے اور مؤدبانہ الفاظ میں ایک مضمون کا املا کراتے ہوئے تحریر کرایا تھا کہ یہ اعلیٰ توجیہ فقیر کے ذہن اسفل سے بعید ہے۔ یہی وہ مسئلہ ہے کہ جب ۳۵ء کے آخر میں مولانا کے کاربنکل (ادیٹھ پھوڑا) نکلا تھا اور گردن میں چھ انچ گہرا شگاف دیا گیا تھا تو بلا کسی بیہوشی کی دوا کے اتنا بڑا آپریشن کرانے پر اس لئے کر ہمت باندھ لی تھی کہ مسئلہ مذکورہ بالا میں فاضل خیرآبادی سے عالم تصور میں مناظرہ شروع کردیا تھا۔ مولانا فرماتے تھے کہ اسی استغراق میں تمام منزلیں طے ہوگئیں۔

تعلیم و تدریس اور تصنیف و مطالعہ سے آخر وقت تک پوری دلچسپی رہی بخاری شریف کے پاروں کے شرحی نوٹ تاج کمپنی لاہور کی فرمائش پر دارہ دیں تحریر فرمانا منظور کر لئے تھے اور ایسی حالت میں پہلے پارے کے حاشیہ پر نوٹ تحریر فرمائے جبکہ بیٹھنے کی جگہ پھوڑا نکلا ہوا تھا۔ برادر خورد حکیم نظام الدین اجمیری کے مکان پر علاج کی غرض سے قیام تھا۔ چلنے پھرنے سے معذور ہو چکے تھے بعض مقامات کی شرح اپنے ہاتھ سے لکھی اور اکثر کا مولوی سید نجم الحسن سے املا کرایا۔ اس میں مولانا کو دلچسپی یوں بھی بڑھ گئی تھی کہ غیر مقلد مولوی وحید الزماں حیدرآبادی کے اس قسم کے شرحی نوٹوں کے ساتھ بخاری شریف شائع ہو چکی تھی جس میں امام اعظم اور دوسرے ائمہ ثلاثہ کے مسالک پر جابجا چوٹیں بھی تھیں۔ بلند بانگ دعووں کے باوجود جب اُسے تاج کمپنی نے تجارتی مصلحتوں کی بنا پر طبع نہ کرایا تو بہت برہم ہوئے۔

جناب میر نثار احمد مرحوم متولی درگاہ معلیٰ و معتمد دارالعلوم معینیہ عثمانیہ اجمیر اور دوسرے بعض مخلصین کی فرمائش پر مولانا نے حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے صحیح حالات مرتب کرنا شروع کئے تھے۔ اس کی تکمیل بھی اسی زمانہ علالت میں فرمائی جو انتقال کے ایک سال بعد "نثار خواجہ" کے نام سے شائع ہوئی اور پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔ میر نثار احمد کے نام کی رعایت سے "نثار خواجہ" نام تجویز فرمایا۔ مولانا محمد یونس میرٹھی ناظم دارالعلوم معینیہ عثمانیہ د

خطیب جامع شاہجہانی درگاہ معلّٰی نے کتاب کے آخر میں مولانا اور کتاب سے متعلق جو صفحات لکھے ہیں وہ دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں اس میں اپنی مہربانی سے میرا اور مولوی سید نجم الحسن کا ذکر بھی کیا ہے کہ ہم دونوں نے استاذِ مکرم کا حق رفاقت آخر تک کس طرح ادا کیا اور مولانا نے کس کس طرح نوازا۔

اسی زمانۂ علالت میں ترمذی شریف کی شرح لکھنا شروع کی۔ جب ایک جزو ہو جاتا تو ہم دونوں بھی نقل کر لیتے۔ ابواب الطہارۃ بھی ختم نہ ہونے پائے تھے کہ زندگی نے ساتھ چھوڑ دیا بہرحال جتنا کچھ ہو گیا ہے وہ بھی اپنی اہمیت کے لحاظ سے کچھ کم نہیں ہے۔ مولانا کی وسعتِ نظر اور مہارتِ علومِ نقلیہ کا اس سے اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے۔ اصل مسودہ مولانا کے ہاتھ کا لکھا ہوا موصوف کے کتاب خانہ میں مولوی عبدالباقی سلمہ کے پاس محفوظ ہے۔ اس پر جابجا حاشیہ مولانا نے میرے نام (الشاہد الشروانی) سے چڑھایا ہے۔

مولانا نے معضلاتِ فن کی تشریحات بھی فرماتے رہتے تھے۔ خاص خاص مسائل پر مبسوط مضمون بھی تحریر فرما دیتے تھے چنانچہ علم و معلوم، دہر اور وجود پر مبسوط مضامین خود مولانا کے دست مبارک کے لکھے ہوئے میرے پاس موجود ہیں۔ آخری مضمون شوال ۵۵ھ میں ختم کیا تھا۔ زمانہ علالت و معذوری میں بھی بعدِ عصر یہ سلسلہ جاری رہتا چنانچہ جمادی الاخرے ۱۳۵۸ھ سے لے کر ۱۵ ذیقعدہ ۱۳۵۸ھ مطابق ۲۷ دسمبر ۱۹۳۹ء، وفات سے ایک ماہ پچیس روز قبل تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ وجود رابطی، متعلق تصدیق، حقیقتِ تصدیق، تحقیق اجزاء قضیہ و تصدیق، مقولاتِ عشر، کلی طبعی وغیرہا جیسے معرکۃ الآرا فنی مسائل کی املا کرائی۔ ۶ نومبر ۱۹۳۹ء مطابق ۲۳ رمضان المبارک ۱۳۵۸ھ دوشنبہ کو بخاری شریف اور ۲۸ نومبر ۱۹۳۹ء مطابق ۱۶ شوال ۵۸ھ منگل کو سنن ابی داؤد ختم ہوئیں اس کے بعد ۲۹ نومبر ۱۹۳۹ء مطابق ۱۷ شوال ۵۸ھ کو مسلم شریف کرا دی گئی۔ کچھ اسباق ہو پائے تھے کہ میں سخت بیمار پڑ گیا اور تقریباً دو ماہ اس کا چکر رہا۔ ایک ماہ صاحبِ فراش رہ کر تبدیل آب و ہوا کے لئے خیرآباد و علیگڈھ چلا گیا۔ وہاں سے ۱۵ ذی الحجہ ۵۸ھ مطابق ۲۶ جنوری ۴۰ء کو واپس اجمیر پہنچا۔ اپنی بدنصیبی پر جتنا بھی ماتم کروں کم ہے کہ ان آخری ایام میں خدمت و استفاضہ سے محروم رہا۔ واپسی پر پھر مسلم شریف کے اسباق شروع ہوئے۔

اس زمانۂ علالت اور آخری ایامِ حیات میں، میں اور مولوی سید نجم الحسن ہم دونوں ہی خدمت گذاری اور استفادہ کے لئے مخصوص ہو گئے تھے۔ ۸ر فروری ۱۹۴۰ء مطابق ۲۸ر ذی الحجہ ۱۳۵۸ھ پنجشنبہ تک اسباق واستفادہ کا سلسلہ رہا۔ یکم محرم الحرام ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۰ر فروری ۱۹۴۰ء شنبہ کو مرض نے شدت اختیار کرلی۔ صحیح بخاری اور آیۂ کریمہ کا ختم کیا گیا، بکری ذبح کی گئی، شام کو کچھ افاقہ ہوا۔ تیسرے روز حالت کچھ اور سنبھل گئی۔ ۸ر محرم الحرام کو حالت مایوس کن ہو گئی دوسرے دن اطباء بھی ناامید ہو گئے۔ آخر تیسرے روز ۱۰ر محرم الحرام ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۹ر فروری ۱۹۴۰ء یکشنبہ کو ٹھیک شہید کربلا سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت اسی یوم عاشورہ میں یہ آفتابِ علم وعمل اور ماہتابِ رشد وہدایت ہمیشہ کیلئے غروب ہو گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

گویا نزاعی حالت سے دس روز پہلے تک درسِ حدیث جاری رہا۔ منطق وفلسفہ جو خاص فن تھا اس کا سلسلہ دو ماہ قبل ہی منقطع ہو چکا تھا جب بیماری نے نازک صورت اختیار کی اور موصوف کو مایوسی ہوئی تو فرمایا:۔

افوض امری الی اللہ ان اللہ بصیر بالعبادہ

جب تک زبان نے کام دیا بار بار اپنی حالت کو دیکھ دیکھ کر اس آیت کی تکرار فرماتے تھے اور سورۂ یٰس تسکینِ خاطر کے لئے پڑھوا کر سنتے تھے صحابۂ کرام میں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر جان فدا کرتے تھے۔ ان کے ایمان وایقان کی نظیر نہیں بتاتے تھے فرماتے تھے انہوں نے خدا کو پہچان کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانا نہ کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر خدا کو جانا۔

حضراتِ اہلِ بیت کے ساتھ خاص انس اور لگاؤ تھا۔ بخاری شریف میں حضورِ اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وفات کے سلسلے میں حضرت سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا جب یہ قول پڑھاتے کہ اے انس! تمہارے دلوں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر مٹی ڈالنا کیسے گوارا کر لیا تو بے ساختہ ایک چیخ نکل جاتی اور ایک عرصہ کے لئے ربودگی سی پیدا ہو جاتی۔ جب بھی حدیث شریف میں یہ موقعہ آیا ہے یہی کیفیت ہوئی ہے۔ ایک بار زمانۂ علالت میں دورانِ گفتگو میں یہ واقعہ زبان پر آگیا چیخ نکلی، حالت متغیر ہو گئی، بدن پر رعشہ طاری ہو گیا۔

خیرآبادی خاندانِ علم میں اس جامعیت کا کوئی دوسرا فرد نہیں گزرا۔ تفسیر، حدیث، فقہ

اصولِ فقہ، منطق، فلسفہ، ریاضی اصطرلاب، ادب وغیرہا جملہ فنون پر یکساں عبور تھا۔ خدا شاہد ہے اپنا تجربہ یہ ہے کہ ہر فن اس طور سے پڑھاتے تھے کہ امامِ فن معلوم ہوتے تھے اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس فن کے سوا انہیں دوسرا فن آتا ہی نہ ہوگا۔

ریاضی میں مولانا حکیم برکات احمد بہاری ثم ٹونکی زیادہ درک نہ رکھتے تھے اس لئے علیگڈھ آ کر استاذ العلماء مولانا مفتی محمد لطف اللہ علیگڈھی کی چھ ماہ تک جوتیاں سیدھی کرکے اس فن پر کماحقہ عبور حاصل کیا تھا۔

ایک بار مولوی حکیم ظفر الحق نبیرہ شمس العلماء مولانا عبد الحق خیر آبادی سے کسی بات پر ٹونک میں خفا ہوئے تو فرمایا کہ :-

"میاں تم ننگِ خاندان ہو اور میں فخرِ خاندان، تمہارے خاندانِ علم و فضل میں کوئی تم سا نہیں ہوا اور میرے خاندان میں آجتک مجھ جیسا نہیں گزرا۔"

استاد کے استاد زادہ سے یہ سخت کلامی اس وجہ سے ہو گئی تھی کہ موصوف ان کو تکرارِ اسباق بھی کرلتے تھے اور استاد کے حکم کے مطابق پوری توجہ اور خیال رکھتے تھے۔

پسماندگان میں ایک بیوہ، ایک صاحبزادی جن کی ۱۵ ربیع الاول ۱۳۶۳ھ کو شادی ہو چکی ہے اور ایک صاحبزادے مولوی عبد الباقی سلمہ ہیں جن کا نکاح شوال ۱۳۶۵ھ میں ہوا ہے اور بھیتم ہائی اسکول کیکڑی میں ٹیچر ہیں۔ افسوس کہ حالات کے سازگار نہ رہنے سے اوسط درجہ تک عربی تعلیم حاصل کرکے "عالم" کا امتحان دینے پر اکتفا کیا۔ اب انٹرنس کا امتحان دے رہے ہیں۔ سرکار نظام نے مولانا کی علمی خدمات کی بنا پر وفات کے بعد سے پچاس روپیہ مشاہرہ پسماندگان کے لئے مقرر کردیا ہے جو برابر جاری ہے۔ اللہ تعالےٰ اسے استقامت بخشے۔

تصانیف میں ازالۃ الاوہام الغفول، ازاحۃ شبہات الشادی، چہار تازیانۂ قہارہ، حیوۃِ طیبہ، چہل حدیث، نثارِ خواجہ، القول الاظہر، تجلیات انوار المعین، اسعاف اور کلمۃ الحق مطبوعہ ہیں۔

استاذ الاساتذہ مولانا فضل حق رامپوری پرنسپل مدرسہ عالیہ رامپور نے شمس العلماء مولانا

ع۵ آپ کی ایک تالیف "معین المنطق" کے نام سے "محرابِ ادب" کراچی کی طرف سے چھپ گئی ہے۔ یہ ان تقریرات کا مجموعہ ہے جو آپ نے زمانۂ اسیری میں قطبی اور میر قطبی کے حل کے لئے مولانا ہاشم جان مدظلہ کے نام بھیجی تھیں۔ محمد موسیٰ عفی عنہ

عبدالحق خیرآبادی کے حاشیۂ شرح مواقف پر بعض شبہات واعتراضات کئے تھے اول الذکر دونوں کتابیں اسی کے جواب در جواب الجواب کا درجہ رکھتی ہیں ضمناً فنی وتحقیقی مسائل پر شرح وبسط سے روشنی پڑتی ہے دونوں عربی میں ہیں۔ چہار تازیانۂ قہار مختصر روداد ہے اس مناظرہ کی جو مولانا کے استاد مولانا حکیم برکات احمد ٹونکی اور مولوی عبدالوہاب بہاری کے درمیان دربار رامپور میں ہوا تھا۔ اس میں بھی بعض فنی مسائل مذکور ہیں۔ جلوۂ طیّبہ نواب عبدالواحد علی خان رئیس بوڑہانسی ضلع بلند شہر وجاگیردار جے پور کی سوانح حیات ہے۔ فقہی اور شرعی مسائل سے مملو ہے۔ نواب صاحب موصوف نے تحریکِ خلافت میں علم وعلماء اور مجاہدین زعماء کی خدمت اپنا فرض سمجھ لیا تھا مولانا جیل میں تھے کہ یہ دیندار بزرگ دنیا سے اٹھ گیا۔ مولانا سے بڑا خلوص واعتقاد رکھتے تھے اسی بناء پر ترتیب سوانحِ حیات سے زندۂ جاوید بنا دیا۔

جناب مولانا احمد رضا خاں بریلوی مرحوم جمعہ کی اذانِ ثانی کو مسجد سے باہر ضروری سمجھتے تھے۔ ممبر کے سامنے اذان کو غیر مشروع مانتے تھے۔ القول الاظہر اور تجلیات انوار المعین اسی کا جواب اور جواب الجواب ہیں ضمناً دوسرے فقہی مسائل بھی آگئے ہیں۔

جناب مولانا احمد رضا خاں بریلوی مرحوم اور جناب مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم میں خیالات و عقائد کے لحاظ سے بعد المشرقین تھا مگر جہادِ حریت کے خلاف تحریک خلافت کے دور میں دونوں بزرگ متفق ہوگئے تھے[۵]۔ کلمۂ حق میں مولانا نے اسی پر تبصرہ فرمایا ہے۔ باقی تصنیفات کا ذکر پیچھے گذر چکا ہے۔

عربی میں دو رسالے رسالہ فی بیان العمرۃ اور رسالہ مسائل الحج والعمرہ بھی لکھے جو غیر مطبوعہ ہیں۔ قاضی کے بعض مقاماتِ ابتداء کا حل بھی اردو میں کر دیا ہے۔

مولانا نے قمری حساب سے ۶۰ سال کی عمر پائی۔ اس میں ۴۰ سال مسلسل درس وتدریس کا سلسلہ جاری رہا۔ ہزاروں طلبہ مستفید ہوئے بہت سے تلامذہ سے اب بھی دریائے فیض جاری ہے مولوی منتخب الحق بہاری مدرسہ خلیلیہ ٹونک میں، مولوی عبیداللہ جامعہ عباسیہ بہاولپور میں، مفتی محمود حسن دارالعلوم راندیر میں، مولوی سید نجم الحسن درگاہ مخدومیہ خیرآباد میں طلبہ کو فیض پہنچا رہے ہیں۔ مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ میں بھی مولانا کے ایک شاگرد درس دے رہے ہیں۔ صاحبزادہ

---

۵ فاضل مصنف کو چاہئے تھا کہ یہاں نواب حبیب الرحمٰن شروانی رفیق خاص مولانا ابوالکلام آزاد کا اسم گرامی بھی درج کر دیتے کیونکہ انہوں نے بھی تحریک خلاف میں ... نے دو غلطیوں، تحریک ترک موالات اور تحریک ہجرت وغیرہ کی سخت مخالفت کی تھی اور اس وقت گاندھی کے چیلوں نے انہیں "حبیب الشیطان" خطاب دے دیا تھا۔ اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی اور دیگر علماء ومشائخ مثلاً حضرت سید پیر مہر علیشاہ گولڑوی وغیرہم نے بروقت احکام شرعیہ کا ...

قمرالدین سجادہ نشین سیالؔ شریف (پنجاب) ، صاحبزادہ ہاشم جان سندھی ، مولوی طاہر حسین امام عیدگاہ دہلی ، مولوی غازی محی الدین اجمیری ، مولوی نور الدین خلف مولانا قمرالدین اجمیری ، مولوی عبدالشکور بہاری ، مولوی عبدالحی اجمیری ، مولوی افتخار احمد چھپروی بہاری ، حضرت مخدوم الانام شاہ مقبول میاں قلندر خیرآبادی اور حکیم نصیرالدین ندوی وغیرہم قابلِ ذکر تلامذہ ہیں۔

مولانا حافظ مفتی سلطان حسن اکبرآبادی اور مولانا مناظر احسن گیلانی نے بھی استفادہ کیا ہے۔

مولانا ہزار اصرار پر بھی کسی کو بیعت نہ فرماتے تھے ۔ مولانا احمد علی ناظم انجمن خدام الدین لاہور نے خطوط کے ذریعہ اصرار کی انتہا کر دی۔ خود بھی حاضر ہوئے ، سینکڑوں التجاؤں کے بعد شرف پذیرائی بخشا گیا۔ اسی طرح سیٹھ عبدالمجید احمد آباد (تالے والے) ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے تو مجبور ہو کر ان کو بیعت کرنا پڑا ۔ ان دو حضرات کے سوا کسی اور کا بیعت کرنا میرے علم میں نہیں ہے بیعتِ مصافحہ وضیافت کے لئے اذنِ عام تھا۔ اکثر حضرات کو اجازت بھی بخشی گئی ۔ ۵ر اکتوبر ۱۹۳۹ء مطابق ۲۱ر شعبان ۵۸ھ پنجشنبہ کو مجھے اور رفیقِ محترم مولوی سید نجم الحسن خیرآبادی کو بھی یہ سعادت نصیب ہوئی۔ حدیث مصافحہ وضیافہ مع اسناد پڑھ کر مصافحہ فرمایا اور "اسودین" پانی اور کھجور سے ضیافت کی۔ اسناد پر دستخط ثبت فرما کر اجازتِ بیعت بھی مرحمت فرمائی۔

مولانا مفتی کفایت اللہ ، علامہ سید سلیمان ندوی ، شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی اور دوسرے اکابر علماء مولانا سے بڑی عزت واحترام کے ساتھ پیش آتے تھے۔ اول الذکر دونوں حضرات کبھی کبھی فنی وعلمی مسائل کی تحقیقی گفتگو بھی کرتے۔

علامہ ڈاکٹر اقبال مرحوم جب یورپ گئے اور وہاں انھیں لیکچر بھی دینا تھا تو جناب میر غلام بھیک نیرنگ کی معرفت مولانا سے زمان یا دہر پر مضمون لکھا یا تھا۔ اس کی انگریزی کر کے وہاں کی علمی مجلس میں وہ مضمون پڑھا جو بے حد پسند کیا گیا ۔ وہاں سے واپسی پر مولانا کو شکریہ کا خط لکھا تھا۔ مولانا نے ایک موقعہ پر وہ خط مجھے بھی دکھایا تھا ۔ معلوم نہیں اب بھی کاغذات میں وہ محفوظ ہے یا نہیں ؟

مولانا کو فلسفہ کے مسائل پر اس قدر عبور تھا کہ اہم سے اہم مسئلہ پر برجستہ گھنٹوں تقریر

عـــہ شیخ الاسلام حضرت خواجہ قمرالدین سیالوی ، مدظلہ العالی موجودہ دور کے مشائخ میں سب سے زیادہ فاضل بزرگ ہیں عربی زبان پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ تحریک پاکستان ، تحریک آزادی کشمیر ، تحریک ختم نبوت اور دیگر قومی وملی تحریکات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے ہیں۔ جمعیۃ العلماء پاکستان کی ...

کر سکتے تھے، میرا ذاتی مشاہدہ ہے۔

شعبان ۵۵ھ میں احمد آباد، سورت اور بمبئی کا سفر ہوا۔ دو دوسرے طالب علموں کے ساتھ مجھے بھی ہمرکابی کا فخر حاصل تھا۔ رمضان کا پورا مہینہ تقریباً بمبئی ہی میں گذرا۔ ترمذی شریف اور سراجی کے اسباق جاری رہے۔ کبھی سحری اور کبھی نمازِ فجر کے بعد یہ سلسلہ رہتا۔ اسی درمیان میں مولانا نے علم و معلوم پر تحقیقی مضمون لکھنا شروع کر دیا۔ نہایت باریک قلم کے ۳۰ صفحات لکھ ڈالے۔ درمیان میں بیسیوں کتابوں اور افاضل کے حوالے دیئے گئے حالانکہ ہمارے علم میں ہے کہ ایسی کوئی کتاب اس وقت مولانا کے پاس نہیں تھی جس سے فائدہ اٹھا سکتے۔ مولانا سے استفادہ کرنے والے جانتے ہیں کہ مولانا کا سینہ علوم و فنون کا گنجینہ تھا علم در سفینہ نہ تھا، افسوس

آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند

جامع مسجد شاہجہانی درگاہ معلی اجمیر کی پشت پر خاص محراب کے متصل احاطہ "چار یاری" میں یہ کوہ عزم و ثبات پیکرِ علم و عمل اور مخزن فضل و کمال ۱۰ محرم الحرام ۱۳۵۹ھ سے آسودہ خواب ہے اور اس کی قبر بھی علمی جلالت شان کا پورا مظہر بنی ہوئی ہے، علیہ رحمۃ اللہ تعالیٰ ؎

طمع فاتحہ از خلق نداریم نیاز

عشق من از پس من فاتحہ خوانم باقیست

جیسا کہ گذر چکا ہے مولانا نے نثار خواجہ، صاحب فراش ہوتے ہوئے مرتب کی تھی۔ وفات کے دوسرے سال طباعت کی نوبت آئی۔ مولانا محمد یونس صاحب سابق ناظم دار العلوم معینیہ عثمانیہ و خطیب جامع شاہجہانی درگاہِ معلی اجمیر شریف نے خاتمہ کتاب میں جو اظہارِ عقیدت کیا ہے اس کا کچھ حصہ نقل کر دینا نامناسب نہ ہوگا۔

آخر میں اپنے چند اشعارِ قطعۂ وفات نذرِ عقیدت کے طور پہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

خاتمہ کتاب و رحلت مصنف علامؒ

یہ کتاب مصنفِ علام نے جس محققانہ طرز اور مجتہدانہ رنگ میں لکھی ہے اپنی نظیر آپ ہے حضرت خواجہ کے حالاتِ طیبات میں اب تک ایسی مستند تاریخ مرتب و مدوّن نہیں ہوئی جسکی

بڑی ضرورت تھی خصوصاً تہذیبِ جدید کا حامل کثیر التعداد گروہ جو ہر منقول کو عقل و فلسفہ کی روشنی میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اور تعلیم یافتہ طبقہ جو ہر روایت کو درایت کی میزان میں تولنے کا خوگر ہے اسکے لئے وہ تمام تصانیف جن میں خوش عقیدتی سے کام لیا گیا ہے ناقابلِ تسلیم ہیں اور عوام کی زبان پر جو روایات جاری و ساری ہیں پایۂ اعتبار سے ساقط اور حضرتِ خواجہ کی اس مقبولیتِ عامہ کا مشاہدہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ بلا تفریقِ قوم و ملت مخلوقِ خدا بلا امتیاز شاہ و گدا فوج در فوج اور موج در موج آپ کے آستانے پر پروانہ وار فدا ہو رہی ہے۔ اس کشش و جاذبیت کی حقیقی لِم اور اصلی راز معلوم کرنے کی روز افزوں طلب نے اس گروہ کو محوِ حیرت بنا رکھا تھا کہ ایسا مرکزِ عقیدت خواجہ جس کی سات سو برس گزر جانے پر یہ شان ہے اپنے دورِ حیات میں کیسا آئینہ دار جمال و کمال ہوگا۔ ہر متین و مہذب شخص انگشتِ حیرت بدنداں کہ ایسا مقبول و مسلم ولی اللہ اور اس کے صحیح حالات و سوانح اس درجہ پردۂ خفا میں کہ چند زباں زد رطب و یابس روایات کے سوا اصلی واقعات مخفی و مستور، اس کمی اور اس طلب کو دیکھ کر حضرت علامۃ الہند مولانا معین الدین اجمیری علیہ الرحمۃ نے قصد فرمایا کہ آپ کے مستند وقائع و حالات آپ کے مسلم کمالات و کرامات مؤرخانہ شان اور محققانہ آن بان کے ساتھ کتابی صورت میں مرتب و مدوّن کئے جادیں اور اس طرح کہ اربابِ عقیدت کی ایمانی آنکھ کا سرمۂ نور افزا ثابت ہوں اور اصحابِ علم و روایت کے لئے مستند دلیل و رہنما۔ فللہ الحمد کہ یہ تصنیف لطیف اسی جامعیت کی حامل و حاوی مرتب ہوئی حضرت خواجہ کے سوانحِ حیات، آپ کا علم و عمل، آپ کا زہد و ورع، آپ کا جہاد و مجاہدہ غرض زندگی کا ہر شعبہ انوارِ قرآنی اور معارفِ ربانی کی تفسیر ہے، ہر قدم شریعت کی روشنی میں اٹھا ہے، ہر عمل اسوۂ نبوت کا عکس اور پرتو ہے۔ مؤرخین کے گمراہ کن اختلافات کو تاریخ ہی کی شہادت سے ایسے مجتہدانہ انداز سے فیصل کیا ہے کہ پڑھ کر وجد آجائے اور ضمناً بعض مذہبی اختلافی مسائل پر لطیف اشارات کے ساتھ پُر لطف بحث فرمائی ہے کہ ہر مصنف کو سوائے تحسین و تسلیم کچھ نہ بنے۔

کاش مولانا مرحوم چند سال قبل صحت جسمانی اور فراغِ خاطر کے وقت اس تصنیف کا موقع پاتے تو وسعتِ بیان اور اس تالیف کی وقعت و شان بہت ہی اعلیٰ و ارفع ہوتی۔ یہ تو مولانا نے اس ماحول میں تصنیف فرمائی ہے کہ ایک طرف جسمانی عوارض نے آپ کو چند سال سے معذ

ہوشت بنا دیا تھا کہ نشست و برخاست تو کجا کروٹ بدلنا بھی بلا دوسرے کی امداد کے ناممکن تھا دوسری طرف چند جاہ طلب شاگردوں (ہوس و اقتدار کے بھوکے جنٹلمینوں) نے مولانا کے وجود کو اپنے لئے سنگِ راہ سمجھتے ہوئے حکومت کی نظر میں مشتبہ کر دیا حتی کہ دار العلوم معینیہ عثمانیہ کے منصبِ صدارت (صدر مدرسی) سے بحکمِ گورنمنٹ نظام خلد اللہ ملکہٗ ہٹا کر مولانا کا فراغِ خاطر مفقود کر دیا لیکن اس جوشِ مخالفت اور اس بے دست و پائی کے عالم میں بھی آپ حمایتِ ملت اور تحریکاتِ حاضرۂ اصلاحِ امت میں برابر مسلمانوں کی مذہبی رہنمائی کے لئے سر بکف رہے اور اس معذوری کی حالت میں مقامی میں جلسوں میں ہمیشہ تقریر فرماتے یہاں تک کہ جے پور کے عالم آشوب حادثہ میں وہاں پہنچکر رہنمائی کی تحریک ہجرت کو روکنے کی تلقین فرمائی۔ ان مشاغل کے ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی برابر جاری تھا کہ حضرت علامہ کا محبوب ترین مشغلہ بلکہ غذائے روح یہی تھا چنانچہ دورۂ حدیث شریف کا درس وفات سے دو ہفتہ قبل تک جاری رہا اور اس دریائے علوم کے لئے مستفیان ہیں سے دورِ آخر کے خوش نصیب مستفیض طلبہ تکمیلِ علوم کے لئے اس حالت میں شبانہ روز مولانا کے گرد حلقہ زن رہتے تھے خصوصاً جناب مولٰنا شاہد شروانی اور جناب مولوی نجم الحسن صاحب خیرآبادی کے متعلق مولانا کی دلی خواہش اور پوری سعی و کوشش تھی کہ ان دونوں جوہر قابل شریف زادوں کو مجسمۂ کمال علمی بنا دیں کیونکہ ہر دو اولوالعزم سعادت مند جوان صالح طالبانِ علوم نے خود کو مولانا کی خدمت و رضا جوئی کے لئے وقف کر دیا تھا چنانچہ ان کی تکمیل اور اس کتاب کی ترتیب کے متصل ہی آپ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اس خدمتِ علم (تدریس) اور اس نذرِ عقیدت (تصنیف نثار خواجہ) کا صلہ تھا جو اس حسنِ قبول کی صورت میں ظاہر ہوا کہ عشرۂ محرم کے روز سیدنا امام حسین (علیہ و علیٰ جدہ السلام) کی عین شہادت کے وقت مولانا نے جان، جان آفریں کو سپرد کی اور جنازہ بھی اس تزک و احتشام سے اٹھا کہ باوجود بلیاں لگا دینے کے لوگوں کو کندھا دینے کا موقعہ نہ ملا۔ اس شانِ قبول کے ساتھ احاطہ درگاہ عالم پناہ میں اندرون خطہ صالحین (چار یار) متصل محراب جامع مسجد شاہجہانی آپ مدفون ہوئے۔ الحق کہ یہ مجاہدِ اعظم فاضل مسلم مجسمۂ کمالات علم و عمل اسی حسنِ قبول کا اہل تھا جو غیب سے ظاہر ہوا۔ تبحر علم، مروت و حلم، زہد و ایثار، صبر و استقلال، تحریر و تقریر، وسعتِ اخلاق

سیر چشمی ، ہمدردی عام ، جرأت تام ، رواداری و مساوات ، استغنا ، و توکل ، تسلیم و رضا غرض جملہ محاسنِ صوری و معنوی کی جامعیت جیسی قدرت نے آپ میں ودلیعت رکھی تھی بہت کم دیکھنے میں آئی ہے۔ افسوس کہ مولانا کی وفات سے مسندِ علم و فضل خصوصاً اجمیر میں بے رونق ہوگئی۔ تمام مستفیدین متفرق و منتشر ہو گئے جن کے لئے مولانا کی ذات نے اجمیر کو مرکز توجہ بنا رکھا تھا۔ افسوس !

آں قدح بشکست وآں ساقی نماند

انا للہ و انا الیہ راجعون۔

عہدِ حاضر کا مؤرخ موجودہ دور کے علماء کی تاریخ میں جس مرتبہ پر آپ کا نامِ نامی درج کرے گا وہ اخبارات کے کالموں میں دیکھئے یا قائدانِ ملک و ملت کے ان جذبات سے پوچھئے جو غالباً معین نمبر کے نام سے شائع ہونے والے ہیں یا ہو چکے

افسوس کہ حضرت علامہ کا یہ نقش آخر (نثار خواجہ) ابھی زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہونے پایا تھا کہ مصنفِ علام واصل بحق ہو گئے "

نذرِ عقیدت

بہ ہادیؔ[1] رفتِ مولانا معین الدین اجمیری
۱۳۵۹ء

مرجعِ خلق و ملاذِ خاص و عام — مخزنِ الطاف و مخدومِ انام

مہرِ عالمتابِ علم و معرفت — زہد و حلم و فضل کے ماہِ تمام

یمِّ تفسیر و حدیث و فقہِ دیں — بحرِ ذخّارِ معانی و کلام

فنِ تاریخ و ادب میں بے نظیر — منطق و حکمت کے لاثانی امام

تھا لقب علامۃ الہند آپ کا — اور معین الدین اجمیری تھا نام

وعظ و افتار، درس و تالیفِ علوم — رات دن اس کے سوا کچھ تھا نہ کام

تھی زبانِ فیض گویا ہر گھڑی — فرقِ باطل کے لیے حق کی حسام

راہِ آزادی میں کیں قربانیاں — سجنِ یوسف بھی بنا دار القیام

خدمتِ ملک و وطن میں پیش پیش — تھا سیاست میں بہت اونچا مقام

"فضلِ حق" سے تھے امامِ حریت — کارزارِ حق میں تیغِ بے نیام

ہو نہیں سکتا خصائل کا شمار — اس دعا پر اب ہو شاہدؔ اختتام

اپنی رحمت سے عنایت کر خدا

جنت الفردوس میں عالی مقام

چشمۂ فیضاں رہے جاری سدا

رحمتوں کا ہو نزول ان پہ مدام

---

[1] یہ مصرعہ تاریخ خاص نوعیت رکھتا ہے، حضرت پیر مرشد مولانا ہادی علی خاں صاحب سیتاپوری رحمۃ اللہ علیہ استاذِ محترم سے ۱۱سال قبل رحلت فرما چکے تھے، دونوں بزرگوں کے ناموں کا اس موقع پر اجتماع جبکہ "ہادی" خدا و رسول کا نام بھی ہو لطف سے خالی نہیں۔

راقم السطور محمد عبدالشاہد خاں شروانی

عجب درد است جانم را نمیدانم کہ چوں گسریم
دلا باخوں شوکہ تا برحالِ خود یک لحظہ خوں گریم

اُس وقت جبکہ ہلال سرور و بہجت فلکِ صحافت پر اُفقِ کلکتہ سے طلوع ہوکر بدرِ کامل بننے سے قبل ہی خسوف و کسوف ضبط و منع کی منزل میں داخل ہو رہا تھا یہ ہلالِ شوم ونحس آسمانِ دنیا پر نمودار ہوا یعنی جنوری ۱۹۱۵ء میں یہ ننگِ خلائق، ناواقفِ حقائق و دقائق، اپنی ننھیال ریاست بھیکن پور ضلع علیگڈھ یو۔ پی میں پیدا ہوا۔ آبا و اجداد کا مسکن موضع بھاموں ضلع ایٹہ بھیکن پور سے ۶ میل پر واقع ہے۔ بھاموں، اضلاع علیگڈھ اور ایٹہ کی سرحد پر آباد ہے۔ اس کے جانب غرب ایک میل پر موضع بلونہ علیگڈھ کی حد میں اور جانبِ شرق اسی قدر فاصلہ پر موضع ڈھولنہ ایٹہ کی حد میں ہے۔ جانبِ جنوب موضع کناوہ اور جانبِ شمال موضع کنوبی ہے۔ کناوہ، ایٹہ اور کنوبی علیگڈھ میں محسوب ہے۔

والد مرحوم اردو، فارسی اور حساب و سیاق میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ میاں جی سید حبیب اللہ حسین پوری مرحوم کے شاگرد تھے۔ میاں جی صاحب کا انتقال ۱۹۴۴ء میں ابھی وسال ہوئے، ہوا ہے۔ راقم السطور کو بھی شرفِ نیاز حاصل تھا۔ فارسی درسیات کی کتابیں انہیں ازبر تھیں۔ فارسی کے اچھے شاعر تھے، ساری عمر اسی شروانی خاندان کی تعلیم و تدریس میں گذاری بڑے وضعدار بزرگ تھے، آخر عمر تک عیدین کی نماز پڑھانے بھاموں آتے رہے۔

والد مرحوم کو تعلیم سے خاصہ لگاؤ تھا۔ فارسی کی کتابیں اور احادیث کے اردو ترجمے ان کے پاس تھے۔ برادرِ گرامی منشی عبدالماجد خاں مرحوم کی رسمِ بسم اللہ بھیکن پور میں ہوئی، حافظ سید مہدی حسن نگینوی نے کرائی۔ جب میں اس عمر کو پہنچا تو آبائی وطن بھاموں میں میانجی محفوظ علی برامی کو مکان پر رکھا میری بسم اللہ موصوف ہی نے کرائی، موصوف شاعر بھی تھے۔ فارسی و اردو دونوں میں کافی دسترس تھی۔ دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اکثر جمعرات کو ۶ میل پیدل چل کر قلعہ ظفر منزل نواب بہادر

عہ محمد عبدالواجد خاں ۲

محمد مزمل اللہ خاں مرحوم کے دربار میں کہا ہوا کلام جا کر سناتے۔ علاوہ دادو تحسین کے نذرانہ بھی پاتے۔ مجھ پر غیر معمولی شفقت فرماتے۔ "خالق باری" مجھے پوری حفظ کرادی تھی۔ قرآنِ مجید بھی حفظ کرانا شروع کردیا تھا۔ سورۂ بقرہ ہی حفظ کر پایا تھا کہ سخت بیمار ہو گیا۔ سال بھر میں چار بار موتی جھرہ نکلا۔ بعض مرتبہ سرسامی کیفیت بھی طاری ہو گئی۔ ایک سال بعد جب بیماری سے نجات ملی تو سورۂ بقر بھول چکا تھا۔ پھر اس سعادت سے محروم رہا۔ میاں جی صاحب بیت بازی بھی کراتے رہتے تھے اس لئے سینکڑوں اشعار یاد کرا دیئے تھے۔

ہم دونوں بھائیوں کے ساتھ گاؤں کے دوسرے غریب بچے بھی پڑھتے تھے بعض لڑکے از راہِ شرارت اپنی ٹوپی میں کانٹے لگا لاتے تھے۔ میانجی صاحب کے چپت مارنے پر وہ کانٹے موصوف کی انگلیوں میں پیوست ہو جاتے۔ پھر ان کی ڈنڈوں سے کافی مرمت کی جاتی۔ کچھ عرصہ بعد میاں جی صاحب اپنی پیرانہ سالی کی وجہ سے اپنے وطن چلے گئے۔ ہم نے کچھ دن ظہور اللہ خاں صاحب کی چوپال کے مکتب میں منشی محمد ادریس خاں سے بھی پڑھا۔ پھر ہم قصبہ سہاور ضلع ایٹہ اپنی خالہ صاحبہ کے یہاں گئے۔ تو والد مرحوم نے مولوی عبد الرزاق عرف کلّے مولوی صاحب مرحوم کے سپرد کر دیا، دو تین ماہ وہاں پڑھتے رہے۔ بھاموں آنے پر چونکہ فوراً کوئی انتظامِ تعلیم نہ ہو سکا تھا اس لئے موصوف نے خود پڑھانا شروع کر دیا غرض یہ ہے کہ رسم بسم اللہ کے بعد سے زندگی کے آخر لمحات تک دیہات میں تعلیمی دشواریوں کے باوجود والد مرحوم نے ایسا کوئی دور ہم پر نہ گزرنے دیا جس میں تعلیمی سلسلہ جاری نہ رہا ہو۔ ہم کہیں رشتہ داری میں جاتے تو وہاں بھی اس سے پیچھا نہ چھوٹتا ابتدا میں ایک بار میانجی صاحب کے پاس سے پیشاب کے بہانے سے میں گھر آکر روپوش ہو گیا والد مرحوم کو پتہ چلا تو ایسی مرمت کی کہ آج تک اس کی لذت یاد ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ پھر کبھی روگردانی کی ہمت نہ ہوئی۔

بھاموں کو دو سال کے لئے ہمیں چھوڑنا پڑا۔ والد مرحوم موضع پنہرا ضلع علیگڈھ میں نواب بہادر محمد مزمل اللہ خاں کی جانب سے عامل و کارندہ بنا کر بھیج دیئے گئے تھے۔ اس موضع کیساتھ اس نواح کا پورا علاقہ جس میں دس بارہ دیہات شامل تھے موصوف کے سپرد کر دیا گیا تھا اس موضع میں موصوف پہلے زمیندار کی حیثیت رکھتے تھے۔ ہمارے نانا محمد محمود خاں شروانی

بھیکن پوری کے ترکہ سے سسرال سے موصوف کو یہ حصہ ملا تھا۔ چونکہ موصوف کے تعلقات و اثرات اہلِ علاقہ سے دیرینہ تھے اس لئے بڑی شان سے کام چلایا۔ دو سال قیام رہا۔ اس درمیان میں خاص پنہرا میں اپنی کوششوں سے پرائمری اسکول جاری کرایا۔ ہم دونوں بھائیوں کی تعلیم کی خاطر پہلے مولوی عبدالصمد خاں پرورُوی اور پھر حافظ عبدالسلام خاں کنادی کو بلا کر رکھا یہ دونوں بزرگ موصوف کے عزیز بھی تھے اس لئے ہم دونوں بھائیوں پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔

والد مرحوم کا خیال تھا کہ مجھے انگریزی تعلیم کے لئے مسلم یونیورسٹی میں داخل کرائیں اور برادر گرامی کو طبیہ کالج دہلی بھیجیں۔ اسی لئے ان کو عربی کی کتابیں شروع کرادی گئی تھیں۔ اس معاملہ میں نواب بہادر سے مشورہ بھی ہو چکا تھا۔ انہوں نے دونوں کے داخل کرانے کا وعدہ کر لیا تھا۔ یہی منصوبے تھے کہ اچانک والد مرحوم بیمار ہوئے اور بیماری نے اتنا طول کھینچا کہ صاحبِ فراش ہو گئے۔

اسی درمیان میں نواب محمد ابوبکر خاں رئیس اعظم دادوں ضلع علیگڈھ نے اپنی جائداد میں سے ساڑھے تیرہ ہزار کے منافعہ کی جائداد ۱۹۲۳ء میں وقف کی تھی اس میں اعراس۔ مساجد۔ مسافر اور فاتحۂ بزرگانِ دین کے ساتھ ساتھ ساڑھے تین ہزار مدرسہ عربیہ کے لئے وقف کئے اور اس میں یہ شرط بھی رکھی کہ آفاتِ ارضی و سماوی سے اس رقمِ وقف میں کمی آنے پر پہلے مدرسہ کی رقم کا لحاظ رکھا جائے گا۔ اس رقم سے کچھ بچے گا تو حصہ رسدی تقسیم ہوگا۔ چنانچہ ۲۴ نومبر ۱۹۲۴ء کو مدرسہ عربیہ کا افتتاح دادوں میں کر دیا گیا۔ مولانا وجیہ الدین احمد خاں رامپوری اور مولوی امین الدین چھروی مرحوم نے درس و تدریس کی ابتدا کی۔ مولوی محمد شریف خاں، مولوی نور محمد، مولوی سید مسعود علی، مولوی نظام الدین نوشوی، مولوی رونق علی سہارنپوری، مولوی شمعون خاں اترولوی حافظ عبدالرؤف علیگڈھی، مولوی محمد مسلم چھروی، مولوی محمد ابوظفر خاں چھروی وغیرہم "السابقون الاولون" کا درجہ رکھتے ہیں۔ طلبہ میں سب سے پہلے یہی لوگ داخل مدرسہ ہوئے تھے۔

انھیں ایام میں والد مرحوم کا انتقال ہو چکا تھا۔ ہمارے چھوٹے ماموں منشی محمد عبدالمجید خاں شروانی بھیکن پوری اس وقت موضع کنوبی میں مولوی محمد جان خاں شروانی رئیس دادوں کی طرف

سے کارندے تھے۔ بھاموں کنوبی سے ایک میل پر واقع تھا اس لئے اکثر آمد و رفت رہتی اور ہر طرح ہم سب کی دلدہی کرتے رہتے۔ موصوف نے برادرِ گرامی کو توسیاق و حساب سکھانا شروع کیا اور مجھے دادوں لیجاکر مدرسہ عربیہ میں داخل کر دیا۔ ۱۹۲۵ء میں جبکہ میری عمر دس گیارہ سال تھی میں نے عربی شروع کی۔ چونکہ مدرسہ کئی ماہ پہلے شروع ہو چکا تھا اور طلبہ سال اول کا کافی نصاب ختم کر چکے تھے اس لئے یہ صورت رہی کہ دن میں اسباق میں شریک رہتا اور بعد مغرب مجھے اور مولوی حبیب الرحمٰن کنوبی کو جو میرے ساتھ ہی داخل ہوئے تھے مولانا وجیہ الدین احمد خاں دروس الادب اور میزان الصرف پڑھاتے۔

نواب صاحب کو مدرسہ سے بڑی دلچسپی تھی۔ بڑے فیاض، سیر چشم اور عالی حوصلہ انسان تھے علماء کی بڑی عزت کرتے اور طلبہ کو گھر سے زیادہ آرام پہنچاتے، رسہ کشی، بیت بازی اور فٹ بال میچ وغیرہ کراتے اور جیتنے والوں کو انعامات و اکرامات سے نوازتے۔ طلبہ کی ساری ضروریاتِ زندگی کا مدرسہ کفیل تھا، نواب صاحب کی داد و دہش مزید براں تھی۔ ہندستان کے ہر گوشے سے طلبہ پہنچنا شروع ہو گئے۔ اساتذہ کے تبحر اور محنت و شفقت نے مدرسہ کو اور چار چاند لگائے۔ دیکھتے دیکھتے دار الجہل خطہ دار العلوم بن گیا۔ ایک بی بی صاحبہ نے چار پانچ ہزار سالانہ آمدنی کا وقف کر دیا پھر بھی اخراجات وسیع ہوتے گئے تو نواب صاحب کی ذات کفیل بن گئی۔ نواب صاحب کا ۴ ارمضان ۱۳۵۴ھ مطابق ۱۹۳۵ء کو مسلسل علالت کے بعد انتقال ہو گیا تو از روئے وقف نامہ مرحوم کے برادر خرد نواب حاجی محمد غلام محمد خاں حافظی رئیس اعظم موہن پور و دادوں مدرسہ اور وقف کے متولی ہوئے۔ موصوف نے برادرِ گرامی کے نقشِ قدم پر چل کر مدرسہ کی شان و عظمت کو ذرا بٹہ نہ لگنے دیا۔ موصوف نے ۴ ار ربیع الاول ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹۴۳ء کو اپنے پیر و مرشد حافظ محمد اسلم خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے آستانہ پہ جان، جاں آفریں کے سپرد کی اور وہیں پائیں میں دفن ہوئے مرحوم کے بعد واقف کے عم زاد بھائی مولوی محمد جان خاں تین سال سے متولی ہیں۔ آپ کے دورِ تولیت میں نصف درجن طلبہ سے زیادہ کبھی تعداد نہیں ہو سکی اور نہ آیندہ کوئی توقع نظر آتی ہے۔

مدرسہ میں حافظ قاری مولوی غلام محی الدین خاں سلیٹی بھیتی اور مولوی حفیظ الدین کرمانی خیر آبادی مرحوم

کا تقرر بھی ہو چکا تھا۔ اول الذکر سے مشق قرارت سال ڈیڑھ سال کی۔ ان دونوں استادوں نے بھی درسی کتابیں پڑھائیں۔ ماسٹر سید مظہر علیم صاحب فرید آبادی مرحوم پرائیویٹ سیکریٹری نواب صاحب مرحوم سے انگریزی بھی شروع کر دی تھی۔ عربی ترجمہ اور خوشخطی کی مشق مولوی حاجی محمد سلامت اللہ لکھنوی خلف استاذ العلماء مولانا مفتی محمد لطف اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے جو شرف منزل پر (جو دادوں سے نصف میل پر واقع ہے) اقامت گزیں تھے وہاں شام کو جا کر کرنا پڑتی۔

اسی درمیان میں ایک مرتبہ قدوۃ السالکین زبدۃ العارفین مولانا الحاج محمد ہادی علیخاں سیتاپوری رحمۃ اللہ علیہ محرم کے ایام میں نواب صاحب کی استدعا، واصرار پر دادوں تشریف لائے۔ واقعات کربلا پر کئی تقریریں ہوتیں، کچھ اس انداز سے واقعات کی تصویر کشی فرماتے کہ سننے والے بے قابو ہو کر چیخیں مارنے لگتے۔ بیان میں وہ اثر تھا کہ بچے بوڑھے سبھی روتے روتے بے حال ہو جاتے جب تک مولانا کا قیام رہا مواعظ و تقاریر کا سلسلہ جاری رہا۔ میں بھی اپنی نوعمری و کم علمی کے باوجود بڑا متاثر تھا۔ سینکڑوں آدمی مولانا سے بیعت ہوئے۔ تقریبًا سارا مدرسہ ہی بیعت ہو گیا، انھیں میں سے میں بھی تھا۔

مولانا کی عمر نوّے سال سے متجاوز تھی۔ کرسی پر دوسرے اٹھا کر مجلس میں لاتے۔ دو چار قدم سے زیادہ نہ چل سکتے تھے اور وہ بھی دوسروں کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر، حضرت شاہ حافظ محمد اسلم خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ اور نواب صاحب مرحوم کے پیر بھائی تھے۔ اسی نسبت سے کبھی دادوں آجاتے تھے۔ نواب صاحب کے والد ماجد نواب احمد سعید خاں مرحوم اور تقریبًا پورا خاندان حافظ صاحب ہی سے بیعت تھا۔ مولانا نے اس پیرانہ سالی کے باوجود ہمیشہ تراویح مسجد پہنچکر پڑھیں اور رمضان میں پورا قرآنِ پاک تراویح میں سنا، پابندِ شریعت اور متبعِ سنت تھے۔ وہ مجلس وغیرہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

۱۶ ربیع الاول ۱۳۴۸ھ بروز شنبہ سرائے معالی خاں لکھنؤ میں آثار شریف میں وصال ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔ کچھ مذہبی تقریبات کے لئے آثار شریف کے لئے وقف بھی فرما گئے ہیں۔ ہر سال ربیع الاول میں موئے مبارک سرکار رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس جگہ زیارت ہوتی ہے، بڑا ہجوم ہوتا ہے مجھے یہ سعادت بھی حاصل ہے کہ دفن میں شریک ہوا اور آخری بار

زیارت سے بعد وفات مشرف ہوا۔ میں اس وقت خیرآباد میں پڑھتا تھا۔ خیرآباد لکھنؤ سے پچاس میل
ہے اطلاع آنے پر کافی لوگ وہاں سے گئے انہیں میں میں بھی تھا۔
میں شرح تہذیب، تاریخ الخلفاء، قدوری وغیرہا پڑھ رہا تھا کہ مدرسہ میں نیا انقلاب آیا۔
مولانا وجیہ الدین احمد خاں رامپور تشریف لے گئے اور مولانا شاہ عماد الدین سنبھلی نے مسندِ صدارت
فتح پوری مسجد دہلی سے آکر سنبھالی۔ وہ تعلیمی سال ختم کر کے، دوسرے سال ذی قعدہ ۱۳۴۷ھ
مطابق ۱۹۲۹ء میں نواب صاحب سے باضابطہ اجازت حاصل کر کے میں خیرآباد چلا گیا۔ یہاں مدرسہ
عربیہ نیازیہ میں مولانا حاجی محمد بشیر خاں رامپوری سے ۲ ذی الحجہ ۱۳۴۷ھ مطابق ۱۹۲۹ء کو جلالین
قطبی اور میبذی سعیدیہ شروع کیں۔ دیوانِ حماسہ ادیبِ مدرسہ مولانا حافظ عزیز الرحمٰن ندوی سے
شروع کیا۔ میں تقریباً سات سال تک خیرآباد رہا۔ ان دونوں اساتذہ نے پوری دلچسپی و شفقت و
توجہ میرے حال پر مبذول رکھی۔
مدرسہ میں ۲۹ ذی الحجہ ۱۳۵۱ھ مطابق ۱۹۳۳ء بروز سہ شنبہ ایک طلبہ کی انجمن بھی قائم کی جس کا نام انجمن
اشاعت الدین رکھا۔ ہر ہفتے خاص خاص موضوع پر تقریریں ہوتیں۔ خیرآباد کے اکابر اور ارکان مدرسہ
کو بھی دعوت دیکر شریک کرتے۔ متولی مدرسہ اس کے نگران، مولوی منظور المحمود خاں رامپوری مدرس
مدرسہ صدر، اور میں ناظم بنایا گیا تھا۔ انجمن کے لئے دار المطالعہ علیحدہ قائم کیا جس میں کتابوں کے
علاوہ، رسائل و اخبارات بھی جاری کرائے۔ اکابرِ اسلام کی تاریخِ وفات پر مختلف مقررین ان
کے حالات بیان کرتے۔ سالانہ محفلِ سیرت و میلاد بھی منعقد ہوتی جس میں باہر سے کسی اچھے مقرر
عالم کو مدعو کیا جاتا۔
۱۹۳۴ء میں زلزلہ بہار کے موقعہ پر ہماری انجمن نے بڑا کام کیا۔ خیرآباد سے کافی رقم جمع کر کے
نائب امیرِ شریعت بہار مولانا محمد سجّاد اور دوسرے ذمہ دار حضرات کو بھیجی۔ اخبار النجم، حقیقت وغیرہما
میں میرے مضامین بہ حیثیت ناظم انجمن شائع ہوتے رہے۔ خیرآباد میں رہ کر شعر و شاعری سے بھی دلچسپی
ہو گئی تھی۔ مشاعروں میں طرحی غزل بھی پڑھتا۔ رسائل میخانہ، انتخاب اور الناظر میں غزلیں اور شاعری
سے متعلق مضامین بھی شائع کراتا رہتا۔ سرگذشت علیگڈھ میں بھی اکثر کچھ نہ کچھ چھپتا رہتا۔ مرزا ابراہیم بیگ
مرحوم بڑی محبت و شفقت فرماتے تھے۔ علیگڈھ آنے پر موصوف ہی کے یہاں قیام رہتا ۱۹۳۴ء

میں نواب بہادر محمد مزمل اللہ خان شروانی نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میرٹھ میں جو خطبۂ صدارت پڑھا اس کا عربی ترجمہ کر کے ۱۰/ دسمبر ۱۹۳۴ء کو مرحوم کی خدمت میں پیش کیا۔ موصوف ہمیشہ کی طرح بڑی شفقت سے پیش آئے اور ۱۲/ دسمبر ۱۹۳۴ء کو نواب حاجی غلام محمد خاں حافظی مرحوم کو ایک خط لکھا جس میں میرے متعلق یہ سطور بھی تھیں۔ یہ خط میرے پاس محفوظ ہے:

عزیز عبد الشاہد خاں نے میرے خطبۂ کانفرنس کا عربی ترجمہ دکھایا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ میں اس ترجمہ کو پڑھ کر حیران ہو گیا اور میرے دل نے ہزارہا تحسین و آفرین کہیں۔ آپ کے اس خیر جاری کو آپ کی مدد اور توجہ سے ایک غریب دیہاتی عزیز اس قدر قابلیت اور لیاقت سے مستفیض ہوا ہے آپ کے حق میں اور نیز اس کے حق میں صدقِ دل سے دعا کرتا ہوں۔ میں ان کے مضامین اور اشعار متعدد اخبار میں پڑھتا رہا ہوں لیکن اس عالمانہ قابلیت کا مجھ کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔ جزاکم اللہ خیر الجزاء و حفظکم من کل البلاء والابتلاء امین ثم امین۔

علامۃ الہند مولانا معین الدین اجمیری کا تذکرۂ علم و فضل مولوی حکیم ظفر الحق اور مولوی حکیم حافظ احمد علی خیرآبادی سے اکثر آ چکا تھا۔ خود رجب ۱۳۵۴ھ میں اپنی آنکھوں سے اس سے بڑھ کر مشاہدہ کیا۔ مولانا کے دربار میں کے دربار میں شعبان ۱۳۵۴ھ میں مستقل طور پر پہنچ گیا۔ مولانا کے تذکرہ میں اپنے قیام اور تعلیمی نظام کے متعلق مختصراً سب کچھ لکھ چکا ہوں۔ استاد کے کرم کا حال اس پہلے خط سے معلوم ہو سکتا ہے جو موصوف نے میرے خدمت میں پہنچنے سے قبل میرے خط کے جواب میں لکھا تھا۔ اس نامۂ گرامی سے وقارِ علم، ادب، ہمت اور استقلال کے پہلو بھی معلوم ہو سکیں گے:

عزیزم! صانکم اللہ تعالیٰ عن النوائب۔ وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔
رقیمۂ وداد موصول ہوا۔ آں عزیز کی روانگی کے بعد جناب مولوی حکیم احمد علی صاحب کا سفارشی خط موصول ہو گیا تھا، اس کا جواب بھی دے دیا گیا کہ تعمیلِ ارشاد

ہوگی. آپ کے جانے کے بعد پھوڑے کی تکلیف میں فقیر مبتلا ہوگیا. اب تک اس کے شدید درد میں مبتلا ہوں، پھوڑا گدّی پر نمودار ہوا ہے، عمل جراحی بھی اسہر ہوگیا ہے. آپ میری جانب سے بالکل مطمئن رہیں. میں جیسا آپ کی حضوری میں تھا ویسا ہی اب ہوں. آپ صرف اپنے شوق واخلاص پر نظر رکھیں جس قدر شوقِ علم اور میرے ساتھ اخلاص آپ کو ہوگا اسی قدر میری توجہ آپ کے حال پر ہوگی، غالب کیا خوب کہتے ہیں ؎

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
یہ دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

اس فلسفہ پر آپ نظر کریں گے تو ہمیشہ مطمئن رہیں گے. حق تعالےٰ آپ کو قائم المرام کرے اور سلسلۂ خیرآباد کو آپ کے دم سے زندہ رکھے. ہم تو اب قبر میں پیر لٹکا چکے ہیں، آپ ہی جیسے اربابِ شوق نوجوانوں سے بقاء سلسلہ کی توقعات قائم کئے ہوئے ہیں. والسلام فقط

فقیر معین الدین کان اللہ لہ، دارالخیر اجمیر

(۱۲ رجب ۱۳۵۴ھ)

سیاسی زندگی کا آغاز اجمیر ہی سے ہوتا ہے مجلس احرار اجمیر عرصہ سے ختم ہو چکی تھی. ۱۰ فروری ۱۹۳۸ء مطابق ۸ ذیقعدہ ۱۳۵۶ھ کو اس کا دوبارہ افتتاح ہوا مجھے بھی اس کا رکن بنایا گیا. اس سے قبل میں انڈین نیشنل کانگریس کا باضابطہ ممبر بن چکا تھا. ۱۲ جنوری ۱۹۳۸ء مطابق ۸ ذیقعدہ ۱۳۵۶ھ سے مستقل کھدر پہننا شروع کر دیا. دونوں جماعتوں کا رکن و ممبر بن جانے کے بعد سیاست میں عملی طور پر حصہ بھی لینا پڑا. اکثر تقریریں بھی سیاسی جلسوں میں کرنا پڑتیں. اس وقت فلسطین پر بڑا جبر و تشدد جاری تھا جو واقعات ہندوستان تک پہنچتے تھے انہیں پڑھ پڑھ کر خون کھولتا تھا یوم فلسطین کے سلسلے میں طبیعت پر قابو نہ رکھ سکا اور پوری باغیانہ تقریر جامع مسجد شاہجہانی میں کر ڈالی. اس سے قبل تین تقریریں اسی قسم کی خطرناک اور کر چکا تھا.

بالآخر ۱۵ دسمبر ۱۹۳۸ء کو گرفتار کر لیا گیا. بعد میں کئی ہزار کی ضمانت اور مچلکوں پر رہائی ہوئی

مقدمہ چلنا شروع ہوا۔ مسٹر اختر حسین اسسٹنٹ کمشنر کی عدالت میں ٦ ماہ تک پیہم پیشیاں ہوتی رہیں کئی کئی گھنٹے کٹہرے میں کھڑا رہنا پڑتا۔ تضییعِ اوقات کے سوا کچھ حاصل نہ تھا۔ یہ وقت میرے لئے بڑے امتحان کا تھا۔ حضرت استاذ پاؤں سے معذور اور صاحبِ فراش تھے، حصولِ علم اور خدمتِ شیخ اولین مقاصدِ زندگی تھے۔ ادھر سرپرستوں اور بزرگوں کا تقاضا تھا کہ یہ لکھ کر گورنمنٹ راجپوتانہ میں داخل کر دیا جائے کہ دورانِ تعلیم و قیامِ اجمیر میں سیاست میں حصہ نہ لوں گا۔" اس بے غیرتی پر آمادہ نہ ہونے پر تمام سرپرستوں سے ہاتھ کھینچ لیا گیا اور بے تعلقی کا اظہار کر دیا گیا۔ یہ بھی صبر و شکر کے ساتھ برداشت کیا اب وہ وقت آیا کہ عدالت کے کٹہرے میں جن فقروں پر مقدمہ چلا تھا ان کے متعلق مجھ سے پوچھا گیا میں نے تمام باتوں کا اقرار کیا۔ اخبار انجام دہلی، احرار سہارنپور، اور معین اجمیر اس کے شاہد ہیں آل انڈیا مجلسِ احرار اور جمعیۃ العلمائے ہند کے ناظمان نے لکھا کہ اس وقت جیل جانا مقصد میں شامل نہیں، بلا وجہ بند ہونے سے فائدہ نہیں۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ اگر فیصلہ خلاف ہو تو اپیل کی جائے مگر اسکی نوبت ہی نہیں آئی۔ چھ ماہ کی زبان بندی کا مجسٹریٹ نے حکم سنایا اور یہ چھ ماہ اس وقت ختم ہوئے جب حضرت الاستاذ دنیا سے عالمِ آخرت کو روانہ ہو چکے تھے۔

قدرت کا نظام تو دیکھئے کہ زبان استاذ کے جلسۂ تعزیت میں کھلی جو کانگریس کمیٹی کی طرف سے ٹاؤن ہال میں ۲۰/فروری ۱۹۴۰ء کو منعقد ہوا تھا۔ میں ۱۹۳۹ء میں شہر کانگریس کمیٹی اجمیر اور ۱۹۴۰ء میں صوبہ کانگریس کمیٹی راجپوتانہ کا ممبر منتخب کیا گیا۔ مجلسِ احرار کا ذمہ دار عہدیدار بھی بنا دیا گیا۔ جمعیۃ العلماء ہند کا رکن مرکزی بھی رہا۔ اجمیر سے واپسی پر ایک سال تک احباب نے صدر مجلسِ احرار علیگڑھ بنا دیا صوبائی اور مرکزی کی رکنیت بھی سر ڈال دی۔ نام و نمود سے نفرت اور علمی و تعلیمی مشغولیت نے سیاسی انہماک سے باز رکھا ورنہ اب تک خدا جانے سیاست کی کس منزل پر پہنچ چکا ہوتا۔

مولانا کی وفات کے ایک ماہ بعد میں اجمیر سے خیرآباد پہنچا اور وہاں ایک ہفتہ رہ کر دادوں پہنچا اور مدرسہ عربیہ حافظیہ سعیدیہ ریاست دادوں ضلع علیگڑھ میں ۲۲/صفر ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۹۴۰ء سے فرائض درس و تدریس انجام دینے لگا۔ سب سے پہلے سابقہ ہدایہ جلد ثالث، مسلم الثبوت اور تفسیر بیضاوی سے پڑا، ان کے علاوہ دوسری کتابیں بھی زیرِ درس رہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ تین سال تک اپنی بساط کے مطابق دیانتداری سے یہ فرض انجام دیا اور اس درمیان میں متولی مدرسہ

رکانِ مینٹی اور طلبہ کو کسی تعلیمی وانتظامی شکایت کا موقعہ نہ ملا۔
متولی مدرسہ نواب حاجی محمد غلام محمد خاں حافظی کا ربیع الاول ۱۳۶۲ھ میں انتقال ہوتا،
اور قانونِ وقف نامہ کے مطابق واقف کے عم زاد بھائی مولوی محمد جان خاں رئیس دادوں متولی
ہوتے ہیں۔ موصوف مدرسہ کا یہ سال کسی نہ کسی طرح پورا کرتے ہیں تعطیل کلاں کے بعد جب مدرسہ
کھلتا ہے تو مولانا محمد امجد علی اعظمی، مولوی محمد شریف خاں دادونی، اور راقم السطور کو مطلع کیا جاتا
ہے کہ مدرسہ تنخواہوں کا اس قدر بار برداشت نہیں کر سکتا ہے اس لئے آپ کی خدمات سے
محرومی پر افسوس ہے۔ مولانا محمد امجد علی اعظمی سات سال سے صدر مدرس تھے۔ بریلی، اجمیر اور دوسرے
مدرسوں کے صدر مدرس رہ چکے تھے۔ کہنہ مشقی کی بنا پر درسیات میں پوری مہارت رکھتے ہیں۔
مولانا ہدایت اللہ خاں جونپوری مرحوم تلمیذ حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی کے شاگرد اور مولانا سید
سلیمان اشرف بہاری مرحوم سابق صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے ہم درس اور استاد
برادر ہیں۔ مولوی محمد شریف خاں مدرسہ دادوں ہی کے فارغ التحصیل اور اس کے سب سے پہلے
طالب علم ہیں، فراغت کے بعد اسی مدرسہ میں مدرس ہو گئے تھے، ان دونوں کے استحقاق اور
قدیم علاقہ کا بھی خیال نہ کیا گیا۔ ہمارے بعد مولوی غلام امام یونس بدایونی کو صدر مدرس بنایا گیا،
وہ بھی دو برس میں تنگ آکر شعبان ۱۳۶۵ھ میں وطن چلے گئے۔ اب مدرسہ جس منزل سے گزر
رہا ہے اس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ خدا، مولوی سید مسعود علی کو ثبات واستقلال بخشے۔ کہیں وہ
بھی بددل ہو کر کنارہ کشی اختیار نہ کر لیں۔ موصوف بھی اس مدرسہ کے " السابقون الاولون "
میں سے ہیں۔ رامپور اور ڈابھیل سے سندِ فراغت حاصل کر کے کئی سال مدرسہ قادریہ بدایوں میں
مدرس رہنے کے بعد جناب مولوی امین الدین چھروی کی رحلت پر دادوں پہنچکر مدرس ہوئے
اور دو سال سے علمی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ چار میل پر آبائی وطن ہے اور دو میل پر والد ماجد
ملازم ہیں اس لئے موصوف قرب کی بنا پر دادوں اقامت گزیں ہیں۔
دادوں سے سبکدوشی کے بعد شوال ۱۳۶۳ھ میں نواب صدر یار جنگ بہادر نے اپنے کتب خانہ
حبیب گنج میں بلاکر بعض اہم خدمات سپرد کیں۔ ابھی پورا سال بھی ختم نہ ہو پایا تھا کہ میں ایک اچانک حادثہ سے
دوچار ہو گیا۔

اجمیر سے واپسی اور مدرسہ دادوں میں تقرر کے بعد میں نے یہ مناسب سمجھا کہ ایسی جگہ سکونت اختیار کی جائے جہاں سے علمی سہولتیں حاصل رہیں۔ آبائی وطن بھاموں سڑک سے دور خام راستہ پر واقع تھا۔ بھموری خاندانِ شروانی کا مرکز اور قدیم مسکن تھا۔ یہ دو تین ہزار کی آبادی کا بڑا گاؤں سڑک کے بالکل کنارے واقع ہے، دو فرلانگ پر ندی بہتی ہے، ۴ فرلانگ پر حبیب گنج و بھیکن پور اور دو میل پر جانبِ جنوب دادوں اور اتنے ہی فاصلہ پر جانبِ شمال قصبہ چھرّہ ہے جہاں اناج کی بڑی منڈی، تار گھر، اور لاری اور یکہ کا اڈا ہے۔ تمام ضروریاتِ زندگی وہاں سے پوری ہوتی ہیں، مویشیوں کا ہسپتال اور طبیبوں اور ڈاکٹروں کی پرائیویٹ دکانیں بھی ہیں۔ قصبہ دادوں میں مدرسہ عربیہ، تھانہ اور شفاخانہ ہے۔ مدرسہ عربیہ دادوں اور کتب خانہ حبیب گنج کے قرب کی وجہ سے بھموری میں مستقل سکونت اختیار کرنا طے کیا اور نواب صدر یار جنگ بہادر سے معقول معاوضہ دیکر جامع مسجد سے متصل ایک بلند اور ہوا دار جگہ عمارت کے لئے حاصل کی اور اس پر خام اور پختہ عمارت اپنی سہولت و ضرورت کے مطابق ۱۳۶۱ھ مطابق ۱۹۴۲ء میں تیار کرا کے پیر و مرشد کے نام پر "ہادی منزل" نام رکھا " شاہدِ رحمتِ مقصود ہے ہادی منزل " تاریخی مصرعہ ہے جس کا پتھر بیرونی برآمدہ کے وسط در پر نصب ہے۔ اس جگہ کے دوسرے لوگ بھی خواہشمند تھے اور مدتوں سے اس کے حصول کی کوشش کر رہے تھے۔ نواب صدر یار جنگ بہادر نے ان سب پر راقم السطور کو ترجیح دی تھی

میں رجب ۱۳۶۴ھ مطابق جون ۱۹۴۵ء میں ایک ہفتہ کے لئے اجمیر عرس میں چلا گیا۔ میرے متعلقین اپنی رشتہ داری میں سہاور و بھیکن پور چلے گئے مکان مقفل اور دروازے پر آدمی سو رہا تھا کہ ۱۵ر جون ۱۹۴۵ء کی شب کو ایک منظم سازش کے ماتحت مکان میں مٹی کا تیل اور پیٹرول چھڑک چھڑک کر آگ لگا دی گئی، سامان، چھتیں، در و دیوار سبھی کچھ جل کر بھسم ہو گیا۔

خدا شاہد ہے کہ اس حادثہ نے میرے دل کو ذرا بھی متاثر نہیں کیا اور میں اس بے سروسامانی میں بالکل اسی طرح مطمئن رہا اور رہوں جیسے سامانِ راحت کی موجودگی میں رہتا تھا اور حسبِ ارشادِ خداوندی واما بنعمۃ ربك فحدث کہہ سکتا ہوں کہ حضرت جلیل مانکپوری کے اس شعر کا مصداق ثابت ہوا؛

توکل کا یہ منشا ہے کہ اطمینان پیدا کر
نہ ہو سامان کا پابند یہ سامان پیدا کر!

آزمائشوں کا مقصد انسان کا ثبات واستقلال دیکھنا ہوتا ہے۔ خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ
میں اس امتحان میں کامیاب ہوا اور امید ہے کہ زندگی کے ایسے بیشمار حوادث کا جو قومی زندگی
کے لوازم سے ہیں، مقابلہ کرتا رہوں گا۔

سیاسی طور پر میرا مسلک بالکل صاف ہے۔ اخلاص وطن و قوم کے لئے تمام ہندستان
سے اشتراک، واتحاد اور غیر ملکی حکومت کی بیخ کنی واستیصال، ہر آزادی خواہ جماعت سے تعاون اور
ہر رجعت پسند گروہ سے بیزاری وتنفر، ہر شیر بیشۂ حریت کے ساتھ صف آرائی اور ہر شیر قالین سے
گریز پائی، انگریز اور ہندستانی کے سوال پر پورا ہندستانی اسلام و کفر کے سوال پر پکا مسلم شیعہ سنی کے
سوال پر پختہ سنی۔ یہی میرا مسلک ہے اور یہی سیاست، یہی میرے خیر آبادی اساتذہ کا طریقہ تھا،
(در یہی میرا وطیرہ)

مکان کی تعمیر کے بعد ہی میرا نکاح ۲۸ ربیع الثانی ۱۳۶۱ھ مطابق ۱۵ مئی ۱۹۴۲ء بروز جمعہ منجھلے
ماموں حافظ حاجی محمد عمران خاں شروانی بھیکن پوری کی بڑی صاحبزادی سے ہو چکا تھا۔ منشی عبدالمجید خاں
شروانی بھیکن پوری اور منشی لطف الرحمن خاں ڈھولنوی شاہد تھے۔ چار ہزار سکہ رائج الوقت مہر مقرر ہوا،
مولانا شاہ مصباح الحسن مودودی پھپوندوی نے نکاح پڑھایا۔ ایک سال کے بعد ۱۵ جمادی الاول
۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹۴۳ء کو رخصت ہوئی۔ مکان کے حادثۂ آتشزدگی کے ڈھائی ماہ کے بعد خدائے
کیمیا بنائی یعنی ۱۸ رمضان المبارک ۱۳۶۴ھ مطابق ۲۷ اگست ۱۹۴۵ء بروز دوشنبہ بعد عشاء فرزند
بلند اقبال عطا فرمایا، آثار خوش طالعی چہرہ سے ہویدا ہیں،

بالائے سرش زہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

نیک فالی کے طور پر محمد مجاہد خاں نام اور جمال میاں اور رشدی میاں خطاب رکھا گیا۔ مجاہد
نہ صرف شاہد کا قافیہ ہی ہے بلکہ اس نے شاہد کو مفت میں "ابوالمجاہد" بھی بنا دیا ہے اور والاسماء
تنزل من السماء کے مطابق فال نیک بھی ہے۔ خدا زندگی دے تو صاحب رشد وہدایت
اور محقق و مجاہد بنائے۔ یہی انسان کی سب سے بڑی معراج ہے صحت و تندرستی اور حسن وخوبی میں
ہزاروں میں ممتاز ہے اللھم احفظہ من شر النوائب ! ذراسی ترمیم سے

محامد مجاہد خاں شروانی تاریخی نام بن جاتا ہے۔ شریکِ حیات عہدِ طفولیت ہی میں شفقتِ مادری سے محروم ہو چکی تھیں [۱۳۶۴ھ]۔ سوتیلی ماں کے واسطہ نے درشتیٔ مزاج عادتِ ثانیہ بنا دی۔ ازدواجی رشتہ کے بعد بھی اس میں کمی نہ آسکی جس کی وجہ سے گھر جنت تو نہ بن سکا مگر خدا کا شکر ہے کہ جہنم بھی نہ بنا، ہمیں بس است :

اب ایک سال سے یعنی ۳۰ ستمبر ۱۹۴۵ء مطابق ۱۳۶۴ھ سے لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے اورنٹیل اسسٹنٹ لائبریرین کے عہدہ پر فرائضِ منصبی انجام دے رہا ہوں۔ لٹن لائبریری اپنے نوادر مخطوطات کی وجہ سے بڑی دولت کی مالک ہے۔ مولوی سبحان اللہ خاں گورکھپوری مرحوم مولینا عبد السلام مرحوم، سر شاہ سلیمان الہ آبادی مرحوم، مولانا احسن مارہروی مرحوم اور دوسرے اکابر کے کتبخانوں کے شمول نے اسے اور بھی اہمیت دے دی ہے۔ نواب صدر یار جنگ بہادر نے اپنا نادر الوجود کتبخانہ بھی از روئے وقف نامہ ۱۳۶۴ھ اپنی وفات کے بعد مسلم یونیورسٹی میں ایک علیحدہ عمارت کتبخانہ کے عماراتی فنڈ سے بنا کر منتقل کرنا تجویز کر دیا ہے۔ اس کتب خانہ کے شامل ہونے کے بعد لٹن لائبریری ہندستان کا بے مثال مشرقی کتب خانہ بن جائے گی۔

ان دو اشعار پر جو زندگی کی صحیح تصویر بھی ہو سکتے ہیں اس بے کیف داستان کو ختم کرتا ہوں :

نالۂ ما صورتے بگرفت بلبل ساختند
لختہائے دل بیکجا جمع شد گل ساختند
آنچہ کم از طاقتِ ما شد بہ تمکینش فزود
صبرِ ما بردند و در چشمش تغافل ساختند

محمد عبد الشاہد خاں شروانی

سہ شنبہ، یومِ عید الاضحیٰ ۱۳۶۵ھ
مطابق ۵ نومبر ۱۹۴۶ء

عکس

نامۂ گرامی خاتم الحکماء علاّمہ فضل حق خیرآبادی بنام مولانا سلطان حسن خان
صدر الصدور (خسر قاضی محمد خلیل رئیس بریلی) مؤرخہ ۱۲۷۲ھ
عطیۂ قاضی موصوف الصدر بہ جناب نواب صدر یار جنگ بہادر
مولانا محمد حبیب الرحمن خاں شروانی سابق صدر الصدور مملکت
حیدرآباد دکن، آنریری سیکریٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس
صدر دار المصنفین اعظم گڈھ
رئیس حبیب گنج ضلع علیگڈھ

نقل خط

نامۂ گرامی خاتم الحکماء علامہ فضل حق خیرآبادی

برخوردار اعزاز جان سعادت و اقبال نشان سلمہ اللہ تعالیٰ

بعد تحیہ و ثناء و دعاء و تمنا مطالعہ نمایند کہ مسرت نامہ بہجت افزا مورخہ ۳۱ جولائی وصول مسرت آوردہ مسرور نمود و ابواب انشراح و انبساط بر روئے خاطر وابستہ کشود بدریافت صحت و عافیت آں برخوردار و شفا یافتن والد ماجد آں برخوردار کہ برائے استعلاج رونق افروز بریلی شدہ بودند سپاس ایزدی بجا آوردم از مدتے حال مقرر آں برخوردار معلوم نبود و بہمیں سبب ارسال مکاتبات صورت نہ بست حالا از نوشتۂ اعزی شفیقی مولوی نور الحسن صاحب رونق افروزی آں برخوردار در سردہنہ بدریافت آمدہ حالا انشاء اللہ تعالیٰ مکاتبت خواہد ماند وبائے ہیضہ درانجا ہم بشدت بودہ است حالا بفضل الٰہی رو بکمی آوردہ است در شاہجہاں آباد ہنوز در اشتداد است او سبحانہ کہ دافع البلیات است ایں بلیہ از ہمہ جا دفع فرماید بحرمۃ حبیبہ و آلہ الامجاد بدریافت ارتحال مولوی محمد حسین خانصاحب مراد آبادی در کول سخت تاسف شد او سبحانہ بیامرزد در حقیقت درایں زمانہ مغتنم بودند ایں وبا امسال در تمام ہندستان شیوع کردہ در آگرہ و متھرا و بھرتپور والور و نواحی آں بسیار اشتداد داشت حالا بفضلہ سبحانہ تخفیف است والحمد للہ!

امروز روز پانزدہم است کہ برخوردار نور الابصار مولوی عبد الحق سلمہ

اللہ تعالیٰ نزدِ من رسیدہ اند چوں مہارا ؤ راجہ بہادر از چندے رونق بخش کاکر ہ دوازدہ کروہے الور اند وہنوز معاودت نکردہ اند ملازمت برخوردار صورت نہ بستہ است در اینجا شغل تدریس بیشتر است شانزدہ سبق می شود مولوی نور احمد صاحب افق المبین مع حاشیہ و اعزاز جان مولوی عبد القادر شرح اشارات ومحاکمات و شرح قاضی مع حاشیہ میخوانند فہم درست دارند، برخودار مولوی عبد الحق نیز سہ چہار سبق داشتہ دیگر بجز تمنا چہ نویسیم لازمہ محبت آنست کہ در ہر ماہ خطے متضمن حال خیر اشتمال خود حوالہ ڈاک بیرنگ کردہ باشند خطے کہ بر ڈاک بیرنگ مے یابد بیشتر مے رسد و بہمیں جہت بندہ التزام کردہ است کہ بہمہ کساں خطوط بیرنگ میفرستم. والسلام

راقم محمد فضل حق ختم اللہ لہ بالحسنیٰ، پنجم ذیحجہ ۱۲۷۲ھ روز پنجشنبہ

برخوردار مولوی عبد الحق و مولوی نور احمد صاحب و مولوی عبد القادر سلام و تمنا میرسانند در بارہ لالہ بنسی لال حتی الوسع توجہ دریغ نشود۔

الثورة الهندية

باغی ہندوستان

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے دردانگیز تاریخی واقعات، مجاہدین کی جلاوطنی، حبسِ دوام بہ عبور دریائے شور، مردوں، عورتوں اور بچوں کا قتلِ عام

(انگریزی مظالم کی دل دہلا دینے والی خونیں داستان)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الحمد لله عظیم الرجاء،
للانجاء من دون الارجاء
من البلوی و البلیٰ و البلاء،
و ایلاء حُسْن البلاء بایتاء
الآلاء لمن دعاه باسنی الاسماء
لاسیما لِمن ظُلم و اضطر
عند الابتلاء بالاسواء و
الادواء۔

والصلوٰة علی بشیر بشیر بنذیر
بشربه انباء الانباء، المرجّی
شفاعته لدفع البلایا والاوباء
وکشف ظُلَم ظلم الاعداء
والشفاء من عُضال الداء،
و وبال الشقاء، و آل النجباء
النقباء الکرماء، وصحب العظماء
الاشدّاء الرحماء، سیما الحنفاء
الخلفاء، سلم الله وبارك علیه
وعلیهم ما سبح الملك فی الفلك
والسماء، و سبح الفُلك فی الفلك
الداماء۔

تمام ثنائیں اس خدائے برتر کے لئے ہیں، جس سے بغیر کسی نا امیدی کے محنت و آزمائش کہنگی و بوسیدگی اور غم و تکلیف سے نجات دینے کی بہت بڑی امید وابستہ ہے اور جو اسے اس کے اعلیٰ نام سے پکارے اسے بہترین عطایا اور بے شمار نعمتیں عطا فرمانے والا ہے بالخصوص مظلوم و مضطر کی، اس کی مصیبتوں اور بیماریوں میں سننے والا ہے۔

سلام ہو اس خوشخبری سنانیوالے اور ڈرانے والے پر جس کی تمام نبی نوید مسرت آمد سناتے آئے، بلا و وباء کے دور کرنے، دشمنوں کے ظلم کے پردے چاک کرنے، بڑی بدبختی اور سخت بیماری سے نجات دلانے کی، گنہگاروں اور سیہ کاروں کو، اس کی شفاعت سے بڑی امید ہے۔ سلام ہو اس کی شریف و نجیب و کریم اولاد پر، اور اس کے عظیم المرتبہ اشدّ و رحیم اصحاب پر خصوصاً پاکباز و صاف باطن خلفاء پر، اللہ کی رحمتیں اور برکتیں ان سب پر نازل ہوں جب تک فرشتے آسمان پر تسبیح و تہلیل کرتے رہیں اور کشتیاں سمندر میں تیرتی رہیں۔

وبعد فان كتابي هذا كتاب
اسير كسير خسير على ما فات منحسير
مبتلى بكل عسير لا يطاق و لو
في ان يسير، منتظر لفرج على ربه
يسير، ومكبول مخبول، واقع في
احبول، على الدعة والسعة من
بدء فطرته مجبول، يرجو النفس
من كربه من نفس ربه بدعاء
مقبول، ومحبوس في بأس بئيس
وبوس، وكل الى ظلوم عبوس عزاه
عما كان له من رئي وزي وملبوس
وابتلاه بشجون شجون، في مضائق
سجون، هي مجامع فتن جون، و
محتبس مبتئس من الخلاص متأس
نظرا الى تحكم محتبس فظ غليظ
القلب مختبس لكنه من رحمة
ربه ليس بيئوس وغرير سلس،
ضرير بلس، في آسر شرير بلس،
وجائر جائر بائر تعس، من ظلم جابر
جائر شكس شرس، وبائس ائس
مني بشدائد لا ينتهى اليها قياس
قائس، ومغتر ومعتر مضطر فتن
باشد احتباس، واحمر بأس، في

میری یہ کتاب ایک دل شکستہ، نقصان
رسیدہ، حسرت کشیدہ، اور مصیبت زدہ
انسان کی کتاب ہے، جو اب تھوڑی سی
تکلیف کی بھی طاقت نہیں رکھتا، اپنے
رب سے جس پر سب کچھ آسان ہے مصیبت
سے نجات کا امیدوار ہے جو ابتداء عمر سے عیش
و فراغت کی زندگی بسر کرنے کے باوجود، اب
محبوس دامِ ظلم اور تباہ شدہ ہے، اور مقبول دعاؤں
کے ذریعہ خدا سے ازالۂ کرب کا طالب ہے
وہ بڑی مشکلات میں مبتلا اور زیر شر و ظالموں کے
ہاتھوں میں گرفتار ہے۔ ان ظالموں نے اسے
اچھے لباس سے معرّا کر کے غم و حزن کی وادیوں
اور ایسے تنگ و تاریک قید خانوں میں ڈالدیا ہے
جو سیاہ فتنوں کے مرکز ہیں، وہ محبوس و حزیں
سخت دل، اچکّے اور ظالم افراد پر نظر کرتے ہوئے اپنی
رہائی سے مایوس ہے مگر اللہ کی رحمت سے نا امید
نہیں ہے۔ وہ ایک سیدھا سادھا، نرم خُو اور مریض و
کمزور ہوتے ہوئے شریر و بدفطرت کی قید میں ہے اور
ظالم و جابر، بدخلق و بدکردار کے مظالم سے حیران و پریشان
ہے۔ وہ آفت رسیدہ، ایسے مصائب میں مبتلا ہے جنکی
سختیوں تک قیاس کرنیوالے کا قیاس نہیں پہنچ سکتا
اور ایسا مضطر و محتاج ہے جو سخت عذاب و احتباس
میں گرفتار ہو چکا ہے۔ وہ سفید رو سیاہ دل

سر ابیض اسود الکبد ازرق
عبّاس، اصهب الشعر متلوّن لبّاس،
جرّده عما کان له من لباس، وکساه
اخشن کساء وکرباس، وعاجز
جازع فازع، الیٰ ربه فازع
نزیع من اسرته بالاسر بالاسر
نازع الیهم نازع، قضی علیه
بلا مدّع ومنازع، وسادم نادم
عادم، لکل مُنادم وخادم،
فتّ فی اعضاده باشدّ مصادم
ونجید فرید طرید عنّی فجلی
من ارضه وبلده، وکئیب کریب
غریب عنّی، فأُنحِیَ عن اهله
وولده، ضامه ظلوم وجاره
وأُنحِیَ عنه اهله وجاره، وخلّی
عنه وعنهم وجاره، اسره ففسره
وکسره بکل ضرب من الایلام لتصلبه
وتعصبه فی الایمان والاسلام
واشتهاره انه من العلّام
الاعلام، روما لدرس رسم
الدرس، وطمس علم العلم
حتی من القرطاس والطرس
وذلک لواقعة فازعة

متلوّن مزاج، ترش رو، کنجی آنکھ، گندم گوں
بال والوں کی قید میں آچکا ہے جس کا اپنا
عمدہ لباس اتار کر موٹا اور سخت لبادہ پہنا دیا
گیا ہے جو اس وقت مجبور و عاجز ہے اور
اپنے رب سے لو لگائے ہوئے ہے اپنے
تمام اعزہ و اقربا سے دور اور بہت دور ہے
مدّعی اور منازع کے بغیر اس پر فیصلہ صادر
کر دیا گیا ہے۔ وہ اپنے ہمنشینوں اور خادموں
کے سامنے شرمندہ ہے۔ اس کے بازوؤں
کو سخت تصادم سے کمزور کر دیا گیا ہے۔ وہ
غمزدہ، تنہا اور دور افتادہ ہے۔ اسے اپنی
زمین و شہر سے جلا وطن اور اہل و عیال سے
دور کر دیا گیا ہے۔ یہ سارا ظلم و ستم ظالم بدکیش
نے روا رکھا ہے۔ اسے اور اس کے اہل و
عیال کو اپنی درندگی کی جھاڑی میں چھوڑ دیا
ہے۔ اسے قید کر کے ہر ممکن مصیبت پہنچائی
گئی ہے۔ اس کا قصور صرف ایمان اور اسلام
پر مضبوطی سے قائم رہنا اور علمائے اعلام میں شمار
ہونا ہے۔ اس سے ان ظالموں کا مقصد
نشان درس و تدریس کو مٹانا اور علم کے جھنڈے
کو نیچے گرانا ہے۔ وہ صفحاتِ قرطاس سے بھی
نام و نشان مٹانا چاہتے ہیں۔ یہ سب کچھ
اس حادثۂ فاجعہ (انقلاب ۱۸۵۷ء) کی وجہ

تركت الديار بلاقع، وجعلتها الصوب المصائب مواقع، وامطرت على اهلها من غمام الغموم صواعق وصواقع وفاقرة جعلت الامراء فقراء صعاليك والملوك اسراء مماليك:

من قصتها ان النصارى البراطنة الاولى شحنوا صدورهم بالشحناء الباطنة، بعدما تسلطوا على ممالك الهند واقطارها وقراها وامصارها واستولوا على حدودها وثغورها واحاطوا باعجازها وصدورها وذللوا العزة رؤسائها بالاستقصاء، ولم يذروا فيها من يبدى لهم قرنه بالاستعصاء هموا بان ينصّروا كلا من قطّانها و سكّانها ورؤسها ووجوهها واعيانها ونبالها ونِذالها واجلتها واذلتها تنصيرا، ظنا بان هؤلاء الضعفاء لايجدون وليا ولا نصيرا ولا يستطيعون سوى الانقياد محيصا ومصيرا.

ليصيرا الناس كلهم كمثلهم من ملاحدة متوافقين على ملة واحدة ولا يفترق فرقة من فرقة بان يتدين كل بدين على حدة لتخيلهم

ہوا ہے جس نے آبادیوں کو ویران اور مصیبتوں کی شور زمین کو شاداب بنا دیا ہے جس کے غموں کے بادلوں سے کڑکتی ہوئی بجلیاں مصیبت زدگانِ وطن پر گریں اور ان پر بادشاہوں کو غلام وقیدی اور امراء کو محتاج وفقیر بنانے والی محتاجی وناداری مسلّط کر گئی۔

یہ داستانِ الم اس طرح ہے کہ وہ برطانوی نصاریٰ جن کے دل ممالکِ ہند کے دیہات و بلاد پر قبضہ اور اس کے اطراف واکناف وسرحدات پر تسلّط کے بعد عداوت وکینہ سے بھر گئے تھے اور تمام ذی عزت اعیان کو ذلیل وخوار کر کے ان میں سے ایک کو بھی اس قابل نہ چھوڑا تھا کہ سرِ نافرمانی کو جنبش دے سکے۔ انہوں نے تمام باشندگانِ ہند کو کیا امیر کیا غریب چھوٹے بڑے، مقیم ومسافر، شہری ودیہاتی سب کو نصرانی بنانے کی اسکیم بنائی۔ ان کا خیال تھا کہ ان کو نہ تو کوئی مددگار ومعاون نصیب ہو سکے گا اور نہ انقیاد واطاعت کے سوا سرتابی کی جرأت ہو سکے گی۔

یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ سب لوگ انہی کی طرح ملحد وبے دین ہو کر ایک ہی ملت پر جمع ہو جائیں اور کوئی بھی ایک دوسرے سے ممتاز فرقہ نہ رہ سکے۔ انہوں نے اچھی،

ان اختلاف النحل فی الادیان و
الملل، من اقوی العلل، لتطرق
الخلل، فی بقاء التسلط و العمل
وحدوث الحِوَل فی الولایات
والدُّول، فجدّوا کل جدّ و
بذلوا کل جهد، لرفع هذا الاختلاف
بابتداع الحیل، فبنوا لتعلم
الاطفال والاغفال و تلقینهم
کتب لسانهم ودینهم فی القریٰ
والبلاد مدارس وصیّروا معالم العلوم والمعارف
والمدارس والعهود التی بنیت فی العهود
السوالف دوارس وقدّروا اذ قدروا ان
یقدروا علی هٰؤلاء الاشتات فی الماکل و
الاقوات بان یاخذوا کل ما یخرج من
الارض من السنابل والغلات ویعطوا
نقودا بدل حقوق الحراث والزراع لئلا
یبقی لهٰؤلاء المساکین والدهاقین
الاراکین خیرة تصرف فی الغلات بالبیع والابتیاع
وان یستاثروا انفسهم ببیعها وشرائها وان
یکون لهم الخیرة فی ترخیص الاسعار و رخائها
فیضطر عباد الله احتکارهم
ویشتد حاجتهم الیهم وافتقارهم ویلجئهم
اضطرارهم الی تلقی ما یروم

طرح سمجھ لیا تھا کہ مذہبی بنیاد پر حکمرانوں سے
باشندوں کا اختلاف، تسلط و قبضہ کی راہ میں
سنگِ گراں ثابت ہوگا اور سلطنت میں انقلاب
پیدا کر دے گا اس لیئے پوری جانفشانی اور
تندہی کے ساتھ مذہب و ملت کے مٹانے
کے لیئے طرح طرح کے مکر و حیلہ سے کام لینا
شروع کیا۔ انہوں نے بچوں اور نافہموں کی
تعلیم اور اپنی زبان و دین کی تلقین کے لیئے
شہروں اور دیہات میں مدرسے قائم کیئے
پچھلے زمانے کے علوم و معارف اور مدارس و
مکاتب کے مٹانے کی پوری کوشش کی۔

دوسری ترکیب یہ سوچی کہ مختلف طبقوں پر
قابو اس طرح حاصل کیا جائے کہ زمینِ ہند
کے غلہ کی پیداوار کاشتکاروں سے لے کر
نقد دام ادا کیئے جائیں اور ان غریبوں کو
خرید و فروخت کا کوئی حق نہ چھوڑا جائے۔
اس طرح بھاؤ کے گھٹانے بڑھانے اور
منڈیوں تک اجناس پہنچانے اور نہ پہنچانے
کے خود ہی ذمہ دار بن بیٹھیں۔ اس کا مقصد
اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ خدا کی مخلوق مجبور و
معذور ہو کر ان کے قدموں پر آپڑے۔

اور خوراک نہ ملنے پر ان نصاریٰ اور ان
کے اعوان و انصار کے ہر حکم کی تعمیل اور

الانصار وانصارهم، الى غير ذلك مما فى قلوبهم من المنى والاهواء، وما تكن صدورهم من الفتن والاسواء كالافتتان بمنع الختان ورفع الحجاب من العقائل والخواتين وطمس سائر احكام الدين المحكم المتين فعمدوا بادئ بدء بمكائدهم الى ان يزلوا جنودهم من مسلميهم واهانِدهم عن رسومهم وقواعدهم ويضلوهم عن اديانهم وعقائدهم، لزعمهم ان الجنود من الابطال اذا ارتضوا الاديانهم بالابدال والابطال وتلقوا احكامهم بالقبول والامتثال لايكون لغيرهم مساغ ومجال للنكول مخافة النكال والانكال۔

فكلفوا الاهانِد منهم وهم جم غفير، وجمع كثير باذاقة شحوم البقير، والمسلمين وهم قليل نزير باذاقة شحوم الخنازير، فانحرف كل من الفريقين عن الطاعة والانقياد، حفظا لما لهم من الدين والاعتقاد فاخذوا يقتلون ذويهم ويقطعون طريقهم ويغتالون خانهم وبطريقهم، و

ہر مقصد کی تکمیل کرے۔ ان ترکیبوں کے علاوہ ان کے دل میں اور بھی بہت سے مفاسد چھپے ہوئے تھے۔ مثلاً مسلمانوں کو ختنہ کرانے سے روکنا، شریف و پردہ نشین خواتین کا پردہ ختم کرانا نیز دوسرے احکام دین مبین کو مٹانا، وغیر ذلک۔

اپنے مکر کی ابتدا اس طرح کی کہ سب سے پہلے اپنے ہندو مسلم لشکریوں کو ان کے رسوم واصول سے ہٹانے اور مذہب و عقائد سے گمراہ کرنے کے درپے ہوئے۔ ان کا گمان تھا کہ جب بہادر لشکری اپنے دین کو بدلنے اور احکام نصرانیت بجالانے پر آمادہ ہوجائیں گے تو پھر دوسرے باشندوں کو سزاو عقاب کے ڈر سے خود ہی مجال انکار نہ ہوسکے گی۔

انھوں نے ہندو لشکریوں کو جو تعداد میں بہت زیادہ تھے گائے کی چربی اور مسلمان سپاہیوں کو جو تھوڑی تعداد میں تھے سوٗر کی چربی چکھانے پر زور ڈالا۔ یہ شرمناک روش دیکھ کر دونوں فرقوں میں اضطراب پیدا ہوگیا اور اپنے اپنے مذہب واعتقاد کی حفاظت کی خاطر ان کی اطاعت وانقیاد سے منہ موڑ لیا۔ ان کے اس اضطراب نے خرمن امن پر چنگاری کا کام کیا۔ گروہ نصاریٰ کا قتل، ڈاکہ زنی، ان کے سرداروں اور سپہ سالاروں پر حملہ شروع کردیا

منهم من اعتدى واساء وارتكب الفظاظة والقساء، فقتل الولدان والنساء، فاستحق الخذلان والهوان من اغتيال النسوان، واستوجب الخزي والصغار من قتل الصبية الصغار۔

ثم ان كلا من الجنود المنحرفة قد انتهضوا من معسكرهم ومقامهم بعد الفتك بامرائهم وحكامهم، وقد تطرق الوهن والاختلال في اعمال العمال، وتمشى في امن الطرائق الفساد والفتور، واختلت الاوامر والامور، وهاجت فتن وجوه من العناد، بين العباد، وشاع البواد، في البوادي والبلاد، فهي تمور،

فأدى كثير من الجيوش الى دار الملك، دهلي التي هي مصر مشهور، وبلد معمور، ومثوى لجمع كثير من آل تيمور، فأمّروا بها من كان من قبلُ من بينهم رئيساله عملة وتامور، وهوم غمّر، قد ردّ الى ارذل العمر، وهو في الحقيقة لزوجه وتامورة مامور وكان مالمه الذي كان في المعنى واب عليا للنصارى مواليا،

بعض لشکری حد سے تجاوز کر گئے۔ انہوں نے قساوتِ قلبی اور شوریدہ سری کا انتہائی مظاہرہ کیا، بچوں اور عورتوں کے قتل سے بھی دریغ نہ کیا، چھوٹے چھوٹے بچوں اور بے گناہ عورتوں کی قتل و غارتگری سے رسوائی و ذلّت کے مستحق بن بیٹھے۔

پھر تمام باغی گروہِ لشکریاں اپنی چھاؤنیوں سے اپنے افسروں سے نمٹنے کے بعد چل کھڑے ہوئے۔ عاملوں اور حاکموں کے نظم درہم برہم ہو گئے۔ راستوں کے امن میں خلل و فتور مخلوقِ خدا میں فتنہ و فساد اور دیہات و بلاد میں شور و شغب پھیل گیا۔ طوفانِ حوادث جوش میں آگیا۔

بہت سے لشکر شہر مشہور، بلد معمور، مسکنِ آلِ تیمور، دارالسلطنت دہلی جا پہنچے، وہاں پہنچکر ان سب نے ایسے شخص کو سردار و پیشوا بنا لیا جو اس سے پہلے بھی ان کا آمر[1] و حاکم تھا جس کے پاس اس کے ارکانِ دولت اور وزیر بھی تھے لیکن وہ خود ضعیف، غمزدہ اور ناتجربہ کار تھا۔ عمر کی کافی منزلیں طے کر کے بڑھاپے کی وادی میں قدم رکھ چکا تھا۔ اور سچ پوچھیے تو آمر و حاکم ہونے کے بجائے اپنی شریکِ حیات[2] اور وزیر[3] کا مامور و محکوم تھا۔ اس کا یہ وزیر

---

[1] مرزا ابو ظفر بہادر شاہ ظفر۔ [2] ملکہ زینت محل۔ [3] حکیم احسن اللہ خاں۔

في حبهم غاليا، ولمن عداهم
لاسيما لعداهم مبغضا قاليا.
وكذا عشيرته وبعض من
عشيرته الاقربين من سريره
وسريرته يفعلون ما يشاؤن
ويعملون بآرائهم وفي طاعته
يُراءون، وهو إمّرة لا يعلم امرا،
ولا يعمل الا إمرا، ولا يأمر
برأيه امرا، ولا يفقه خيرا
ولا شرا، ولا يحكم بشئ جهرا
وسرا ولا يملك نفعا
ولا ضرا

جو حقیقت میں نصاریٰ کا کارپرداز اور ان کی
محبت میں غالی تھا، ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صحیح معنوں میں حاکم و والی اور
نصاریٰ کے دشمنوں کا شدید ترین مخالف تھا
یہی اس آمر و حاکم کے اہل خاندان کا حال تھا،
ان میں سے بعض[1] مقرب بارگاہ اور راز دار بھی
تھے۔ یہ سب کے سب جو جی چاہتا تھا کرتے
تھے۔ اپنی آراء پر عمل پیرا ہوتے تھے لیکن اس
کی اطاعت کا دم بھرتے تھے۔ اور وہ سردار ایسا
ضعیف الرائے ناتجربہ کار تھا کہ کچھ جانتا ہی نہ
تھا۔ اس سے عجیب عجیب حرکتیں سرزد ہوتی تھیں
کوئی کام اپنی رائے سے نہ کر سکتا تھا، نہ اچھا
برا سمجھنے کی صلاحیت رکھتا تھا، کسی کو خفیہ یا
علی الاعلان کوئی حکم دے سکتا تھا، نہ کسی کو
نفع و ضرر پہنچانے کی طاقت رکھتا تھا،

هذا وقد انتهض من بعض
القرى والبلاد جمع من المسلمين الجلاد
للجدال والجلاد، والغزو والجهاد،
بعد الاستفتاء والاستشهاد، من العلماء
الزهاد، وافتائهم بوجوب الجهاد،
بفتاوى ائمة الاجتهاد، وقد امّر ذلك الامّر
على الجيوش بعض من له من الاحفاد والابناء
وكانوا من السفهاء الخوّان الجبناء المدّعين

یہ تو سب کچھ ہو ہی رہا تھا کہ بعض شہر و
دیہہ سے بہادر مسلمانوں کی ایک جماعت[2] علماء
زہاد، اور ائمہ اجتہاد سے جہاد کے وجوب
کا فتویٰ لے کر جدال و قتال کے لئے اٹھ
کھڑی ہوئی۔

ادھر اس ناتجربہ کار سردار نے اپنے بعض
ناعاقبت اندیش، سفیہ، خائن اور بزدل اولاد[3]
کو امیر لشکر بنا دیا، یہ لوگ دیانتدار عقلمند دل

---

[1] شہزادہ مرزا مغل وغیرہ۔ [2] مولوی ابو سعید مستفتی وغیرہم۔ [3] مرزا مغل و خضر سلطان وغیرہما۔

من العقلاء الامناء۔
لم يشهدوا ملحمة وحربا، ولم يمارسوا طعنا وضربا، اختاروا للمعاشرة والمشاورة سوقة من اهل السوق، فغامر اولئك الاغمار في غمور الاتراف والاسراف وغمرات الفسوق.

كانوا في عسر ثم فجّروا، واذ فجّروا فجروا، كانوا ياخذون من الناس بحيلة تزويد الجيوش وتجهيزهم مالا جمّا، ولا يناولون شيئا منه احدا من الجيش فياكلون كل ما ياخذون اكلا لمّا، شغلهم قواد البغايا، عن قيادة البغايا، واقعدهم القعود مع السراري عن السُّرى مع السرايا، والهاهم ملاهيهم في رخاء العيش، فاخّرهم عن مقدمة الجيش، وقلبهم ما في قلوبهم من الفشل والهمّ الخسيس، عن الثبات في قلب الخميس، وشطّهم المشأمة عن الميمنة وعاقهم الميسر والميسرة عن الميسرة، وكفّهم من معهم

سے متنفر تھے۔

انہیں نہ تو میدان کارزار ہی سے کبھی واسطہ پڑا تھا اور نہ کبھی شمشیر زنی اور نیزہ بازی کا ہی موقع ہوا تھا۔ انہوں نے بازاری لوگوں کو اپنا ہم نشین و جلیس بنالیا، اس طرح یہ ناآزمودہ کار، آرام طلبی، اسراف بیجا اور فسق و فجور میں مبتلا ہو گئے۔

وہ تنگدست ہو چکے تھے پھر مالدار ہو گئے جب مالدار ہو گئے تو عیش پرستیوں میں پڑ گئے لوگوں سے لشکروں کے ساز و سامان کے بہانے سے کافی مقدار میں مال جمع کرتے تھے اور اس میں سے ایک حبہ بھی کسی لشکری پر خرچ نہ کرتے تھے جو کچھ وصول کرتے تھے، خود کھا جاتے تھے۔ یہاں تک بھی غنیمت تھا لیکن ان کو تو زنان فاحشہ و تباہ کار نے طلایہ کی قیادت اور کنیزوں کی شب باشی نے لشکروں کے ساتھ رات کو چلنے سے روک دیا اور آلات عیش و طرب نے آرام طلبی میں ڈال کر مقدمۃ الجیش سے بھی پیچھے کر دیا۔ ان کے دلوں میں نامردی اور ذلیل اندیشہ بیٹھ گیا، اسی نے ان کو وسط لشکر میں ثابت قدمی سے روکا، شومیٔ قسمت نے میمنہ سے اور قمار و تونگری نے میسرہ سے باز رکھا، ان کے خوشامدی اور بازاری

من السوقة السوقية عن
الانسياق مع الساقة، وكذلك
من يتولى خطبا جليلا مع
عدم الخلاقة، وحمّل حملا
ثقيلا مع عوز الطاقة، يبيتون
نياما ويظلون سكارى، واذا انتبهوا
وصحوا فهم اغفال حيارى۔

وقد هجمت عليهم
بالجنود النصارى قد عرجوا
وعرّجوا اتجاه المصر على جبل
شاهق، وحصّنوه وحفروا حوله
خنادق، ونصبوا عليه مجانق،
يرمون بها نحو البلد والسُّور
والمساكن والدور بنادق،
كانها شهب وصواعق۔

والجنود المنحرفة اشتات
مختلفة، صاروا طرائق قددا، بعضهم
لا يطيع احدا، والبعض لا يجدون
ملتحدا، منهم من ونت لفقره طاقته، و
اقعدته عن القيام للحرب فاقته
ومنهم من عوقه عن المبارزة
ما نهب ومنهم من هرب وقلبه
رهب، ومنهم من طغى وبغى،

ہم صحبتوں نے ساقہ (پچھلا دستہ) سے بھی
علیحدہ رکھا۔ ایسا ہی ہوا کرتا ہے جب
کسی نا اہل کو کوئی بڑا کام سپرد کیا جاتا
ہے اور کمزور پر بھاری بوجھ لادا جاتا
ہے۔ وہ رات سو کر اور دن بدمست
ہو کر گذارتے، جب بیدار و ہشیار ہوتے
تو غافل وحیران پھرتے۔

نوبت بہ اینجا رسید کہ نصاریٰ کا لشکر
ان پر آکر ٹوٹ پڑا۔ ایک بلند پہاڑی[1] پر چڑھ
کر شہر کا رخ کر دیا، شہر کا محاصرہ کر کے
خندقیں کھود ڈالیں، پہاڑی پہ توپیں
اور منجنیقیں نصب کر کے شہر پناہ او مکانات
پر گولہ باری شروع کر دی۔ ایسا معلوم ہوتا
تھا کہ بجلیاں اور تارے ٹوٹ ٹوٹ کر عمارتوں
پر گر رہے ہیں۔

ہندستانیوں کا بر سر پیکار اور باغی لشکر
مختلف ٹولیوں میں تقسیم تھا، بعض گروہ کا
کوئی جنرل ہی نہ تھا، بعض کو جائے پناہ بھی
میسر نہ تھی، بعض کی طاقت فقر و فاقہ نے سلب
کر کے ہاتھ پاؤں توڑ کر بٹھا دیا تھا، کچھ تھوڑا
سا مال غنیمت ہاتھ لگنے سے بے نیاز ہو گئے
تھے، کچھ ترساں و لرزاں قلب کے ساتھ بھاگ
چھپے تھے، بعض طغیان و سرکشی سے

[1] پہاڑی دھیرج۔

وابتغى له من البغايا ما ابتغى، ومنهم من
يستنكف بلبس لشفوف عن الدخول
في الصفوف، ومنهم من كان يجالد و
يحارب ويجاوب النصارى ويضارب.

والنصارى بعد ما وهنوا و
استكانوا، واستمدوا في الحرب
هنالك الغرب واستعانوا فامدوهم
بكثير من العَدد والعُدد، و
اعانوهم بمدد بعد مدد، في
اقصر المُدد، فجمع النصارى
على ذلك الجبل للحرب العوان،
كثيرا من الجنود والاعوان، فمن جنودهم
اشياعهم البيضان، ومنهم اجرائهم من ارذل الهنادك
الخفتان والمسلمين الذين ارتدوا بولاء النصارى بعد
الايمان وباعوا دينهم بثمن بخس من الاثمان.

وقد استلف بالنصارى من سُكّان
البلد الوف آلافا، فالهنادك كلهم
معهم واما المسلمون فقد اختلفوا اختلافا
فبعضهم للنصارى قالون، وبعضهم لهم
موالون في حبهم غالون، يكيدون لكسر
الجنود المنهزمة بالحيل والمكائد جدا، ويجهدون
في فل شوكة المجاهدين وقلعهم
وقمعهم

بدکار عورتوں پر قبضہ جما بیٹھے، بعض نے میدانِ جہاد
کے تنگ و سخت فوجی کپڑے پہن کر صفوفِ جنگ
میں داخل ہونے کو بُرا جانا، صرف ایک گروہ نصاریٰ
کا جواب دیتے ہوئے بہادری سے لڑتا رہا۔

نصاریٰ جب لڑتے لڑتے تھک گئے اور
پست ہو گئے تو غربی ہندوؤں سے مدد و معاونت
کے طالب ہوئے۔ ہندوؤں نے کثیر لشکر اور سازو
سامانِ حرب سے تھوڑی سی مدت میں پے در پے
مدد کی، تب تو نصاریٰ نے سخت لڑائی ٹھان لی
اور اس پہاڑی پر بہت سا لشکر اور مددگار و معاون
جمع کر لیے۔ ان کے لشکریوں میں گورے منہ کے
گروہ بھی تھے اور ذلیل ترین ہندو اجیر بھی اور وہ
بدبخت و بدکیش مسلمان بھی جو ایمان کے بعد نصاریٰ
کی محبت میں مرتد ہو کر اپنے دین کو چند ٹکوں کے
بالعوض بیچ چکے تھے۔

ہزاروں شہری بھی نصاریٰ کی محبت کا دم
بھرنے لگے اور تمام ہندو ان کے ساتھی ہو گئے
مسلمانوں میں دو گروہ بن گئے، ایک گروہ تو
ان (انگریزوں) کا جانی دشمن تھا، دوسرا گروہ
ان کی محبت میں اس درجہ غلو رکھتا تھا کہ اس
نے ہندوستانی لشکر کی بربادی، مجاہدین کی
شوکت و وقار کی خواری اور ان کے قلع و قمع
کرنے میں مکر و حیلہ سے کوئی کسر اٹھا رکھی

وتبديد شملهم وتفريق جمعهم ولايالون في هذا كله جهدا.

فطفق النصارىٰ يحملون على البلد وابوابه ويسطون على درابنته وحجّابه، والمجاهدون الشهود، وفريق من الجنود، يعوّقونهم عن البلد ويصاولون، ويحولون بينهم وبين مايحاولون، يتجالد الفريقان ليلاً ونهاراً، ركباناً ورجالاً، وكانت الحرب بينهما اربعة اشهر سجالاً، ولم يجد العدى في تلك المدة مع غاية الشدة وكثرة العِدّ، والعُدّ الى دخول البلد سبيلاً ومجالاً، بل كلما هجموا صُدّوا، ومهما اقدموا رُدّوا، كان المجاهدون الغزاة الحماة الكماة يدافعونهم اشد دفاع، و يقارعونهم اسدّ قراع، يثبتون عند الالتحام الاقدام، ويتقدمون على كل مقدام، لدى الاقدام، فذاق كثير منهم شُهد الشهادة، وسعدوا وصعدوا معارج السعادة،

" وللذين احسنوا الحسنىٰ وزيادة "

تھی، ان کے اندر افتراق وانشقاق پھیلانا ان کا دلچسپ مشغلہ تھا

پھر تو نصاریٰ شہر اور اس کے پھاٹکوں، دربانوں اور محافظوں پر حملہ کرنے لگے! ادھر جماعتِ مجاہدین اور لشکریوں کے ایک بہادر گروہ نے ان کے حملوں کو روکنا اور ان کے مقاصد میں حائل ہونا اپنے لئے اہم ترین فرض قرار دیا۔ دن رات پیدل اور سوار دادِ شجاعت دینے لگے۔

چار مہینے[1] تک متواتر جنگ ہوتی رہی، دشمن اس مدت میں کثیر لاؤ لشکر اور ساز وسامان کے باوجود شہر میں داخل نہ ہو سکا۔

جب بھی حملہ کرتے تھے روکے جاتے تھے، جس وقت اقدام کرتے تھے لوٹائے جاتے تھے، بہادر اور نگہبان غازی بڑے زور شور سے یلغار کو روک رہے تھے، مدافعت و مبارزت میں خوب خوب جوہر دکھا رہے تھے، مقابلے میں ثابت قدم تھے اور ہر پیشقدمی کرنے والے پر آگے بڑھ کر حملہ آور تھے۔ ان میں سے بہت سے جامِ شہادت پی کر سعادت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوئے۔

نیکو کاروں کے لئے بہشت، حوریں اور اس سے بڑھ چڑھ کر بھی نعمتیں ہیں۔

---

[1] مئی ۱۸۸۵ء سے ستمبر ۱۸۸۵ء تک

وما بقي من المجاهدين الاقلين يبيتون جياعا، ويصبحون الى الغزو سراعا، فيقارعون العدو قراعا، فكانوا مع جمع من الجيش يحفظون السور، ويسدون الثغور، حتى اُقعدت ليلة ثلةٌ من الجيش قد تعوّدوا بالدعة و الكسل، وجبلوا على الجبن والفشل، في مرصد محاذ للجبل، فوضعوا اسلحتهم وباتوا نياما، فبيّتهم العدوُّ واخذوا اسلحتهم واخترموهم اخترما، وانامو اولئك النيام فما استطاعوا قياما۔

فلما استولى النصارى على ذلك المرصد ودخلوا فيه نصبوا مجانق كثيرة لهدّ سور بليه، وهدم برج كان في حواليه، و فتح باب يحاذيه، وامطروا بنادق ثقالا كبارا، في كل آن ليلا ونهارا، فحدث الفطور والكسور، في حائط السور، وبدا الفروج في الجدر والبروج، وتضعضع اللبات، وتقطع الاسباب، وارتفع الحجاب، ولم يستطع احد من الجيوش هنالك قياما وقعودا، ولا اطلوعا على ذلك السور وصعودا، فكل من طلع رُمي ببندق، وتردّى في خندق۔

اب مجاہدین کی ایک مختصر جماعت باقی رہ گئی جو بھوک پیاس برداشت کرکے رات گذارتی اور صبح ہوتے ہی دشمن کے مقابلہ پر ڈٹ کر نبرد آزما ہوتی۔ لشکریوں کی ایک جماعت کے ساتھ مل کر یہی شہر پناہ کی حفاظت اور شہری سرحدات کی نگہداشت کرتی۔ بدقسمتی سے ایک شب کو پہاڑی کی محاذی کمین گاہ پر ایک عیش پرست، بزدل اور کسل مند جماعت مقرر کی گئی وہ اپنے ہتھیار اتار کر آرام کی نیند سو گئی، دشمن نے موقعہ غنیمت سمجھ کر شبخون مارا اور ہتھیاروں پر قبضہ کرکے اسے قیامت تک کے لئے سلا دیا۔

جب نصاریٰ نے اس کمین گاہ پر قبضہ کرلیا تو بہت سی توپیں اور منجنیقیں نزدیک ترین شہر پناہ اور قریب ترین برج پران کے گرانے اور محاذی پھاٹک کھولنے کے لئے لگا دیں اور دن رات گولوں اور بندوقوں سے گولیوں کا مینہ برسانا شروع کردیا جس سے شہر پناہ کی دیوار اور برجوں میں شگاف پڑ گئے، پھاٹک گر پڑا اور امیدوں کے رشتے ہاتھ سے چھوٹ گئے، حائل پردہ درمیان سے اٹھ گیا، کوئی لشکری اٹھنے بیٹھنے کی وہاں قدرت نہ رکھتا تھا نہ دیوار پر چڑھ کر جھانک سکتا تھا، جو جھانکتا تھا گولی کا نشانہ بن کر خندق میں جا پڑتا تھا۔

وبعد ذٰلك خادع النصارٰی واحتالوا، و وجّهوا فریقا من جنودهم تلقاء باب آخر لیخیل انهم علٰی ذٰلک الباب الآخر صالوا، فاشتغل الغزاة و فریق من الجیش بقراعهم و دفاعهم، وغفلوا عن کید النصارٰی و خداعهم فدخل البلد فریق من النصارٰی وجنودهم من باب وهنوه وسور هدموه، و برج هدّوه، ولم یجد واهنالک مزاحما ومقاوما و لا مدافعا وممانعا، ولا معاوقا ومنازعا، فجاسوا خلال الدیار، دیار الذین کانوا من قبلُ انصار الانصار، وضربوا علیهم قبابهم من الدوبسوب، وعجّلوا لهم ما اتخذوا لهم من القِریٰ والسور، واشبعوهم باللحوم والالبان، وقضوا ما کان لهم من الاوطار والکُبان۔ وفتحوا روازن فی الجدران والحیطان، وغلّقوا الابواب، لیتمکنوا من رمی البندق و یحترسوا ممن ینحو نحوهم للحراب، فکلما برز لهم احد من الجیش او اهل البلد رموہ ببندق یصرعه قتیلا ولا یجد المبارز الی ضربهم سبیلا۔

اب نصارٰی نے یہ چال چلی کہ ایک لشکر دوسرے دروازے کی طرف روانہ کیا تاکہ دوسری طرف سے حملہ محسوس کیا جائے۔ یہ دیکھ کر مجاہدین اور لشکریوں کا گروہ ادھر متوجہ ہوگیا اور دشمن کا مکر نہ سمجھتے ہوئے وہاں مدافعت میں مشغول ہوگیا۔ یہ موقعہ پاکر نصارٰی اور ان کا لشکر اسی گرے ہوئے پھاٹک، ٹوٹی ہوئی دیوار، اور منہدم برج سے داخلِ شہر ہوگئے، وہاں انہیں کوئی مزاحم و مدافع نہیں ملا۔

پس وہ تلاش کرکے ان لوگوں کے گھروں میں پہنچ گئے جو پہلے ہی سے ان کے معاون و مددگار بن چکے تھے۔ انہوں نے فوراً ان کی حفاظت کا گھروں میں انتظام کیا اور جلد جلد پہلے سے تیار شدہ ضیافت سے نوازا۔ انہیں خوب پیٹ بھر کر گوشت اور دودھ کھلایا پلایا اور تمام ضرورت کی چیزیں مہیا کیں۔

مکانوں کے دروازے بند کرکے دیواروں میں روزن کردیئے تاکہ جو باغی ادھر آنکلے اس پر گولی چلاکر اپنی حفاظت کرسکیں چنانچہ جو لشکری یا شہری ادھر آنکلتا یہ بندوق چلاکر مار ڈالتے، اور مقابل کا ان پر کوئی قابو نہ چلتا تھا۔

وكانوا ينتهزون فرصة للخروج الى دور أُخَر، ليتخذوها كدور اوليائهم مبيتا ومقيلا، لكنهم كلّما برزوا ملعونين اينما ثُقفوا اُخذوا وقُتِّلوا تقتيلا، فكانوا لا يبرزون حيث يستشعرون مقاتلا ومقابلا الا قليلا، ومع ذلك كان يأتيهم من الجبل مدد متوالٍ يؤديه كل هندكيّ للنصارى موال.

ثم انه لم يبق فى البلد من وال، ولا وال، اذ خرج الملك مع من له من آل وعيال، الى مقبرة هى من البلد ثلثة اميال، وكان مطيعا الزوجة وعاملة الخوّان، مغترّا بما كان يختلق من الكذب والبهتان، ويسوّل له انّ النصارى بعد تسلطهم يتبعونه باحسان، ويمكّنونه فى الملك بابّهة وسلطان، فكان مغرورًا مسرورا بما يمنّيه ويَعِده الشيطان، وخرج مع الملك من له من الامراء والأُجراء مستصحبين اهاليهم وعيالهم تاركين فى دورهم وبيوتهم اللاتى خلوها امتعتهم واموالهم

وہ فرصت کے منتظر رہتے تھے کہ موقعہ پاکر اپنے دوستوں کے گھروں کی طرح دوسرے گھروں میں بھی پہنچکر انہیں شب و روز کی آرام گاہ بنائیں لیکن وہ لعنتی جب بھی نکلتے پکڑکر قتل کر دیتے جاتے۔ اس لئے جہاں انہیں مقابلہ کا اندیشہ ہوتا وہاں بہت کم نکلتے، اس کے باوجود انہیں پہاڑی سے مسلسل مدد پہنچ رہی تھی اور ہر عیسائی دوست ہندوان کی مدد میں پیش پیش تھا۔

بڑی مصیبت یہ آپڑی تھی کہ شہر میں نہ کوئی جائے پناہ رہی تھی اور نہ حاکم ہی باقی تھا کیونکہ حاکم (بادشاہ) اپنے اہل وعیال کو لیکر شہر سے تین میل دور مقبرہ[1] میں جاچکا تھا وہ دراصل اپنی بیگم اور خائن وزیر کا مطیع تھا، جس نے کذب وبہتان سے کام لیکر دھوکے میں ڈال رکھا تھا۔ اس نے یہ کہکر بادشاہ کو پھسلایا تھا کہ نصاریٰ قابض ہونے کے بعد اس کے ساتھ اچھا سلوک کریں گے اور اسی کو بزرگی و سرداری بخش دیں گے وہ فریب خوردہ ان شیطانی وعدوں اور ابلیسی آرزؤں پہ خوش تھا، بادشاہ کے ساتھ اس کے تمام امراء و متعلقین بھی اپنے اہل وعیال کو لیکر، گھروں میں مال ومتاع

[1] مقبرہ ہمایوں

وبخروجهم من البلد استولى الرعب على كثير من سكانه، فخرج كل من اولاء من مكانه۔

فلما خلت الديار من اهليها دخلت النصارىٰ وجنودهم فيها فمالوا على ما وجدوا فيها من الموجد والمال، واغتالوا من بقى فى دار من النسوان والاطفال؛ والضعفاء من الرجال، فلم يبق من اهل البلد لمجادلتهم ومجالدتهم احد من اهل الجلد۔

واما الجيوش المنحرفة فمنهم من فرّ قبل اتيان النصارىٰ فرارا، ومنهم من لم يستطع بعده ثباتا و قرارا، ومنهم من قاتلهم فى البلد مرارا، فدبر البدّالون، وهنالك آخرون، هم للنصارىٰ موالون، وعمل الملك الاولىٰ هم للمقاتلين قالون، تدبيرا، يتبّرهم تتبيرا، فقتّروا عليهم الاقوات تقتيرا، فواروا ما كان فى البلد من الحبوب والغلات وسدّوا ما كان يجبى ويجلب اليهم من القرى والقصبات حتى ظلوا وباتوا جياعا، والتاحوا التياحا، والتاعوا التياعا

ان سب کے شہر چھوڑ کر چلے جانے سے شہریوں پر سراسیمگی و رعب طاری ہو جانا قدرتی امر تھا مرعوب و متائژ لوگ بھی مکان چھوڑ بھاگے۔

جب شہر کے مکان مکینوں سے خالی ہو گئے تو نصاریٰ اور ان کا لشکر ان میں داخل ہو گیا۔ انہوں نے مال و متاع لوٹنا، باقیماندہ ضعیفوں، بچوں اور عورتوں کو قتل کرنا شروع کیا۔ بہادرانِ شہر میں سے ایک بھی ایسا نہ بچا تھا جو ان کا کسی اعتبار سے مقابلہ کر سکتا۔

باغی لشکروں میں سے بعض تو نصاریٰ کے قبضہ سے پہلے ہی بھاگ گئے، بعض قبضہ کے بعد ثابت قدم نہ رہ سکے، بعض کئی بار شہر میں مصروفِ کارزار رہ کر بے دم ہو چکے تھے، اب بنیوں اور دوسرے ہندوؤں نے جو نصاریٰ کے دوست تھے اور بادشاہ کے ان کارپردازوں[1] نے جو مجاہد گروہ کے دشمن تھے، ایسی تدبیر سوچی جس سے شہریوں اور لشکریوں کو ہلاک کر سکیں، انہوں نے وہ سب غلہ جو بنیوں کے پاس تھا چھپا دیا اور دیہات و قصبات سے جو ان کے پاس اناج آتا رہتا تھا وہ روک دیا، یہ تدبیر کارگر ہوئی لشکری اور شہری بھوک، پیاس، سوزش

[1] مرزا الٰہی بخش وغیرہ

فاضطروا اشد اضطرار، وفرّوا اشنع فرار، فاستولی النصاریٰ علی البلد وابوابه وسوره، وقلعته واسواقه وابیاته ودوره۔

واذ کان فی دهلی، کثیر من عیالی واهلی، ومع ذٰلك کنت مدعوا، وکان الافلاح والافلاح مرجوًا، والفرج والفرح مظنونا، وما قدّر فی الغیب مکتوبا مکنونا، توجهت تلقاء دهلی، مسا کان محلّی، فالقیتُ بها رحلی، ولاقیت بها اهلی، واشرت الی الناس بما اقتضی رأیی وقضی به عقلی، فلم یأتمروا بما اشرت، ولم یأتمروا بما امرت۔

فلما استولی النصاریٰ علی البلد، ولم یبق فیه من الجیوش ومن سکّانه احد، وعازت فیه الاقوات، ولم یتیسّر لنا الماء الفراتُ، اذ قد استبد به العُداة، مکثت فیه خمسة ایام ولیالی، ثم خرجت مع اهلی وعیالی، بعد ترك مالی، من کتبی ونشبی ومالی، لعوز ما یکفی لنقل احمالی واخذت للنجاء سبیلا، متوکلا علی الله وکفٰی بالله وکیلا

والنصاریٰ بعد استیلائهم علی البلد وسواده، بسواد بیضانهم

اور بے چینی سے دن رات گذارنے لگے بالآخر مجبور و پریشان ہو کر بھاگ چھوٹے، پھر تو نصاریٰ نے شہر کے پھاٹک، شہر پناہ، قلعہ، بازار اور مکانوں پر مکمل قبضہ جما لیا۔

اس وقت دہلی میں میرے اکثر اہل[1] و عیال موجود تھے اور مجھے بلایا بھی گیا تھا، ساتھ ہی فلاح و کامیابی، کشائش و شادمانی کی امید بھی تھی، جو کچھ ہونے والا تھا وہ تو پہلے ہی مقدر ہو چکا تھا میں نے دہلی کا رخ کر دیا۔ وہاں پہنچکر اہل و عیال سے ملا، اپنی عقل اور فہم کے مطابق لوگوں کو اپنی رائے اور مشورہ سے آگاہ کیا لیکن نہ انہوں نے میرا مشورہ قبول کیا اور نہ میری بات مانی۔

جب نصاریٰ کا شہر پر اچھی طرح قبضہ ہو گیا اور کوئی لشکری و شہری باقی نہ رہا، غلّہ اور پانی دشمنوں کے ظلم و استبداد کی وجہ سے ناپید ہو گیا تو پانچ شبانہ روز اسی حالت میں گذار کر اپنی عزیز ترین متاع کتابیں، مال و اسباب چھوڑ کر (بار برداری کا انتظام نہ ہو سکنے کی وجہ سے) خدا پر بھروسہ کر کے اہل و عیال کو ساتھ لے کر نکل کھڑا ہوا۔

شہر اور اس کے مال و دولت پر سفید رُو لشکریوں کے ذریعہ قابض ہو کر نصاریٰ کی

---

[1] مولوی شمس الحق اور ان کی والدہ وغیرہ۔

عمدوا الی اخذ الملك واولاده واحفاده،

وهم لم يبرحوا مستقرهم والقضاء مكّنهم فی ذلك المكان واقرهم، وهم مستوثقون بمن غرّهم، باكاذيبه ومكرهم، وكان فی تلك المقبرة مغرورا مسرورا، محشودا محفودا، فاضحی ماسورا، محسورا مكمودا مصفودا، واخذوا من معه من الابناء والاحفاد، مقرنين فی الاصفاد، وذهبوا به الی البلد، مع معه من الاهل والولد، فاغتال احد من عظمائهم هو طرخان[1] او بطريق، ابناءه و احفاده بالبندق فی اثناء الطريق، واهدوا رؤسهم مقطوعة، الی رئيسهم فی خوان موضوعة، وتركوا جثثهم منبوذة، ثم نبذوا تلك الرؤس مجذوذة.

وحبسوه فی بيت من سمّ الخياط اضيق، فی حرس ابيض اسود الكبد اصهب الشعر ازرق، ثم نفوه من ممالك واسعة الی بعض جزائر شاسعة، مع زوجته التی كانت لهم

تمام تر توجہ، بادشاہ اور اس کے بیٹوں اور پوتوں کے پکڑنے کی طرف مبذول ہوئی۔

ان سب نے اب تک اپنا مستقر (مقبرہ) نہ چھوڑا تھا، تقدیرِ الٰہی نے وہیں برقرار رکھا تھا۔ انہیں اپنے جھوٹے اور مکّار وزیر کی کذب بیانی پر اعتماد تھا۔ وہ اس مقبرہ میں بڑے خوش اور مگن تھے، مخدوم بنے ہوئے دن گذار رہے تھے۔

اس فریب خوردگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ حسرت کشیدہ، دل تپیدہ، بیٹوں اور پوتوں کے ساتھ پابزنجیر شہر کی طرف لیجایا گیا۔ راستے میں بیٹوں اور پوتوں کو کسی سردار[1] نے بندوق کا نشانہ بنایا، دھڑ وہیں پھینک کر سروں کو خوان میں لگا کر بادشاہ کے سامنے تحفۃً پیش کیا پھر ان سروں کو بھی کچل کر پھینک دیا۔

بادشاہ کو گورے منہ، سیاہ دل گندمی بال اور کنجی آنکھ والوں کی حراست میں سوئی کے سوراخ سے بھی تنگ کوٹھڑی میں مقید کر دیا۔ پھر اس وسیع ملک سے نکال کر دور دراز جزیرہ[2] میں بھیجا دیا۔

بادشاہ کے ساتھ اس بیگم کو بھی روانہ کیا گیا

---

[1] طرخان اس پیشوا کو کہتے ہیں جس کے تحت پانچ ہزار آدمی ہوں، اور بطریق وہ ہوتا ہے جس کے ماتحت دس ہزار ہوں۔

[1] مسٹر ہڈسن نے مرزا مغل اور خضر سلطان وغیرہما کو گولی کا نشانہ بنایا تھا۔

[2] رنگون۔

وكانت لهم موالية ، اذ كانت في الحقيقة ملكة والية ، وقد خابت في ما طمعت ، و سلبت اموالا قد جمعت ، وقد شينت بعد ما كانت زينت ، وابتذلت بعد ما صينت ، وقتلوا من وجد وا من قومه بالضرب والخنق كما خنقوا وقتلوا ممن عداهم كثيرا من الخلق ، و لم ينج من هؤلاء الضعفاء الا من فر مستخفيا ، متواريا بالليل ساريا ، او من جد مسرعا هاربا ، بالنهار ساربا ، وقليل ما هم .

ثم النصارى قتلوا من كان في نواحي المصر وتلك الارجاء من الاراكين والرؤساء ، وغصبوا ارضهم وعقارهم ومساكنهم وديارهم ، وامتعتهم واموالهم واسلحتهم واثقالهم ، وافراسهم وافيالهم ، وجمالهم وحمالهم فاهلكوهم واهاليهم وعيالهم جمعاء ، مع انهم كانوا رعايا لهم وتبعا يطيعونهم خوفا و طمعا ، ثم انهم حشروا جنودهم لكل سبيل ، ليأخذوا من فر بالاخذ الوبيل ، فاخذوا كثيرا من الهاربين و ما نجا منهم

جو نصارےٰ کی اس وقت بھی مطیع و دوست تھی جبکہ وہ حقیقت میں ملکہ تھی ۔ وہ اپنی آرزو کی (بیٹے کو جانشین بنانے) میں ناکام رہی، اس کا جمع کردہ مال بھی چھین لیا گیا ۔ وہ زینت[1] بننے کے بعد بدصورت اور حفاظت کے بعد بدہیئت بنی ۔ بادشاہ کی قوم میں سے جو بھی ملتا اس کی گردن ماردی جاتی یا پھانسی دی جاتی جیسا کہ دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی عمل کیا گیا ان کمزوروں میں سے وہی بچ سکا جو رات میں چھپ کر یا دن میں نظریں بچاکر تیزی سے بھاگ گیا ، اور ایسے خوش نصیب بہت کم تھے ۔

پھر نصارےٰ نے شہر کے گرد و نواح کے رئیسوں اور سرداروں کو قتل کرنا ، ان کی جائداد ، عمارتیں ، مویشی ، مال و متاع ، ہاتھی ، گھوڑے ، اونٹ اور ہتھیاروں وغیرہ کو لوٹنا شروع کیا ۔

اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ ان کے اہل و عیال کو بھی قتل کر ڈالا حالانکہ یہ سب رعایا بن چکے تھے اور ڈر یا لالچ سے فرمانبردار بن ہی جاتے انہوں نے تمام راستوں پر چوکیاں بٹھادیں تاکہ بھاگنے والوں کو پکڑ پکڑ کر لایا جائے ہزاروں بھاگنے والوں میں تھوڑے

---

[1] زینت محل اس ملکہ کا نام تھا ۔

الا قليل، فنهبوا اولا ما كان مع الماخوذين من النقدين؛ الذهب واللُّجين، بل الجلابيبُ السرابيل؛ والمآزر والسراويل، ثم بلّغوهم عظمائهم فقضوا عليهم بالخنق والتقتيل، ولم يذر الفتك شبّانا ولا ضعافا، ولا اشرافا ولا اجلافا، فبلغ القتلى والخنقى الافا، وجُل من ابتلى بظلم الظلّام اهل الايمان والاسلام، واما الاهانند فقد سلموا الا من ظنّ به انه ممن يعاند، ولم يسلم من المسلمين الا من خرج من بيته مهاجرا، او من كان للنصارىٰ ناصرا، وفي دينه قاصرا، او من كان لهم جاسوسا، ومن رحمة الرحمٰن الرحيم يئوسا، كعامل الملك الذى يتولاهم، بل سلّطهم وولّاهم، لكنه تعنّىٰ، اذ حرم ما تمنّىٰ، وبقى حسران، فى الخُسران، قد حال حاله وبطل محاله، ولبث كانه رهين مهين، فى ذل معين؛ خسر الدنيا والأخرة ذلك هو الخُسران المبين۔

ہی بچ پائے، باقی سب پکڑے گئے۔ ان لوگوں کے پاس جو کچھ چاندی سونا نکلتا پہلے تو وہ چھین لیتے، پھر چادر، تہبند، قمیص، پاجامہ جو کچھ ہاتھ لگتا نہ چھوڑتے۔ اس کے بعد افسروں کے پاس پہنچا دیتے، وہ ان کے لئے قتل یا پھانسی کی سزا کا فیصلہ کرتے۔ جوان، بوڑھا، شریف، اور رذیل سب کے ساتھ یہی سلوک ہوتا۔ اس طرح پھانسی پانے والوں اور قتل ہونیوالوں کی تعداد ہزارہا تک پہنچ گئی۔ ظالموں کے ظلم کا شکار اکثر و بیشتر مسلمان تھے۔ ہندوں میں سے صرف وہ مارے گئے جن کے متعلق دشمن و معاند ہونے کا یقین تھا، اور مسلمانوں میں سے فقط وہ بچ سکے جو کسی نہ کسی طرح وہاں سے ہجرت کر گئے تھے یا وہ جو نصاریٰ کے ناصر اور اپنے دین و مذہب میں قاصر تھے، یا وہ جوان کے جاسوس اور اللہ کی رحمت سے مایوس تھے انھیں میں سے بادشاہ کا وہ عامل[1] بھی تھا جس نے نصاریٰ کو مسلط کر کے حاکم بنایا تھا لیکن اسے امیدوں کی محرومی اور ناکامی کی حسرت کا غم اٹھانا پڑا، اس کا حال متغیر ہو گیا، زمانے میں ذلیل و خوار ہو کر جیا، دنیا اور آخرت دونوں جگہ نقصان میں رہا اور یہی کھلا ہوا نقصان ہے۔

---

[1] حکیم احسن اللہ خاں۔

ثم النصارىٰ ارسلوا الیٰ رؤساء الهنادك الذين هم يملكون من الاراضى اقطاعا، وكانوا لهم اتباعا، ليأخذوا من دخل ديارهم فاناء اووجد فى ارضهم مارًّا، فاخذ هؤلاء جمعا كثيرا، من الغرباء وأسروهم واكسروهم اسارىٰ، الیٰ عظماء النصارىٰ فقتلوهم جميعا، ولم يذروا رفيعا، ولا وضيعا.

ثم حشروا ونشروا اشياعهم وأتباعهم فى اقطار الملك، واجدّوا فى فى اخذ الناس وابتلائهم بالردىٰ والهُلك، واذخرجت الخواتين والمحصنات من النساء فى هذه الداهية الدهياء، وعجزن وفيهن عجائز وعجازى عن الفرار للاعياء، فمنهن من هلكت من غلبة الفرَق ومنهن من اهلكت نفسها بالغرق، صونا لعرضها وحرمتها، وحفظا لعفّتها وعصمتها واكثرهن صرن سبايا، وابتُلين برزايا، واصبن ببلايا، فمنهن من استرقّها بعض الخمّان، ومنهن من بيعت ببخس الاثمان، وكثير منهن هلكن عطشا وجوعا، وكثير منهن غبن ولم يستطعن رجوعا، ولم يُرلهن

ادھر نصاریٰ نے ماتحت ہندو رؤساء کے پاس پیغام بھیجا کہ جو شخص بھی تمہارے علاقے میں سے گذرے اسے پکڑ لیا جاتے، ان بداطواروں نے کافی تعداد میں مسافروں اور مہاجروں کو پکڑ کر نصرانی سرداروں کے پاس پہنچا دیا۔ ان ظالموں نے سب کو مار ڈالا، نہ کوئی عالی خاندان فرد بچ سکا نہ کسی ادنیٰ انسان کو چھٹکارا نصیب ہوا۔

پھر اطراف واکنافِ ملک میں لشکر بھیجے جنھوں نے قتل وغارت گری کی انتہا کر دی۔

اس ابتلاءِ عظیم میں پردہ نشین خواتین پیدل نکل کھڑی ہوئیں، ان میں بوڑھی اور عمر رسیدہ بھی تھیں جو تھک کر عاجز ہو گئیں بہت سی خوف کی وجہ سے جان دے بیٹھیں۔ اور بیچاریوں عفت وعصمت کی بنا پر ڈوب کر مر گئیں، اکثر پکڑ کر قیدی بنالی گئیں اور طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا ہو گئیں، کچھ کو بعض رذیلوں نے لونڈیاں بنا لیا اور بعض چند ٹکوں کے بالعوض بیچ ڈالی گئیں، بہت سی بھوک پیاس کی تاب نہ لا کر مر گئیں، بہت سی ایسی غائب ہوئیں کہ پھر نہ تو لوٹ کر ہی آئیں

ن، ولم يُسمع عنهن خبر، وجُل
نساء اثنتين من الاولياء، والبعولة
والآباء، والاخوة والابناء، اذكان
كل يوم من هذا الزمن
الكريه، يوم يفرّ المرء من
اخيه، وامه وابيه، وصاحبته
وبنيه، وفصيلت التى تؤويه،
فكم من نسوة امسين اياميٰ وولد
اصبحوا يتاميٰ، وكم من ثكلى
تبكى وتنوح، وكم من ثكلان
تعبر عبراته عن حزنه ويسره
يبوح، وقد صار البلد قاعا
صفصفا وقفرا سبسبا، و
اهلوه تفرقوا وتمزّقوا
وذهبوا ايدى سبا۔

ثم توجهت النصاريٰ الیٰ جانب
الشرق وما فيه من القرى والبلاد، فاكثروا فيها
الفساد، وعمّوا فيها القتل بالضرب والخنق بين العباد
فحصدت الاٰجال كثيرا من الرجال وربات الحجال واخترمت
المنايا جمًا غفيرا من البرايا، واُصيب
بالمنا والحتوف مئات والوف
من الرعايا۔

واما انا فقد كنت انحُو

نہ ان کا کچھ پتہ ہی چل سکا۔

ہزاروں عورتیں اپنے سرپرستوں
شوہروں، باپوں، بیٹوں، اور بھائیوں سے
جدا کر دی گئیں جب کہ وہ ایسی مصیبت
کا زمانہ تھا جو قیامت کا منظر پیش کر رہا
تھا کہ اس دن انسان اپنے بھائی، ماں،
باپ، بیوی، اولاد اور اہلِ خاندان سے
بھاگتا نظر آئے گا۔ بہت سی صبح کی سہاگن
عورتیں شام کو بیوہ بن گئیں اور شب کو آغوشِ
پدر میں سونے والے بچے صبح کو یتیم ہو کر
اٹھے، کتنی ہی عورتیں اپنی اولاد وغیرہ کے
غم میں گریہ و زاری کرتی تھیں اور کتنے مردوں
کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا جاری تھا،
شہر چٹیل میدان اور بے آب و گیاہ جنگل بن گیا تھا
اور شہری تباہ و برباد و منتشر ہو گئے تھے۔

اس کے بعد نصاریٰ کی توجہ مشرقی
شہروں اور دیہات کی طرف مبذول ہوئی
وہاں بھی بڑا فساد مچایا، قتل، غارتگری اور
پھانسی کا بازار گرم کر دیا، بے شمار مرد اور
پردہ نشین مستورات موت کے گھاٹ
اتر گئے۔ اور سینکڑوں، ہزاروں عایا کے
آدمی مار ڈالے گئے۔

میرا کیا پوچھنا، میں اپنے وطن مالوف

نحو ناحية الوطن المالوف والسبيلُ
مخوف، وعابره موَّف، وبيني وبين وطني
اقطار، فيها مخاوف و اخطار، و
النصارى وجنودهم متجسّسون،
ومن المارّة متحسسون، وقد
امروا الزطّ وقبيلهم وفريقهم، بان
يقتلوا المارّة ويرهبوهم، وينهبوهم
ويقطعوا سبيلهم وطريقهم
ولم يخلّوا سبيلاً لعابر، ولم يذروا
فُلكا في فَلَكٍ في معبر من المعابر، اخذوا
السفائن وخرقوها، بل حرّقوها
اوعابوها و اغرقوها، وحجروا
على الملّاحين، لئلا يتيسّر العبور
للسيّاحين والسبّاحين في وقت وحين،
فقد نجّاني ومن معي مالك الملك من
كل بلية وهلك، وجاوز بي وبهم بحارا و
انهارا بلا جسر وفُلك، وحفظنا جميعا
من آفات تلك المسافات، ومهالك تلك
المسالك، وطوارق تلك الطرائق، وقوارع
تلك الشوارع، وبلغنا بوقاية الكافية، وحماية
الوافية، ونعمته الصافية، و
رحمته العافية. وطني وسكني و
داري، و وجاري واهلي وجاري؛

(خیرآباد) کی طرف چلا جا رہا تھا، راستہ خوفناک
اور رہگذار اندوہناک تھا میرے اور وطن
کے درمیان کئی خوف وخطرہ سے بھری
ہوئی منزلیں تھیں، نصاریٰ اور ان کا لشکر
دن رات تلاش وتجسس میں سرگرداں رہتا۔
جاٹوں کو مسافروں کے مار ڈالنے، ڈرانے،
لوٹنے ڈاکہ ڈالنے کی کھلی چھٹی دے دی گئی
تھی۔

انہوں نے سارے ناکے بند کر رکھے
تھے اور کسی گھاٹ پر کوئی کشتی یا ناؤ تک
نہ چھوڑی تھی، کشتیوں کو پھاڑ ڈالتے بلکہ
خراب کر کے غرق کر دیتے یا جلا ڈالتے۔
ملاحوں کو روک دیا تھا تا کہ کوئی سیّاح
یا مسافر کسی وقت بھی ادھر سے نہ گذر سکے۔
خدائے مالک الملک نے مجھے اور میرے
متعلقین کو ہر مصیبت وہلاکت سے محفوظ رکھ
کر پُل اور کشتی کی مدد کے بغیر دریاؤں اور
نہروں کو عبور کرا کے نجات دی اور ہم سب
کو آفاتِ مسافات، مہالکِ مسالک، حوادث
راہ، اور مصائبِ گذرگاہ سے مصئون و مامون
رکھا اور اپنی پوری حفاظت، کامل حمایت،
مکمل نعمت اور بیشمار رحمت کے ساتھ ہمیں
اپنے جوار و دیار اور احباب و رشتہ دار تک

فقد منّنا من المخافات علينا فى تلك المسافات، ومن
بالمعافاة من جميع الآفات، فحمدنا الله المالك، حمدا
كثيرا على ذلك، وقد كان جمع ممن انحرفوا عن
النصارى وكانوا فى ديارنا من الجيوش والفيالق،
امّروا بعد انحرافهم امرأة من نساء والينا المعزول
السابق، وابنا لها الحريث غرع ولم يراهق،
وقد كان النصارى اخذوا ذلك الملك
من والينا وكان واهيا، بالملاهى لاهيا، عن
الملك لاهيا، ولم يك حازما ولا داهيا،
بنقض العهود والمواثق، فخلا لها الملك
بعد ما بطل عمل النصارى وهو زاهق،
وابنها صغير غرير غرىّ ذو غرين، لاهٍ مع
لداته لاهٍ عن عداته، لا يستطيع ان يدبّر
ويدبر فى امور الملك وتجويزها، وامضاء
الاوامر وتنجيزها، وقيادة الجيوش و
تجهيزها، واعيان عملته، واركان
دولته جلّهم فسل فشل جبناء حمقى
خوان لا عقلاء ولا امناء، جلّهم دون،
وبعضهم عبدون۔

فمنهم سفيه رفيه، ورقيع رفيع، و
واهٍ واهن، ومُدهن داهن مداهن وهجين
عجين، ونذل مذل، وحائر بائر، وجابر
جائر، ومختان مختال، وخادع مُحتال، ومنهم عبد عين، ومنهم

پہنچایا۔ ہم خدا کی اس بے پناہ عنایت اور
تمام آفات سے حفاظت پر اس کا شکر بجا لائے۔

نصاریٰ کے باغی گروہوں اور ہمارے
نواح کے متعدد لشکروں نے اپنے سابق معزول
والی[1] کی ایک بیگم[2] اور اس کے ایک ناتجربہ کار اور
ناسمجھ لڑکے[3] کو امیر و حاکم بنا ڈالا۔

نصاریٰ نے اس والی سے اس کا ملک
چھین لیا تھا، وہ بڑا واہی و لاہی تھا۔ عیش و
طرب میں منہمک، انتظامِ ملکی سے غافل، عقل و
خرد سے بیگانہ اور نقضِ عہد و میثاق میں یگانہ
تھا۔ نصاریٰ کی عملداری ختم ہونے پر وہ ملکہ
مالکہ بن گئی۔ اس کا لڑکا چھوٹا، ناتجربہ کار،
ناز پروردہ، ہم سنوں کے ساتھ کھیلنے والا،
اور دشمن سے لاپروا تھا۔ تدبیر امور مملکت،
اجراء احکام اور قیادت فوج کی صلاحیت نہ
رکھتا تھا۔ اس کے اعیانِ[4] سلطنت اور ارکانِ
دولت سب کے سب نااہل، سست، بزدل،
احمق، خائن اور غیر دیانتدار تھے۔ اکثر ذلیل
اور بعض بندگانِ زر تھے۔

ان میں سفیہ عیش پرست، نادان، بلند
آواز، سست، منافق، چرب زبان، ذلیل،
غلام زادہ، حیران و پریشان، ظالم و جابر، حیلہ
ساز و متکبر، خائن و مکار، بندہ زر و غیبت خور،

[1] واجد علی شاہ اختر۔ [2] حضرت محل۔ [3] برجیس قدر۔ [4] ممو خاں وغیرہ۔

عين ذو وجهين ۔

ومنهم مدبّر لكنه مُدبر،
يفضي به التدبير الى الادبار،
والدبار والتبار، ويبصّر اولى
الابصار، بصائر الاعتبار.

واكثرهم للنصارىٰ ناصرون،
وفي توليهم متناصرون، وكلهم
عن تدبير تتبيرهم مقصّرون، او
مُقصِرون قاصرون، او متقاصرون،
والنصارىٰ مع نسوانهم وولدانهم
محصورون، في المصر في قصور، محفوظون
لما في تدبير محاربيهم من قصور،

وقد حصّن النصارىٰ تلك القصور
بالخنادق والسور، والجيوش المنحرفة
حولهم يصولون ويفشلون، ويقولون
ما لا يفعلون، ثم اتى جند من البيضان
لامداد المحصورين، ودخلوا المصر
فقاتلهم الغزاة الشجعان، فقتل كثير
من البيضان، ودخل بقيتهم على المحصورين
محسورين مكسورين، ثم خرج كل من في القصور ولم
يتعرض لهم احد باقتضاء الفشل والقصور، وتحصّن
النصارىٰ في حديقة هي على
ميلين من البلد، وحصّنوها

سبھی قسم کے لوگ تھے۔

بعض ایسے بھاگنے والے مدبّر تھے کہ ان کی
تدبیر، تباہی و بربادی و ادبار کی طرف لیجاتی
تھی اور صاحبِ نظر افراد کو عبرت کے عجیب
عجیب مناظر دکھائی تھی۔

ان میں سے اکثر نصاریٰ کے معاون و مددگار
اور محبّ و وفاشعار تھے اور یہ سب کے سب
دشمن کی ہلاکت خیز تدبیروں سے ناواقف اور
ان کی مصلحت اندیشی سے بے خبر تھے۔

نصاریٰ اپنے بچوں اور عورتوں کے ساتھ
شہر[1] میں محصور مگر مخالف گروہ کی ناقص تدبیروں
کی وجہ سے اپنے مکانوں[2] میں محفوظ تھے۔

نصاریٰ نے خندقیں کھود کر اور حصار بنا کر
ان مکانوں کو قلعہ کی شکل دے لی تھی، مقابل
لشکر ان پر حملہ آور ہو کر پسپا ہو جاتا تھا۔ جو
کچھ کہتا وہ کر نہ پاتا تھا۔ اسی حالت میں محصورین
کی امداد کے لیے سفید رو گروہ آگیا۔ شہر میں
داخل ہونے لگا تو بہادر غازیوں نے ڈٹ کر
مقابلہ کیا۔ بہت سے گورے مارے گئے،
باقیماندہ دل شکستہ اور حسرت زدہ ہو کر محصورین
تک پہنچ گئے۔ پھر تازہ دم ہو کر یہ مکانوں سے
نکلے تو بزدلی اور کوتاہی کی وجہ سے کوئی مقابلہ
پر نہ آیا۔ نصاریٰ نے شہر سے دو میل دور

---

[1] لکھنؤ۔ [2] بیل گارد۔

حتى تحصين بقوة وجلد، و
طلبوا فيها مددا على مدد، و
جمعوا فيها عددا على عدد،
وجموع الجيوش التي كانت في البلد من قبل
في الايام الخالية، والجيوش التي اتت بعد
الفرار من دهلي وادت الى الوالية، فآوتهم
واكرمتهم بالنعم المتوالية، وجم غفير من الاجراء
الاولى لم يشهدوا حربا، ولم يشاهدوا طعنا ولا ضربا،
ولم يعرفوا مصلحة، ولم يزاولوا اسلحة، ولم يلحموا
في معركة، ولم يقتحموا في مهلكة، تبوؤا اتجاه تلك
الحديقة مقاعد وحفروا هناك خنادق و
مراصد، وطال بين الفريقين التراهي و
التناصل، وامتد بينهما التقابل والتقاتل،
استمد النصارى من والي الجبال فاسعفهم
بما كانوا يتمنون ويريدون، وامدهم من
افواج الجبليين بجبل كثير كانوا ثلثين
الفا او يزيدون،

فصالت النصارى وبيضانهم
واجرائهم واعوانهم، صولات شديدة،
متتابعة متوالية، وحملوا حملات سديدة،
متشافعة متتالية، فقلعت محاربيهم عن
مقاعدهم، وزلزلت اقدامهم، ففروا
من مراصدهم، فرارا لم يستطيعوا معه

باغ پر قبضہ جما لیا اور قوت و بہادری سے اسی
کو اپنا گڑھ بنا لیا۔ وہاں مدد پر مدد اور سامان
پر سامان جمع کر لیا۔

وہ لشکر جو شہر میں پہلے سے موجود تھے
اور وہ جو دہلی سے بھاگ کر بیگم کی پناہ میں
آ گئے تھے جن کو ملکہ نے قدر و منزلت کیساتھ
جود و بخشش سے نوازا تھا اور تنخواہ دار سپاہیوں
کا وہ جم غفیر جو حرب و ضرب سے نابلد، اسلحہ
بندی سے ناواقف اور مصلحت و معرکہ سے
ناآشنا تھا، یہ سب اس باغ پر خندقیں کھود کر
اور کمین گاہ بنا کر جا ڈٹے۔

دونوں فریقوں میں ایک مدت تک
مقابلہ و مقاتلہ اور نیزہ بازی و تیر اندازی ہوتی
رہی۔ تنگ آ کر نصارے نے پہاڑوں کے
والی سے مدد مانگی۔ اس نے ان کی آرزو
کے مطابق تیس ہزار سے زیادہ پہاڑی
لشکر بھیجکر مدد کی۔

اب تو نصارے[1] ان کی گوری فوجوں،
کرایہ کے سپاہیوں اور لالچی معاونوں نے
ایک ساتھ حملہ کر دیا۔ یہ حملے بڑے سخت،
متواتر اور مسلسل تھے جنہوں نے مقاتلین کو
ان کی جگہ سے ہلا دیا اور ان کے پاؤں اکھاڑ
دیئے۔ وہ کمین گاہوں سے ایسی بری طرح

[1] جنرل بخت خاں و شہزادہ فیروز شاہ وغیرہما۔

قرارا، في البلدة وثغورها، حتى تركوا الوالية وابنها وحيدين في قصورها، وخانها كثير من اولياء دولتهما، واركين ملكهما، واركان سلطنتهما، ودهاقين اراضيهما، وهم كانوا قد جاءوا لانجادهما وامدادهما واعانتهما وصيانتهما وحفظ عرضهما وعرضهما فنكثوا المواثيق والايمان، واستبدلوا الكفر بالايمان، ونافقوا فوافقوا النصارى ورافقوهم وانتصروا لهم انتصارا، فدخل النصارى واعوانهم البلدة فخرج اهلوه وتركوا ديارهم وبيوتهم خالية، حتى حصرت النصارى وبيضانهم، وجنودهم واعوانهم، مقصورة كانت فيها الوالية، فخرجت مع ابنها وامراتين من صواحبها من المقصورة المحصورة من ظهرها راجلة، ودخلت محلة اخرى عاجلة ومكثت في البلدة ثلثة ايام تستعيد جنودها الفارة وتسترده، وتستعينهم وتستمد، وهم قد ملئوا من الدهش والرعب فنكصوا ونكلوا عن الاقتحام في هذا النكال الصعب، فلم يرجع اليها احد ولم يبق لها في البلد ملتحد، فلما استيئست

بھاگ گئے کہ شہر کی سرحدوں پر بھی نہ ٹھہر سکے۔ ملکہ اور اس کے لڑکے کو تنہا محل میں چھوڑ بھاگے ان دونوں سے وقت پر بہت سے ارکانِ دولت، اعیانِ سلطنت نے دغا کی اور وہ دیہاتی جوان کے علاقہ سے ان کی مدد و اعانت، عزت و آبرو، مال و دولت کی صیانت و حفاظت کے لئے آئے تھے عہد شکنی کر کے اور کفر کو ایمان سے بدل کر منافق بن گئے نصاریٰ کی موافقت و رفاقت کرنے لگے نصاریٰ معاونین شہر میں داخل ہو گئے، شہر کے رہنے والے گھروں کو خالی کر کے نکل گئے نصاریٰ اور ان کی گوری فوج اور مددگاروں نے اس محل شاہی کا جس میں ملکہ تھی محاصرہ کر لیا۔ بیگم اپنے ولیعہد اور دو سہیلیوں کو لیکر محصور محل کی پشت سے نکل کر دوسرے محلہ میں تیزی سے پیدل پہنچ گئی۔

تین دن شہر میں رہ کر بھاگے ہوئے لشکر کو واپس کرنے اور اس سے مدد حاصل کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ وہ لشکر ایسا دہشت زدہ ہو چکا تھا کہ کسی صورت سے اس نازک موقعہ پر دستگیری کو تیار نہ ہوا۔ نہ ان میں سے کوئی متنفس لوٹا اور نہ شہر بھر میں کہیں جائے پناہ ملتی رہی۔ آخر کار بیگم

من الاعوان والانصار، نفرت مع ابنها وعدة من الانفار للسفار الى القاع والقفار، فاجتمع اليها جماعات من الفرسان الوجال، وجمّ غفير من الرجال الرجال، وجمع كثير من اهل البلد وربّات الحجال، وهم حفاة عُراة، وقد كانوا من السراة وهن حافيات غير خافيات، وقد كنّ عقائل ذوات اخادير مقصوّات في مقاصير، فرُمين من بقاع بقاع، واقتنعن للقنوع برقاع، فاقتنعن بها من دون قناع، تقاذفهن القفار والبلاقع، و انتضيت عنهن الستور، والبراقع كنّ في زهو وتيه، ثم تهن في مهامه وتيه، قد تركوا امكنة ومكانة و دولة، كانوا لا يبغون عنها حِولا، حتى حال الحال، وحلّ الوبال، وفشا الخبال، فصار بلاء مبيدأ

اپنے اعوان وانصار سے مایوس ہو کر ولیعہد اور چند ساتھیوں کو ساتھ لے کر چٹیل میدان، اور بے آب وگیاہ جنگل کی طرف چل کھڑی ہوئی اب اس کے گرد کمزور دل سواروں کی کچھ جماعتیں، پیدل مردوں کا انبوہ کثیر شہریوں اور عزت دار عورتوں کی کافی تعداد آکر جمع ہو گئی۔ وہ شہری ننگے بدن اور ننگے پاؤں تھے حالانکہ سرداروں میں سے تھے اور عورتیں ننگے پاؤں اور بے پردہ تھیں، حالانکہ گرامی قدر، پردہ نشین اور محل سراؤں کی رہنے والی تھیں۔ وہ سرسبز و شاداب خطوں سے چٹیل میدانوں کی طرف پھینک دی گئیں۔ وہ پیوندوں کے کپڑے پہنکر ستر پوشی کرتی تھیں اور برقعے نہ ہونے سے اسی پر اکتفا کرتیں، ایک میدان سے دوسرے میدان میں پہنچتیں، بے پردگی میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا۔ وہ عیش و عشرت میں زندگی بسر کرتی تھیں پھر دور دراز جنگل اور پُرخطر میدان میں ڈال دی گئیں، ان لوگوں کو محلات، پائگاہیں اور ریاستیں چھوڑنا پڑیں حالانکہ وہ ان سے ذرا بھی ہٹنا نہ چاہتے تھے یہاں تک کہ حال متغیر، وبال نازل اور ہلاکت عام ہو گئی۔ یہ ایسی مہلک

ترك البلاد بِيدا، و الاحرار عبيدا، و الاغنياء مساكين، والنبلاء مهاجين، كانوا متوطنين في رُفهنية وبُلهنية مع الاهل و العيال، فاغتربو اومطمئنّين برفاه الحال، وفراغ البال، فاضطربوا انا تهم المتربة والإتراب، عن المتاربة مع الاتراب، واضطرهم الاضطراب الى الإضراب عن الاضراب، فمن باك يتفجع، وشاك يتوجّع، وحنان يرجّع، و لهفان يسترجع، صبيان فُطموا قبل الابّان عن اللبان، وشيب وشبّان، قد استيئسوا عن الحاجات و اللُّبان، ما لهم مثوى وثواء، ولا لدواهم دواء، و افئدهم هواء، لا تطيب لهم هوى وهواء، فالعيش و الموت عندهم سواء، كانوا في سرور وسرير، واستبرق و حرير، وفواكه وفكاهة، ورفاهة ونزاهة، ونعمة ونَعمة، وغنى وغناء، ونغمة و سرّاء وسراء، ودولة وثراء، اليوم وطا نهم قتاد،

مصیبت نازل ہوئی جس نے شہروں کو میدان، آزادوں کو غلام، مالداروں کو فقیر و مسکین اور شریفوں کو خوار و ذلیل بنا دیا۔ وہ اپنے اہل و عیال میں آرام و آسائش کی زندگی بسر کر رہے تھے، خوش حال اور فارغ البال تھے کہ مجبور ہو کر نکلنا پڑا۔ فقیری و تنگدستی نے ہمسنوں کی مجالست اور اضطراب و اضطرار نے برابر والوں کی رفاقت سے دور کر دیا۔ رونے والے آہ و زاری، بہانۂ فریاد و شیون کرتے، آرزو مند چلّاتے اور حسرت کشیدہ انا للہ پڑھتے، بچے اپنی ماؤں کے سینوں سے قبل از وقت جدا کر دیئے گئے تھے، بوڑھے اور جوان حاجتوں کے پورا کرنے سے ناامید تھے، نہ ان کا کوئی ٹھکانا تھا، نہ بیماری کی دوا تھی، ان کے دل خالی تھے، ان میں نہ کوئی خواہش تھی نہ انہیں کوئی بات بھاتی تھی، زندگی اور موت ان کے لئے دونوں برابر تھے، وہ مسرت و شادمانی، تخت شاہی، دیباج و حریر، میوے، خوش طبعی، عیش و عشرت، نظافت و نزاہت، نزاکت و نعمت، نغمۂ و سرود، مال و دولت خیرسگالی و مروت میں پلے تھے۔ آج ان کی ۔ ہ مد ع لے ہیں

ما لهم زاد وعتاد، وثيابهم اخلاق وما لهم من الراح خلاق، عافاهم الله برحمته، واخذ الظلمين ببطشة ونقمته. ثم ان الوالية، اى الحضرة العالية، بعد ما اوى اليها جموع من الجيوش ارذولى هربوا، وكثيرا من الذين اغتربوا، عبرت معهم من البحار والانهار اللاتى لا يعبر منها بدون الفلك، واقامت مع من شايعها فى قرية على شاطئ بحر فى شمال الملك، واقعدت اذا قامت بها فرسانا ورجالا على المعابر ليقبضوا على السفائن، ويصدوا عن العبور اهل الضغائن، وارسلت عمالا لاخذ الخراج واصلاح الرعايا فى القرى والمدائن، وجهزت جيوشا وبعثتها ليقيموا بمراصد قريبة من دار ملكها التى استولى النصارى عليها ليقاوموهم ويلاحموهم ويناوقوهم ويزاحموهم عند انتهاضهم من حواليها لكنها فوضت الامر كله، عقده وحله، دقه وجله، الى عامل خامل، ذاهل واهل، لم يكن للامس

سامان و زادِ راہ کا پتہ نہیں، کپڑے بوسیدہ ہیں اور عیش و راحت میں کوئی حصہ نہیں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے انہیں معاف کرے اور ظالموں کو سخت گرفت میں لے۔

پھر والیہ یعنی حضرت عالیہ، اس لشکر کو جو بھاگ کر اس کی پناہ میں آگیا تھا اور دوسرے ساتھیوں کو لے کر ایسے دریاؤں اور نہروں سے گذری جن سے بغیر کشتی کے عبور مشکل و دشوار تھا۔ وہ شمالی ملک میں دریا کے کنارے ایک گاؤں میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ اقامت گزیں ہو گئی اور دریا کے گھاٹوں پر سوار، پیادے بٹھا دیئے کہ تمام کشتیوں پر قبضہ کر لیں اور دشمنوں کو دریا عبور نہ کرنے دیں۔ اس نے انتظامِ رعایا اور حصولِ خراج کے لئے شہروں اور قصبات و دیہات میں عامل بھیج دیئے لشکروں کو آراستہ کر کے اپنے اس دار السلطنت کے قریبی مورچوں پر جس پر اب نصاریٰ کا قبضہ ہو چکا تھا، بھیج دیا تاکہ اگر دشمن ادھر کا قصد کرے تو اس سے ڈٹ کر مقابلہ و مقاتلہ، مزاحمت و مجادلہ کیا جائے، لیکن یہ تمام امورِ مہمہ اور ان کا اہتمام و انصرام ایسے ذلیل، غافل اور متحیر عامل[1] کو سونپا گیا تھا جو

---

[1] نواب احمد علی خان عرف ممو خاں

اهلاً، لا يستشير و يأتمر جهلاً، يستصعب كل سهل و يحسب كل صعب سهلاً، وكان وغداً زهدنا دُهدونا، لا يستخلص للمعاشرة والمشاورة، والمجاورة والمحاورة الا سفلة جُهّلاً و دُونا، يتجنب النبلاء الدهاة، والعقلاء الهداة بنخوته، ولا يستصحب ولا يؤمّر ولا يستعمل الا السفلة الجهلة من عشيرته واخوته، فامّر ذٰلك الامّر على تلك الجيوش سُفلاء جبناء انذالا، وفُسلاء فشلاء ارذالا، يطمعون فيطعمون ما اُدرّ للجيوش لاقواتهم، ويختانون لما فی صدورهم من غلّ فيغلّون ويغلون من غلاتهم، يحسبون كل صيحة عليهم هم العدو، فلا يزالون من الفرق فی الفلق، ما لهم قرار ولا هدو، يظنون من غاية الوجل كل صيحة مقدمة الاجل، ويخالون كل صوت، داعی موت، ولعلهم يلقون الی العُداة اللئام، بالمودة واللؤام والالتيام۔

کسی طرح اس کا اہل نہ تھا، وہ صحیح مشورہ سے گریزاں اور جہل سے ہمکنار تھا۔ آسان بات کو سخت اور دشوار کو آسان سمجھتا۔ وہ ذلیل احمق اور بزدل تھا۔ اس نے مکالمات و مشاورت مجالست اور منادمت کے لئے احمق، جاہل اور ذلیل طبقہ کو چن رکھا تھا۔ وہ نخوت و غرور کی بنا پر شریف سرداروں اور عقلمند رہنماؤں سے بچتا اور اپنے ہی اہلِ خاندان اور اعزہ میں سے جاہلوں اور احمقوں کو مصاحب و حاکم بناتا چنانچہ اس ناتجربہ کار نے ان لشکروں پر کمین، ذلیل، بزدل اور رذیل لوگوں کو سردار بنا دیا۔ وہ بڑے ہی لالچی تھے۔ جو کچھ لشکریوں کو خوراک وغیرہ دیجاتی، کھا جاتے۔ وہ بددیانت تھے۔ اپنی کینہ پروری کی وجہ سے ان کے نقد اور جنس میں خیانت کرتے اور گراں فروشی کے مرتکب ہوتے۔ ہر آواز کو دشمن کی آواز سمجھتے ہمیشہ اضطراب کے ساتھ خوف کی وجہ سے لرزتے رہتے۔ کسی وقت بھی ان کو راحت و سکون میسر نہ تھا۔ بزدلی سے ہر آواز کو موت کا پیش خیمہ اور ہر صدا کو موت کی پکار سمجھتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کمینے دشمنوں کے سامنے محبت و چاہت کے ساتھ پیش کئے جا رہے ہیں۔

والنصارى بعد استيلاءهم على دار الملك لبثوا فيها، ولم يخرجوا الى ارجائها ونواحيها وطفقوا يؤلفون كفار الاقطار واراكينها، وحراث القرى ودهاقينها، بالصفح والعفو عن المعاصى والجنايات والتخفيف فى الخراج والتطفيف فى الجبايات.

فلما دانوا لهم دانوهم اعضادا، وكانوا لهم فكانوا لهم اعضادا. فبرز النصارى الى نواحى الملك واقطاره، ليستولوا على قراه وامصاره، فلما عمدوا الى مرصد[1] كان من دار الملك فى جهة الشمال[1] على ثمانية[2] اميال، وفيه خيل ورجال، مع قائد كبير من اسفل الرذال فهرب ذلك القائد الرذيل مع من معه من ذلك القبيل اذ سمع من لقائهم خبرا، قبل ان يرى لاحد منهم اثرا، وثبت هناك للقتال جمع قليل من الهنادك الاقتال، مع اركون ركين كان من شجعان الابطال، ولم يكن عدد تلك الفئة، زائدا على المائة، فقاتلوا وقتلوا وقتلوا ولم يبق منهم احد لتجنبهم عار الفرار، وفقد المدد من قبل القائد الفرار مع كثرة من كان معه من

نصارے دارالسلطنت پر قبضہ کرنے کے بعد وہیں ڈٹے رہے اطراف وجوانب کیطرف نہ نکلے، انہوں نے گرد و نواح کے کافروں، دیہاتیوں اور کاشتکاروں کی تالیفِ قلب شروع کردی۔ ان کی خطاؤں کو درگذر، ان کے خراج میں تخفیف اور تاوانوں میں کمی کی۔

اس مہربانی پر وہ مطیع و فرمانبردار اور معاون و مددگار بن گئے۔ ادھر سے مطمئن ہو کر اطرافِ ملک میں شہر و دیہات پر قبضہ کرنے کے لئے نصارے نکل کھڑے ہوئے۔

جب نصارے اس مرصد[1] کی طرف متوجہ ہوئے جو دارالسلطنت سے جانبِ شمال آٹھ میل کے فاصلہ پر واقع تھا اور جس میں سوار، پیادے اور وہ رذیل و ذلیل قائدِ عظیم بھی تھا تو وہ کمین قائد ان کی آمد کی خبر سن کر ہی اپنے ذلیل سرداروں کے ساتھ بھاگ گیا۔ بہادر ہندوؤں کی تھوڑی سی تعداد اپنے گاؤں کے بہادر مکھیا کے ساتھ مقابلہ پر ڈٹ گئی۔ یہ سو سے زیادہ نہ تھے۔ دشمنوں کو فنا کے گھاٹ اتار کر خود بھی کٹ گئے۔ وہ فرار کی عار برداشت نہیں کر سکتے تھے اور بھگوڑے قائد کی طرف کافی لشکر اور ساز و سامان کے ہوتے

[1] فی نسختنا بدل الشمال "الشرق"۔ [2] فی نسختنا عشرة اميال۔

[1] نواب گنج ضلع بارہ بنکی ۱۲

العدد، وما كان معه من المُدد.

فاستولى النصارى على قرية كان فيها ذلك الجبان الخوان للرصد اذ وجدوها خالية، على عروشها خاوية، فجعلوا تلك القرية حصنا حصينا، وحصارا منيعا رصينا، وجمعوا عددا، ولبثوا فيها مُددا، لا يقدمون ميلا، كانهم ينتظرون ما امّلوا من قواد الجيوش تاميلا، ويرتقبون ما وعدهم اولئك الخُوّان فيوجلون الى انجاز الوعد تاجيلا، ثم انهم خرجوا فى جانب الغرب من البلد الى ناحية جُلّ دهاقينها وسكانها لهم يدينون، ولهم على اعدائهم معينون؛ وكان فيها من قِبَل الوالية العلية عامل خامل لم يكن حازما ولا مجربا ولا مدبّرا، فولّاهم الدبر وتولّى وهو مدابر لهم مُدبرا، وهرب بلا مقابلة ومقاتلة هربا، واتخذ سبيله سربا، لقلة الخيل والرجل لديه، وعدوان الدهاقين والكفار عليه؛ قد كانوا واثقوه على انهم وافقوه، ثم خالفوه، بعد ما حالفوه، وغدروا غدرا، ومكروا مكرا نكرا، وكفروا بنعمة كانوا بها رافهين، ونعمة كانوا فيها فاكهين، دهرا، وازدادوا الى الكفر والكفران، بترك كفران الايمان والارتداد عن

ہوئے بھی انہیں کوئی مدد نہیں پہنچ سکی تھی۔

نصاریٰ نے جب اس گاؤں کو جس میں وہ نامرد خائن، عامل نگہداشت کے لئے موجود تھا، خالی اور ویران پایا تو اس پر قبضہ جما کر اپنا مضبوط و محفوظ قلعہ بنا لیا۔ وہیں فوج جمع کر لی اور مدت تک وہیں مقیم رہے وہ ایک میل بھی نکل کر نہ گئے۔ وہ سردارانِ لشکر کی امیدوں کی تکمیل اور ان خائنوں کے ایفاءِ عہود کے منتظر تھے اسی لئے اپنے ایفاءِ وعدہ میں بھی تاخیر کر رہے تھے۔

ادھر سے فارغ ہو کر انہوں نے اس مغربی گوشے کا رخ کیا جہاں کے تمام باشندے ان کے مطیع ہو چکے تھے اور دشمنوں پر ان کے معاون تھے۔ وہاں بھی ملکہ کی طرف سے ناعاقبت اندیش، غیر مدبّر، ناتجربہ کار اور ذلیل عامل تھا، وہ بھی پیٹھ پھیر کر مقابلہ کئے بغیر بُری طرح بھاگا۔ سرنگ میں ہو کر اپنا راستہ بنایا، اس کے پاس سوار اور پیادے بھی کم تھے، اس پر ستم یہ ہوا کہ کفار اور دیہاتیوں نے معاہدہ و قسم کے باوجود وقت پہ دغا کی۔ غدر و مکر کی انتہا کر دی۔ ناز و نعمت اور پُرعیش و مسرت زندگی کا کفران کیا، معاہدوں سے انکار کر کے کفر میں اضافہ اور ارتداد میں زیادتی

الایمان، کفرانا وکفرا، فانتہض لمحاربۃ النصاریٰ، المتسلطین علی تلک النّاحیۃ عامل ناحیۃ اخریٰ، قد ادخر من المحسنات والخیرات، والسعادات والمبرات، ذخرا، کان برّا تقیا، صفیا نقیا، شجاعا کمیا، لرسول الملاحم نبی المراحم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سمیا، فاغار علی النصاریٰ وجُندھم فھزمھم فی اول سطوۃ،

ففروا بعد بذل جھدھم، وتحصنوا مع عصبۃ فی دار ھندکی فی القصبۃ، کانت تلک الدار منیعۃ حصینۃ، وکتبوا لطلب کتیبۃ، یمدونہم الیٰ عظماء النصاریٰ کانوا فی المدینۃ، فارسلوا لامدادھم کتیبۃ من فیالقھم، ومعھا جم غفیر من الدھاقین و المنفقین الذین نکثوا الایمان، وکفروا بعد الایمان، بنقض مواثقھم، وقد خادع بعض الکفار من الدھاقین الکفار، ذلک العامل البار الکرار، بمکر کبار، فواثقہ بتاکید الایمان بانہ یمدّہ اذا التقی الجمعان، باربعۃ الاف ابطال الشجعان،

فلما تراءی الفئتان، صال ذلک العامل المتدین الکامل مع عدۃ من الفتیان،

کرلی۔

اس موقعہ پر متسلّط نصاریٰ سے قتال کے لیے دوسری طرف کا ایک عامل[1] اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے خیرات ومبرّات اور سعادات و حسنات کا کافی ذخیرہ اپنے اندر جمع کر لیا تھا۔ وہ بڑا ہی پاک طینت، صاف باطن، متقی، پرہیزگار، بہادر اور رسولِ ملاحم اور نبی مراحم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمنام تھا۔ اس نے نصاریٰ کے لشکر پر حملہ کر کے پہلے ہی حملہ میں شکست دے دی۔

اپنی ساری کوششیں ختم کر کے وہ بھاگ گئے اور قصبہ کے ایک ہندو کے مضبوط و محفوظ مکان میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے اور عظماء نصاریٰ کے پاس شہر میں پیغام بھیجکر مدد مانگی۔ انہوں نے ایک لشکر اور منافقین و دہاقین کا جم غفیر جنہوں نے عہد شکنی کی تھی۔ ان محصورین کی مدد کو بھیجدیا۔

ادھر اس نیک سرشت بہادر عامل سے ایک دیہاتی کافر زمیندار[2] نے بڑا داؤ کھیلا۔ اس نے قسمیں کھا کر اطمینان دلایا کہ جب دونوں جماعتیں مقابلہ پر آجائیں گی تو چار ہزار بہادروں کا گروہ لے کر مدد کو پہنچوں گا۔

جب مقابلہ کی نوبت آئی تو اس زمیندار کی قسموں پر بھروسہ کر کے اس دیانتدار عامل

[1] شاہ احمد اللہ مدراسی۔ [2] جگناتھ سنگھ راجہ پوائیں ضلع شاہجہانپور

على عسكر النصران، منخدعا بامداد ذلك الكافر الدهقان. فرمى عسكر النصارى بالبنادق والمجانق من امامهم وجوههم وصدورهم ورمت جماعة ذلك الدهقان الكفار المكار الغدار من خلفهم ادبارهم وظهورهم، وكانت تلك الجماعة في الحقيقة انصار الانصارى اعوانهم واتباع الشياطين واخوانهم،

فاستشهد ذلك العامل الكامل فخر في المعركة شهيدا صريعا، واستشهد كل من معه عند الصيال والقتال استشهادا سريعا،

وبعد استشهاد ذلك البار الكرار وهؤلاء الابرار، ولى من ورائهم الادبار للفرار، وفروا فرار الحمر ليلتفتوا فيه الى ما خلفهم وما ورائهم لغلبة الفشل والاضطرار، وتعقبهم جنود النصارى فعاقبوهم بالاثخان والتقتيل؛ فما نجا منهم الا قليل جدوا عند الفرار في الاسراع والتعجيل، وعند ذلك لان ودان، وكان كل من كان في تلك الناحية من الاراكين والاركان، وغيرهم من الرعايا والدهاقين و

نے اپنے تھوڑے سے بہادروں کے ساتھ دشمن پر حملہ کر دیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ سامنے سے توبندوقوں اور توپوں سے چہروں اور سینوں پر نصارے نے گولیاں برسائیں اور پیچھے سے اس غدار مکار زمیندار کی جماعت نے پشت و سرین کو پھوڑنا شروع کیا۔

وہ دراصل نصارے کے انصار و اعوان اور شیاطین کے اتباع واخوان تھے

وہ خدا پرست عامل معرکہ میں گر کر شہید ہوا اور اس کی ساری جماعت نے بھی اسی کے نقشِ قدم پر چل کر جامِ شہادت نوش کیا۔

ان سب ابرار واخیار کی شہادت کے بعد بزدل لوگ ایسے بھاگے کہ نامردی اور اضطرار سے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ نصارے نے تعاقب کر کے ان سب کو پکڑ کر قتل کر ڈالا، تھوڑے سے وہ بچ رہے جنہوں نے بھاگنے میں پوری تیزی اور عجلت سے کام لیا۔

اس نواح کے سارے باشندے دہقانی، کاشتکار، مکھیا اور مقدم وغیرہم سب مطیع و فرمانبردار بن گئے البتہ دو بہادر،

السكان لمعشر النصران، ما عدا اثنين ابيين كميين مغيارين مغوارين، قاتلا النصارى اشد قتال، فقتلوا كثيرا من جنودهم من خيل ورجال، بشدة حماستهما وشجاعتهما مع قلة بضاعتهما وجماعتهما، ثم استخلصا منهم بتصلبهما، فلم يهتم النصارى بتعقبهما، فصفت لهم تلك الناحية والقت الرعب فی قلوب مخالفيهم تلك الواقعة الداهية.

وكانت من ادهى الخطوب، الباعثة للكروب، وكانت تلك الهيجاء كانها خاتمة الوقائع والحروب، فبعد ما غلب فيها النصارى وانتصروا وانفسحوا فی النواحی الاخر وانتشروا، فكلما هتموا بنحو قطر واهتموا باخذه اهتماما، هتم همهم من فی ذلك القطر من مخالفيهم فاهتموا اهتماما، ما استطاعوا معه هناك قياما، وانهزموا قبل المكافحة انهزاما، ومع ذلك كادت ملكة النصارى كيدا، قد ازدادوا به قوة وايدا، وذلك انها قد شهرت بارسال بطاقات مطبوعة فی كل من الاقطار والقرى والامصار، فاشتهر غاية الاشتهار انها قد عفت عن

غیرتمند، اور غارتگر جوانمردوں نے خوب جم کر مقابلہ کیا۔

اپنی بے پناہ شجاعت و بسالت سے قلتِ اسباب و جماعت کے باوجود دشمن کے ہزاروں سوار، پیادے ٹھکانے لگادیئے آخر کار مجبور ہوکر اپنی بہادری سے جان بچا کر نکل گئے اور دشمن ان کا تعاقب نہ کرسکا اب وہ نواح بھی صاف ہوگیا۔ ان دونوں سرداروں کی شکست کے بعد مخالفوں کے دل میں دشمن کا رعب قائم ہوگیا۔

یہ واقعہ رنجیدہ واقعات میں سے سب سے اہم اور آخری واقعہ اور اس جنگ کا خاتمہ تھا۔

نصاریٰ یہاں غالب ہونے کے بعد دوسرے اطراف میں پھیلنا شروع ہوئے۔ وہ جب کسی طرف کا قصد کرتے تو وہاں کے رہنے والے غم و فکر میں مبتلا ہوجاتے اور لڑے بھڑے بغیر شکست مان لیتے۔

ان تمام فتحمندیوں کے بعد بھی ملکۂ نصاریٰ (وکٹوریہ) مکر سے باز نہ رہی۔ اس مکر کی وجہ سے انہیں بڑی قوت و طاقت حاصل ہوگئی اس نے تمام دیہات، شہروں اور قصبوں میں مطبوعہ حکم نامے جاری کئے جن میں عام

الجیوش التی انحرفوا، والرعایا الذین ارتکبوا العصیان واقترفوا، الا الذین قتلوا النسوان والصبیان، والنصاریٰ الاولی جاءوا مضطرین للاستیمان، فاغتالوهم بالعداوۃ والعدوان، والذین قاموا للملک والریاسۃ والسلطان، والذین کانوا یحثون الناس علی الاعتداء و الطغیان، وقد کانت الجیوش المنحرفۃ وغیرہم ممن رافقوا ووافقوا الوالیۃ واجتمعوا لدیہا، لعوز المعائش اذ قدرت ارزاقہم وقترت اقواتہم وعدم ما کانوا یعطون مشاھرۃ او میاومۃ لفقد خراج کان یجبیٰ الیہا، لانتشار جنود النصاریٰ فی اقطار الملک وتسلطہم علیہا فضاقت، علیہم الارض بما رحبت، وضاقت علیہم انفسہم فی ضنک شدید، وضیق مدید، وکان کل منہم صفر الکف والراحۃ، فقید العافیۃ والراحۃ، مقسم البال بالبلبال لنأی الاھل والعیال، فانحاز کثیر منہم الی النصاریٰ واشیاعہم، واختاروا الانقیاد لطاعتہم واتباعہم، فسلبہم النصاریٰ ما کان لہم من الافراس و

معافی کا اعلان کیا کہ تمام "باغی" لشکر اور سرکش و نافرمان رعایا کو، ان لوگوں کو چھوڑ کر معاف کیا جاتا ہے جنہوں نے عورتوں، بچوں اور ان نصاریٰ کو جنہوں نے مجبور ہو کر پناہ لی تھی، ظلم و عداوت سے قتل کر ڈالا، یا وہ جنہوں نے سلطنت و ریاست قائم کی، یا وہ جنہوں نے سرکشی و عدوان پر لوگوں کو ابھارا،

ادھر وہ "باغی" لشکر اور دوسرے بیگم کے ساتھی، روزی کے نہ ہونے اور تنخواہ و ضروریاتِ زندگی میسر نہ آنے سے پریشان ہو چکے تھے۔

نصاریٰ کے مسلط و منتشر ہو جانے کی وجہ سے بیگم کے پاس خراج اور محاصل کا آنا بند ہو گیا تھا، زمین کی کشادگی کے باوجود ان پر تنگ ہو چکی تھی۔ وہ بڑی سخت مصیبت و تنگی میں پڑ گئے تھے، وہ سب تنگدست اور عیش و راحت سے دور تھے ان کے دل اہل و عیال کی جدائی سے پارہ پارہ تھے۔

ایسے حالات میں مجبور و مضطر ہو کر بہت سے لشکری وغیرہ نصاریٰ کے اطاعت گذار بن گئے۔ ان کے پاس ہتھیار، گھوڑے۔

نسلحان، واعطوهم خطوط الامان، فرجعوا الى الاهل والاوطان، ائبين خائبين مع الخسران والحرمان۔

فتسلط النصارىٰ على الملك كله بلامزاحم، واستراحوا من المعارك والملاحم، والوالية بعد هذا الخبال والوبال، اوت مع قليل من الرجال، الىٰ قُلل الجبال۔

واذكنت قد طال اغترابى، واكتيابى واضطرابى، واشتد ارتغابى، فى ايابى، الى دارى واهلى وجيرتى واحبابى، ورأيت موثق الايمان، موثقا بالايمان، رجعت الى اهلى ووطنى، ودارى وسكنى، مطمئنا بموثق الايمان، غافلا عن انه لا ايمان لمن ليس له ايمان، وانه يمين بعد اليمين، من لا يتدين بدين، ولا يخاف يوم الدين۔

فبعد ايام دعانى، من مَعَانى، عامل نصرانى، فحبسنى وعنّانى، وحزننى وعنّانى، ثم ارسلنى ماسورا الىٰ قاعدة الملك التى صارت دار الهلك، وفوّض امرى الى

جو کچھ تھا چھین لیا گیا اور پروانۂ امان دیدیا گیا۔ اب وہ اہلِ وطن کی طرف خائب و خاسر ہو کر لوٹے۔

پھر تو نصاریٰ سارے ملک پر بلامزاحمت قابض ہو گئے۔ میدانِ کارزار اور لڑائیوں سے نجات پا گئے۔ بیگم اس تباہی و بربادی کے بعد، بچے کھچے تھوڑے سے ساتھیوں کے ساتھ پہاڑوں[1] کی چوٹیوں پر چلی گئی۔

میں مسافرت و غربت، اضطراب و مصیبت کی زندگی گذار رہا تھا اور میرا اشتیاق و رغبت اپنے گھر، اہل و عیال، پڑوسی اور احباب تک پہنچنے کے لئے بڑھ رہا تھا کہ امن و امان کا وہی پروانہ جسے قسموں سے مؤکد کیا گیا تھا، نظر پڑا، اس پر بھروسہ کر کے اپنے اہل و وطن میں پہنچ گیا۔ مجھے اس کا بالکل خیال نہ رہا کہ بے ایمان کے عہد و پیمان پر بھروسہ اور بیدین کی قسم و یمین پر اعتماد کسی حالت میں درست نہیں خصوصاً جبکہ وہ بے دین جزاء و سزاء آخرت کا قائل بھی نہ ہو۔

تھوڑے دن کے بعد ایک حاکم نصرانی نے مجھے مکان سے بلا کر قید کر دیا اور رنج و غم میں مبتلا و مقید کر کے دار السلطنت (لکھنؤ) جو در اصل اب خانۂ ہلاکت تھا بھیجدیا۔ میرا معاملہ ایسے

[1] سرحد نیپال۔

حاکم متحکم، ظالم لا یرثی
لمتظلّم، و وشّی علیّ عنده
مرتدّان اشذان الدّان، جادلانی
فی آیة من ای القرآن، محکمة
حکمت بان من یتولّی النصاری نصرانی
وهما علی تولّیهم یُصرّان، فارتدّا
واستبدلا الکفر بالایمان، ففحنی
علیّ بتخلید حبسی وتعذیبی وجلائی و
تغریبی، وغصب کل مالی من کتبی ونشبی
ومالی، وغصب دارا کانت لاهلی وعیالی
وهم لم یخصّونی بهذا الغدر الفظیع،
بل عاملوا خلقا کثیرا بما هو افظع من
هذا الصنع الشنیع، فهم نکثوا مواثقهم
کل نکث، واغتالوا کثیرا من الخلق
بالضرب والخنق واخذوا کثیرا منهم
بالابتلاء بالاسر والجلاء، بلا تأنٍّ ومکث،
واخلفوا کل وعد کل اخلاف، واتلفوا
النفوس والنفائس ای اتلاف، فقد
جاوز العدّ دماء مطلولة لا تحصی بمئات
والالوف، وتعدّی الحد رقاب
مغلولة من اشراف واجلاف، سیّما
فیما بین دهلی و بین دیارنا من فسیح
قطر، فیه بلاد وقری وقصبات هی

ظالم حاکم کے سپرد کر دیا جو مظلوم پر رحم کرنا ہی نہ
جانتا تھا۔ اور میری چغلی ایسے دو مرتد جھگڑالو،
تند خُو افراد نے کھائی جو مجھ سے قرآن کی محکم
آیت میں مجادلہ کرتے تھے جس کا حکم یہ تھا کہ
نصاریٰ کا دوست بھی نصرانی ہے۔ وہ دونوں
نصاریٰ کی مودّت و محبت پر مُصِر تھے انہوں
نے مرتد ہو کر کفر کو ایمان سے بدل لیا تھا۔

اس ظالم حاکم نے میری جلا وطنی اور عمر قید
کا فیصلہ صادر کر دیا اور میری کتابیں، جائداد،
مال و متاع اور اہل و عیال کے رہنے کا مکان،
غرض ہر چیز پر غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ اس شرمناک
رویّہ کا تنہا میں ہی شکار نہ بنا تھا بلکہ بہت
سی مخلوق سے اس سے بڑھ چڑھ کر، ناروا سلوک
روا رکھا گیا۔ انہوں نے عہد و پیمان توڑ کر
ہزاروں مخلوقِ خدا کو پھانسی، قتل، جلاوطنی
اور قید و حبس میں بلا تاخیر مبتلا کر دیا، وعدہ
خلافی کر کے بے شمار نفسوں اور لاتعداد نفیس
چیزوں کو تباہ کر ڈالا۔ اس طرح خونِ ناحق
شمار سے آگے بڑھ گیا، سینکڑوں اور ہزاروں
سے گنتی نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح شریف و غیر شریف
قیدیوں کی تعداد حد سے متجاوز ہے، خصوصًا
دہلی اور ہمارے دیار کے مابین وسیع علاقے
میں جہاں شریف و عظیم خاندانوں کے شہر کے شہر

مواطن لاکثر نبال وخُطر۔

وقد ارسل الیهم رئیس یدعی الاسلام والایمان، جموعاً و والی دار ریاستهٔ بالاستیمان، فاسرهم و قسرهم بعد ما وعدهم بالایمان؛ فغدرهم ارضاءً للنصاریٰ بما هو محظور فی جمیع الادیان، ولم یخش لاسترضاء النصاریٰ سخط العزیز المنتقم الدیّان، فقیّد النصاریٰ اولئک المرسلین، مغلولین مسلسلین؛ فقتلوا کثیرا من النبلاء، وعذّبوا جمعا جمّا من هٰؤلاء بالقیود والجلاء، وما یشق جدّا من اشد البلاء فقد شارک النصاریٰ ذٰلک الرئیس، فی ما استحقوا من الاجور فی ابتلائهم عباد الله بکل عذاب بئیس۔

هٰذا، ولمّا ابتلانی النصاریٰ بالحبس، بما اختلقوا من الخدع و اللبس نقلونی من سجن الی سجن، و من حزن الی حزن، وزادونی شجنا علیٰ شجن، وحزنا علیٰ حزن، وسلبونی النعال واللباس ولبسوا علیّ کسی الکساء والکرباس، و اخذوا منّی

گاؤں کے گاؤں اور قصبے کے قصبے آباد ہیں۔

ان شرفاء وعظماء کے پاس ایک رئیس نے جو اسلام و ایمان کا مدعی بھی تھا، دارالریاستہ میں طلبی کے ساتھ امن و امان کا پیغام بھیجا وہاں پہنچنے پر اپنے وعدے سے پھر کر نصاریٰ کی خوشنودی کی خاطر غداری کر کے ان سب کو گرفتار کر لیا۔ یہ عہدی سارے مذاہب میں مذموم و ممنوع ہے اس کا بھی لحاظ نہ کیا، یہ بدبخت نصاریٰ کی رضاجوئی میں خدائے عزیز و منتقم کے غصہ سے بھی نہ ڈرا، نصاریٰ نے ان سب کو ہتھکڑی اور بیڑی پہنا کر محبوس کر دیا۔ اکثر شرفاء کو قتل اور باقی کو قید، جلاوطنی اور طرح طرح کے عذاب میں مبتلا کیا۔ اس طرح وہ بدنصیب رئیس بھی نصاریٰ کے ساتھ اللہ کی مخلوق کو سخت عذاب میں مبتلا کرنے کیوجہ سے اجر و انعام کا مستحق بن گیا۔

یہ المناک کہانی یوں ختم ہوئی، اب میرا ماجرا سنئے: مکر و تلبیس سے نصاریٰ نے جب مجھے قید کر لیا تو ایک قید خانے سے دوسرے قید خانے اور ایک سخت زمین سے دوسری سخت زمین میں منتقل کرنا شروع کیا۔ مصیبت پر مصیبت اور غم پر غم پہنچایا۔ میرا جوتا اور لباس تک اتار کر موٹے اور سخت کپڑے پہنا دیئے

فراشا ليّنا حسنا، ومهّد والي
وطاء مولما خشِنا، كانه شوك
قتاد، اوجمر وقّاد، ولم يترك وا
عندى ابريقا ولا قعبا ولا انية
واطعمونى ضنازِنًا وسقونى مياها
انية، فعوضت من حميم دان،
بحميم آن، وبليت مع مالى من
كبر وتوان، بصغار وهوان، فى
كل آن، ثم قذفنى شط الخصم
الكالح الى شط الخضمّ المالح، الى
جبل مستوبل رأس، اسمه راس،
لايزال الشمس فيه على سمت
الراس، فيه شعاب صعاب، وعقاب
فيها عقاب، وفجاج تغشاه امواج،
من بحر لُجّى ماءه اُجاج، نسيمه
احرّ من السموم، ونعيمه اضرّ
من السموم، غذاءه امرّ من طعوم
العلاقم، وماءه اضرّ من سموم
الاراقم سماءه غمام، يمطر الغموم
وسحابه الهموم، يفيض الهموم،
وارضه كالجدرى والحصبة حصباء،
وريحه من النكبة نكباء، كل بيت
فيه من الحشائش والقصب، مملوّ

زم وبہتر بستر چھین کر، خراب، سخت اور تکلیف
دہ بچھونا حوالہ کر دیا۔ گویا اس پر کانٹے بچھا دیئے
گئے تھے یا دہکتی ہوئی چنگاریاں ڈالدی گئی
تھیں، میرے پاس لوٹا، پیالہ، اور کوئی برتن
تک نہ چھوڑا۔ بخل سے ماش کی دال کھلائی
اور گرم پانی پلایا، محبانِ مخلص کے آبِ محبت
کے بجائے گرم پانی اور ناتوانی وکبر سنی کے
باوجود ذلت و رسوائی سے ہر وقت سامنا
رہا۔ پھر ترش رو دشمن کے ظلم نے مجھے دریائے
شور کے کنارے ایک بلند ومضبوط، ناموافق
آب وہوا والے پہاڑ پر پہنچا دیا جہاں سورج
ہمیشہ سر پر ہی رہتا تھا۔ اس میں دشوار گذار
گھاٹیاں اور راہیں تھیں جنہیں دریائے شور
کی موجیں ڈھانپ لیتی تھیں، اس کی نسیم صبح
بھی گرم و تیز ہوا سے زیادہ سخت اور اس کی
نعمت زہرِ ہلاہل سے زیادہ مضر تھی۔ اس کی
غذا حنظل سے زیادہ کڑوی، اس کا پانی،
سانپوں کے زہر سے بڑھ کر ضرر رساں، اس
کا آسمان غموں کی بارش کرنے والا، اس کا
بادل رنج وغم برسانے والا، اس کی زمین
آبلہ دار، اس کے سنگریزے بدن کی پھنسیاں،
اور اس کی ہوا ذلت وخواری کی وجہ سے ٹیڑھی
چلنے والی تھی۔ ہر کوٹھری پر چھپر تھا جس میں

من الوصب والنصب، لايزال سقفه
يكف، قطره كدمع عيني لا تقف،
لايزال تتعفن فيه الهواء، فجمت
فيه الأدواء. وهان الدوى وعز
الدواء، وشاعت فيه الأوباء،
وعم فيه الجرب والقوباء، ما فيه
التئام لكليم، ولا سلامة لسليم،
ولا علاج لسقيم، من يداوى
فيه يدوى، ومن يداوى فيه
يُودى، ومن اسى اساء، وزاد فى
الاسى، ومن آسِىَ لايوسىٰ عليه
ولا يواسىٰ، وما من كرب فى الدنيا
يقاس على كرب ههنا يقاسىٰ، ما
فيه سقام، الا وهو داء عقام، فالحمىٰ
فيه مقدمة الحِمام، وعموم علة
السرسام والبِرسام علة تامة
للتمام، وكم فيه من مرض وسقم،
لا يوجد منه اسم ورسم، من
كتب الطب فى رقم، والساعور،
يسعر حشا المرضى كالساعور، والنطيس
لا يحمى المريض ولكن يحمى عليه قبة
الوطيس، فهو لا يعرف مرضا، ويسقى
المريض ما يصير به حرضا، واذا مات

رنج و مرض بھرا ہوا تھا، میری آنکھوں کیطرح
ان کی چھتیں ٹپکتی رہتی تھیں، ہوا بدبودار اور
بیماریوں کا مخزن تھی، مرض سستا اور دوا
گراں، بیماریاں بے شمار، خارش و قوبار
(وہ مرض جس سے بدن کی کھال پھٹنے اور
چھلنے لگتی ہے) عام تھی، بیمار کے علاج،
تندرست کے بقاء صحت، اور زخم کے اندمال
کی کوئی صورت نہ تھی۔

معالج مرض میں اضافہ کرنے والا اور
معالَج ہلاک ہونے والا، طبیب تکلیف و رنج
بڑھانے والا تھا۔ رنجیدہ کی نہ غمخواری ہی کیجاتی
نہ اس پر رنج و افسوس کا اظہار ہی ہوتا، دنیا
کی کوئی مصیبت یہاں کی المناک مصیبتوں
پر قیاس نہیں کی جاسکتی۔ یہاں کی معمولی
بیماری بھی خطرناک ہے۔ بخار موت کا
پیغام، مرض سرسام اور برسام (دماغ کے
پردوں کا ورم) ہلاکت کی علتِ تام ہے
بہت مرض ایسے ہیں جن کا کتبِ طب میں
نام و نشان نہیں۔ نصرانی ماہر طبیب مریضوں
کی آنتوں کو تنور کی طرح جلاتا اور مریض کی
حفاظت نہ کرتے ہوئے آگ کا قبہ اس کے
اوپر بناتا ہے۔ مرض نہ پہچانتے ہوئے دوا
پلا کر موت کے منہ کے قریب پہنچا دیتا ہے

في احد من الناس، جرّ برجله احد
من الانجاس الادناس، هو كنّاس؛
كانه شيطان خنّاس، اونسناس؛
فيواريه بعد نزع ماله من اللباس؛
فی كثيب من رمل، بلا تكفين و غسل؛
فلا يحفر له لحد، ولا يصلّى عليه احد،
هٰذا، ولولا للميت في هٰذه
الحالة الدنيّة، لكانت فيه المنيّة،
هی الامنيّة، وكان فجاءة الاجل هی
الامل الاجلّ، وكان المنا، اقصى
المنى، ولو لم يكن قتل المرء نفسه
فی الدين محظورا، وعذاب يوم
الدين فيه محذورا، لم يرهق من
جيئ به هٰهنا ما سوّا معسورا،
وكان النجاء ممن ابتلى به ميسورا،
هٰذا، وقد ابتليت فيه باعراض عديدة،
وامراض شديدة، وقد عيل بها صبری،
وضاق بها صدری، وامتحق بدری، و
هان قدری، وكيف الخلاص والمناص؛
عما شجانی فاعتاض، لا ادری وبليت
مع ما اقاسی من الكرب، بشدة القوبا
والجرب، اغدو وارسم، وجثمانی كله
مصاب بقروح، تربو على كلوم وجروح،

جب کوئی ان میں سے مرجاتا ہے تو نجس و ناپاک
خاکروب جو درحقیقت شیطان خناس یا دیو
ہوتا ہے اس کی ٹانگ پکڑ کر کھینچتا ہوا غسل و
کفن کے بغیر اس کے کپڑے اتار کر ریگ کے
تودے میں دبا دیتا ہے۔ نہ اس کی قبر کھودی
جاتی ہے، نہ نمازِ جنازہ پڑھی جاتی ہے۔

یہ کیسی عبرت ناک والم انگیز کہانی ہے۔
یہ واقعہ ہے کہ اگر میّت کے ساتھ یہ برتاؤ نہ ہوتا
تو اس جزیرہ میں مرجانا سب سے بڑی آرزو
ہوتی اور اچانک موت سب سے زیادہ تسلی
بخش تھی۔ اور اگر مسلمان کی خودکشی مذہب میں
ممنوع اور قیامت کے دن عذاب وعقاب کا
باعث نہ ہوتی تو کوئی بھی یہاں مقید و مجبور بنا کر
تکلیف مالا یطاق نہ دیا جاسکتا اور مصیبت سے
نجات پالینا بڑا آسان ہوتا۔

یہ ناقابلِ برداشت حالات تھے ہی کہ میں
متعدد سخت امراض میں مبتلا ہوگیا جس کی وجہ
سے میرا صبر مغلوب، میرا سینہ تنگ میرا چاند دھندلا
اور میری عزت ذلّت سے بدل گئی۔ میں نہیں
جانتا کہ اس دشوار و سخت رنج وغم سے کیونکر
چھٹکارا ہوسکے گا، خارش و قوبا میں ابتلا اس
پر مستزاد ہے، صبح وشام اس طرح بسر ہوتی
ہے کہ تمام بدن زخموں سے چھلنی بن چکا ہے

مع مالی من اوجاع تحلل الروح، یکاد یفضی بی البثور الی الثبور والبور، بعد ما عشتُ عمرا فی عافیة وحبور، و رفاهة وجبور، قد کنت قبل مبتورا، والآن صرت میثورا، بل مثبورا، وکنت زمنا سلیما فرحانا، والیوم صرت زمِنا کلیما قُرحانا، اعانی شدائد مصائبا، واکافح من صعائب عصائبا، شعر،

حملنا من الایام ما لا نطیقه
کما حمل العظم الکسیر العصائبا

ومع ذلک کله احمد اللّٰہ سبحانه، واشکره علی منّته وفضله، فانی اری غیری من الاسری مُثقلا باغلال، مبتلی باعلال، یساق فی اقیاد، و یقتاد بقیاد، یسوقه ویقوده غلیظ شدید حدید، فی قیود من حدید، یسومه کل مهنة ومحنة، و یبدی له کل حقد و إحنة، و یزیده اوجاعا علی اوجاع، ولا یرثی لما ذا تعطش او جاع، فاحمد اللّٰه ربی علی المعافاة، من هذه الآفات، واشکره علی ما له من المنن، وصیانته ایای من هذه المِحَن،

روح کو تحلیل کردینے والے درد و تکلیف کے ساتھ زخموں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ وہ وقت دور نہیں جب یہ پھنسیاں مجھے ہلاکت کے قریب پہنچادیں۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب عیش و مسرت، راحت و عافیت میں زندگی بسر ہوتی تھی۔ اب محبوس و قریب ہلاکت ہوں۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب محسودِ خلائق غنی اور صحیح و سالم تھا۔ اب اپاہج اور زخمی ہوں، بڑی سخت مصیبتیں اور بیسیوں صعوبتیں جھیلنا پڑ رہی ہیں؛ "ٹوٹی ہوئی ہڈی جس طرح لکڑی اور پٹی کا بوجھ اٹھاتی ہے اسی طرح ہم بھی ناقابلِ برداشت مصیبتیں اٹھا رہے ہیں۔" ان تمام مصائب کے باوجود اللہ کے فضل و احسان کا شکر گزار ہوں کیونکہ اپنی آنکھوں سے دوسرے قیدیوں کو بیمار ہوتے ہوئے بھی، بیڑیاں پہنے ہوئے زنجیروں میں کھینچے جاتے ہوئے دیکھتا ہوں انہیں لوہے کی بیڑیوں اور زنجیروں میں ایک سخت، تیز اور غلیظ انسان کھینچتا ہے، محنت و مہنت، کینہ و عداوت کا پورا مظاہرہ کرتا ہے تکلیفوں پر تکلیفیں پہنچاتا اور بھوکے پیاسے پر بھی رحم نہیں کھاتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے ان آفات و تکالیف سے محفوظ رکھا۔

وانی وان استیئست نظرا
الی ظاهر الاسباب من نجاتی،
وقطعت رجائی، فان اعدائی
یعدّون فی ایذائی، ویبغون
بما یبغون ایدائی وآودائی لایستطیعون
مداواۃ دائی، وقد رسخت فی
قلوب العدیٰ منّی اضغان وحقائد
کما ترسخ فی القلوب من الادیان عقائد،
وقد شحنت صدورهم الوخیمۃ،
بالشحنا والسخیمۃ، لکنی ارجو رحمۃ
ربی العزیز الرحیم، البرّ الرؤف الکریم،
الذی ینجی الضعفاء العاجزین من
الفراعنۃ الجبابرۃ، ویلئم جروح المظلومین
المکلومین بمراهم مراحمہ الجابرۃ،
فهو الجبار علی کل جبّیر، وهو الجبار لکل
کسیر، وهو الجبار لکل فقیر وخسیر،
وهو المنجی للمرجی الاسیر، و
هو المیسر لکل عسیر، وهو
الذی نجّی نوحا من الغرق، وابراهیم
من الحرق، وایوب مما مسّہ واصابہ
من الضر والاوصاب، ویونس
من بطن النون، وبنی اسرائیل
مما کانوا یعانون، وکفی

میرے دشمن میری ایذا رسانی میں کوشاں اور میری ہلاکت کے درپے رہتے ہیں، میرے دوست میرے مرض کے مداوا سے لاچار ہیں دشمنوں کے دل میں میری طرف سے بغض و کینہ، مذہبی عقائد کی طرح راسخ ہوگیا ہے، ان کے پلید سینے کینہ وعداوت کے دفینے بن گئے ہیں۔

ان ظاہر اسباب پر نظر کرتے ہوئے میں اپنی نجات سے مایوس اور اپنی امیدوں کو منقطع پاتا ہوں لیکن اپنے رب عزیز ورحیم رؤف وکریم کی رحمت سے ناامید نہیں ہوں وہی تو جابر فرعونوں سے عاجز ضعیفوں کو نجات دلاتا ہے اور وہی تو زخمی مظلومین کے زخموں کو اپنے رحم وکرم کے مرہم سے بھرتا ہے، وہ ہر سرکش کے لئے جبار وقہار ہے، ہر ٹوٹے ہوئے دل کا جوڑنے والا، اور ہر نقصان رسیدہ فقیر کا کامیاب بنانے والا اور ہر دشوار کو آسان کرنے والا ہے۔

اسی نے نوح (علیہ السلام) کو غرق، اور ابراہیم (علیہ السلام) کو طپش وحرق، ایوب (علیہ السلام) کو مرض ومصائب، یونس (علیہ السلام) کو شکم ماہی، اور بنی اسرائیل کو بربادی وتباہی سے نجات دی۔

موسیٰ وهارون فرعون، وهامان وقارون، وكفى المسيح مامكر الماكرون، وكفى حبيبه المصطفى ما كان يمكر به الكافرون، فان رمقني صعوب، ولحقني خطوب، و محقني كروب، وحاقت بي ذنوب، فلست بفضله بمبتئس ولا من رحمته بمتائس، فربي هو الشافي والكافي، والمعافي والعافي، فكم ضرير يكون على شفا، اذا دعاه شفى، وكم معتد اذا اعتذر اليه واستغفره عذره وعفا، وكم كريب اذا ناداه كشف كربه، وكم غريب اذا ناجاه اسعف اربه، وكم مسجون يشد عليه الوثاق، يمن عليه الرب الخلاق، على الاطلاق، بالتخليص والاطلاق عن الحبس والاصفاد، من دون مان ولا فاد،

وانا مظلوم مهضوم مضطر و مسكين مستكين معتر، ادعوه مناجيا، وابتهل اليه راجيا، واناديه متضرعا، بحبيبه اليه متذرعا، وقد وعد ولا يخلف وعده باجابة المضطر، و كشف السوء عنه اذا دعاه، و

اسی نے موسیٰ و ہارون (علیہما السلام) کو ہامان و فرعون و قارون، اور عیسیٰ مسیح (علیہ السلام) کو مکرِ ماکرین اور اپنے حبیب مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دجل و فریبِ کفار پر غالب کیا۔ پھر اگر مجھے مشقتوں، صعوبتوں اور حوادث و معاصی نے گھیر لیا ہے تو اس کی رحمت و فضل سے کیوں مایوس ہوں، وہی میرا رب، شافی و کافی اور خطا پوش و آمرزگار ہے۔

بہت بیمار جو موت کے کنارے پر پہنچکر بھی اسے یاد کرتے ہیں، شفا پاتے ہیں۔ بہت خطاکار جب استعذار و استغفار کرتے ہیں مقبولِ بارگاہ ہوتے ہیں، بہت دردمند جب اسے پکارتے ہیں مصیبت سے نجات پاتے ہیں، بہت مسافر جب اپنی حاجتیں پیش کرتے ہیں مراد کو پہنچتے ہیں بہت قیدی جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہوتے ہیں خلاقِ مطلق انہیں بیڑیوں اور قیدوں سے بلا فدیہ و احسان چھٹکارا دلاتا ہے۔

میں بھی مظلوم و دل شکستہ و مضطر اور مسکین و ذلیل و محتاج بنکر اسی خدائے برتر کو پکارتا ہوں اس کے حبیب کو وسیلہ بنا کر اور امیدوارِ رحمت ہو کر اس کی بارگاہ میں بصد تضرع التجا کرتا ہوں وہ وعدہ خلافی نہیں کرتا، اس نے مظلوم و مضطر کے یاد کرنے پر اجابتِ دعوت اور کشفِ مصیبت

اعانة المظلوم اذا استصرخه وناداه، فهو ينجيني عما يشجيني، ويطلقني عما يقلقني، ويشكيني عما يشكيني، ويبرئني عما يبريني، وينقذني عمّن ياخذني، ويسلمني عمّن يظلمني، ويرحم على عويلي وبكائي، ويشفيني عن اشتكائي وشكائي، ويمحو شأمتي وشقائي، انه سامع الدعاء، واسع العطاء، دافع البلاء، فهو الذي ارجو لجلاء حزن الجلاء وابلاء حسن البلاء من الآلاء، يارب فأنجني مما انا فيه، يامعوّل المرتجين، ياموئل الملتجين، آمين، بحرمة حبيبك الامان الامين، وآله الميامين، وصحبه المحامين، ياارحم الراحمين، يااحكم الحاكمين، المنتقم للمظلومين من الظالمين، وآخر دعوٰنا ان الحمد لله رب العالمين۔

هذا وقد وصفت[1] بعض ما نابني، ونبذا مما اصابني، في قصيدتين احدٰهما همزية تحكى همزات الشياطين، والاخرىٰ دالية

کا وعدہ کیا ہے، وہی مجھے تکلیف سے نجات دے گا، وہی قلق و اضطراب سے آزاد کریگا وہی امراض سے شفا بخشے گا، وہی پکڑنیوالے سے چھڑائے گا، وہی ظالم سے بچائے گا، وہی میرے گریہ و بکا، پر رحم کرے گا، وہی میری بدبختی و شامت کو مٹائے گا، وہ دعا کا سننے والا، بہت دینے والا، اور بلاؤں کا دفع کرنے والا ہے۔ اسی سے جلاوطنی کے غم کو دور، اور بہترین نعمتوں کے عطا کرنے کی امیدیں وابستہ ہیں۔ اے میرے رب! مصیبتوں سے مجھے نجات دے، اے امیدواروں کے امیدگاہ، اور اے التجا کرنے والوں کے پناہ گاہ! اپنے حبیب امین، اس کی آل طاہرین ومبارکین اور اس کے صحابۂ محافظین دین کے صدقے میں ہماری سن لے، اے ارحم الراحمین! اور اے احکم الحاکمین! تو ہی ظالموں سے مظلوموں کا انتقام لینے والا ہے۔ بیشک ساری تعریفیں سارے جہان کے پالنے والے کے لئے ہیں۔

یہ پر درد و الم انگیز کہانی ختم ہوئی۔ میں نے اپنی مصیبت و پریشانی کا کچھ حال دو قصیدوں میں بھی لکھا ہے۔ ایک قصیدہ ہمزیہ ہے جس میں شیطانی وساوس کا ذکر ہے، اور

---

[1] فی بعض النسخ وضعت.

دالة علی مایعانی هذا الحزین الزمین، وختمتهما بمدح سید المرسلین، الرسول المکین الامین، علیه ازکی صلوات المصلّین، وتسلیمات المسلمین، وکنت قد نظمت قبلُ قصیدة فی قوافی النون، فریدة کالدر المکنون، کل بیت منها بیت القصید، بل بیت مشید، عددا بیاتها ثلاثة او یزید، لم یتیسر لی اتمامها، وعاقنی هجوم البلایا وارتکامها مطلعها: شعر

مانـاح اورق فی اوراق اشجان
الّا وهیّج اشجانی واشجانی

فان منّ علیّ ربی الخلاق، بالتخلیص والاطلاق، ذیّلتُها بحسن التخلّص بمدح من خص من مکارم الاخلاق، باوفی خلاق، علیه وعلیٰ اٰله اخلق الصلوات الی یوم التلاق، والله سبحٰنه ولی التوفیق والاحقاق۔

دوسرا دالیہ ہے جس میں اس غمگین ومعذور کی تکلیف ورنج کا تذکرہ ہے۔ ان دونوں قصیدوں کو سرورِ کائنات علیہ السلام والصلوٰۃ کی مدح پر ختم کیا ہے ان دونوں سے پہلے "نون" کے قوافی میں بھی قصیدہ لکھا تھا جو دُرِّ یتیم کی طرح فرید ویگانہ ہے۔ اس کا ہر شعر مضبوط ومرتفع قصر کی طرح ہے۔ اس کے تین سو سے کچھ زیادہ اشعار ہو کر رہ گئے، اس کے اتمام کی نوبت نہیں آئی۔ مصائب وآلام کے ہجوم نے تکمیل کا موقعہ نہیں دیا، اس کا مطلع یہ ہے،

مـاناح اورق فی اوراق اشجان
الّا وهیّج اشجانی واشجانی

اگر اللہ نے مجھ پر رہائی سے احسان فرمایا تو اس ذات کی مدح اس میں شامل کر کے ختم کروں گا جسے مکارمِ اخلاق سے پورا پورا حصہ ملا ہے۔ اس پر اور اس کی آل پر قیامت تک صلوٰۃ وسلام۔ واللہ سبحانہ ولی التوفیق والاکرام۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لجوی لہ بجوانحی ایراء   جمد الدموع وذابت الاحشاء

سوزِ دل سے میرے پہلو کی ہڈیوں میں آگ بھڑک رہی ہے، آنسو خشک اور اندرونی اعضاء پگھل گئے ہیں

ولِمَا أَلَمَّ من النوائب والنویٰ   یبکی الصدیق ویشمت الاعداء

مجھ پر نازل شدہ مصیبتوں اور میری اہل و وطن سے دوری پر دوست روتے اور دشمن خوش ہوتے ہیں۔

قد کنت فی عزّ وجاہ کان فی   اعیان اعیان بہ اقذاء

میں عزت و عظمت کی زندگی بسر کر رہا تھا، جو شرفاء و عظماء کی آنکھوں میں کھٹکتی تھی۔

اسی الصدیق علیٰ أساى وحارھن   حوری وفی آسوی آساء اِساء

میرے درد و غم اور تباہی و ہلاکت پر دوست غمگین و حیران ہیں اور چارہ گروں نے تیمارداری میں بُرا طرزِ عمل اختیار کر رکھا ہے

شمت العِدیٰ اذحال حالی واعتری   ماشابی المشّاء والوشّاء

میرے اس تغیرِ حال پر چغلخوروں کی خبر رسانی اور مخبروں کی ریشہ دوانی پر دشمن خوشیاں منا رہے ہیں۔

المُّ الَمّ بنا وھمٌ ھمّنا   ونویٰ لنا منہا بلًی وبلاء

رنج نازل، اور غم ہم پر طاری ہو گیا، اور ہماری دوری میں کہنگی و سختی ہے۔

حلت عظام مصائب جلّت بہا   وھن العِظام ودقّت الاعضاء

بڑی بڑی مصیبتوں نے گھیر لیا جن کی وجہ سے ہڈیاں کمزور اور اعضاء ریزہ ریزہ ہو گئے۔

انّی بلائی خدعة امرأةٍ[1] بلیٰ   کیدٌ عظیمٌ ماتکید نساء

مجھے ایک عورت کے مکر نے مبتلائے مصائب کر دیا، عورتوں کا مکر بڑا ہی زبردست مکر ہے۔

یخلبن خلقا بالمواثق ثم لا   لعھودھن وعھدھن وفاء

یہ عہد و پیمان کر کے مخلوق کو فریفتہ بنا لیتی ہیں، پھر ان کے عہد و میثاق کو وفا و قرار نہیں ہے۔

فدعت بان قد شہّرت ان امنت   قوماً نبت بھم الدیار ونأوا

اس نے یہ کہہ کر شہرت دی کہ جو لوگ گھر سے دور پڑے ہیں انہیں امن دیدیا گیا۔

---

[1] ملکہ وکٹوریہ۔

اذ غرّھم میثاقہا رجعوا الیٰ   اوطانھم مستبشرین وفاءوا

ایسے لوگ اس کے اعلانِ امان سے دھوکے میں آکر اپنے گھروں کو خوش خوش واپس ہوگئے

فاتیتُ دارھی اتبا اذ غرّنی   ایمان کافرۃ لھا استیلاء

میں بھی کافرہ متسلطہ کے اعلانِ امان سے فریب کھا کر مکان پہنچ گیا۔

ثم اعتدی عمّا لھا اذ مازعوا   میثاقھا فاتانی استدعاء

پھر تو حکامِ سلطنت نے اس کے عہد و میثاق کی پرواہ نہ کرتے ہوئے سختی شروع کی اور میری بھی طلبی ہوئی

منھم ،فعنّونی ، فعنونی کان   لم یُنوَفیما عاھدت ایفاء

انہوں نے مجھے روک لیا اور خوب اذیتیں پہنچائیں، گویا کہ اس عہدِ ملکہ میں ایفاءِ عہد کی نیت بھی نہ کی گئی تھی

لمّا عنوت وما عنتّ لھم ربت   من ظلمھم بی محنۃ وعناء

جب میں قیدی بنکر بھی انکا اطاعت گذار نہ بنا تو ان کی طرف سے رنج و تکلیف میں اور بھی زیادتی کردی گئی

اذ کنتُ فی عیش رغید رابغ   ھجم الکروب وفاجئت ارزاء

میں خوشگوار عیش و عشرت میں تھا، پھر غموں کا ہجوم اور مصائب کا ناگہانی ورود ہوا۔

شحن الحقودُ صدورَھم حتی بدت   بالضّغن من افواھھم بغضاء

ان کے سینوں کو کینوں نے بھر دیا ، ان کی زبانوں پر بھی بغض کی وجہ سے دشمنی ظاہر ہونے لگی۔

قد ضیّقوا عیشی علیّ فعفت   ونسیت عیشا کان فیہ رخاء

انہوں نے مجھ پر عرصہ حیات تنگ کر دیا ۔ میں اس زندگی سے دل برداشتہ ہوگیا

اور اس پُر مسرت زمانہ کو بھول گیا جس میں آسانی تھی۔

یومی ولیلی فی اشتداد حرارۃ   ودُجیٰ ھما الباحور والداداء

میرے رات دن سخت گرمی اور اندھیرے میں گذرتے ہیں گویا کہ سخت موسمِ گرما کے دن اور آخر ماہ کی اندھیری راتیں ہیں

فاللیل ساج ما لہ صبح ولا   للیوم عَوضُ عشیۃ ومساء

رات تو دوامی شکل اختیار کر چکی ہے جس کی صبح نہیں ہے اور نہ دن کے لئے شام اور رات ہی ہے۔

حجروا علیّ واسکنونی حجرۃ   لم یأتھا غیر السّموم ھواء

مجھے سب تصرفات سے روک کر ایک کوٹھڑی میں ٹھہرا دیا جس میں زہریلی ہوا کے سوا اور کسی قسم کی ہوا نہ پہنچ سکتی تھی

یا ویلہا من حجرۃ جُدرانہا　　تشوی الشوی وترابہا رمضاء

کیسی مصیبت تھی، اس کوٹھڑی کی دیواریں انسانی اعضاء کو بھونتی تھیں اور اس کی مٹی تپتی ہوئی زمین تھی

یا ویل سجن لامبال بساحۃ　　وکنیفہ ما فیہ قط خلاء

کیسا پریشان کن قید خانہ تھا، نہ تو اس کے میدان میں پیشاب خانہ تھا، نہ اس کے پاخانہ میں آبدست خانہ تھا

منعوا اشدّ المنع ان یلقانیَ الأ　　حباب والاخوان و الابناء

انہوں نے سختی کے ساتھ دوستوں، بھائیوں اور بیٹوں کو مجھ سے ملنے سے روک دیا

وسُلبت اثوابی وبعد تجردی　　لِلُبس اُعطِی میزر وکساء

میرے کپڑے چھین کر مجھے تہبند اور کملی پہننے کے لئے دے دی گئی۔

سلبوا الکِسیٰ لبسوا علی کساءھم　　مالی سوا ذاک الرّدیٔ رداء

کپڑے اتار کر قیدیوں کی کملی پہنادی، میرے پاس اس خراب کملی کے سوا کوئی دوسری چادر نہ رہی

سلبوا الاوانی والنعال بظلمہم　　لم یبق عندی قصعۃ و اناء

میرے برتن اور جوتے بھی ظلماً چھین لئے، میرے استعمال کے لئے کوئی برتن اور پیالہ بھی باقی نہ چھوڑا

مالی حَفِیٌّ فی حفای وکان لی　　من قبل لُبسی للکساء کساء

میرے ننگے پاؤں رہنے پر کوئی مہربانی سے پوچھنے والا بھی نظر نہ آیا حالانکہ اس کملی اوڑھنے سے قبل مجھے مجد و شرف حاصل تھا۔

کم من صفیّ بی حفیّ مُخلص　　فی الودّ منہ محوضۃ وصفاء

میرے بہت سے مہربان، مخلص اور صاف دل دوست جن کی محبت صدق و صفا پر مشتمل تھی،

صُدّوا فصدّوا عن محاورتی فلم　　یمکن مزاورۃ لھم و لقاء

انہیں روک دیا گیا، وہ میری ملاقات، بات چیت اور زیارت سے مجبوراً محروم رہے۔

لو شاھدونی حافیا استرجعوا　　ولکان منھم فی حفائی حفاء

وہ مجھے ننگے پاؤں دیکھتے تو انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھتے اور میری برہنہ پائی پر ان سے جھگڑا کر بیٹھتے۔

لم یترکوا فی السجن عندی خادما　　لیزید فی ایذائہم ایذاء

قید خانے میں میرے پاس کوئی خادم بھی ایذا رسانی کے ازدیاد کی وجہ سے نہ چھوڑا،

امسی واصبح مقلقا مالی سوی　　شوك القتاد او الوقاد وطاء

صبح وشام بے چینی سے گذرتے ہیں، کانٹے اور چنگاریاں، بستر کے بجائے مقدر ہو چکی ہیں

یعدو علی سواد بیضان عدی　　صهب الشوارب شربهم صهباء

بہت سے سفید رنگ، شرابخور، اور میگون مونچھوں والے دشمن مجھ پر ظلم و بیداد کرتے ہیں۔

سود الکبود وجوههم بیض لهم　　فی الجلد لین و فی القلوب قساء

وہ سیاہ جگر، سفید فام، نرم جلد اور سخت قلب واقع ہوئے ہیں۔

نکد وقاح مالهم عار و لا　　غار ولا حلم ولا استحیاء

وہ بدبخت وبے شرم ہیں، انہیں نہ ننگ و عار ہے نہ غیرت و حلم وحیا، ان کے پاس ہو کر گذری ہے

لُدٌّ غلاظ لیس فیهم رقة　　وحمایة وحمیة واباء

بڑے جھگڑالو اور سخت دل ہیں، ان میں نرمی اور مادۂ حمایت وحمیت نام کو نہیں،

جمع المعائب کلها فیهم ففی　　الذکران بغی فی الاناث بغاء

سارے عیوب ان میں موجود ہیں، مردوں میں سرکشی اور عورتوں میں حرام کاری پائی جاتی ہے

بمذا لهم وبغاءهن وبغیهم　　کثر الفسوق وشاعت الفحشاء

ان سب کی بدمعاشیاں، مردوں کی سرکشیاں، عورتوں کی حرام کاریاں فسق و فجور کی اشاعت وکثرت کا سبب بنی ہوئی ہیں۔

لم یکتفوا ظلما بحبسی بل رما　　فوق احتباسی غربة وجلاء

ظلم وستم کے لئے میری قید ہی کافی نہ سمجھی بلکہ جلا وطنی اور غربت ومسافرت کی سزا بھی دی۔

أسروا وأسروني الی جبل به　　قد باد من اسرائهم أسراء

قید کر کے مجھے ایسے پہاڑ پر رات میں وہ لے گئے جہاں پہنچ کر قیدی ہلاک ہو چکے ہیں۔

جبل احاطت ابحر بشعابه　　ماحوله غیر الفناء فناء

اس پہاڑ کی گھاٹیوں کو دریا گھیرے ہوئے ہیں، موت کے سوا اس کا کوئی صحن نہیں

مستوبل حاق الوبال لکل من　　یاتیه اذ عمت به الاوباء

یہاں کی آب وہوا ناموافق، اور آنے والے کے لئے وبال ہے، وبائیں ہر طرف عام ہیں۔

ذل الاعزۃ فیہ واعتلوا وقد　　عز الدواء وشاعت الادواء

یہاں شریف و عزیز ، ذلیل و گریہ کناں ہیں ، دوا ناپید اور بیماریاں بے شمار ہیں۔

عمّ العقاب عقابہ وفشا الودی　　یُربی الدویٰ فیہا دوی ودواء

اس کی گھاٹیوں میں عقوبت و ہلاکت عام ہے ، اس میں دوا ، دارو بھی
بیماری میں اضافہ کرتی ہے۔

ماساغ ماء فیہ للصادی ولم　　یھنأ الطاوِ فیہ قطّ غذاء

اس میں نہ تو پیاسے کے حلق سے پانی اترتا ہے اور نہ بھوکے کو غذا ہی بھلی معلوم ہوتی ہے۔

الاکل دِنٍّ ماھنا لحم و لا　　بصل ولا بقل ولا قثاء

ماش کی دال غذا ہے ، گوشت ، پیاز ، ترکاری ، ککڑی ، کچھ میسّر نہیں۔

ھو شط بحر ماھنا برّ و لا　　تبنٌ ولا مُبتٌ و لا حلواء

وہ دریا کا کنارہ ہے۔ جہاں میدان ، مہربان ، گیہوں اور شیرینی ، کسی چیز کا پتہ نہیں ،

قدمات احیاء من الاُسراء والُباقون لا موتی ولا احیاء

قیدیوں کے گروہ کے گروہ مر چکے ، جو بچے ہوئے ہیں ، وہ نہ مُردوں میں ہیں ، نہ زندوں میں ،

ما فیہ للموتی صلوۃ جنازۃ　　و ثری ولا کفن لھم وغطاء

میت کی نمازِ جنازہ ، قبر ، کفن اور پوشش کا یہاں کوئی سوال ہی نہیں ،

ما فیہ من عار علی عار و لا　　للمعتری المعترّ فیہ حیاء

یہاں ننگے کے لئے کوئی عار اور طالبِ احسان محتاج کے لئے سوال کی حیا نہیں ؛

ھو مرّۃ سوداء من یثوی بھا　　غلبت علیہ المرّۃ الصفراء

وہ ایسی خراب جگہ ہے جہاں طاقتور انسان پر بھی رہنے کے بعد زرد پتوں کا غلبہ ہو جاتا ہے ،

شقوا علی اُسراتھم فاصابھم　　بالاسر من ایذاتھم ایداء

قیدیوں کو ایسی مشقت میں مبتلا کیا گیا کہ ان کی ایذاء ہلاکت کے درجہ تک پہنچ گئی۔

قد اوثقت من غلّھم و غلیلھم　　اغلال لھم فدھاھم الاِعیاء

ان کے کینوں کی وجہ سے قیدیوں کی بیڑیاں مضبوط ہو گئیں اور تھکن نے دشواری میں ڈال دیا۔

اودت بہم بجحٌ وباسٌ ساءہم — احرامہم والبؤس والباساء

بلاؤں اور سختیوں نے انہیں ہلاک کیا، اور جو کسیداروں اور مصیبتوں نے رنج میں مبتلا کر دیا۔

وغیلہم حزنا وغلتھم علی — جوع وقلۃ غلۃ و غلاء

ان کی غم انگیز تشنگی اور بھوک پر پیاس، قلتِ غذا اور گرانی نے بھی مبتلائے مصیبت کر دیا۔

ولقد احلونی بمہلکۃ بہا — لا الارض ارض لا السماء سماء

انہوں نے مجھے ایسے مہلکہ میں ڈال دیا جہاں زمین، زمین ہے، نہ آسمان، آسمان

فسماءہا الدنیا غمائم صوبہا — سیل الغموم وارضہا حصباء

اس کا قریبی آسمان وہ بادل ہیں جن کی بارش غموں کا سیلاب ہے اور اس کی زمین سنگریزے ہیں۔

لاغیث فیہا انما من حرّہا — من جوہا تصبب الرحضاء

اس میں بارش نہیں ہوتی، گرمی کی شدت سے فضاء آسمانی سے بخارات کا پسینہ گرنے لگتا ہے۔

غمّ السموات الغمام فلا یری — لیلا ویومانیّر و ذُکاء

بادلوں نے آسمان کو ڈھانپ رکھا ہے جس کی وجہ سے دن میں سورج اور رات کو چاند نظر نہیں آتا

فاللیل فیہا ظلمۃ فی ظلمۃ — والیوم فیہا لیلۃ ظلماء

رات میں تو اندھیرے پر اندھیرا چھایا رہتا ہے اور دن اندھیری رات کی طرح ہے۔

ماکان فیہا قطّ یوم شامس — ابدا ولم تک لیلۃ قمراء

اس میں سورج والا کبھی دن نہیں ہوتا، اور نہ چاندنی والی راتیں ہوتی ہیں۔

افق بہیم ما استہل ہلالہ — احد ولم یرشمسہا حرباء

اس کے سیاہ افق پر کسی نے چاند نکلتا نہیں دیکھا اور نہ گرگٹ ہی سورج دیکھ سکا۔

ظلماء قد غشیت بحر مظلم — لا لؤلؤ فیہا ولا لألاء

وہ خود تاریک ہے اور تاریک دریا سے گھرا ہوا ہے اس دریا میں نہ موتی ہے نہ روشنی۔

لا فصل بین ربیعہا وخریفہا — لا الصیف صیف لا الشتا شتاء

یہاں کی فصل بہار و خزاں میں کوئی فرق نہیں، یہاں نہ گرمی، گرمی ہے نہ جاڑا، جاڑا،

تیھاء اتیھا یتیہ وللعدی　　یزداد فیھا التیہ والخیلاء

یہاں آنے والا حیران و پریشان ہوجاتا ہے اور دشمنوں کا کبر و غرور اور　　بڑھ جاتا ہے۔

ھم فی غنی وقنی ومال اذ علوا　　مالوا علی الاسری فھم فقراء

وہ تونگری، مسرت اور مال و دولت سے ہمکنار تھے، متکبر بن کر قیدیوں پر ظلم و ستم ڈھانے لگے تو

فقیر بن گئے (گویا اخلاقی طور پر دیوالیہ ہوگئے)

وطریقھا شُفُنٌ تموج فکل من　　رکبوا علیھا اصدعوا وقاءوا

اس کا راستہ ہچکولے کھانے والی کشتیوں کے ذریعہ ہے جو بھی ان پر سوار ہوتا ہے درد سر یا متلی میں ضرور مبتلا ہوتا ہے

وتبلّ امواج تجوش ثیابھم　　ووطائھم وتبلھم انداء

اس کی جوش مارتی ہوئی موجیں کپڑوں اور بستروں کو تر کرتی ہیں اور ان کی تری سے مسافر بھیگ جاتے ہیں

انئیت عن وطنی واھلی بغتۃً　　ظلماً ولی ذُرّیۃ ضعفاء

مجھے ظلماً اہل و وطن سے اچانک دور کر دیا گیا۔ مجھے کمزور و نحیف ذریت کو بھی چھوڑنا پڑا۔

ھم اُخرجوا عن دارھم ظلماً فما　　سکن واسکان لھم و ثواء

ان کو زبردستی ان کے مکان سے نکال دیا گیا، ان کے لئے آرام و سکون کی کوئی جگہ نہیں چھوڑی

فتمسکنوا اذ ما لھم سکنی ولا　　قوت ولا شیئ ولا اشیاء

وہ مسکین و فقیر بن گئے کیونکہ مکان، روزی اور کوئی چیز بھی ان کے لئے نہ رہی۔

وترکتھم غرثی جیاعاً ما لھم　　مال ولا مغنی لھم وغناء

میں نے انہیں حالتِ گرسنگی میں چھوڑا۔ نہ ان کے پاس مال و دولت ہے نہ مسکن و منفعت،

قد جانبتھم اقربون تجنّبوا　　کالجانب وجفاھم الاکفاء

ان سے اپنے بیگانے بن کر علیحدہ ہو گئے، اور برابر والوں نے ظلم و ستم اختیار کیا۔

الآمش انائی اُسرتی واقاربی　　ما من حمیم فیہ الا الماء

میرے خاندان اور اقارب کو قید و بند نے دور کر دیا اب یہاں پانی کے سوا کوئی دوست نہیں ہے

عَمِیت علی الابناء انبائی کما　　عمیت علینا منھم الانباء

میرے بیٹوں سے میری خبریں ایسی ہی پوشیدہ ہیں، جیسی ان کی مجھ سے،

أبكي لبُعد اقاربي واحبّتي ولهم على فقدي اسى وبكاء

میں احباب واعزہ کی دوری پر روتا ہوں، اور وہ میری جدائی پر

حق البكاء لهم على اذ الردى والعيش في الحبس الردئ سواء

ان کا مجھ پر رونا ایک حد تک ٹھیک بھی ہے کیونکہ مرنا اور ذلیل قید میں زندگی گذارنا دونوں برابر ہیں۔

أسكنتُ وحشا لا يرى فيه سوى الوحشيين الغربان والغرباء

مجھے وحشیوں میں بسا دیا گیا۔ اس قید خانہ (جزیرے) میں دو قسم کے وحشیوں کوّوں اور اجنبیوں کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔

مستوبلا وخسا فما بطعامه شبع ولا في مائه ارواء

اس کی آب وہوا ناموافق اور وبائی ہے۔ نہ تو اس کے کھانے میں شکم سیری ہے، نہ پانی میں سیرابی۔

فالماء ان مابه ری کما الماکول زن ماله استمراء

پانی گرم ہے جس میں سیرابی نہیں، جس طرح کہ غذا ماش ہے جس میں مزا نہیں۔

مافيه من عذب يسوغ ولا بها طعم يلذ ولا هناك فضاء

وہاں نہ شیریں پانی ہے، نہ لذیذ کھانا، اور نہ وسیع میدان ہی سامنے ہے۔

زادت على كربي عوارض جثتي الفتق والقولنج والقوباء

میری مصیبت میں میرے بدن کے عارضوں قولنج، فتق (فوتوں میں پانی اترنا) اور قوباء (داد) نے اضافہ کر دیا۔

وجدي لعافية عفت وعفت لى النكبات فيه وربحه نكباء

میرا غم والم مٹنے والی عافیت پر ہے اور اسمیں مصائب نے مجھے بھی مٹانے میں کسر نہیں رکھی اور اس کی ہوا ٹیڑھی ہے

كانت لفضل الحق فضل مثالة منها على الامثال لي استعلاء

فضل حق کے لئے رفعت وبلندی کا فضل تھا۔ اسی کی وجہ سے مجھے برابر والوں پر سربلندی تھی۔

ووجاهة بين الوجوه وجاهة تعنو لها الاعيان والرؤساء

شرفاء میں قدر ومنزلت ووجاہت میسر تھی جن کے سامنے رؤساء و

اعیان ملک جھکتے تھے۔

وبراعة ورفاعة ورفاهة ونزاهة ونباهة وعلاء

کمال ، رفعت ، وسعت ، نزہت ، بزرگی ، برتری

وُجد وجدٌ مُسعد مع جدّة　　　لم تبلها بلویٰ ولا لأواء

تونگری قلب، خوش بختی، نصیبہ وری، یہ سب نعمتیں حاصل تھیں جنہیں آزمائش و مصیبت بھی بوسیدہ نہ کر سکی ہے

و تمام عافیة و عرض ناده　　　عرض یزید و عزة قعساء

پوری عافیت، بڑھتے ہوئے سامان کی بنا پر بڑھتی ہوئی آبرو اور پائدار عزت بھی نصیب تھی۔

کم نعمة زالت و کم من نعمة　　　حالت وحل الضُّر و الضرّاء

بہت سی عیش کی زندگی متغیر اور کتنی نعمتیں زائل ہو گئیں، سختی اور بدحالی نازل ہو گئی۔

الله اقنانی علوما یقتنی　　　منها علوما جمة علماء

اللہ نے مجھے وہ علوم عطا کیے کہ ان میں سے بہت کچھ علماء نے حاصل کیے۔

حال النویٰ بینی و بین احبّتی　　　حالا و حال الحال و النعماء

میرے اور میرے احباب کے درمیان جدائی حائل ہو گئی، حالت اور نعمت متغیر ہو گئی۔

هجم الشرور و فاجئت فتن بها　　　ذهب السرور و ولّت السّرّاء

شرارتیں گھر آئیں اور فتنے اچانک چھا گئے، مسرت جاتی رہی اور شادمانی و راحت پھر گئی۔

قد سُلّط الأنصار فی امصارنا　　　أن صار انصارا لهم سفهاء

نصاریٰ ہمارے شہروں پر مسلط کر دیئے گئے، بے وقوف ہندستانی ان کے مددگار بن گئے۔

لم یعلموا ان لا وفاء لهم ولا　　　ان لا لهم مندوحة و وقاء

وہ اسے نہ سمجھ سکے کہ نہ ان کے پاس وفاداری ہے نہ وسعت و حمایت

من قبل ولّاهم علیها من لها　　　اذ صدّه عنها غنی و غناء

اس سے قبل ان پر ایسا شخص حکمران تھا جسے غناء و سرود اور مال و دولت نے خدمت اہل دیار سے روک دیا تھا

والآن اذ نُصر النصاریٰ افرطوا　　　فی الظلم فاخترم الضعاف جفاء

اب جب کہ نصاریٰ کی پورے طور پر مدد کی گئی تو وہ ظلم و ستم میں افراط سے کام لینے لگے، اور کمزوروں کو تو جور و جفا نے جڑ سے ہی اکھاڑ پھینکا۔

اقوی دیار کنّ اهله کما　　　اقوی الأولی اقووا و هم امراء

وہ دیار جو آباد تھا ویران ہو گیا جس طرح کہ امراء و رؤساء تباہ و برباد ہو گئے۔

فتفرقوا ایدی سبا و اذا رکت　　فرقا کثیرا اخذة وسباء

وہ قوم سبا کی طرح متفرق و منتشر ہو گئے ، ان کے بہت سے گروہوں کو قید و بند نے آدبایا۔

عال الغنی و ذل ذو عز کما　　هان الخطیر وصغر الکبراء

مالدار فقیر ، عزیز و شریف ذلیل ، عظیم و کریم خوار ، اور بڑے چھوٹے بن گئے ۔

قتلوا و غالوا جل من اخذوا هم　　مما ادعوا من جرمهم برءاء

جن کو پکڑ لیا ان کو قتل و ہلاک کیا حالانکہ جو جرم ان پر لگائے گئے تھے ان سے وہ بری تھے ۔

غالوا برایاهم برایا غیلة　　فجرت کما انفجر العیون دماء

انہوں نے اپنی بری اور بے گناہ رعایا کو بری طرح ہلاک کیا ، خون ایسا بہا جیسے چشمے ابل کر بہتے ہیں

کم خربوا بلدا ولم یذروا به　　بلدا افصار کانهم بیداء

بہت سے شہروں کو برباد و خراب کر کے ان کا نشان تک نہ چھوڑا ، وہ جنگل اور میدان معلوم ہونے لگے ۔

هدوا المساجد والقصور کانها　　لم تبن لم یک ثم قط بناء

مسجدوں اور محلوں کو منہدم کیا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس جگہ کوئی عمارت

ہی نہ تھی نہ وہاں کبھی کچھ بنا ہوا تھا

بخست بخستهم زروع الارض من　　شوم فلا ریع لها و نماء

ان کی نحوست و ذلت کی وجہ سے زمین کی پیداوار میں بھی کمی ہو گئی ، اس میں کوئی نشو و نما باقی نہ رہا ۔

قدروا علی الناس المعاش فقدهم　　ان لا غداء عندهم و عشاء

انہوں نے لوگوں پر زندگی تنگ کر دی ، ان کے لئے رات اور دن کا کھانا بھی نہ رہا ۔

فظهورهم ثقلت باوزار بما　　شحنت بطون صدورهم شحناء

ان کے سینوں میں بھرے ہوئے کینوں کے بوجھ سے ان کی پیٹھیں ثقیل ہو گئیں

افهل لعدوان تعدی حده　　حد وهل للمعتدین جزاء

کیا حد سے متجاوز سرکشی کی بھی کوئی حد ہے ؟ اور کیا سرکشوں کی کوئی سزا بھی ہے ؟

لم اقترف ذنبا سوی ان لیس لی　　مع هؤلاء مودة و ولاء

میں نے اس کے سوا کوئی گناہ نہیں کیا کہ ان سے کسی قسم کی محبت و دلچسپی نہیں رکھی ۔

فولاؤهم كفر بنص مُحكم — مافيه للمرء المحق مراء

اور بات یہ ہے کہ نص محکم قرآنی سے ان کی محبت کفر ہے، حق پرست انسان کو اس میں شک نہیں ہو سکتا

كيف الولاء وهم اعادي من له — خلق السما والارض والانشاء

ان سے محبت روا کیسے رکھی جا سکتی ہے جب کہ آسمان و زمین جس کی وجہ سے پیدا کئے گئے اس ذاتِ گرامی کے یہ نصاریٰ دشمن ہیں

هو اول النور الذي تبلّجت — بضيائه في العالم الاضواء

وہ پہلا نور ہے جو دنیا میں چمکا، اور اسی کی روشنی سے سارا عالم منوّر ہوا۔

هو اول الانباء اخرهم به — خُتم النبوة وابتدا الانباء

وہ اول و آخر پیغمبر ہیں، انھیں پر نبوت ختم ہوئی، اور انھیں سے اس کی ابتداء ہوئی تھی۔

بدءٌ به ابدى المهيمن سرّه — فلاجله الايداء والافناء

وہ بہترین سردار ہیں، خدا نے اپنا بھید انھیں کے ذریعہ ظاہر کیا اور انھیں کی وجہ سے آفرینش و ہلاکت ہے

قد خصّه الباري باوصاف علىً — لم يُعطها الاحداث والقدماء

خدا نے انھیں ایسے بلند اوصاف کے ساتھ مختص کیا جو کسی جدید و قدیم کو نہ بخشے گئے۔

اعطاه فضلا ليس يمكن ان يكون له شريك فيه او شركاء

انھیں ایسا فضل و علوِ مرتبہ عطا کیا کہ اس میں کوئی بھی ان کا شریک و سہیم نہیں

اسماه اذ اسماه بالحسنى فمن — اسماء خالقه له اسماء

ان کے اچھے اچھے نام رکھ کر رفیع الشان بنایا، خالق کے ناموں میں سے ان کے بہت سے نام ہیں

برّ رحيم مفضل ذو قوة — هادٍ رؤف مُحسن معطاء

نیکو کار، رحمدل، کثیر الفضل، صاحب قوت، ہادی، نرم خو محسن، کثیر العطاء ان کے اوصاف و نام ہیں

قد ذاد امكة رفعةً ميلادُه — وتشرّفت بوجوده البطحاء

ان کی پیدائش نے مکہ کی شان دوبالا کر دی، اور بطحا نے ان کے وجود سے شرف پایا۔

قد طاب طيبة اذ ثواها واعتلت — شرفا يُيمّم ساحها البُعداء

انکے قیام سے طیبہ (مدینہ منورہ) پاک و بلند رتبہ ہوا، دور دور سے لوگ اس کی زیارت کا قصد کر کے آتے ہیں۔

بشر بشیر بشرت زبر بہ　　　من قبلہ انبا بہ الانباء

وہ خوشخبری سنانیوالے انسان ہیں۔ ان سے پہلے صحف آسمانی اور انبیاء کرام ان کی بشارت دیتے آئے

انبا بعثتہ المسیح وقبلہ　　　موسیٰ کما انبا بہ شعیاء

ان کی بعثت کی عیسیٰ علیہ السلام اور ان سے قبل موسےٰ علیہ السلام نے بشارت دی جیسے کہ شعیاء

(ابن امصیا) نے عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت دی تھی۔

جاءت بنات الملک ساحتہا　　　انبا الزبور بہ وھن اماء

شہزادیاں ان کے دربار میں لونڈیاں بن کر حاضر ہوئیں، اسی طرح صحیفہ آسمانی کی پیشینگوئی تھی۔

اومی الی القمر المنیر فشقہ　　　وابانہ شقین ذا الایماء

چمکنے اور جگمگانے والے چاند کو انہوں نے اشارہ سے دو ٹکڑے کرکے دونوں کو جدا جدا کر دیا۔

والشمس اشفت للغروب فاوقفت　　　لیکون منہ للصلوٰۃ اداء

سورج غروب ہونیکے قریب پہنچ چکا تھا کہ آپ نے نماز کیلئے ٹھہرا لیا

حیتہ احجار واشجار وکم　　　نطقت لہ بفصاحۃ عجماء

پتھروں اور درختوں نے انھیں سلام کیا اور بہت سے چوپائے ان سے فصاحت کے ساتھ ہمکلام ہوئے۔

اروی بماء من اصابعہ جری　　　عطشیٰ فانھلھم روی ورواء

انگلیوں سے پانی جاری کرکے انہوں نے پیاسوں کو سیراب و شاداب کیا۔

کم اشبع الغرثیٰ الکثیر بیمنہ　　　نزر وکم نال المقل ثراء

ان کی برکت سے بہت بھوکوں کا تھوڑی سی غذا نے پیٹ بھر دیا، اور بہت نادار، مالدار بن گئے

قد حن جذع حین فارقہ کما　　　تبکی المتیم فی النوی البرحاء

ان کی جدائی پر کھجور کا تنا اس عاشق کی طرح رویا جس کو محبوب سے دوری کی سوز وتپش رلاتی ہے۔

اُمّان امانٌ یعلم حکمۃ　　　قد حکمت عن درکہا الحکماء

وہ امین و معتمد ہیں، اُمّی ہو کر ایسی حکمت کی تعلیم دیتے ہیں جسکے سمجھنے سے حکماء و عقلاء بھی عاجز ہیں۔

حکم تلا ذکرا حکیما احکمت　　　ایاتہ فیہا ھدی وشفاء

وہ حاکم ہیں، ذکر حکیم کی تلاوت کرتے ہیں، اس کی آیتیں محکم ہیں، ان میں ہدایت و شفا ہے۔

ذکراحوی حکما واحکاما بہا　　　عقل العقول وعیّت العقلاء

وہ ذکر حکمتوں اور حکموں پر مشتمل ہے جن سے عقلیں دنگ اور اہلِ عقل و دانش عاجز ہیں۔

بلغت بلاغته الکمال فافحم البلغاء منه واعجم الفصحاء

اس ذکرِ حکیم کی بلاغت کمال کو پہنچی ہوئی ہے اس نے بلیغوں کو ساکت اور فصیحوں کو گونگا بنا دیا ہے۔

جلّی سواد شرائع منسوخة　　　بشریعة هی سمحة بیضاء

انہوں نے اپنی سہل و روشن شریعت کے ذریعے منسوخ شریعتوں کی سیاہی کو دور کر دیا۔

فظهور ملته محا مللا کما　　　تمحو الکواکب من ذکاء ذکاء

ان کی ملت کے ظہور نے تمام ملتوں کو اس طرح مٹا دیا جیسے تارے سورج کے چمکتے ہی محو ہو جاتے ہیں

یمحو ضیاء الشمس نور کواکب　　　ویطو فوق کواکب داماء

سورج کی روشنی ستاروں کی چمک مٹا دیتی ہے ، اور سمندر دریاؤں پر غالب آجاتا ہے۔

فانه اظهر دینه و ادامه　　　فله علی مرّ الابود بقاء

اللہ نے ان کے دین کو غالب و باقی رکھا اور مرورِ دھور پر اسی کو بقا ہے۔

لاغرو ان جحد السفاه به ومن　　　فی قلبه داء العناد عیاء

اگر بے وقوف اور معاند دشمن ان کے ان کمالات کا انکار کرتے ہیں تو تعجب کی بات نہیں۔

ماضر عین الشمس زجحدته　　　عین الضریر ومقلة عمیاء

قرصِ خورشید کو اندھے کی آنکھ کی بے نوری ضرر نہیں پہنچا سکتی۔

الله اوجب ان ینوه باسمه　　　فی حین یرفع للصلوة نداء

اذان میں ان کے نام کو بلند آواز کے ساتھ پکارنا ، اللہ نے ضروری قرار دیا ہے۔

ان زاد ادم من بنوته علی　　　فکما اعتلی ببنیهم الاباء

اگر آدم کے مراتب اس فرزند سعید کی بدولت بلند ہو گئے تو تعجب کیوں ہے؟ بہت سے باپ بیٹوں کی وجہ سے بلند مرتبہ ہوئے ہیں۔

قد شاء رسل ان یکونوا امة　　　وسطا فاعطی بعضهم ما شاؤا

بہت سے رسولوں نے امتِ وسط ہونا چاہا ، ان میں سے بعض کی آرزو پوری کر دی گئی (جیسے کہ زمانہ امام مہدی میں عیسیٰ علیہ السلام یہ شرف حاصل کریں گے۔

هو مفزع للناس اذ فزعوا اذا حُشروا فليس لهم سواہ رجاء

میدانِ حشر میں لوگوں کی سراسیمگی کے وقت وہ جائے پناہ ہیں
ان کے سوا کسی سے امید نہیں ہو سکتی۔

یاتون آدم ملتجین وغیرہ مستشفعین فاحجم الشفعاء

وہ سب حضرتِ آدم اور دوسرے رُسل علیہم السلام کے پاس طلبگارِ شفاعت ہو کر پہنچیں گے
مگر وہ سب خاموشی اختیار کر لیں گے۔

فاتوہ حین استیئسوا فیہم میحابہ الانجاح والانجاء

ان سب سے مایوس ہو کر وہ سب ۔ ان سخی داتا کی خدمت میں حاضر ہوں گے، یہ فلاح و
نجات والی سخاوت سے کام لیں گے۔

طلب الانام رضاء مز مطلوبہ ھو ان یکون لمصطفاہ رضاء

انہوں نے مخلوق کے لئے خالق کی وہ خوشنودی چاہی، جو اس کے برگزیدہ بندے کی رضا تھی۔

و رضاءہ ھو ان یکون بمیحہ للمؤمنین من العذاب نجاء

اور ان کی رضا اس کے سوا کچھ نہ تھی، کہ ایمان والوں کو عذاب سے نجات ملے۔

اولادہ غرٌ اماجد سادۃٌ فوق الانام لھم سنًا وسناء

ان کی اولاد شریف بزرگ اور سردار ہے مخلوق پر انھیں رفعت و بلندی حاصل ہے،
اور ان کی چمک دمک کے سامنے سب ماند ہیں

خُطر کبار سادۃ کرم ھم النُبلاء والنجباء والنقباء

وہ عظیم و کریم اور نجیب و نقیب ہیں۔

فلھم مناقب لایحیط بوصفہا من واصفٍ مدحٌ ولا اطراء

ان کے اوصاف و مناقب کا احاطہ کسی مدح کرنے والے کی مبالغہ آمیز مدح بھی نہیں کر سکتی

افکیف یوصف جدُّ خطرجدُّھم خیر الانام وھم لہ اجزاء

ان بزرگوں کی فیروز بختی کی کیا تعریف ہو سکتی ہے جب کہ ان کے جدِ امجد افضلِ خلقِ خدا ہیں اور
وہ سب ان کے اجزاء ہیں۔

اصحابہ حُمس اشدّاء علی الکفّار فیما بینھم رحماء

ان کے صحابہ بڑے بہادر، آپس میں رحیم اور دشمن پر شدید ہیں۔

اثنی علیھم ربھم فی آیۃ مافوق ھذا للعباد ثناء

اللہ نے قرآن کی آیت میں ان کا وصف بیان کیا ہے۔ یہ وصف ایسا ہے
کہ اس سے بڑھکر انسانوں کی تعریف نہیں ہوسکتی

السابقون الاوّلون خیارھم وخیارھم خلفاءہ الخلفاء

انہیں "السابقون الاولون" سے یاد کیا گیا ہے، یہ طبقہ صحابہ میں سب سے بہتر ہے اور
ان میں بھی سب سے اعلیٰ خلفاء راشدین ہیں

یا رحمۃً للعٰلمین ارحم علی من لا لہ فی العالمین رثاء

اے رحمت عالم! اس شخص پر رحم کیجیے جس کے لئے زمانے میں کہیں رحم نہیں

افدیک مَنّ علی اسیر مالہ راثٍ ولا منٍّ لہ و فداء

میں آپ پر قربان! اس قیدی پر احسان فرمایئے جس پر نہ کوئی رحم کرنے والا ہے اور
نہ اس کے پاس فدیہ و احسان ہے۔

فاشفع لہ من دون ارجاء فقد ضاقت علیہ الارض والارجاء

نا امیدی اور تاخیر کے بغیر اس کی شفاعت فرمایئے کیونکہ زمین اور اس کے وسیع و عریض
اطراف و اکناف اس کے لیے تنگ ہو چکے ہیں۔

یا من اغاث بلطفہ جملاً شکا مالی شکوی نوی و شکاء

اے شاکی اونٹ کے فریاد رس! مجھ پر بھی ویسی ہی مہربانی فرمایئے۔ مجھے بھی بیماری
اور مجبوری کی شکایت ہے۔

قد طال اشکام الکروب فاشکنی فاشفع لیرفع ذٰلک الاشکاء

مصائب کی رسّی زمانہ دراز سے دراز ہے انکو دور فرمایئے اور سفارش کیجیے تاکہ اس اذیت سے نجات ملے

لم یبق لی غیر امتیاحک ولدی الرب الرحیم المستماح رجاء

آپ کی سخاوت وعطا کے سوا، رب رحیم و معطی کے سامنے مجھے کوئی امید نہیں۔

مِحنی ومحنی عنہ واحم علی مِحَنی بمنحل لابرد دعاء

مجھے نفع پہنچایئے اور خدا کی بارگاہ میں سفارش فرمایئے، میری مصیبتوں پر رحم فرمایئے کیونکہ آپ مستجاب الدعوات ہیں۔

یارب حقق لی رجائی ولا یکن لی فی النجاۃ من العدی ارجاء

اے خدا میری امیدوں کو ثابت کر دکھا اور دشمنوں سے مجھے نجات دلانے میں تاخیر نہ فرما۔

قد قمتُ اُرجی القاعدین الی الوغی وقعدتُ لمّا قامت الھیجاء

میں بیٹھنے والوں کو لڑائی میں برابر آگے بڑھاتا رہا اور لڑائی شروع ہو جانے پر خود بیٹھا رہا

اجرمت اذ احجمتُ من کسل فلم اشھد اذا ما استشھد السعداء

میں اپنی سستی کی وجہ سے ایسے موقع پر باز رہا۔ یہ میں نے بڑا جرم کیا، جب نیک بخت حضرات نے مجھے شہادت کے لئے بلایا تو میں حاضر نہ ہوا۔ یا میں شہادت سے محروم رہا جب کہ سعادتمندوں نے جام شہادت نوش کیا۔

ربّ اعف عنی ما اقترفت واعفنی فرجائی منک العفو والاِعفاء

اے آمرزگار! میرے قصور کو معاف کر، اور جو کچھ مجھ سے خطا سرزد ہوئی اس سے درگذر، تجھی سے عفو و درگذر کی امید ہے۔

ان جم اجرامی فعندک رحمۃ ماحدھا حد و لا اِحصاء

اگر میرے جرموں کی فرد بڑی ہے تو تیرے پاس ایسی وسیع رحمت ہے جس کی حدو نہایت نہیں۔

فاغفر وعاف وتُب علی ونجنی مما ابتلانی الخصم و المشاء

مغفرت وعفو فرما، توبہ قبول کرتے ہوئے دشمنوں اور چغلخوروں کے ابتلاء سے مجھے نجات دے۔

ان کان ما اشکوہ مقضیا فکم بدعاء مظلوم یردّ قضاء

میری مصیبتیں اگر میرے حق میں مقدر بھی ہو چکی ہوں، تب بھی مظلوم کی دعا سے ردّ قضا ہو جایا کرتا ہے۔

لا تشقنی ابدا واسعدنی فلا یجتاب من بعد السعود شقاء

مجھے بدبختی میں نہ ڈال، نیک بخت بنا، پھر سعادت کے بعد شقاوت کی نوبت نہ آئے

وَاَجِبْ لمظلوم دعاك وضرّہ　　فاضطرّہ کُفرٌ عدوا واساءوا

جو مظلوم تجھے پکار رہا ہے اس کی سن لے اور اس کی مصیبت دور کر، کافروں نے ظلم و تعدی کا اس کے ساتھ برا برتاؤ کیا ہے۔

قد ضفتُ ذرعا اذ تتابع منھم　　الارزاء والازدا، والاخزاء

ان کی طرف سے مصائب، اتہامات، اور رسوائیوں کے پے بہ پے حملوں نے مجھے ضعیف و ناتواں بنا دیا ہے

انت الوکیل فلا تُکلِ امری الی　　لَدّ دھانی منھم الاِشحاء

تو ہی میرا وکیل ہے، میرے معاملہ کو ایسے دشمنوں کے سپرد نہ کر جن کی ایذا رسانی نے مجھے مصیبت میں ڈال دیا ہے

رب اجزھم بالانتقام واَخزھم　　لیکون لی بجزائھم اجزاء

اے خدا! ان سے انتقام لے اور انہیں رسوا کر، تاکہ ان کی سزا سے میرے مصائب کی کچھ تلافی ہو سکے۔

رب انتقم لی من عدائی واوٗنی　　وانصُر فمنك النصرو الایواء

اے پروردگار! میرے دشمنوں سے انتقام لے اور مجھے پناہ دے، میری مدد کر، مدد و پناہ تیرے ہی پاس ہے

طال انتظاری للنجاح فلا یکن　　فیما رجوت من النجا ابطاء

کامیابی کا مجھے مدت سے انتظار ہے۔ اب میری امید نجات میں تاخیر نہ ہونی چاہئے۔

یا ربِّ عجّل ان یکون لما شجانی من شجونی فی الجلا جلاء

اے پروردگار! عجلت فرما تاکہ جلاوطنی کی تکلیفوں سے رہائی و خلاصی نصیب ہو۔

ھب اننی لم اقترف شیئا من الحسنات بل افعالی الاسواء

مجھے اعتراف ہے کہ میں نے کوئی نیکی کا کام نہیں کیا بلکہ بد اعمالی ہی میں مبتلا رہا۔

لقد انقضی عمری سُدی بملاعب　　فی اللھو الھانی بھا الاھواء

میری عمر لہو و لعب میں بے کار گذری، اور خواہشات نے مجھے نیکیوں سے غافل رکھا۔

لم اقترف عملا یثاب وانما　　قولی و فعلی سُمعۃ و ریاء

کوئی ثواب کا کام نہ کر سکا، میرے قول و فعل میں ریا، و نمائش کو دخل رہا

لکن فضلك واسع یُرجی بہ　　عن علتی و ماٰثمی الابراء

لیکن تیرا فضل و کرم وسیع ہے۔ اسی سے اپنی بیماری اور گناہوں سے براءت کی امید ہے۔

فارحم علیّ فقد دھانی فتنۃ   لم تُغن عنہا فطنۃ ودھاء

مجھ پر رحم فرما، مجھے ایسی آزمائش سے سابقہ پڑا ہے کہ اس سے زیرکی اور اصابتِ رائے بھی نہ بچا سکی۔

عافیتنی ستین عاما لاتنی   تزداد لی من فضلک الآلاء

ساٹھ سال تک تو نے مجھے امن وعافیت میں رکھا۔ تیرے فضل سے اس مدت میں نعمتیں بڑھتی ہی رہیں

فاختلّ عافیتی وفاجأ خلۃ   فارحم فمنک الخیر والاعطاء

پھر اچانک میری عافیت مختل اور احتیاج مسلط ہو گئی، رحم فرما، خیر وعطا تیری ہی جانب سے مل سکتی ہے۔

ووسائلی ربی الیک محمد   والمرتضیٰ وابناہ والزہراء

اے میرے رب تیرے دربار میں میرے وسیلے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، علی حسن حسین، اور فاطمہ زہرا ہیں

یارب صل علیہ ماصدحت علی   الایک الوریق حمامۃ ورقاء

اے پروردگار! جب تک سرسبز وشاداب مرغزاروں میں کبوتروں اور سبز رنگ پرندوں کی آوازیں گونجتی رہیں، ان پر رحمتیں نازل فرما۔

حیّاھم الرحمٰن ما احیی حیا   ارضا وسحّت دیمۃ وطفاء

اور جب تک بارش اور مسلسل جھڑ زمین کو سیراب کرتے رہیں، اللہ کی برکتیں اور اس کی رحمتیں ان سب بزرگوں پر نازل ہوتی رہیں۔

○

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عُودی فَعُودی مریضاً انہ عادی   اشفیٰ علی الحین حتی عادہ العادی

اے محبوبہ[1] واپس آ، اور ایک ایسے مریض کی عیادت کر جس کا مرض قدیم اور متعدی ہے اور جو ہلاکت کے اس درجہ قریب پہنچ چکا ہے کہ دشمن بھی عیادت کو آنے لگے ہیں۔

عوّاد سُقمِ قلیٰ عُوّادہ ولھوا   وکان یُلھی بزمّار و عــوّاد

وہ امراض کا عادی بن چکا ہے۔ اس کے عیادت کرنے والے اس سے تنگ آ کر کنارہ کش ہو چکے ہیں حالانکہ ستار اور بانسری بجانے والے اس کے گرد رہا کرتے تھے

واعتاد عید ودیٰ کلّ الاُساۃ بہ   فعاد کلّا عــلی اھل وعُوّاد

وہ مرضِ ہلاکت کا خوگر ہو گیا ہے، چارہ ساز و غمخوار بھی تھک چکے ہیں، وہ عیادت گروں اور اہل وعیال پر بارِ گراں بن گیا ہے۔

داء دواہ عیـاء لا دواء لـہ   حِمامہ حاضر من سقمہ البادی

وہ ایسا مریض ہے جس کی بیماری ایسا عجز و درماندگی ہے جس کی کوئی دوا نہیں، اس کے ظاہر مرض کیوجہ سے موت ہر وقت سامنے کھڑی ہے

وبــلاہ من زمن لا یشتفی زمنا   علاجہ لیس یجدی غیر اکماد

زمانہ کی حالت پر حسرت وافسوس ہے کہ مریض مُزمن کو شفایاب ہونے نہیں دیتا۔ اس کا علاج غم کی زیادتی کے سوا کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا

دائی عضال ولا یجدی بعائدۃ   عود لـداء بعود الـداء عوّاد

میری بیماری سخت ہے، عیادت گروں کی بار بار چارہ فرمائی بھی ایسے مریض کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی جو امراض کے ہجوم ورود کا عادی ہے

---

[1] عربی شاعری میں ہم سفر ساتھیوں یا محبوبہ سے خطاب کیا جاتا ہے اور علی العموم قصائد کی ابتدا اسی تخاطب سے ہوتی ہے ۱۲ شروانی غفا اللہ

حشاحشای جوی یشوی الجوانح والحشا کنا رغضا توری بایقاد

میرے سینے میں وہ غم و اندوہ بھر گیا جس نے اندرونی و بیرونی اعضا کو غضا[1] لکڑی کی آگ کی طرح جلا ڈالا جو جلاتے ہی بھڑک اٹھتی ہے۔

کو بین نار حشا التنور موقدھا وقودھا حطب من بعض اعواد

بہت فرق ہے اس آگ میں جس کے جلنے کی جگہ تنور کا پیٹ ہو جس کا ایندھن لکڑیوں کا گٹھا ہوتا ہے

و بین نار جوی یصلی جوانحنا وقودھا من حشامنا و اکباد

اور اس غم و الم کی آگ میں جو ہمارے اعضا کو جلاتی ہے جس کا ایندھن ہماری انتڑیاں، پسلیاں اور قلب و جگر ہیں۔

ولی السعود فلا سلمیٰ تسالمنی ولا سعاد تداریني باسعاد

نیک بختی نے پشت دکھادی، اب نہ سلمیٰ ہی مصالحت کرتی ہے اور نہ سُعاد ہی سعادتمندی کا اظہار کرتے ہوئے مدارات پر آمادہ ہے

خلقی تنکرحتی کاد ینکر لی من کان یعرفنی من یوم میلادی

میں غم اٹھاتے اٹھاتے بدصورت بن گیا، جو لوگ مجھے یوم پیدائش سے پہچانتے ہیں انہیں بھی شناخت میں تامل ہونے لگا ہے۔

فقوتی ضعفت والضعف ضوعف من تنقص فی القوی والجسم مزداد

میری طاقت کم ہوگئی، ضعف دونا ہوگیا، یہ سب کچھ قویٰ اور جسم میں بہت زیادہ نقص کی وجہ سے ہوا

لم یبق لی جلد مما اصیب بہ قلبی و روحی و جثمانی و اجلادی

میرے قلب، روح، جسم اور بدن کو جو مصیبتیں پہنچیں ان کی وجہ سے مجھ میں قوت باقی نہیں رہی۔

اودی لداھیۃ دھیاء قد حجمت ھدو ھم بارواح و اجساد

سخت مصیبت کی وجہ سے ہلاکت کو پہنچ گیا، روحانی اور جسمانی اذیتوں میں گھر کر شیخ فانی بن گیا۔

فاجئ بلاء فابکی اسرتی واولی القربیٰ واشمت اعدائی وحسادی

اچانک مصیبت نے آدبایا، اس نے میرے اہل خاندان اور رشتہ داروں کو رُلایا اور دشمن و حاسد کو ہنسایا۔

---

[1] غضا ایک درخت ہے جس کی لکڑی سخت ہوتی ہے۔ اسکی چنگاری بہت دیر تک نہیں بجھتی۔ سلطان نجد کو اہل غضا بھی کہتے ہیں۔ ۱۲ شاہد شروانی

لقد دهانی فاوهانی فزایلنی — الدهاء آن کادنی اشرار انکاد

اس مصیبت نے مجھے کمزور و ناتواں بنا دیا ، اور شریر و بدخصلت لوگوں کے مکر نے مجھ سے زیرکی و دانائی کو زائل کر دیا ۔

کادت ملیکتهم اذا امنت فرقا — من الرعایا و افواج واجناد

رعایا ، فوج اور لشکر کے گروہوں کے لئے امن کا اعلان کر کے ان نصاریٰ کی ملکہ نے بھی مکر سے کام لیا ۔

همت بتنصیرهم قبلاً وهم شیَع — من مسلمین ومن عبّاد ابداد

اس نے پہلے تو مسلمانوں اور بت پرستوں کی جماعتوں کو نصرانی بنانے کا قصد کیا ۔

فاستنکفوا وابوا واستنکروا ونبوا — الا اقِلّاء من دون و اوغاد

ان سب نے اعراض کرتے ہوئے صاف انکار کر دیا اور اسے برا سمجھتے ہوئے دوری اختیار کر لی البتہ تھوڑے سے ذلیل و رذیل اشخاص نے انکا کہنا مان لیا ۔

صالوا علی حزبها البیضان فانهزموا — کالشاء تنفر من سید و اساد

انہوں نے انکی سفید فوج پر حملہ کیا اور گردشِ تقدیر سے شکست کھا گئے ، جیسے بکریاں بھیڑیئے اور شیر سے دور بھاگتی ہیں ، یہی ان کا بھی حال ہوا ۔

فالفت جمع نرطٍ من تکاکرة — من الهنادك لاستدعاء امداد

پھر اس نے ہندؤں میں سے جاٹ ٹھاکروں کو اپنی مدد کیلئے جمع کیا

وبعض من یدّعی الاسلام فانخدعوا — اذا استعدّوا لِاعداء و اعداد

اور بعض مدعیانِ اسلام کو بھی ، وہ دھوکے میں آ کر مدد کے لئے آمادہ ہو گئے ۔

قد اعتدوا اذ عدوا اکفاءهم وعدوا — اذا اعتدوا العداهم کل اعتاد

انہوں نے اپنے ساتھیوں پر حملہ کر کے زیادتی سے کام لیا اور اپنے مقابل لوگوں سے پوری طرح تیاری سے پیش آ کر بڑا ظلم کیا ۔

فکم اعدّ والنصر الخصم من عُدد — ومن عساکر لا تحصی باَعداد

ان سب نے دشمن کی مدد کے لئے بہت سا سامانِ جنگ اور بے شمار لشکر اکٹھا کیا ۔

ثم استعانت رجالا ساکنی جبل　　فانجدوهم بانعام بانجاد

پھر اس ملکہ نے پہاڑیوں سے مدد لی، انہوں نے پوری رغبت اور بہادری سے مدد کی۔

وشهرت کتبا منشورة نشرت　　ایمانها للمحاریب و اضداد

اس نے محاربوں اور دشمنوں کی امان کے اشتہارات جاری کئے۔

الا الذی قتل الصبیان او قتل النسوان او غال مغلولا باقیاد

کہ بچوں، عورتوں اور قیدیوں کے قاتلوں کے سوا سب کو امان ہے

من سالموا سلموا آل القتال الی　　عمالها واطاعوا طوع منقاد

جنہوں نے صلح کی، آلات حرب اس ملکہ کے عاملوں کے سپرد کر دیئے اور فرمانبرداروں کی طرح اطاعت گذار بن گئے۔

وطمعت کل دهقان فطاوعها　　جل الدهاقین من قار ومن باد

اس نے تمام دہقانیوں کو لالچ دیا جس کی وجہ سے اکثر دیہاتی اور بادیہ نشین اس کے مطیع ہو گئے۔

فنصرهم سلطا لانصار فانتصروا　　اذا انجدوهم باغوار وانجاد

ان سب کی مدد نے ان کو مسلط و غالب کر دیا، جب کہ ہر پستی و بلندی پر ان کی مدد کی۔

واخوا البلاد بتخریب ولم یذروا　　ما کان فیهن من رسم وآبلاد

انہوں نے شہروں پر غارتگری کے ذریعہ قبضہ کر لیا اور ان کے آثار و نشانات بھی باقی نہ چھوڑے۔

قد انجدوا واغاروا وقتلوا نهبوا　　وافسدوا فی النواحی کل افساد

وہ بلند اور پست مقامات پر پہنچے اور قتل، لوٹ مار، اور سارے علاقہ میں فتنہ و فساد پیدا کر دیا۔

هدوا المعابد واجتاحوا المساجد واغتالوا عبادا غلوا فی قتل عباد

عبادت گاہوں کو منہدم اور مسجدوں کو مسمار کر دیا، خدا کے بندوں کو قتل کیا اور عابدوں کی ہلاکت میں حد سے تجاوز کر گئے

من کان منحرفا عن طوعها فشلوا　　لم یسمعوا امر حکام و قواد

جن لوگوں نے اس ملکہ کی اطاعت نہیں کی تھی ان پر ایسی بزدلی چھائی تھی کہ نہ اپنے سردار کا حکم مانتے تھے اور نہ حاکم کی بات سنتے تھے۔

اعیت فریقاعن الهیجاء فاقتهم   واقعد البعض جبنٌ کل اقعاد

ان میں سے ایک فریق کو فقر و فاقہ نے جنگ سے تھکا دیا تھا اور دوسرے گروہ کو بزدلی نے پاؤں توڑ کر بٹھا دیا تھا

لما رأت انه لم یبق مختصم   للحرب باغٍ ولا باغٍ ولا عاد

جب ملکہ نے دیکھا کہ کوئی جنگ کا خواستگار دشمن، باغی، اور سرکش باقی نہیں رہا۔

عادت فعادت فما منّت بما وعدت   منّت حبائل میثاق و میعاد

تو اپنے قول سے پھر گئی اور دشمنی پر اتر آئی۔ کوئی اپنا وعدہ پورا نہ کیا اور عہد و میثاق کی رسیوں کو کاٹ دیا۔

منّت بما وعدت ثم اعتدت وعدت   فکان موعدها کیدًا لایعاد

پہلے وعدہ کر کے لوگوں کو آرزومند بنا دیا پھر عداوت و ظلم سے کام لیا، دراصل کا وعدہ، وعید کے لئے مکر تھا

رجعت اذ غرنی ایمان کافرة   زورا بعهد الی اهلی و اولادی

اس کافرہ کے جھوٹے وعدوں اور قسموں سے دھوکے میں پڑ کر میں بھی اپنے اہل و عیال کیطرف لوٹ آیا۔

وآب من ند من انداد نا فبلا   فی النصاری بحبسی وز انداد

ہمارے ساتھیوں میں دوسرے روپوش لوگ بھی واپس آ گئے مگر نصاریٰ نے صرف مجھی کو قید میں ڈال دیا۔

جرّوا الی السجن ضمّونی الی فئة   کسری و اسری باغلال و اصفاد

وہ مجھے قید خانے کھینچ کر لے گئے اور ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں بندھے ہوئے درماندہ و شکستہ دل قیدیوں میں شامل کر دیا

اسری عناة یعانون الشدائد فی   حذو حدّة و سجّان و حدّاد

وہ بڑے جفاکش قیدی تھے قید خانہ کے دربانوں اور نگہبانوں کی بے انتہا سختی اور ان کے مزاج کی تیزی برداشت کرتے تھے

شق الغلاظ علیهم لم یذر جلدا   فیهم و شق جلود اجلد جلّاد

بدخو اور درشت مزاج نگہبانوں کی محنت و مشقت نے ان کے بدن پر کھال نہ چھوڑی تھی اور جلّاد کے کوڑوں نے بدن کی کھال پھاڑ دی تھی

جمعُ العدی جمعوا بینی و بین عدی   وفرّقوا بین اعضائی و اعضادی

دشمنوں کی جماعت نے دشمنوں کو اور مجھے جمع کر دیا اور میرے اعضاء اور بازوؤں کو جدا کر دیا۔

قد صدّ عنی الرجال کنت آملهم   و صُدّ عنی اخلّائی و اودادی

جن لوگوں سے مجھے امیدیں تھیں وہ اعراض کر گئے اور میرے دوستوں اور ساتھیوں کو مجھ سے علیحدہ رکھا گیا۔

وحال بینی وبین الاقربین نوی　　وغمنی بینُ اولادی واحفادی

میرے اور اعزہ کے درمیان جدائی حائل ہوگئی اور اولاد و احفاد کے فراق نے مجھے غم میں ڈال دیا۔

حُبِستُ فی السجن منجوداً ولم یذروا　　عندی رفیقاً کخبّازٍ ونجّاد

میں غمگین و حزین جیل میں پہنچادیا گیا۔ میرے پاس میرا کوئی رفیق باورچی، یا خدمتگار بھی نہ چھوڑا گیا۔

وقد کسونی کساءً بعد ما سلبوا　　الکساء وانتزعوا لبسی وازوادی

میرا عمدہ لباس اتار کر قیدیوں کے کپڑے پہنادیئے، میرا توشہ اور کپڑے چھین لئے۔

اعطوا وطاءً غلیظاً شائکاً خشناً　　لنوم لین بلین الفرش معتاد

انھوں نے سخت موٹا اور چبھنے والا بستر ایسے راحت پسند شخص کو سونے کے لئے دیا جو نرم بستر کا عادی تھا۔

سقوا اجاجاً حمیماً از شکوت صُدًے　　واعتدوالی غذاءً غیر معتاد

میں نے پیاس کی شدت کی شکایت کی تو گرم اور کھاری پانی پلایا اور ایسی غذائیں مہیا کیں جنکا میں کبھی عادی نہ تھا۔

لم یقنعوا باحتباسی بل اضیف الی　　حبسی جلائی وتغریبی وابعادی

میرے قید کرنے پر ہی اکتفا نہ کی بلکہ اس کے ساتھ جلا وطنی، مسافرت اور اہل و وطن سے دوری کا بھی اضافہ کردیا

فارکبونی والاسریٰ آخرین علی　　فلک یمور بموج البحر میّاد

مجھے اور دوسرے قیدیوں کو جہاز پر سوار کرکے لے چلے اور وہ جہاز سمندر کی موجوں سے ہچکولے کھاتا چلتا تھا۔

وانزلونی مع الاسریٰ علی جبل　　قاصٍ تنی دونه اوهام قُصّاد

اور مجھے ان قیدیوں کے ساتھ ایک دور دراز پہاڑی پر اتار دیا جہاں قصد کرنے والوں کا وہم و گمان بھی نہ پہنچتا تھا۔

شطّ المزار بنا اذ شطّ حابسنا　　بشطّ بحر له مدّ بازباد

ہمارے قید کرنے والے نے ہم پر ظلم روا رکھ کر ہماری دید سے لوگوں کو محروم کر دیا اور ہمارے درمیان ایسے سمندر کا کنارہ حائل ہوگیا جس میں پانی کے جوش سے جھاگ پیدا ہوتے تھے۔

ارواحه تنزع الارواح من خبث　　کصرصرٍ اُرسلت قبلاً علی عاد

وہاں کی ہوائیں اپنی خرابی کی وجہ سے جان نکال لیتی تھیں۔ وہ اس ہلاکت خیز آندھی کی طرح تھیں جو قوم عاد پر اس سے قبل بھیجی جا چکی تھی۔

خاب المُنٰى والمنا قد عم فيه وما — لميّت فيه من دفن والحاد

اس میں آرزوئیں پامال اور موت عام تھی، اور کسی میت کے لئے دفن و قبر کا کوئی انتظام نہ تھا۔

يفيض فيه هموم ما جمة ابدا — غيم هموم فسارٍ رائح غاد

غموں کے بادل قسم قسم کے رنج والم برساتے رہتے ہیں اور وہ بادل صبح، شام اور شب کو آتے جاتے رہتے ہیں

فلا يرى فيه يوما ضوء شمس ضُحٰى — ولا سنا نيّر بالليل وقّاد

وہاں کبھی دن میں سورج کی روشنی نظر آتی ہے، نہ چمکنے والے چاند اور تاروں کی رات میں چمک۔

يومي كليلي وليلي سرمد تقف — النجوم فيه كان شدّت باوتاد

میرا دن، رات کی طرح ہے، اور میری رات کو دوام ہے۔ آسمان پر ستارے ایسے رکے ہوئے ہیں جیسے میخوں میں انہیں باندھ دیا گیا ہو

كانت كايامنا بيضا ديا جرنا — وكان ايامنا ايام اعياد

ایک زمانہ وہ تھا کہ ہماری تاریک راتیں، روشن دن کی طرح تھیں اور ہمارے دن عید کے دن تھے

كيف احتيالي لاطلاقي وقد ضربت — عليّ ارضي اقلّتني باسداد

میری رہائی کے لئے کیا حیلہ ہو سکتا ہے جو زمین میرا بار اٹھائے ہوئے ہے اسکے سارے راستے مسدود ہیں

كيف الخلاص وخصمي ظالم شكس — ويلاه من كافر بالله كنّاد

مجھے چھٹکارا کیسے نصیب ہو سکتا ہے، میرا دشمن ظالم و بدخو ہے، اس کافر کی خرابی ہو جو خدا کا بھی منکر ہے۔

اغرى النصارى بتعذيبي زنادقة — يلونهم وتولّوهم لالحاد

مجھے تکلیف پہنچانے کے لئے نصاریٰ نے ایسے زندیقوں کو آمادہ کیا جو ان کے مقرب ہیں اور وہ بھی جن سے ان کے الحاد کی وجہ سے محبت کرتے ہیں

غاظوا وجدّوا وتجوا في معاقبتي — عادوا وبادوا باضغان واحقاد

وہ غصے میں آپے سے باہر ہو گئے اور میری اذیت رسانی میں ہر ممکن جد و جہد سے کام لیا، پوری پوری دشمنی برتی اور بغض و کینہ کا کھلا مظاہرہ کیا۔

اَیستُ من اَملی اذ قطّعت حِیَلی — وجرت كالطير في احبول صيّاد

اپنی تدبیروں کے انقطاع پر میں ناامید و مایوس ہو گیا اور شکاری کے جال میں پھنسے ہوئے پرندہ کی طرح حیران و پریشان

کالظبی فی جُرّة امسی یُناوصها وقد یسا لمهامن خوف مصطاد

میری حالت اس ہرن سے مشابہ تھی جو شکاری کی لکڑی سے موقع شکار کے خوف سے مصالحت کر بیٹھا ہو۔

رجوت ناسارجامن اقسلوامُعُبا قد اقلعت بعد ابراق وارعاد

میں نے چند لوگوں سے ان قحط زدہ اشخاص کی سی امید باندھی جو ایسے بادلوں سے جو گرج اور چمک کر چھٹ گئے ہوں، امیدیں باندھ لیتے ہیں۔

قطعت عما سوی للہ الرجاء فما ممن سواہ رجاء رِفدٍ و ارفاد

میں نے خدا کے سوا سب سے کنارہ کشی اختیار کرلی، اس کے سوا کسی دوسرے سے بخشش و امداد کی امید نہیں ہے۔

فلا اؤمل الا رحمة الملک العدل الذی ذکرہ حرزی واورادی

اس بادشاہ عادل کی رحمت کا ہی میں امیدوار ہوں جس کا ذکر میرا حرزِ جاں اور میرا ورد ہے۔

حیٌّ یُحَیِّی حفی بالدعاة فلا یردُّ دعوة ملهوف ولاراد

وہ ہمیشہ زندہ رہنے والا، حیا رکھنے والا اور پکارنے والوں کے ساتھ مہربانی سے پیش آنیوالا ہے، ہلاکت زدہ اور مظلوم و مضطر کی دعا رد نہیں کرتا ہے

یُنجی اُساری ضعافامن جبابرة شوس اشداء جابوا الصخر بالواد

وہ کمزور قیدیوں کو ایسے جابر، متکبر اور سخت انسانوں سے نجات دلاتا ہے جو وادی میں پتھروں کو کاٹنے والے ہیں

یُسلّط الضعفاء العاجزین علیٰ صِید شِداد کفرعون وشدّاد

وہ فرعون و شداد جیسے سخت و جابر بادشاہوں پر کمزور عاجزوں کو مسلط کر دیتا ہے۔

فمن سواہ لعانٍ لا احتیال لہ وما لا طلاقه منّ و لا فاد

اس مصیبت زدہ کے لئے جس کا کوئی حیلہ وسیلہ نہ ہو اور جس کی رہائی کے لئے نہ کوئی فدیہ ہو اور نہ احسان، خدا کے سوا کون چارہ ساز ہے

یارب اَنقذہ من ایدی عِدی کفر بجاہ احمد محمود وحمّاد

اے پروردگار! اس عاجز و خستہ کو، ستودہ صفات، احمد و حمّاد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے طفیل میں، کافر دشمنوں کے چنگل سے نکال

ارسلتہ رحمۃً للعالمین الی الانام طرًّا لارفاد وارشاد

تو نے انہیں تمام مخلوق کی طرف اس کی رہبری و ہدایت اور عطا و اعانت کے لئے رحمتِ عالم بنا کر بھیجا ہے۔

غوث المنادی لکف الباس مفزعنا	یوم التنادی ندیّ الکف فی النادی

وہ مصیبت و عذاب روکنے کے لئے پکارنے والوں کے فریاد رس، روزِ قیامت میں ہماری پناہ گاہ، او مجلس میں بڑے سخی و جواد ہیں

ھاد وحام و ماح مائح لِغَوِی	عم ومستصرخ مستشفع جادی

وہ گمراہ کے لئے ہادی، نابینا کے حامی، فریادی کے مددگار، سفارش چاہنے والے کے شفیع اور سائل کو عطیات سے نوازنے والے ہیں

جار لجار شکا جور ایمیم لمن	قد استماح وممتاد لممتاد

ظلم سے شاکی پڑوسی کے محافظ ہیں، امداد چاہنے والے کے معاون اور طالبِ عطا کے لئے سخی ہیں۔

ھاد یبشر قد القت بشارتہ الرُّھبان فی رَھب والھُود فی ھاد

وہ خوشخبری سنانے والے ہادی ہیں، راہبوں نے ان کی آمد کی اطلاع حالتِ خوف میں پہنچائی اور اسی طرح یہود نے۔

ھدی سبیلا سویا کل منحرف	عن السبیل وسوّی کل متئاد

انہوں نے ہر گم کردہ راہ کو سیدھا راستہ بتایا اور ہر ٹیڑھے کو سیدھا کر دیا۔

غوث وغیث للملھوف ومنتجع	بحر وبرٌ لوُرّاد ورُوّاد

وہ غمگین کے فریاد رس اور طالبِ بارش کے لئے بادل، گھاٹ پر آنے والوں کے لئے دریا چارہ اور پانی کے متلاشی کے لئے دسر سبز میدان ہیں۔

بحرٌ شریعتہ بیضاء صافیۃ	مشروعھا مشرع عذب لوُرّاد

وہ دریا ہیں، ان کی شریعت روشن اور صاف ہے جس کے احکام پیاسوں کے لئے شیریں چشمہ ہیں۔

برٌ ندیٌ یشبع الغرثی اصابعه — جادت فجادت جُواد اللاهبِ الصادی

وہ بڑے نیک اور سخی ہیں، بھوکوں کا ان کی انگلیاں پیٹ بھرتی ہیں، جب انگلیاں سخاوت پر آتی ہیں
تو تشنہ لبوں کی پیاس پر غالب آجاتی ہیں

ان زاد آدم جدّا من لدنه فکم — بابن علا جدٌّ آباء و اجداد ۔

آدم علیہ السلام کی بزرگی میں ان کی وجہ سے اضافہ ہوا تو تعجب کیوں ہے۔ بہت سے آباء واجداد
نے اپنی اولاد کے مجد و شرف کے باعث بلند مرتبہ پالیا ہے

ختم النبیین اَولاهم واوّلهم — بدء لبدئ سناه بدءُ ایجاد

وہ خاتم النبیین ہیں، نبیوں میں سب سے اول و افضل ہیں، مخلوق میں اولیت کا شرف انھیں کو
حاصل اور انھیں کی روشنی سب سے پہلی ایجاد ہے۔

فدینه ناسخ الادیان قاطبة — باقٍ علیٰ مرّ احقاب و آباد

ان کا دین تمام دینوں کا ناسخ اور رہتی دنیا تک رہنے والا ہے۔

تلا کتابا حکیما مُحکما حکما — یقضی علیٰ کل مرتاب لمُرتاد

انہوں نے حکمت والی مضبوط اور فیصلہ کن کتاب کی تلاوت کی، وہ کتاب متلاشیِ حق کے حق
میں اور شکی کے خلاف فیصلہ صادر کرتی ہے۔

دعا لیدخل فی افراد امته — رسل علیٰ ماروی اصحاب سناد

رسولوں نے ان کے امتی بننے کی خدا کی بارگاہ میں دعا کی روایات میں اسناد کیساتھ اسکا تذکرہ موجود ہے

دعوا لکی یحسبوا من امة وَسَط — عدل علی الامم الماضین اشهاد

انہوں نے امتِ وسط، شاہدِ عادل (امت محمدیہ) میں شمار ہونے کی دعا کی جو کہ تمام سابقہ امتوں
پر قیامت کے دن گواہ بنے گی۔

فمن اولئك من لم یعط ما اَملوا — والبعض فازوا بما مول و مرتاد

ان میں سے بہت کی آرزو پوری نہ ہوئی اور بعض اپنی مراد کو پہنچے۔

اکرم بعترته الغرّ الکرام فهم — خیر النبال وهم سادات امجاد

کس قدر قابلِ عظمت ہے، ان کی شریف، بزرگ، نجیب، اور بلند رتبہ اولاد

اصحابہ جاهدوا للدین واجتهدوا　　لنصره واجدوا کل اجداد

ان کے صحابہ نے دین کے لئے جہاد کیا، معاونت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی
اور اس سلسلہ میں طرح طرح کی کوششیں کیں

یاسید الخلق یاخیر الوری خلقا　　یاخیر من یرتجی یاخیر اجواد

اے مخلوق کے سردار، اور اخلاق میں سب سے بلند و بہتر، امیدوں کے
بہترین سہارے، اور تمام اہلِ سخاوت سے بلند مرتبہ رکھنے والے۔

افدیک محنی وھنی واکفنی محنی　　بالمیح یاخیر ممتاح وممتاد

میں آپ پر قربان، مجھ پر رحم فرمایئے، اور مجھے بخشش سے نوازیئے، اپنی عطا سے میری مشقتوں
اور غموں کی تلافی کیجئے، اے جود و عطا کے مالک!

فاشفع وھنی وسل بی لینجینی　　ممن بلائی بتغریبی وافرادی

مجھ پر کرم کرتے ہوئے خدا سے میری سفارش کیجئے کہ مجھے جلاوطنی اور قیدِ تنہائی کی مصیبت و
آزمائش سے نجات دے۔

وان ینفس عنی عاجلا کربی　　اللاتی تجاوزن عن حصر وتعداد

اور جلد سے جلد میری ان پریشانیوں اور اذیتوں کو دور کرے جو حدّ و
شمار سے متجاوز ہو چکی ہیں۔

وان عافینی فورًا ویبدلنی　　وجدی بوجد واشقائی باسعاد

اور مجھے عجلت کے ساتھ اچھی عافیت میں لے اور میرے غم کو سرور اور شقاوت کو سعادت سے بدل دے

وان یتیم حِمامی بالشهادة فی　　جوار مثواک یاجاری ویاهادی

اے میرے محافظ و رہنما! اس بات کی بھی دعا کیجئے کہ خدا میری موت آپ کی اقامت گاہ کے
جوار میں شہادت کی موت مقدر کر دے۔

ناشدتک الله فاقبل مدحتی کرما　　حتی افوز بمنشودی بانشادی

میں آپ کو خدا کی قسم دلاتا ہوں، اپنے کرم سے میری مدح و ستائش قبول فرمایئے تاکہ اشعار خوانی
کی بدولت میں اپنی مراد کو پہنچوں۔

علیك ازکی صلوة اللہ ما صدحت ورقاء ایك وریق اوشد اشادی

آپ پر اللہ کی پاکیزہ رحمتیں نازل ہوتی رہیں جب تک سرسبز و شاداب
مرغزاروں میں قمریوں کی آوازیں گونجتی رہیں اور گانیوالے گاتے رہیں

قال رحمہ اللہ :

تمت القصیدتان فی شہر رجب ۱۲۷۶ھ یعنی الفا ومائتین وستا وسبعین من الهجرة المقدسة النبویة علی صاحبہا ازکی الصلوة والتحیة وانا محبوس فی الجزیرة الوبیة، نجانی اللہ سبحنہ منہا برحمتہ الوسیعة، وقدرتہ البدیعة، بجاہ حبیبہ وآلہ وعترتہ علیہ وعلیہم ازکی الصلوات واسنی التسلیمات۔

مصنف علیہ الرحمۃ نے آخر میں تحریر فرمایا یہ دونوں قصیدے رجب ۱۲۷۶ھ میں بحالت اسیری جزیرہ وبائی تمام ہوئے۔ اللہ تعالٰے اپنی رحمتِ وسیعہ اور قدرتِ بدیعہ سے اپنے حبیب اور اس کی آلِ اطہار اور اولادِ امجاد کے طفیل اس وبائی جزیرہ سے نجات دے، ان شاء اللہ کی روشن نعمتیں اور پاکیزہ رحمتیں نازل ہوں۔

تتمہ

باغی ہندوستان

— سلسلۂ خیرآبادی اور مولانا فضل امام کی ایک تصنیف کا تعارف —

مرتبہ:

محمد عبدالحکیم شرف قادری

مولانا فضل امام خیرآبادی کی ایک غیر مطبوعہ تصنیف

مقدمۂ تاریخ یا خلاصۃ التواریخ (فارسی) اس کتاب کے دو نسخے ہماری نظر سے گزرے ہیں:۔

۱۔ عجائب گھر لائبریری (لاہور) میں Acc. No 90 محفوظ ہے یہ نسخہ ۳۶۹ ورق پر مشتمل اور خوشخط لکھا ہوا ہے۔ اس نسخہ پر کتاب کا نام مقدمہ تاریخ لکھا ہوا ہے۔

۲۔ مولوی عبد الرشید لاجپت نگر (شاہدرہ) کے پاس دیکھنے کا اتفاق ہوا، اب یہ نسخہ مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان کے کتاب خانہ گنج بخش راولپنڈی صدر میں منتقل ہو چکا ہے [۱] اس پر کتاب کا نام خلاصۃ التواریخ لکھا ہے۔

یہ کتاب مولانا فضل امام خیرآبادی نے ۱۲۲۴ھ میں قیام دہلی کے دوران لکھی۔ یہ کتاب گویا تاریخ عالم ہے جس کی ابتدا حضرت سیدنا آدم علیہ السلام سے کی گئی ہے۔ مولانا نے اس کی اجمالی فہرست اس طرح بیان کی ہے:۔

گفتار اول: خلقت آدم اور دیگر انبیاء کرام کے احوال، اس ضمن میں نبی کرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی آل پاک، صحابہ کرام و ازواج مطہرات کا ذکر آگیا ہے۔

گفتار دوم: صوفیائے کرام اور اولیائے عظام کے ذکر میں۔

گفتار سوم: ملوک ایران کے ذکر میں، اس گفتگو کا آغاز آدم علیہ السلام سے کیا گیا ہے سلاطین کیانی خلفائے عباسیہ، سلاطین چنگیزیہ اور شاہان تیموریہ کا ذکر کیا ہے یہ سلسلہ ابو نصر محمد اکبر بادشاہ تک پہنچایا ہے۔

گفتار چہارم: ان راجوں کا ذکر جو دہلی اور دیگر بلاد میں حکمراں رہے۔

گفتار پنجم: غزنی اور لاہور کے حکام کے بیان ہیں، یہ سلسلہ بابر کے ہندوستان آنے اور ابراہیم کے مارے جانے تک پہنچایا ہے۔

---

[۱] ان دونوں نسخوں کی نشاندہی جناب پروفیسر محمد اقبال مجددی نے کی جس کے لئے راقم شکر گزار ہے۔

گفتار ششم : سلجوقی، صفوی، گجراتی اور مصری اکابر سلاطین کا اجمالی ذکر۔

گفتار ہفتم : مشہور حکماء، اطباء اور خوشنویسوں کا ذکر۔

خاتمہ : ہفت اقلیم کے بلاد اور عجائب کا بیان

آمد نامہ مولانا کی مفید تصنیف آمد نامہ فارسی کا ایک باب تراجم الفضلاء کے نام سے انگریزی ترجمہ اور حواشی کے ساتھ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔

علامۃ الدہر مولانا علامہ ہدایت اللہ خاں رامپوری ثم جونپوری قدس سرہ العزیز

استاذ الاساتذہ مولانا علامہ ہدایت اللہ خاں بن مولانا رفیع اللہ خاں قدس سرہما محلہ الف خاں
رام پور میں پیدا ہوتے آپ کا آبائی وطن سوات تھا۔[1] روہیلہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے،[2]
ابتدائی کتب والد ماجد سے پڑھیں۔ صرف ونحو کی تحصیل مولانا حافظ غلام علی سے کی اور میر زاہد
تک معقولات کی تعلیم مولانا جلال الدین (م ۱۳۱۳ھ/ ۶-۱۸۹۵ء) سے حاصل کی۔ جب خاتم الحکماء مولانا
علامہ فضل حق خیرآبادی رامپور تشریف لائے تو ان کے حلقۂ درس میں شریک ہوکر کسب کمال کیا۔
درس حدیث مولانا سید عالم علی نگینوی (م ۱۲۹۵ھ/ ۱۸۷۸ء) سے لیا۔ علامہ خیرآبادی کے شیدائی
تھے۔ مختلف مقامات میں ان کے ساتھ رہے اور جب علامہ محمد فضل حق خیرآبادی اسیر ہوکر
انڈمان روانہ ہوئے تو آپ مغموم ومحزون رام پور میں تشریف لائے اور مدرسہ عالیہ میں درس دینا
شروع کیا۔ ۸-۱۲۸۷ھ/ ۱۸۷۰ء میں مولوی حیدر حسین کے طلب کرنے پر جونپور تشریف لے گئے
اور مدرسہ حنفیہ میں مفتی محمد یوسف فرنگی محلی لکھنوی کی جگہ صدر مدرس مقرر ہوئے اور تاحیات اسی
مدرسہ میں علم وفضل کے خزانے لٹاتے رہے۔[3]

اپنے استاذ محترم مولانا جلال الدین کے چھوٹے بھائی حضرت شاہ چھوٹے میاں قدس سرہ
کے سلسلۂ عالیہ قادریہ میں مرید تھے، وسیع الاخلاق، کریم النفس، طلبہ پر شفیق اور مسلک اہل سنت پر ثابت
قدم تھے۔ ۱۳۰۰ھ/ ۸۳-۱۸۸۲ء میں مرشدآباد بنگال میں مشہور غیر مقلد بہاری عالم عبدالعزیز رحیم آبادی
کے مقابلہ میں مذہب حنفیہ کی حمایت فرمائی۔ ۱۳۱۸ھ/ ۱-۱۹۰۰ء میں مجلس علمائے اہل سنت کے اجلاس
میں شریک ہوئے جو ندوہ کی اصلاح کے لئے پٹنہ میں منعقد ہوا تھا۔[4]
علم وفضل میں فقید المثال شخصیت تھے، بالخصوص معقولات وحکمت میں اپنی مثال آپ تھے۔ حکیم

---

[1] محمود احمد قادری، مولانا شاہ : تذکرہ علمائے اہل سنت جلد اول، مطبوعہ کانپور ۱۳۹۱ھ، ص ۲۶۱
[2] اقبال احمد، سید : تاریخ شیراز ہند جونپور، مطبوعہ جونپور ۱۹۶۳ء، ص ۷۸۹
[3] محمود احمد قادری، مولانا : تذکرہ علمائے اہل سنت، ص ۲۶۱، نیز اقبال احمد، سید : تاریخ شیراز ہند جونپور، ص ۷۹۰
[4] محمود احمد قادری، مولانا : تذکرہ علمائے اہل سنت، ص ۲۶۱

عبدالحی لکھنوی لکھتے ہیں :

انتھت الیہ ریاستہ المنطق والحکمۃ[1] "منطق و حکمت کی ریاست آپ پر ختم ہو گئی۔"

مولانا شاہ محمود احمد قادری لکھتے ہیں :

"آپ ان علماء میں تھے جن سے علم و فضل کو شرف حاصل ہوتا ہے" [2]

سید اقبال احمد لکھتے ہیں :۔

"معقولات میں یگانہ روزگار تھے اور ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں ان کے برابر کا کوئی عالم اس وقت نظر نہ آتا تھا۔" [3]

آپ کے تلامذہ کا احصار بہت دشوار ہے۔ آپ سے ان اساطینِ علم و فضل نے اکتسابِ فیض کیا، جن کی برکاتِ علم آج بھی پاک و ہند کے گوشے گوشے میں بروجہ اتم جلوہ گر ہیں، چند مشاہیر کے نام یہ ہیں :۔ صدر الشریعۃ مولانا حکیم محمد امجد علی ، فقیہ العصر مولانا یار محمد بندیالوی ، رئیس العلماء مولانا علامہ سید سلیمان اشرف، سابق چیرمین اسلامک اسٹڈیز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ، مولانا عبدالسلام نیازی دہلوی ، مولانا حکیم سید برکات احمد ٹونکی ، مولانا شیر علی صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن ، مولوی محمد ابراہیم بلیاوی صدر مدرس دار العلوم دیوبند ، مولانا عبدالاول جونپوری (مصنف مفید المفتی وغیرہ) ، مولانا عنایت حسین خاں جونپوری ، مولانا محمد اسمٰعیل جونپوری ، مولانا منصب علی جونپوری اور جبروت جونپوری وغیرہ وغیرہ

استاذ الاساتذہ حضرت مولانا ہدایت اللہ جونپوری قدس سرہ بروز اتوار یکم رمضان المبارک ۲۷ ستمبر (۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء) دارِ فانی سے رخصت ہوئے اور حضرت قطب الاقطاب مولانا شیخ عبدالرشید جونپوری قدس سرہ مصنف مناظرہ رشیدیہ (م ۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء) کی درگاہ واقع رشید آباد میں دفن ہوئے

---

[1] عبدالحی لکھنوی، مؤرخ : نزہۃ الخواطر جلد ہشتم ، مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۳۹۰ھ/۱۹۷۰ء ، ص ۵۲۰

[2] محمود احمد قادری ، مولانا : تذکرہ علمائے اہلسنت ، ص ۲۶۱

[3] اقبال احمد ، سید : تاریخ شیراز ہند ، جونپور ، ص ۸۹

[4] محمود احمد قادری ، مولانا : تذکرہ علمائے اہل سنت ، ص ۲۶۲ ، ۲۶۳

[5] اقبال احمد ، سید : تاریخ شیراز ہند جونپور ، ص ۸۲ تا ۹۲

[6] رشید احمد صدیقی ، پروفیسر : گنجہائے گرانمایہ ، ص ۳۲

مصرعۂ تاریخِ وفات یہ ہے :

ع شد نہاں مہرِ اوجِ فلسفیات [1]

۱۳ ھ ۲۶

سید عبد الحکیم نقوی نے تاریخِ وفات کہی :

مولوی ہدایت اللہ خاں — صاحبِ علم و زہد و عقل و شعور
چوں بماہِ صیام رحلت کرد — از جہاں سوئے خلد، حور و قصور
بر دلِ دوستان و شاگرداں — رنجش و کرب و غم نمودہ ظہور
داشت در جملہ علوم کمال — بود معقول او مگر مشہور

فکرِ تاریخ چوں نمود حکیم
گفت ہاتف کہ ہاں بگو "مغفور" [2]
۱۳۲۶ھ

ذیل میں آپ کے اول الذکر تین اجلہ تلامذہ کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے :

صدر الشریعہ مولانا شاہ محمد امجد علی اعظمی قدس سرہ العزیز

خلیفۂ مجاز اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی قدس سرہٗ

صدرِ شریعت، بدرِ طریقت مولانا شاہ محمد امجد علی اعظمی بن حکیم جمال الدین بن مولانا خدا بخش بن مولانا خیر الدین (قدست اسرارہم) ۱۲۹۶ھ/ ۹-۱۸۷۸ء میں قصبہ گھوسی محلہ کریم الدین ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے [3]۔ آپ کے والدِ ماجد اور جدِ امجد فنِ طب اور علم و فضل میں باکمال تھے۔ ابتدائی کتب جدِ امجد سے پڑھیں بعد ازاں اپنے چچیرے بھائی مولانا محمد صدیق رحمہ اللہ تعالیٰ سے علوم و فنون کی ابتدائی کتابیں پڑھیں پھر انہی کے مشورے سے استاذ الکل مولانا ہدایت اللہ خاں رام پوری ثم جونپوری رحمہ اللہ تعالیٰ (م ۱۳۲۶ھ/

---

[1] محمود احمد قادری، مولانا : تذکرہ علمائے اہلِ سنت، ص ۲۶۱، ۲۶۲
[2] احمد علی خاں، شوق : تذکرہ کاملانِ رامپور، طبع دہلی ۱۹۲۹ء، ص ۴۵۳
[3] غلام مہر علی، مولانا : الیواقیت المہریہ، ص ۷۹

۱۹۰۸ء) سے اکتسابِ فیض کے لئے مدرسہ حنفیہ جونپور میں داخل ہوئے۔ علوم و فنون کی تکمیل کے بعد حجۃ العصر و شیخ المحدثین مولانا شاہ وصی احمد محدث سورتی قدس سرہ (م ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۶ء) کی خدمت میں مدرسۃ الحدیث (پیلی بھیت) میں حاضر ہو کر درسِ حدیث لیا اور ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء میں سند حاصل کی، ۱۳۲۳ھ میں حکیم عبدالولی جھوائی ٹولہ، لکھنؤ سے علمِ طب حاصل کیا۔ ۲۴ھ سے ۲۷ھ تک حضرت محدث سورتی کے مدرسہ میں درس دیا، اس کے بعد ایک سال تک پٹنہ میں مطب کرتے رہے۔[1]

اس اثناء میں اعلیٰحضرت امام احمد رضا قادری بریلوی قدس سرہ کو مدرسہ منظرِ اسلام بریلی کے لئے ایک مدرس کی ضرورت پیش آئی، استاذِ گرامی مولانا وصی احمد محدث سورتی کے ارشاد کی بناء پر مولانا امجد علی اعظمی مطب چھوڑ کر بریلی شریف چلے گئے۔ ابتداءً تدریس کا کام شروع کیا، بعد ازاں مطبع اہل سنت کا انتظام اور جماعت رضائے مصطفےٰ بریلی کے شعبۂ علمیہ کی صدارت کے فرائض بھی آپ کے سپرد کر دیئے گئے، افتاء کی مصروفیات اس کے علاوہ تھیں، سلسلۂ عالیہ قادریہ میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری بریلوی کے دستِ حق پرست پر بیعت ہوئے اور جلد ہی خلافت سے نوازے گئے۔ قریباً ۱۸ برس شیخِ کامل کے فیوض و برکات سے مستفید ہوئے اور کمالِ عروج کو پہنچے۔[2]

اعلیٰحضرت امام احمد رضا قادری بریلوی، فتاویٰ کے سلسلے میں آپ پر حد درجہ اعتماد فرماتے تھے۔ ایک دفعہ ارشاد فرمایا:

"آپ کے یہاں موجودین میں تفقہ جس کا نام ہے وہ مولوی امجد علی صاحب میں زیادہ پایئے گا، اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ استفتاء سنایا کرتے ہیں اور جو میں جواب دیتا ہوں لکھتے ہیں، طبیعت اخاذ ہے، طرز سے واقفیت ہو چلی ہے۔"[3]

تلامذہ اور خلفاء کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

میرا امجد، مجد کا پکّا
اس سے بہت کچھ ساتے یہ ہیں

---

[1] محمود احمد قادری، مولانا: تذکرہ علمائے اہل سنت (مطبوعہ بھوانی پور، بہار ۱۳۹۱ھ) ص ۵۱، ۵۲

[2] ہفت روزہ (اور اب ماہنامہ) رضائے مصطفےٰ، گوجرانوالہ، ۲ ذیقعدہ ۱۳۷۹ھ، ص ۳

[3] محمد مصطفےٰ رضا بریلوی، مفتی اعظم ہند، ملفوظات حصہ اول (مطبوعہ کراچی) ص ۹۳۔

بریلی شریف میں قیام کے دوران حضرت صدر الشریعہ کی مصروفیات حیرت انگیز حد تک بڑھی ہوئی تھیں۔ تدریس، پریس کی نگرانی، پروف ریڈنگ، پریس مینوں کو ہدایات، پارسلوں کی ترسیل اور فتوی نویسی وغیرہ امور تن تنہا انجام دیتے۔ فیضِ غمانے دین کیلئے کام کرنے کی وہ سپرٹ پیدا کر دی تھی کہ تھکاوٹ یا اکتاہٹ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ بعض حضرات کہا کرتے تھے کہ:-

"مولانا امجد علی صاحب تو کام کی مشین ہیں۔" [1]

اعلیٰ حضرت مجدد دین و ملت مولانا شاہ احمد رضا خاں بریلوی قدس سرہ کا فقید المثال ترجمۂ قرآنِ مجید مسمّٰی باسمِ تاریخی "کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن" (۱۳۳۰ھ/۱۹۱۱ء) آپ ہی کی مساعی جمیلہ سے شروع ہوا اور پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

آپ نے ابتدائے شباب سے تدریس کا کام شروع کیا اور آخر حیات تک جاری رکھا اور ایسے نابغۂ روزگار افراد تیار کئے جن پر علم و فضل کو بھی ناز ہے۔ طویل عرصہ تک مدرسہ منظرِ اسلام بریلی میں فرائضِ تدریس انجام دیے۔ ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۴ء میں بحیثیت صدر مدرس دار العلوم معینیہ عثمانیہ اجمیر شریف چلے گئے۔ ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۲ء میں پھر بریلی شریف چلے آئے [2] اور تین سال تک قیام کیا۔ [3] بعد ازاں نواب حاجی غلام محمد خاں شروانی رئیس ریاست دادوں (علی گڑھ) کی دعوت پر بہ حیثیت صدر مدرس دار العلوم حافظیہ سعدیہ میں تشریف لے گئے اور سات سال تک بہ کمال حسن و خوبی فرائضِ تدریس انجام دیے۔ مولانا حبیب الرحمٰن شروانی نے ۱۳۵۶ھ/۱۹۳۷ء میں مدرسہ کے سالانہ جلسہ میں امتحان کے موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے آپ کے فضل و کمال کا اعتراف ان الفاظ میں کیا:-

"مولانا امجد علی صاحب پورے ملک میں ان چار پانچ مدرسین میں ایک ہیں جنہیں میں منتخب جانتا ہوں۔" [4]

---

[1] ماہنامہ پاسبان الہ آباد (امام احمد رضا نمبر، شمارہ مارچ و اپریل ۱۹۶۲ء) ص ۶۵

[2] محمود احمد قادری، مولانا: تذکرہ علمائے اہل سنت، ص ۵۲

[3] غلام مہر علی، مولانا: الیواقیت المہریہ، ص ۸۰

[4] محمود احمد قادری، مولانا: تذکرہ علمائے اہلسنت ص ۵۳

اس زمانے میں مولانا عبدالشاہد خاں شروانی اسی مدرسہ میں نائب مدرس تھے۔ انہوں نے اپنے تاثرات کا اظہار اس طرح کیا ہے:۔

"مولانا محمد امجد علی اعظمی، سات سال سے صدر مدرس تھے۔ بریلی، اجمیر اور دوسرے مدرسوں کے صدر مدرس رہ چکے تھے، کہنہ مشقی کی بنا پر درسیات میں پوری مہارت رکھتے ہیں"۔ [۱]

۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء تک دادوں میں قیام رہا، اس کے بعد ایک سال بنارس میں رہے بعد ازاں ۱۳۶۴ھ/۱۹۴۵ء تک منظر اسلام بریلی میں درس دیا۔

اجمیر شریف کے قرب و جوار میں راجہ پرتھوی راج کی اولاد آباد تھی جو اگرچہ مسلمان ہو چکی تھی لیکن ان میں فرائض و واجبات سے غفلت اور مشرکانہ رسوم بکثرت پائی جاتی تھیں حضرت صدر الشریعہ کے ایماء پر آپ کے تلامذہ نے ان میں تبلیغ کا پروگرام بنایا، تبلیغی جلسوں کا خوشگوار اثر ہوا اور ان لوگوں میں مشرکانہ رسوم سے اجتناب اور دینی اقدار اپنانے کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ [۲] پروفیسر محمد ایوب قادری لکھتے ہیں:۔

"اجمیر کے زمانۂ قیام میں نو مسلم راجپوتوں میں مولانا امجد علی نے خوب تبلیغ کی اور اس کے بہت مفید نتائج برآمد ہوئے"۔ [۳]

اس کے علاوہ، ارد گرد کے بڑے شہروں اور قصبات مثلاً نصیر آباد، بیاور، لاڈنوں، جے پور، جودھپور، پالی مارواڑ اور چتوڑ وغیرہ میں بھی خود آپ اور آپ کے تلامذہ تبلیغی سرگرمیاں جاری رکھتے، مذہب اہل سنت کی اشاعت اور وہابیہ، قادیانیہ کا رد کیا کرتے تھے، آپ کی تقریر خالص علمی مضامین اور قرآن و حدیث کی تفسیر و تفصیل پر مشتمل ہوا کرتی تھی، مسلک اہل سنت کو ٹھوس دلائل سے اس طرح بیان فرماتے کہ مخالفین تسلیم کے علاوہ چارہ کار نہ پاتے۔

---

[۱] محمد عبدالشاہد خاں شروانی: باغی ہندوستان، مطبوعہ بجنور ۱۹۴۷ء، ص ۲۳۷

[۲] ماہنامہ پاسبان (امام احمد رضا نمبر) ص ۶۸

[۳] محمد ایوب قادری، پروفیسر: یادگار بریلی، مطبوعہ کراچی ۱۹۷۰ء، ص ۱۶

حضرت صدر الشریعہ اگرچہ دینی اور مذہبی قائد تھے لیکن بوقتِ ضرورت سیاسی طور پر ملتِ اسلامیہ کی صحیح ترجمانی فرمائی۔ چونکہ آپ کے مرشدِ طریقت امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ دو قومی نظریہ (بت پرست اور بت شکن کا اتحاد نہیں ہو سکتا) کے عظیم مبلغ تھے، اسی نظریہ کی بناء پر پاکستان معرضِ وجود میں آیا، آپ نے ان کی موافقت میں اس نظریہ کی تبلیغ پورے شد و مد سے کی۔ ۱۴ رجب ۴ / مارچ (۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۱ء) کو بریلی میں جمعیۃ العلماء ہند کا اجلاس منعقد ہوا جس میں ابو الکلام آزاد کے علاوہ دوسرے لیڈر بھی شریک ہوئے جمعیت کے لیڈر اس جوش و خروش سے آئے تھے کہ گویا "ہندو مسلم اتحاد" کے مخالف علمائے اہل سنت کو لاجواب کر دیں گے۔ مولانا محمد امجد علی نے جماعت رضائے مصطفےٰ (بریلی) کے شعبۂ علمیہ کے صدر کی حیثیت سے اراکین جمعیت کے ہندوؤں سے اتحاد و وداد کے بارے میں ستر سوالات پر مشتمل سوالنامہ مرتب کر کے قائدینِ جمعیت کو بھجوایا، بار بار اصرار اور مطالبہ کے باوجود انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔[1]

صدر الافاضل مولانا سید محمد نعیم الدین مراد آبادی نے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی (قدس سرہما) کے نام ایک مکتوب میں اس سوالنامہ کے بارے میں اس طرح اظہارِ خیال فرمایا ہے :-

"سیدی، دامت برکاتہم اسلام نیاز کے بعد گزارش، حضور سے رخصت ہو کر مکان پہنچا، یہاں آ کر میں نے "اتمام حجت تامہ" کا مطالعہ کیا، فی الواقع یہ سوالات فیصلۂ ناطقہ ہیں اور یقیناً ان سوالات نے مخالف کو مجالِ گفتگو اور راہِ جواب باقی نہیں چھوڑی ہے۔"[2]

ابو الکلام آزاد نے روانگی کے وقت بریلی کے اسٹیشن پہ کہا :-

---

[1] یہ سوالنامہ "اتمام حجت تامہ" (۱۳۳۹ھ) کے نام سے چھپ چکا ہے۔ ملاحظہ ہو "دوامغ الحمیر" مطبوعہ مطبع حسنی، بریلی، ص ۴۰، ۴۶۔

[2] دوامغ الحمیر، مکتوب صدر الافاضل، ص ۵۴، ۵۵:

"ان کے جس قدر اعتراضات ہیں حقیقت میں سب درست ہیں، ایسی غلطیاں کیوں کی جاتی ہیں جن کا جواب نہ ہو سکے اور ان کو اس طرح گرفت کا موقع ملے؟" [1]

۱۹ - ۲۰ر شعبان المعظم، ۳ - ۴ر اکتوبر (۱۳۵۸ھ/۱۹۳۹ء) کو مرادآباد میں، شاہزادۂ اعلیحضرت، حجۃ الاسلام مولانا حامد رضا خاں بریلوی کی صدارت میں اجلاس منعقد ہوا اور ایک جماعت موتمر العلماء قائم کی گئی جس کا مقصد مسلمانوں میں پیدا ہونے والے مفاسد کی اصلاح اور خارجی حملوں کا دفاع تھا۔ اس اجلاس میں حضرت صدر الشریعہ نمایاں طور پر شریک ہوئے، یہی جماعت بعد میں آل انڈیا سُنّی کانفرنس کے نام سے مشہور ہوئی۔ [2]

اپریل ۱۹۴۶ء میں سُنّی کانفرنس کے بنارس میں منعقد ہونے والے فقید المثال اجلاس (جس میں علماء و مشائخ پانچہزار کی تعداد میں شریک ہوئے) کو قیام پاکستان کی بنیاد کی حیثیت حاصل ہے۔ اس اجلاس میں اسلامی حکومت کے لئے لائحۂ عمل مرتب کرنے کے لئے جلیل القدر علماء کی ایک کمیٹی بنائی گئی تھی جس کے ممتاز اراکین میں حضرت صدر الشریعہ بھی شامل تھے۔ [3]

صدر الشریعہ مولانا محمد امجد علی کو اللہ تعالیٰ نے جملہ علوم و فنون میں مہارتِ تامّہ عطا فرمائی تھی لیکن انہیں تفسیر، حدیث اور فقہ سے خصوصی لگاؤ تھا۔ فقہی جزئیات نوکِ زبان پر رہتی تھیں اس لئے دورِ حاضر کے مجدّد امام احمد رضا بریلوی نے آپ کو صدر الشریعہ کا لقب عطا فرمایا تھا۔ [4]

---

[1] دوامغ الحمیر: مکتوب صدر الافاضل، ص ۵۶، ۵۷

[2] ابوالبرکات، سید احمد، مفتئ اعظم پاکستان: قلمی یادداشت

[3] غلام معین الدین مولانا: حیات صدر الافاضل (طبع ثانی) ص ۱۹۰

[4] محمود احمد قادری، مولانا: تذکرہ علمائے اہل سنت، ص ۵۲

آپ نے دادوں (ضلع علی گڑھ) میں قیام کے دوران امام ابوجعفر طحاوی حنفی قدس سرہٗ (م ۳۲۱ھ/۹۳۳ء) کی حدیث کی مشہور کتاب شرح معانی الآثار پر حاشیہ لکھنا شروع کیا اور سات ماہ کی مختصر مدت میں پہلی جلد پر مبسوط حاشیہ تحریر فرما دیا۔ یہ حاشیہ باریک قلم سے ۵۰۴ صفحات پر مشتمل تھا اور ہر صفحہ میں ۳۵، ۳۶ سطریں تھیں، گویا دیگر مشاغل سے فارغ وقت میں اڑھائی صفحے روزانہ قلمبند فرماتے تھے افسوس کہ یہ حاشیہ طبع نہ ہو سکا۔

آپ کی دوسری تصنیف فتاوے امجدیہ ہے جو علمی تحقیقات پر اپنی مثال آپ ہے۔ جس زمانے میں باتصویر قاعدے جاری ہوئے آپ نے ایک قاعدہ مرتب فرمایا جو صرف بے جان اشیاء کی تصاویر پر مشتمل تھا۔ اس کی خوبی یہ تھی کہ بچہ بہت جلد اردو پڑھنے پر قادر ہو جاتا۔ آپ کی تحریر کی خصوصیت یہ ہے کہ آپ مشکل سے مشکل مسئلہ عام فہم انداز میں بیان فرما دیتے تھے۔

بہارِ شریعت، حضرت صدر الشریعہ کی وہ شہرۂ آفاق تصنیف ہے جسے بجا طور پر فقہ حنفی کا دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) کہا جا سکتا ہے۔ اس کے کل سترہ حصے بارہا طبع ہو کر قبولیتِ عامہ کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ اس کتاب سے نہ صرف عوام بلکہ علماء کے لئے بھی سہولت پیدا ہو گئی ہے۔ اس کتاب کی ابتداء غالباً ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۵-۱۶ء میں ہوئی اور ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی۔ آپ ابھی تین حصے اور لکھنا چاہتے تھے مگر حالات نے اس کی مہلت نہ دی۔ چار سال کے عرصے میں یکے بعد دیگرے گیارہ عزیز داغِ مفارقت دے گئے جس کا اثر دل و دماغ پر اس قدر پڑا کہ بینائی جاتی رہی اور تصنیف و تالیف کا کام رک گیا۔

بہارِ شریعت کے ابتدائی چھ حصے اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا بریلوی نے حرف بحرف سنے اور جا بجا اصلاح فرمائی اور انہیں تقریظ سے مزیّن کیا۔ کتبِ فقہ میں سے بہارِ شریعت کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ہر باب میں پہلے آیاتِ مبارکہ پھر احادیث

---

[۱] محمد امجد علی اعظمی، صدر الشریعہ: بہارِ شریعت، حصہ ۱۷، ص ۱۰۲

مقدسہ۔ اس کے بعد مسائل فقہیہ بیان کئے گئے ہیں۔

آپ کے حلقہ درس میں سینکڑوں ملکی اور غیر ملکی طلباء شامل ہوئے اور اوج کمال کو پہنچے۔ چند مشاہیر تلامذہ کے اسماء یہ ہیں:

۱ —— محدث اعظم پاکستان مولانا ابو الفضل سردار احمد لائلپوری۔

۲ —— مناظر اعظم مولانا حشمت علی لکھنوی۔

۳ —— مولانا محمد الیاس سیالکوٹی۔

۴ —— مولانا مفتی محمد اعجاز الرضوی۔

۵ —— مولانا غلام یزدانی سابق صدر مدرس جامعہ رضویہ مظہر اسلام بریلی (رحمہم اللہ تعالیٰ)

۶ —— مولانا غلام جیلانی صاحب برادر کلاں مولانا علامہ یزدانی صاحب شیخ الحدیث براؤں شریف

۷ —— حافظ ملت مولانا عبد العزیز قدس سرہ بانی دار العلوم اشرفیہ مبارکپور

۸ —— مجاہد اعظم مولانا حبیب الرحمٰن صدر آل انڈیا تبلیغ سیرت۔

۹ —— مولانا رفاقت حسین مفتی اعظم کانپور۔

۱۰ —— مولانا وقار الدین دار العلوم امجدیہ کراچی۔

۱۱ —— مولانا تقدس علی خاں شیخ الجامعہ، جامعہ راشدیہ پیر گوٹھ (سندھ)

۱۲ —— مولانا ولی النبی، بیکی تورڈ پیر شریف (مردان)

۱۳ —— مولانا مختار الحق خطیب اعظم دار السلام (ٹوبہ ٹیک سنگھ ضلع لائلپور)

وغیرہ وغیرہ[۱]،

حضرت صدر الشریعہ کے تین صاحبزادے آپ کی حیات میں ہی داغ مفارقت دے گئے تھے، اس وقت آپ کے چار صاحبزادے موجود ہیں۔ مولانا علامہ عبد المصطفیٰ ازہری مدظلہ شیخ الحدیث جامعہ امجدیہ کراچی، مولانا حافظ رضاء المصطفیٰ خطیب جامع مسجد، مولانا ثناء المصطفیٰ اور مولانا ضیاء المصطفیٰ[۲]۔ حضرت علامہ ازہری مدظلہ العالی جمعیۃ العلماء پاکستان کے ممتاز راہنما اور قومی اسمبلی کے ممبر ہیں۔

---

[۱] ماہنامہ پاسبان: امام احمد رضا نمبر، ص ۷۳، ۸۴ رضائے مصطفیٰ: صدر الشریعہ نمبر، ص ۸

[۲] رضائے مصطفیٰ: صدر الشریعہ نمبر، ص ۸

اور حضرت صدر الشریعہ کے ساتھ نسبت تلمذ تقریباً اول سے لے کر دورہ حدیث تک ہے۔

حضرت صدر الشریعہ بریلی شریف کے قیام کے دوران ١٣٣٧ھ/١٨٢٢ء میں پہلی مرتبہ حج و زیارت کی سعادت سے مشرف ہوئے[1]۔ دوسری دفعہ حرمین شریفین کی حاضری کے ارادے سے بمبئی پہنچے تھے کہ ٢/ ذلیقعدہ ٦/ ستمبر بروز دوشنبہ (١٣٦٧ھ/١٩٤٨ء) رات کے گیارہ بجے عالم جاودانی کی طرف تشریف لے گئے۔ درج ذیل آیۂ مبارکہ مادۂ تاریخ ہے:

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّٰتٍ وَعُيُونٍ (١٣٦٧ھ)

شاعر مشرق شفیق جونپوری نے چہلم کے موقعہ پر بطور ہدیۂ عقیدت یہ قطعہ پیش کیا:

سلامی جا بجا ارض و سما دیں
مہ و خورشید، پیشانی جھکا دیں!
ترے خدام، اے صدر شریعت!
جدھر جائیں، فرشتے پر جھکا دیں[2]

---

[1] غلام مہر علی، مولانا: الیواقیت المہریہ، ص ۸۰

[2] ماہنامہ پاسبان: امام احمد رضا نمبر، ص ۴۴

فقیہ العصر مولانا یار محمد بندیالوی قدس سرہ

استاذ العلماء، فقیہ العصر مولانا یار محمد بندیالوی ابن میاں شاہنواز (قدس سرہ)، ۱۲۹۷ھ/ ۸۰-۱۸۷۹ء میں بندیال ضلع سرگودھا میں پیدا ہوئے[1]۔ موضع بگہ ضلع میانوالی میں قرآن مجید حفظ کیا، بعد ازاں ایک مقامی عالم کے پاس فارسی کی کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد مولانا محمد امیر دامانی رحمہ اللہ تعالیٰ (مصنف قانونچہ امیریہ) سے صرف ونحو کے علاوہ بعض دینی کتابیں پڑھیں، پھر مولانا ثناء اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں موضع پنجائن ضلع جہلم حاضر ہوئے اور الفیہ ابن مالک پڑھا۔ فنونِ عالیہ کی تحصیل مشہور زمانہ استاد مولانا غلام احمد حافظ آبادی صدر مدرس جامعہ نعمانیہ لاہور سے کی، جامع مسجد فتحپوری دہلی میں بھی تعلیم حاصل کرتے رہے، مزید دینی تعلیم حاصل کرنے کے لئے مرکز اہل سنت بریلی شریف اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے علالتِ طبع اور تصنیف وتالیف کی بے پناہ مصروفیات کی بناپر استاذ الکل مولانا ہدایت اللہ خاں جونپوری، تلمیذِ رشید خاتم الحکماء مولانا علامہ محمد فضل حق خیر آبادی کی طرف راہنمائی کی، مولانا یار محمد قدس سرہ نے جونپور پہنچ کر معقولات کی منتہی کتب افق المبین، شرح اشارات، حواشی جدیدہ وقدیمہ پڑھ کر علوم کی تکمیل کی۔ ان دنوں صدر الشریعہ مولانا محمد امجد علی رحمہ اللہ تعالیٰ (مصنف بہارِ شریعت) بعض اسباق میں آپ کے ہم درس رہے۔[2]

---

[1] غلام مہر علی، مولانا: الیواقیت المہریہ (مطبوعہ مکتبہ مہریہ چشتیاں شریف ۱۹۶۴ء) ص ۱۰۲۔

نوٹ:۔ حیات استاذ العلماء (مطبوعہ مکتبہ ادارئہ مظہریہ، بندیال ضلع سرگودھا ۱۳۸۹ھ) میں سنِ ولادت ۱۸۸۷ء لکھا ہے جس کے مطابق سن ہجری ۵-۱۳۰۴ھ ہے، ادوارِ حیات کے پیش نظر مذکورہ بالا سنِ ولادت صحیح معلوم ہوتا ہے، تذکرہ علمائے اہل سنت (مطبوعہ مظفر پور بہار انڈیا) مرتبہ مولانا شاہ محمود احمد قادری میں سنِ ولادت ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۷ء لکھا ہے۔ اس میں سن ہجری وعیسوی کی مطابقت نہیں ہے۔

[2] حیات استاذ العلماء، بندیالوی: ص ۱۰، ۲۶

مرشد العصر حضرت مولانا صوفی محمد حسین الٰہ آبادی (م ۸ رجب ۱۹ ستمبر ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء)

خلیفۂ اعظم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہما اللہ تعالیٰ کے دستِ مبارک پر سلسلۂ عالیہ چشتیہ صابریہ میں بیعت ہوئے اور اڑھائی سال تک بارگاہِ شیخ میں حاضرہ کر کتبِ تصوف کا درس لیا اور منازلِ سلوک طے کیں، بالآخر اجازت وخلافت سے مشرف ہوئے۔ [1]

استاذ العلماء، مولانا ہدایت اللہ جونپوری کے وصال کے بعد مدرسہ حنفیہ میں مدرس مقرر ہوئے [2]، بعد ازاں الٰہ آباد، رام پور، بھوپال اور ٹونک کے مدارس میں بیس بائیس سال تک تدریسی فرائض انجام دینے کے بعد مراجعت فرما ہوئے وطن ہوئے اور قریباً تیس برس تک تشنگانِ علم کی علمی پیاس بجھاتے رہے۔

مولانا یار محمد قدس سرہ کو قدرت نے غضب کا حافظہ دیا تھا، تمام علوم میں حیرت انگیز مہارت رکھتے تھے، خاص طور پر فقہ میں ید طولیٰ حاصل تھا، مناظرہ میں آپ کو معراجِ کمال حاصل تھا، قیامِ ہند کے دوران مولوی اشرف علی تھانوی سے آپ کی ملاقات ہوئی تو آپ نے پوچھا: ارشادِ باری تعالیٰ ہے وعلم آدم الاسماء کلھا، اس میں "اسماء" معرف بلام استغراق اور "کلھا" سے مؤکد ہے، اس کا عموم قطعی ناقابلِ تخصیص ہے، یہی علم کلی ہے، تو جو علم نصِ قرآنی کے مطابق آدم علیہ السلام کے لئے ثابت ہے اسے نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لئے ثابت ماننا کیونکر کفر و شرک ہوگا؟ تھانوی صاحب نے کہا حضرت آدم علیہ السلام کو صرف اسماء کا علم عطا کیا گیا تھا نہ کہ مسمیات کا لہٰذا یہ علم کلی نہ ہوا۔ مولانا نے فرمایا اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے ثم عرضھم علی الملٰئکۃ فقال انبئونی باسماء ھٰؤلاء الآیۃ پھر آدم علیہ السلام کو فرمایا انبئھم باسمائھم، اس سے صراحۃً پتہ چلتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اسماء اور مسمیات دونوں کا علم عطا کیا گیا تھا نہ کہ صرف اسماء کا، تھانوی صاحب سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ [3]

---

[1] حیات استاذ العلماء بندیالوی : ص ۱۷

[2] محمود احمد قادری، مولانا : تذکرہ علمائے اہلسنت، ص ۲۶۴

[3] غلام مہر علی، مولانا : الیواقیت المہریہ ص ۱۰۳

استاذ الاساتذہ مولانا یار محمد بندیالوی کی تقریر میں بلا کا سوز تھا۔ تحریکِ پاکستان شروع ہوئی تو آپ نے پورا زورِ خطابت مسلم لیگ کی حمایت میں صرف کر دیا۔ اس وقت ضلع سرگودھا اور میانوالی کے اکثر امراء یونینسٹ پارٹی سے تعلق رکھتے تھے اور مسلم لیگ کا نام تک سننا گوارا نہ کرتے تھے، پھر اس علاقہ میں ملک خضر حیات ٹوانہ کا بہت اثر تھا، اس کے باوجود آپ نے علی الاعلان فرمایا :

" ایک طرف اسلام کا جھنڈا ہے، دوسری طرف کفر کا، چونکہ مسلم لیگ مسلمانوں کی جماعت ہے اس لئے اس سے کٹنا اسلام سے کٹنا ہے "

آپ ہر جمعہ نظریۂ پاکستان کے حق میں بیان فرماتے جس سے متاثر ہو کر سینکڑوں افراد مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ [1]

حضرت استاذ العلماء سے سینکڑوں علماء نے اکتساب فیض کیا۔ قیام ہند کے دوران جن حضرات نے آپ سے استفادہ کیا ان کے اسماء کا علم نہیں ہو سکا۔ آپ کی بارگاہِ علمی سے مستفید ہونے والے چند مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں :-

ملک المدرسین مولانا حافظ عطا محمد گولڑوی دامت برکاتہم العالیہ ، شیخ القرآن مولانا محمد عبد الغفور ہزاروی رحمہ اللہ تعالیٰ ، مولانا علامہ سید سلیمان اشرف قدس سرہ خلیفہ اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا بریلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ و سابق چیئرمین اسلامک اسٹڈیز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ، مولانا محمد سعید مد ظلہ العالی (واں بھچراں) ، مولانا فتح محمد ، مولانا قادر بخش ، مولانا عبد الرحیم (کاشغر) مولانا عبد الخالق (سوات) ، مفتی محمد شفیع دیوبندی (سرگودھا) ، مولوی احمد شاہ دیوبندی (چھوکیرہ) ، مولوی غلام یٰسین دیوبندی (واں بھچراں) وغیرہ وغیرہ [2]

آپ کے تلامذہ میں سب سے زیادہ فیض رساں شخصیت ملک المدرسین استاذ الاساتذہ مولانا عطا محمد گولڑوی دامت فیوضہم العالیہ زیبِ مسندِ تدریس دار العلوم امدادیہ مظہریہ بندیال (ضلع سرگودھا) ہیں، دنیائے اہلِ سنت پر آپ کا احسانِ عظیم ہے کہ آپ نے افاضل مدرسین کی بہت بڑی جماعت تیار کی ہے۔

---

[1] حیات استاذ العلماء : ص ۳۲
[2] ایضاً : ص ۴۰

آپ کے بالواسطہ اور بلاواسطہ تلامذہ کراچی سے پشاور تک کے مدارس میں گرانقدر تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس وقت مجاہدِ تحریکِ آزادی مولانا علامہ محمد فضل حق خیرآبادی شہید قدس سرہ کے سلسلۂ تلامذہ میں سب سے عظیم مدرس آپ کی ذاتِ گرامی ہی ہے۔

استاذ العلماء مولانا یار محمد بندیالوی کا وصال ۲۲ محرم ۶/ دسمبر (۱۳۶۷ھ/۱۹۴۷ء) کو ہوا، آپ کا مزارِ انور بندیال کی جنوبی جانب مرجعِ خلائق ہے، لوحِ مزار پر آپ کے تلمیذِ ارشد مولانا عطا محمد گولڑوی مدظلہ العالی کا درجِ ذیل قطعہ کندہ ہے:

شدہ اُو رایدِ طُوبے بہ منقول — بُدہ در مرتبہ اوئے بہ معقول
دلش روشن ز انوارِ الٰہی — بیانش گنجِ اسرارِ الٰہی
و ازاں غایب و لیکن ضوفشاں ماند — سراجِ صد ہزاراں زو نشاں ماند
ہمہ عمرش بزہد و اتقا رفت
عطا گوید بہ عشقِ مصطفےٰ رفت

آپ کی اولاد میں سے اس وقت دو صاحبزادے صاحبِ علم و فضل تشریف فرما ہیں:

۱۔ فقیہِ جلیل مولانا محمد عبد الحق مدظلہ العالی مہتمم دار العلوم امدادیہ مظہریہ (بندیال)

۲۔ مولانا محمد فضل حق مدظلہ العالی ناظم مدرسہ مذکورہ۔

دار العلوم امدادیہ مظہریہ (بندیال)، دورِ حاضر میں علومِ دینیہ کی وہ عظیم یونیورسٹی ہے جہاں پاکستان بھر کے محنتی اور شائق طلباء کھنچے چلے آرہے ہیں اور شب و روز علومِ دینیہ کی تحصیل میں محو ہیں۔ مجھے حضرت سید مبلغِ اسلام مولانا شاہ محمد عارف اللہ مدظلہ العالی کا وہ فرمان آج تک نہیں بھولا جو میں نے دورانِ تعلم واں بھچراں میں سنا تھا۔ انہوں نے فرمایا تھا:

"بندیال میں علم پڑھایا نہیں جاتا، پلایا جاتا ہے"

مولائے کریم حضرت استاذ العلماء بندیالوی کے فیوض و برکات کو تا قیامت جاری رکھے۔ آمین!

رئیس المتکلمین مولانا سید محمد سلیمان اشرف بہاری قدس سرہ

دنیائے علم و فضل کے تاجدار، میدانِ تحقیق و تدقیق کے شہسوار مولانا سید محمد سلیمان اشرف بہاری ابن مولانا حکیم سید محمد عبداللہ قدس سرہما تقریباً ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء میں محلہ میرداد، بہار (ضلع پٹنہ) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی کتب پڑھنے کے بعد مدرسہ حنفیہ جونپور میں استاذ العلماء مولانا علامہ محمد ہدایت اللہ رام پوری ثم جونپوری سے علوم کی تحصیل و تکمیل کی[1]، ان کے علاوہ استاذ الاساتذہ مولانا یار محمد بندیالوی قدس سرہ سے بھی استفادہ کیا[2]

طریقت کے اعتبار سے آپ چشتی نظامی فخری سلیمانی تھے (آپ کے مرشد کا نام معلوم نہیں ہوسکا) موجودہ صدی کے مجدد اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خاں بریلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی آپ کو اجازت و خلافت حاصل تھی۔

۲۰-۱۳۱۹ھ/۱۹۰۲ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے چیرمین مقرر ہوئے آپ کے تقرر کی تفصیل جناب حافظ غلام غوث (نبیرۂ مولانا ہدایت اللہ خاں جونپوری) نے ایک مضمون میں بیان کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ میں دینیات کے لیکچرار کی ضرورت تھی، مولانا کو اطلاع دی گئی اور انٹرویو میں "معجزہ" پر مقالہ لکھنے کی فرمائش کی گئی اور ساتھ ہی کہا گیا کہ کتابوں کی ضرورت ہو تو حبیب گنج تشریف لے جائیں۔ مولانا نے فرمایا: بحمد اللہ مجھے کتابوں کی ضرورت نہیں ہے، صرف کاغذ اور قلم دوات مہیا کر دیا جائے چنانچہ نمازِ عشاء کے بعد سے صبح کی نماز تک ایک ہی مجلس میں بائیس فل اسکیپ صفحات پر مدلل مضمون قلمبند کر دیا جسے بہت پسند کیا گیا پھر نمازِ جمعہ کے بعد "توحید" پر خطاب کرنے کے لئے کہا گیا تو آپ نے تین گھنٹے تک اس موضوع پر تقریر فرمائی جسے سُنکر پرستارانِ وحدت جھوم گئے۔ اس تقریر میں دینیات کمیٹی کے

---

[1] محمود احمد قادری، مولانا : تذکرہ علمائے اہلِ سنت، ص ۱۰۰

[2] حیات استاذ العلماء بندیالوی : ص ۳۹

تمام اراکین، نواب وقار الملک مشتاق حسین اور مولانا حبیب الرحمٰن شروانی موجود تھے، اسی دن پچاس روپیہ مشاہرہ پر آپ کا تقرر کر دیا گیا [1] آپ نے تاحیات بڑے جاہ وجلال کے ساتھ فرائض منصبی کو ادا کیا۔

قدرتِ ایزدی نے آپ کو حیرت انگیز صلاحیتوں سے نوازا تھا، خطابت میں بلا کا زور تھا جس وقت آپ گفتگو فرماتے تو دریا کی روانی کا نقشہ سامنے آجاتا تھا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی صدر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علیگڑھ لکھتے ہیں:

> "جونپور میں سیرتِ رسول کا جلسہ تھا، مرحوم مولانا محمد سلیمان اشرف) کی تقریر ہو رہی تھی، جلسہ کیا ایک جم غفیر تھا، مرحوم اپنے مخصوص والہانہ جوش و وارفتگی کے ساتھ تقریر کر رہے تھے۔ حاضرین کی خاموشی کا عالم یہ تھا کہ سارا مجمع ایک ہی متنفس تھا اتنے میں دور سے ایک بوڑھا پستہ قد، منحنی شخص جھکا ہوا، انبوہ کو چیرتا ہوا بڑھتا نظر آیا، جس شخص کے پاس سے گزرتا ہے وہ خوف و عقیدت سے سمٹ کر تعظیم دیتا ہے۔ دیکھتے دیکھتے پلیٹ فارم پر پہنچ گیا، مرحوم کو سینہ سے لگا کر پیشانی کا بوسہ دیا اور واپس چلا گیا۔ یہ مولانا ہدایت اللہ خاں صاحب جبروت جونپوری مرحوم کے استاد اور جونپور میں اس وقت علم و ہنر کے چشم و چراغ تھے۔" [2]

جرأت اور بے باکی مولانا کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اپنی رائے کا اظہار بے دھڑک کر دیتے تھے، کسی کے علم وفضل یا وجاہت و اقتدار سے مرعوب ہونا تو آپ نے سیکھا ہی نہ تھا۔ خودداری کا یہ عالم تھا کہ یونیورسٹی کے کسی ایسے اجلاس میں شریک نہ ہوتے جس میں کسی بڑے آدمی کو مدعو کیا گیا ہوتا، اور نہ ہی کسی کے گھر جاتے جب تک اس سے دوستانہ مراسم نہ ہوتے۔" [3]

---

[1] غلام غوث، حافظ: مولانا سلیمان اشرف اور مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کے تعلقات (سہ ماہی العلم اپریل تا جون ۱۹۷۴ء) ص ۸۴

[2] رشید احمد صدیقی، پروفیسر: گنجہائے گرانمایہ (آئینہ ادب لاہور) ص ۳۱، ۳۲

[3] ایضاً: ص ۳۳

پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں :

”مرحوم میں اپنے استادہی کا جبروت وطنطنہ تھا ، ان کی شفقت میں بھی جبروت کارفرما تھا ، میں نے مرحوم کو جھجک کر یا گول مول باتیں کرتے کبھی نہ پایا ۔“ [1]

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں مردانہ وار حصہ لینے کی بنا پر مسلمانوں کو خوفناک مصائب کا سامنا کرنا پڑا ، کون سا وہ ظلم ہوگا جو انگریزوں نے اہلِ اسلام کے لئے روا نہ رکھا ، مسلمانوں کی خستہ حالی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندؤوں نے پہلے تو مسلمانوں کی املاک اور جاہ ومنصب پر ہاتھ صاف کیا پھر اس طرف سے ایک گونہ مطمئن ہو کر ان کے مذہب پر جارحانہ حملے کا آغاز کیا ۔ ابتداءً گائے کی قربانی بند کرنے کی تحریک شروع کی اور نکتہ یہ اٹھایا کہ اسلام میں گائے کی قربانی فرض نہیں ہے لہٰذا اگر اس خیال سے کہ گائے کی قربانی سے ہندوؤں کی دل آزاری ہوتی ہے ، اسے ترک کر دیا جائے تو کیا مضائقہ ہے ؟ اس قسم کے سوالات علماء کی خدمت میں پیش کئے گئے ۔ بعض حضرات نے ہندوؤں کے فریب میں آکر فتوٰے دے دیا کہ گائے کی قربانی ترک کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے ۔ مولانا محمد سلیمان اشرف اور آپ کے شیخ اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خاں بریلوی اور دیگر علمائے اہلِ سنّت ہی کا کام تھا کہ انہوں نے اس فتنے کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور دو ٹوک الفاظ میں اعلان کیا کہ :

”شریعت نے جو اختیار عطا فرمایا ہے اس سے فائدہ اٹھانے کا ہمیں حق حاصل ہے خوفِ فتنہ ہو تو حکومت کی قوت کو متوجہ کرنا چاہیئے ، بہ پاسِ خاطرِ ہنود یا خوفِ ہنود اپنے دینی حق سے باز رہنا ہرگز روا نہیں ۔“ [2]

امام احمد رضا بریلوی نے اس مسئلہ پر ایک مستقل رسالہ ” انفس الفکر فی قربان البقر“ سپردِ قلم فرمایا اور مولانا محمد سلیمان اشرف نے اپنی گرانقدر تالیف ”النور“ میں سیر حاصل بحث فرمائی ۔

پھر ہندوؤں کے عیار لیڈر گاندھی نے کانگریس نواز علماء کو کچھ ایسا چکمہ دیا کہ یہ حضرات اس کے دامِ تزویر میں آگئے اور نہ صرف یہ کہ تحریکِ خلافت اور تحریکِ ترکِ موالات ایسی تحریکوں

---

[1] رشید احمد صدیقی ، پروفیسر : گنجہائے گرانمایہ (آئینہ ادب لاہور) ص ۳۲

[2] محمد سلیمان اشرف ، مولانا : النور (مطبوعہ علیگڑھ ۱۹۲۱ء) ص ۲

میں گاندھی کے فیصلے کو حرفِ آخر سمجھنے لگے بلکہ اس کی اقتدا میں دین و مذہب سے بھی بے اعتنائی برتنے لگے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان عوام اپنے دینی شعائر کو ترک کر کے ہنود کی خرافات کو اپنانے لگے۔ اس دور کا نقشہ مولانا سید سلیمان اشرف نے کس درد و کرب سے کھینچا ہے، ذیل کی عبارت میں ملاحظہ فرمائیے:

"گائے کی قربانی مسلمانوں سے چھڑائی جاتی ہے، موحدین کی پیشانیوں پر قشقہ جو شعار شرک ہے، کھینچا جاتا ہے۔ مساجد ہنود کی تفریح گاہیں، مندر مسلمانوں کا ایک مقدس معبد ہے، ہولی شعائر اسلام ہے جس میں رنگ پاشی اور وہ بھی خاص اہل ہنود کے ہاتھوں جبکہ وہ نشہ شراب میں بدمست ہوں عجیب دلکش عبادت ہے۔ بتوں پر ریوڑیاں چڑھانا، ہار پھولوں سے انہیں آراستہ کرنا، پھولوں کا تاج اصنام کے سروں پر رکھنا خالص توحید ہے۔ یہ سارے مسائل ان صورتوں میں اس لئے ڈھل گئے کہ ہنود کی دلنوازی اور استرضاء سے زیادہ اہم نہ توحید ہے نہ رسالت۔ نہ معاد، نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ"۔ [1]

اس وقت امت مسلمہ کو ایسے راہنما کی ضرورت تھی جو ہنود کی شاطرانہ چالوں کے تار و پود بکھیر کر راہ راست واضح کرتا اور مسلمانوں کو ہندو ازم میں مدغم ہونے سے بچاتا۔ اس نازک دور میں علمائے اہل سنت نے طعن و تشنیع سے بے نیاز ہو کر حق گوئی کا فریضہ کما حقہ ادا کیا اور علی الاعلان کہا:

"بت پرست اور بت شکن کا اتحاد نہیں ہو سکتا"

یہی وہ دو قومی نظریہ کا نعرہ تھا جو پہلے پہل علمائے اہل سنت کی طرف سے بلند ہوا اور اسی نظریے کی بنا پر پاکستان معرض وجود میں آیا۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری بریلوی کی بلند پایہ تصنیف "المحجۃ الموتمنہ" اور مولانا سید محمد سلیمان اشرف کی تصنیف لطیف النور کا مطالعہ کیجئے، یہ حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجائے گی۔

مولانا سید محمد سلیمان اشرف، مشرکین ہنود سے کس قدر متنفر تھے اس کا اندازہ ذیل کے

---

[1] محمد سلیمان اشرف، مولانا : النور، ص ۸

واقعہ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ جناب ڈاکٹر عابد احمد علی بیان کرتے ہیں کہ:

"ایک مرتبہ علی گڑھ یونیورسٹی کی مسجد میں بعض لوگوں نے گاندھی کو تقریر کے لیے بلایا تو سید صاحب (مولانا محمد سلیمان اشرف) نے بعد میں خود اپنے ہاتھ سے ساری مسجد کو دھو کر صاف کیا۔"[۱]

مشرکین سے یہ نفرت و بیزاری محض دینی جذبے اور خوفِ خدا کے تحت تھی چنانچہ ایک موقع پر یہ فرمایا:

"دیکھو! علماء کس طرح لیڈروں کا کھلونا بنے ہوئے ہیں اور لیڈروں نے مذہبی اصول اور فقہی مسائل کو کیسا گھروندا بنا رکھا ہے؟ — میں جھگڑا مول لینا نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ کالج اس قسم کے مناقشوں کا مرکز بنے لیکن کیا کروں خدا کو تو بعد میں منہ دکھانے کا موقع ملے گا، اس دنیا کے پڑھے لکھے لوگ کیا کہیں گے۔"[۲]

مولانا کے نزدیک دین کی حفاظت سب سے اہم تھی، سلطنت کے حصول کی خاطر ہنود سے اتحاد منا کر دین کے پسِ پشت ڈالنے کو بدترین گمراہی قرار دیتے تھے چنانچہ فرمایا کرتے تھے:

"لعنت ہے اس سلطنت پر جو دین بیچ کر حاصل کی جائے"[۳]

ماہِ رجب مطابق مارچ (۱۳۳۹ھ/۱۹۲۱ء) میں جمعیۃ العلماء ہند کا اجلاس بریلی میں ہونا طے پایا، پروپیگنڈے کے طور پر دو اشتہار سامنے آئے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ اراکین جمعیت اس آن بان سے بریلی آئیں گے کہ ان کی گھن گرج سے مخالفین دہل جائیں گے اور کسی کو مجالِ دم زدن نہ ہوگی ایک اشتہار کا عنوان تھا "زندگی مستعار کی چند ساعتیں" اس میں اجلاس کے مقاصد بیان کرتے ہوئے کہا گیا تھا:

"مخالفین ترکِ موالات اور موالاتِ نصاریٰ کے عملی حامیوں پر اتمامِ حجت کیا جائے گا"

دوسرا اشتہار بہ عنوان "آفتابِ صداقت کا طلوع" شائع ہوا۔ اس میں مخالفین پر بڑے رکیک حملے کئے گئے تھے۔ ذرا اس اشتہار کے غیر منصفانہ تیور ملاحظہ ہوں۔ اس میں لکھا تھا:

"منکرین و منافقین پر اتمامِ حجت، مسائلِ حاضرہ کا انقطاعی فیصلہ، خدائی فرمان پہنچانے کے لئے بریلی میں جمعیۃ العلماء کا اجلاس ہونے والا ہے" "سچائی ظاہر ہو گئی اور جھوٹ

---

[۱] عابد احمد علی، ڈاکٹر: مقالاتِ یوم رضا حصہ سوم، مطبوعہ اپریل ۱۹۷۱ء، ص ۱۰

[۲] رشید احمد صدیقی، پروفیسر: گنجہائے گرانمایہ: ص ۳۰

[۳] محمد نعیم الدین مراد آبادی، مولانا سید: حیات صدر الافاضل، ص ۱۰۱

بھاگ نکلا" خداوند جبار و قہار کا یہ فرمان پورا ہو کر رہے گا"۔ [1]

۱۰ رجب ۲۰ مارچ (۱۳۳۹ھ/۱۹۲۱ء) کو صدر شعبۂ علمیہ جماعت رضائے مصطفےٰ بریلی صدر الشریعہ مولانا محمد امجد علی نے ستّر سوالات پر مشتمل اعلانِ مناظرہ بنام "اتمامِ حجت" شائع کر کے جمعیۃ العلماء کے ناظم کو بھیجدیا لیکن بار بار تقاضوں کے باوجود عمائدینِ جمعیۃ مناظرہ کے لئے تیار نہ ہوئے اور بلند بانگ دعاوی کو صاف نظر انداز کر گئے۔

۱۳ رجب کو مولانا سید سلیمان اشرف بھی تشریف لے آئے۔ انہوں نے انفرادی طور پر بھی مناظرہ کی دعوت دی، اس کا جواب مولانا ابوالکلام آزاد نے دیا لیکن مختلف فیہ مسائل پر گفتگو کرنے کی بجائے غیر متعلقہ مسائل کا تذکرہ چھیڑ دیا اور کسی طرح نزاعی مسائل پر گفتگو کرنے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ آخر ۱۴ رجب کو شام کے بعد مولانا سید سلیمان اشرف، حجۃ الاسلام مولانا حامد رضا بریلوی، صدر الشریعہ مولانا امجد علی صدر جماعت رضائے مصطفےٰ، صدر الافاضل مولانا سید محمد نعیم الدین مراد آبادی، ملک العلماء مولانا ظفر الدین بہاری، مولانا محمد حسنین رضا ناظم جماعت رضائے مصطفےٰ اور مولانا برہان الحق وغیرہم حضرات شان و شوکت کے ساتھ جمعیۃ العلماء کے پنڈال میں تشریف لے گئے۔ صدر جلسہ مولوی ابوالکلام آزاد نے جماعت رضائے مصطفےٰ کے مناظرین کو خطاب کا وقت نہ دیا، غالباً وہ اس طرح ستر سوالات کے جواب سے پہلو تہی کرنا چاہتے تھے البتہ مولانا سید سلیمان اشرف کو ۳۵ منٹ کا وقت دیا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کے نام اجلاسِ بریلی میں شرکت کا دعوت نامہ جا چکا تھا"۔ [2]

مولانا سید سلیمان اشرف نے خطاب فرمایا اور علماءِ اہل سنت کا موقف بڑی خوبی سے واضح کیا۔ اس تقریر کو پڑھ کر مولانا کی حق گوئی، صلابتِ رائے اور چھا جانے والی شخصیت کا گہرا احساس دل پر نقش ہو جاتا ہے، یہ تقریر رودادِ مناظرہ میں جماعت رضائے مصطفےٰ بریلی کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔ اس تقریر کے کچھ اقتباسات ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں، مولانا نے ما بہ الاتفاق اور ما بہ الاختلاف بیان کرتے ہوئے فرمایا:

---

[1] اراکین جماعت رضائے مصطفےٰ، بریلی: دوامغ الحمیر (مطبوعہ بریلی) ص ۴۷

[2] ایضاً: رودادِ مناظرہ، ص ۴۰۲

" مسئلہ خلافت وتحفظ وصیانت اماکنِ مقدسہ اور ترکِ موالات ، یہ وہ مسائل ہیں جنہیں نہ صرف فقیر بلکہ تمام علمائے کرام ، نہیں بلکہ تمام عامہ مسلمین ہمیشہ متفق اللسان ہیں ، ترکوں کی خلافت بمعنی قوتِ دفاعی ایک امرِ مسلّم ہے ، خدمت حرمین شریفین ہر مسلمان پر فرضِ کفایہ ہے نیز محافظتِ حرمین شریفین بھی ہر مسلمان پر فرض کفایہ ہے — سلطنتِ ترکی ہماری دینی بھائی ، اس پر اسلامی سلطنت ، اس پر اسلام کی قوتِ دفاعی ، پھر حرمین شریفین کی خادم ومحافظ ، پس ان کی اعانت اور نصرت نہ صرف مسلمانانِ ہند بلکہ تمام مسلمانانِ عالم پر بقدرِ استطاعت فرض ہے۔ یہ وہ مسائلِ شرعیہ ہیں جنہیں نہ میں صرف اس وقت بیان کر رہا ہوں بلکہ آج سے دس برس پیشتر فقیر نے کہا ، لکھا ، چھاپا ، ملک میں شائع کیا۔

میرا و نیز دیگر علمائے اہل سنت وجماعت کا آپ سے اختلاف اس مسئلہ میں ہرگز نہیں ، ہاں اختلاف اس میں ہے کہ آپ ہندؤں سے موالات برتتے ہیں اور مسلمانوں کو حرام وکفریات کا مرتکب بتاتے ہیں ، تفصیل اس کی یہ ہے کہ موالات ہر نصرانی ویہودی سے ہر حال میں حرام ہے اور قطعی حرام ! ، یاایھا الذین اٰمنوا لاتتخذوا الیھود والنصاریٰ الاٰیۃ نصرانی اور یہودی خواہ فریق محارب ہو یا غیر محارب مطلقاً موالات اُن سے حرام اور مطلقاً حرام ، ہر کافر سے موالات حرام خواہ محارب ہو یا غیر محارب . لایتخذ المؤمنون الکافرین اولیاء ۔

آپ حضرات انگریزوں سے تو موالات حرام بتاتے ہیں اور کافروں (ہندؤوں) سے موالات نہ صرف جائز بلکہ عین حکمِ الٰہی کی تعمیل بتاتے ہیں — آپ نے قشقہ لگایا ، گاندھی کی جے ایک دو بار نہیں بلکہ بیسیوں جگہ بیسیوں بار پکاری کہ مہاتما گاندھی کی جے ، جس طرح صلیب علامتِ تثلیث ہے کیا قشقہ علامتِ شرک نہیں ؟ کیا آپ کی غیرت تقاضا کرتی ہے کہ شرک کی علامت قشقہ اپنی پیشانیوں پر لگائیے ؟

آپ ہمارے سامنے سمرنا وغیرہ کے مظالم بیان کرکے ہمارے جذبات ابھارتے ہیں مگر کیا ہندوؤں نے آرہ، شاہ آباد، کٹار پور وغیرہ میں قربانی بند کرنے کے لئے ایسے ہی مظالم نہیں کئے؟ قرآنِ مجید نہیں پھاڑے؟ عورتوں کی بے حرمتی نہیں کی؟ مسلمانوں کی جانیں نہیں لیں؟ مسجدیں میں بے ادبیاں نہیں کیں؟ آج آپ سبز گنبد کی بے ادبی ہونے سے غیرت دلاتے ہیں مگر کیا آپ کے سینے میں یہ غیرت کی بات نہیں تھی جبکہ یہ کہ کر دربارِ نبوت و رسالت کی اہانت کی گئی کہ:

"اگر نبوت ختم نہ ہوگئی ہوتی تو مہاتما گاندھی نبی ہوتے"

آپ نے اس پر کیوں نہ انکار کیا؟ کیوں خاموش رہے؟

غرض مقاماتِ مقدسہ و خلافتِ اسلامیہ کے مسائل میں ہمیں اختلاف نہیں، ہندوستان کے مفاد کی کوشش کیجئے، اس سے ہمیں خلاف نہیں خلاف ان حرکات سے ہے جو آپ لوگ منافی و مخالفِ دین کر رہے ہیں ان حرکات کو دور کر دیجئے، ان سے باز آئیے، ان کی روک تھام کیجئے، عوام کو ان سے باز رکھیے تو خلافتِ اسلامیہ و ممالک مقدسہ کی حفاظت، ہندوستان کے ملکی مفاد کی کوششیں، ہم بھی آپ کے ساتھ مل کر کرنے کو تیار ہیں۔ [1]

اس کے بعد ابوالکلام آزاد نے چند باتیں بطور صفائی کہیں جن کا خلاصہ درج ذیل ہے:

"یہاں کس نے قشقے کی اجازت دی؟ کس نے مہاتما گاندھی کی جے پکارنے کو کہا؟ بلکہ میں خود تو مہاتما کے معنی تک نہیں جانتا کہ وہ کوئی تعظیم کا لفظ ہے — یہاں کے کس ذمہ دار نے کہا کہ "اگر نبوت ختم نہ ہوگئی ہوتی تو مہاتما گاندھی نبی ہوتے"؟ "یہ کفر کا کلمہ کون مسلمان کہہ سکتا ہے؟ اور جے قشقہ وغیرہ

---

[1] راکین جماعت رضائے مصطفےٰ بریلی: روداد مناظرہ، ص ۸۰۵

حرکات مخالف دین پر ہم سخت نفرین کرتے ہیں ــــ نفس موالات تمام کفار سے خواہ وہ حربی ہوں یا غیر حربی، یقیناً حرام اور ممنوع ہے اور ہم کب اسے جائز بتاتے ہیں ــــ کوئی غیر مسلم کسی مسلم کا ہرگز پیشوا و رہنما نہیں ہو سکتا مسلمانوں کی پیشوائی و راہنمائی ایک ذات حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لئے ہے اور ان کی نیابت سے علماء کے لئے ہے۔ میں صاف کہتا ہوں کہ ہمارے ہندو بھائی بائیس کروڑ ہیں اگر وہ بائیس کروڑ گاندھی ہوں اور مسلمان ان کو اپنا پیشوا بنائیں اور ان کے بھروسہ پر رہیں تو وہ بت پرست ہیں اور گاندھی ان کا بت !" [1]

مولانا آزاد نے اپنی تقریر میں مسئلہ قربانی کے بارے میں کچھ نہ کہا، اس تقریر کے جواب میں مولانا سلیمان اشرف نے کہا :

"ابوالکلام صاحب کہتے ہیں کہ آیات میں تحریف کر کے ہنود سے موالات کس ذمہ دار شخص نے جائز بتائی ؟ کیا حکیم اجمل خان صاحب ذمہ دار شخص نہیں ؟ پھر ان کا مطبوعہ خطبہ دیکھئے جس کی ہزاروں کاپیاں شائع ہوئیں ــــ آپ کہتے ہیں کہ قشقہ وغیرہ حرکات کی ہم نے کب اجازت دی مگر آپ نے عوام کے سامنے ہنود سے اتحاد کو کیوں اس طرح مفصل و مشرح کر کے نہیں پیش کیا کہ ان امور میں اتحاد کرو اور ان امور میں الگ رہو، آپ نے ان کے سامنے مجمل صورت میں اتحاد پیش کیا جس سے وہ ان حرکات میں مبتلا ہوئے پھر آپ ان حرکات کی ذمہ داری کیسے الگ ہو سکتے ہیں ــــ خود آپ کے شہر دہلی میں گاندھی کو سپاسنامہ پیش کیا گیا جس میں گاندھی کی نسبت کہا گیا :

ع خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست

کیا آپ حضرات نے اس پر کچھ انکار کیا ؟ کیا آپ کا یہ سکوت آپ پر الزام نہیں لاتا؟

[1] اراکین جماعت رضائے مصطفےٰ، بریلی : روداد مناظرہ، ص ۹،۸

مولانا ابوالکلام آزاد ان الزامات پر خاموش رہے، پھر مولانا سید سلیمان اشرف نے مولانا عبدالماجد بدایونی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا :

"کہو یار تمہاری بھی کہہ دیں، تم نے گاندھی کو کہا کہ خدا نے ان کو مُذکّر بنا کر بھیجا ہے، یہ کفر ہے" ؎

اس پر مولانا بدایونی خاموش رہے، تقریر ختم ہونے پر مولانا حامد رضا بریلوی نے فرمایا :

"ہمیں خلاف آپ حضرات کی ان خلافِ شرع وخلافِ اسلام حرکات سے ہے جن میں سے کچھ مولوی سید سلیمان اشرف صاحب نے بیان کیں اور جن کے متعلق جماعت (رضائے مصطفےٰ) کے ستر سوال بنام "اتمام حجت تامہ" آپ کو پہنچے ہوئے ہیں ان کے جواب دیجئے۔ جب تک آپ اُن تمام حرکات سے اپنا رجوع نہ شائع کر دیں گے اور اُن سے عہدہ برآ نہ ہولیں گے ہم آپ سے علیحدہ ہیں اور اس کے بعد خدمت وحفاظت حرمین شریفین ومقامات مقدسہ وممالک اسلامیہ میں ہم آپ کے ساتھ مل کر جائز کوشش کرنے کو تیار ہیں" ؎

یہ ہے خلاصہ گفتگو جس میں علمائے اہل سنت کو نمایاں کامیابی ہوئی۔ صدرالافاضل مولانا سید نعیم الدین مرادآبادی نے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی کے نام ایک مکتوب میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا :

"روانگی کے وقت بریلی کے اسٹیشن پر ایک تاجر صاحب نے مجھ سے کہا کہ ابوالکلام جس وقت بریلی سے جا رہے تھے میں ان کے ساتھ تھا، وہ یہ کہتے جاتے تھے کہ ان کے جس قدر اعتراض ہیں حقیقت میں سب درست ہیں ایسی غلطیاں کیوں کی جاتی ہیں جن کا جواب نہ ہو سکے اور ان کو اس طرح گرفت کا موقع ملے"۔

میں اپنی اس مسرت کا اظہار نہیں کر سکتا جو مجھے اس فتح سے حاصل ہوئی میدان

؎ اراکین رضائے مصطفےٰ : روداد مناظرہ، ص ۹-۱۰

؎ ایضاً ، ص ۱۰-۱۱

مولوی سلیمان اشرف صاحب کے ہاتھ رہا، حضرت کے غلاموں کی ہمت قابلِ تعریف ہے۔" [1]

مولانا سلیمان اشرف نے متعدد کتابیں تحریر فرمائیں جن میں بیان و برہان کا زور پوری طرح جلوہ گر ہے۔ آپ نے حب النور اور الرشاد ایسی کتابیں لکھ کر ہندو نواز گانگریسی لیڈروں کا شرعی نقطۂ نگاہ سے محاسبہ کیا تو مخالفتوں کا طوفان کھڑا ہوگیا۔ تحریر و تقریر کے ذریعے آپ کے خلاف پروپیگنڈا کیا گیا لیکن آپ کوہِ وقار بنے رہے اور طعن و تشنیع کی پرواہ کئے بغیر اعلاء کلمۃ الحق کا فریضہ ادا کرتے رہے۔ اس وقت عوام تو عوام بعض خواص بھی اس مغالطے میں واقع ہوگئے کہ عام طور پر کانگریس اور جمعیۃ العلماء ہند کے لیڈر جو کچھ کہہ رہے ہیں وہی سو فیصد درست ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا یہ احساس یقین کی حد کو پہنچنے لگا کہ اس افراتفری کے دور میں علماء اہل سنت نے جو کچھ کہا تھا وہی حقیقت تھا، پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

"سیلاب گزر گیا، جو کچھ ہونے والا تھا وہ بھی ہوا لیکن مرحوم (مولانا سلیمان اشرف) نے اس عہد سراسیمگی میں جو کچھ لکھ دیا تھا بعد میں معلوم ہوا کہ حقیقت وہی تھی، اس کا ایک ایک حرف صحیح تھا، آج تک اس کی سچائی اپنی جگہ پر قائم ہے۔ سارے علماء سیلاب کی زد میں آچکے تھے، صرف مرحوم اپنی جگہ پر قائم تھے۔" [2]

فارسی شعر و ادب کی تاریخ پر الانہار لکھی عربی، فارسی اور اردو کے محقق اور راوی حبیب الرحمن شروانی نے اسے شبلی کی شعر العجم سے بہتر قرار دیا۔ حج کے موضوع پر الحج تالیف کی جسے مولانا شروانی نے حج کے موضوع پر سب سے بہتر قرار دیا۔ عربی زبان کی برتری اور فوقیت پر نہایت وقیع کتاب المبین لکھی جسے اہل علم نے بے حد سراہا۔ مشہور مستشرق مسٹر براؤن نے اسے دیکھ کر کہا:

"مولانا نے اس عظیم موضوع پر اردو میں یہ کتاب لکھ کر ستم کیا، عربی یا انگریزی میں ہوتی تو کتاب کا وزن اور وقار بڑھ جاتا۔" [3]

---

[1] ایضاً : ص ۱۹ - ۲۰

[2] رشید احمد صدیقی، پروفیسر : گنجہائے گرانمایہ، ص ۳۱

[3] محمود احمد قادری، مولانا : تذکرہ علمائے اہل سنت، ص ۱۰۰

مولانا نے المبین کا ایک نسخہ ڈاکٹر اقبال کو بھی بھجوایا تھا ۔ اتفاقاً کچھ دن بعد اقبال علی گڑھ گئے تو دورانِ ملاقات اس کتاب کی بڑی تعریف کی اور کہا :

" مولانا آپ نے عربی زبان کے بعض ایسے پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے جن کی طرف پہلے کبھی میرا ذہن منتقل نہیں ہوا تھا " [1]

مولانا کا اہل سنت پر یہ احسان بھی کچھ کم نہیں ہے کہ آپ نے مجاہد جلیل مولانا علامہ محمد فضل حق خیرآبادی کی لاجواب تصنیف امتناع النظیر پہلی دفعہ شائع کرکے اسے علمی دنیا میں متعارف کرایا ہے ۔" [2]

مولانا سید سلیمان اشرف نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں فرائضِ تدریس انجام دیتے رہے ۔ آپ سے ہزارہا افراد نے استفادہ کیا ، چند مشاہیر تلامذہ کے نام یہ ہیں :-

۱۔ مبلغِ اسلام مولانا ڈاکٹر فضل الرحمٰن انصاری ، بانی المرکز الاسلامی ، کراچی
۲۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی مؤلف گنجہائے گرانمایہ ، علی گڑھ
۳۔ ڈاکٹر عابد احمد علی ، مہتمم بیت القرآن ، پنجاب پبلک لائبریری ، لاہور (م ۲۵ اپریل ۱۹۷۴ء)
۴۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی ، لاہور

۵ ربیع الاول ، ۲۵ اپریل (۱۳۵۸ھ / ۱۹۳۹ء) میں مولانا سید محمد سلیمان اشرف قدس سرہ کا وصال ہوا اور علی گڑھ کے قبرستان میں دفن کئے گئے ۔

---

[1] رشید احمد صدیقی ، پروفیسر : گنجہائے گرانمایہ ، ص ۱۴۱
[2] محمد یعقوب ضیاء القادری ، مولانا : اکمل التاریخ حصہ اول ، ص ۹۰
[3] عبدالقدوس ہاشمی : تقویم تاریخی ، ص ۳۴۰

نوٹ :- تذکرہ علمائے اہل سنت میں لکھا ہے کہ رمضان المبارک ۱۳۵۲ھ میں آپکا وصال ہوا جو صحیح نہیں ہے ۔

تلامذہ ــــــ شمس العلماء مولانا عبد الحق ــــــ خیرآبادی

مولانا عبد الشاہد خاں شروانی نے لکھا ہے کہ مولانا عبد الحق خیرآبادی سے ہزاروں تلامذہ نے استفادہ کیا، ان میں سے دس تلامذہ کے نام بھی لکھے ہیں، ذیل میں چند مزید نام پیش کئے جاتے ہیں:-

۱- حکیم احمد رضا خاں لکھنوی — متوفی ۱۹۰۴ء — تذکرہ کاملانِ رامپور ص ۱۲

۲- حکیم مولوی افضال احمد خاں رامپوری — ″ ۲۴؍اگست ۱۹۲۴ء — ″ ص ۴۸

۳- حکیم حسین رضا خاں — یکم ربیع الاول ۱۳۲۷ھ — ″ ص ۱۰۴

۴- حکیم مولوی سید شہاب الدین — ″ ص ۱۶۵

۵- مولوی عبد الغنی خاں (والدِ ماجد حکیم نجم الغنی مؤرخ) — ″ ۱۸۹۹ء — ″ ص ۲۳۳

۶- مولوی عبد الملک خاں — ″ ص ۲۴۵

۷- حکیم تفضل حسین — ″ ص ۲۴۹

۸- مولوی حکیم عبد الہادی خاں (متوفی ۲۷؍ذیقعدہ ۲۶؍ستمبر ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۶ء) — ″ ص ۲۵۱

۹- مولانا فضل حق رامپوری — ″ ۱۹۴۰ء — ″ ص ۳۱۷

۱۰- صاحبزادہ محمد علی خاں عرف چھٹن صاحب — ″ ۲۸؍محرم ۱۳۳۵ھ/۱۹۱۶ء — ″ ص ۳۶۵

۱۱- مولوی محمد نبی خاں — ″ ص ۳۷۶

۱۲- حکیم مولوی حاجی منور علی محدث — ″ ص ۳۷۸

۱۳- مولوی حکیم مرتضیٰ — ؍جولائی ۱۹۰۶ء — ″ ص ۳۸۴

۱۴- مولوی نظیر الدین — ″ ص ۴۱۹

۱۵- مولانا شاہ اعظم حسین مدنی — ″ ۱۳۳۷ھ — (تذکرۂ علمائے اہلسنت ص ۳۴

۱۶- مولوی مقیم الدین (ٹانک] — ″ ہند ص ۵۰۲

۱۷- مولانا شسنہ گل (مردان) [1] ۱۸- مولانا علیم الدین شاہجہانپوری (محشی رسالہ قطبیہ)

---

[1] ۳؍ستمبر ۱۹۷۱ء کو راقم الحروف اور مولانا قاضی عبد الغنی کوکب زید مجدہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے شمس العلماء مولانا عبد الحق خیرآبادی سے استفادہ کا ذکر کیا۔

مُقدمہ اور اس کے متعلقات

ڈاکٹر اطہر عباس رضوی جب "سوتنتر دہلی" تالیف کر رہے تھے تو اس کی ترتیب کے سلسلے میں سرکاری مواد بھی مہیا کر رہے تھے۔ اسی ضمن میں علامہ فضل حق خیر آبادی کے مقدمہ کی مسل بھی میسر آگئی۔ موصوف سے میرے دیرینہ تعلقات ہیں۔ وہ غالباً ۱۹۴۲ء میں کتب خانہ جبیب گنج میں اپنے موضوع کی تحقیق کے سلسلے میں پہنچے تھے! اور میں وہاں کام کرتا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۴۵ء میں لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی میں بہ حیثیت اورینٹل اسسٹنٹ میرا تقرر ہو گیا۔ کچھ دن کے بعد رضوی صاحب بھی شعبۂ تاریخ میں لیکچرر ہو کر آگئے۔ پھر تو مسلسل ملاقاتیں ہونے لگیں۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ یوپی سرکار میں اچھے عہدے پر چلے گئے۔ اسی دور میں "سوتنتر دہلی" کی تالیف کی۔ اب آسٹریلیا کی یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ اور وہیں کے باشندے ہو گئے ہیں۔ مگر تقریباً ہر سال علی گڑھ آتے ہیں۔

میری استدعا پر موصوف نے اس مسل کی دو کاپیاں ٹائپ کر کے مجھے دیں۔ پھر میری استدعا پر اس کا اردو ترجمہ بھی کر کے دیا۔

اس مسل میں سے کچھ کاغذات سرکاری طور پر نکال لئے گئے ہیں۔

علامہ کو ۳۰ جنوری ۱۸۵۹ء کو گرفتار کیا گیا۔ اور لکھنؤ میں مقدمہ چلایا گیا۔ گرفتاری سے تین ہفتے کے اندر کیپٹن ایف۔ اے۔ وی تھر برن کی عدالت میں ۲۱ فروری ۱۸۵۹ء کو مقدمہ شروع ہوا۔ استغاثہ اور صفائی کے پانچ پانچ گواہوں کے بیانات کے بعد ۲۸ فروری ۱۸۵۹ء کپتان تھر برن نے فرد جرم مرتب کر کے مقدمہ جوڈیشل کمشنر اودھ کی عدالت میں منتقل کر دیا۔ جو ڈیشل کمشنر مسٹر جارج کیمبل اور میجر بارو قائم مقام کمشنر خیر آباد ڈویژن کی مشترکہ عدالت سے ۴ مارچ ۱۸۵۹ء کو قتل پر انگیخت اور بغاوت کے الزام میں بطور شاہی قیدی حبس حیات بعبور دریائے شور اور تمام جائداد کی ضبطی کی سزا سنا دی گئی۔

مقدمہ فوجداری نمبر ۲ (۷،۱) ۱۸۵۹ء خیرآباد ڈویژن۔

سرکار۔ بنام فضل حق۔

الزام۔ بغاوت۔

سزا۔ عمر قید (موت ۲-۸-۶۱) ضبطی کل جائداد۔

۱۔ مسٹر تھامسن کا نیم سرکاری خط مورخہ ۹ر فروری۔
۲۔ کیپٹن تھربرن کے ریکارڈ کی شہادت
۳۔ مقدمہ فوجداری کیپٹن تھربرن کی عدالت میں چلا۔
۴۔ چارج شیٹ۔
۵۔ کلینڈر۔
۶۔ اخبار کا ترجمہ۔ مورخہ ۱۶ر جون ۱۸۵۸ء
۷۔
۸۔ خط ازطرف کمشنر متعلقہ اسٹیٹ نمبر، (۷،۱) مورخہ ۲ر مارچ۔
۹۔ فارسی کے اخبار کے اقتباسات۔
۱۰۔ نقل خط ازطرف کمشنر سی، ایس، ایس نمبر، مورخہ ۲ر مارچ ۱۸۵۹ء بنام کمشنر دہلی۔
۱۱۔ کمشنر دہلی کا خط نمبر ۱۳۵ (۷،۱) مورخہ ۲۶ر فروری ۱۸۵۹ء (جس کے ساتھ ایک نوٹ بزبان فارسی نوشتہ فضل حق جس پر G لکھا ہے منسلک ہے)
۱۲۔
۱۳۔ اور مختلف لوگوں کے DEPOSITION بزبان فارسی۔
۱۴۔ جوڈیشل کمشنر کے شہادتی نوٹ۔
۱۵۔ چارج شیٹ۔
۱۶۔ ریمارکس بمعہ ڈاکٹ نمبر ۳۲۲ مورخہ ۷ر مارچ ۱۸۵۹ء بنام ایس۔
۱۷۔ وارنٹ نمبر ۱۴۔

۱۸۔ مولوی فضل حق کی جانب سے عرضداشت (Petition) بزبان فارسی۔

۱۹۔ خط از طرف کمشنر خیرآباد نمبر ۱۵۳ مورخہ ۳۰ جولائی۔

۲۰۔ خط بنام [illegible] کمشنر نمبر ۲۸۰ مورخہ ۳ اگست ۱۸۶۱ء

۲۱۔ خط از طرف [illegible] کمشنر نمبر ۱۹۷۵ مورخہ ۱۲ اگست ۱۸۶۱ء

۲۲۔ نقل ایک .G ایجنٹ کے روبکار ایٹ راجپوتانہ کی مورخہ ۱۰ جولائی ۱۸۶۱ء۔

۲۳۔ مسٹر ولیم کا میمو۔

۲۴۔ خط بنام ایجنٹ گورنمنٹ جنرل راجپوتانہ نمبر ۷۵۱ مورخہ ۱۶ از طرف سپرنٹنڈنٹ پورٹ بلیر (۲۵ اور ۲۶)

۲۵۔ (ARYDAK گم ہے ممکن ہے الگ کر دیا گیا ہو نمبر A مورخہ ۴ ۱۱/۹۰ء)
سب سوائے نمبر ۲-۴-۱۴-۱۵-۱۶-۱۹-۲۰-۲۱ اور ۲۶ کے الگ کر دیئے گئے۔

۲۶۔ وارنٹ۔

۲۷۔ فارسی کی مسل لسٹ پر نشانی لگائی ہوئی۔

۲۸-
۲۹ }

۳۰
۳۱ } ڈسٹرکٹ جج کے کاغذ نمبری ۲۵۸۵ مورخہ ۱۷ دسمبر ۱۸۹۱ء

۳۲
۳۳ } جوڈیشل کمشنر کے کاغذ نمبری آر ۷۱ ۱۸۵۹ء مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۸۹۱ء

یہ مقدمہ فوجداری نمبری ۲ (۷) کیپٹن ایف ۔اے۔ ڈی بقر برن کی عدالت میں ۲۱ فروری ۱۸۵۹ء کو لکھنؤ میں شروع ہوا۔ استغاثہ کی طرف سے پانچ گواہ پیش ہوئے۔ (۱) عبدالحکیم اکسٹرا اسسٹنٹ دریاباد (۲) تجمل حسین۔ (۳) فضل حسین (۴) رام دیال (۵) مرتضیٰ حسین۔ ان گواہوں نے اپنے بیانات میں مولانا فضل حق کو بوندی میں ممو خاں باغی کا مشیر اودھ کی بغاوت میں شریک کار، اور عبدالحکیم و مرتضیٰ حسین کے قتل کے لئے فتوا دینے

کا مرتکب ثابت کرنے کی کوشش کی۔

استغاثہ کے گواہوں کے بعد مولانا فضل حق کا بیان ہوا:-

بیان مدعا علیہ

"میں الور کے راجہ کی ملازمت میں تھا۔ میں ان کے ساتھ ۵ سال رہا، اور بغاوت کے شروع ہونے پر بھی ان کے ساتھ تھا۔ راجہ بنے سنگھ کی موت کے ایک ماہ بعد تک میں الور میں رہا۔ اگست ۱۸۵۷ء میں، میں نے الور چھوڑ دیا۔ میں نے دہلی کیلئے کوچ کیا وہاں ۱۵ دن رہا اور پھر الور لوٹ آیا۔ میں نے اپنا خاندان الور ہی میں رہنے دیا تھا۔ اور ستمبر ۱۸۵۷ء میں خیرآباد کے لئے چل پڑا۔ میں اپنے گھر رہا تھا۔ اور میں نے کسی کی ملازمت نہیں کی۔ نہ ہی میں باغیوں سے ملا تھا۔ میرے گواہان میر فتح حسین، محمد حسین اور احمد علی خاں ہیں۔ نبی بخش، قادر بخش، امام علی، آل محمد اور ممو خاں میرے رہنے سہنے کی شہادت دے سکتے ہیں۔ میں نے خیرآباد اس لئے چھوڑا کیونکہ سب ہی لوگ بیگم کے ساتھ بھاگ لئے تھے۔ میں خیرآباد سے ہٹنے کے بعد کچھ وقفہ کے لئے کھیری، ہرگانوں، تنبول اور رسول پور میں بھی ٹھہرا تھا۔ میں کچھ دن دوریہ میں بھی رہا۔ ۲۶ر دسمبر ۱۸۵۸ء کو میں کرنل کلارک سے سبیہا کے مقام پر ملا اس سے پہلے میں بریگیڈیر ٹروپ سے مل چکا تھا۔ بریگیڈیر ٹروپ ہی نے مجھے کرنل کے پاس بھیجا تھا۔ کرنل کلارک نے ایک روبکار لکھی اور حکم دیا کہ اسے ڈپٹی کمشنر ضلع کی تحویل میں دے دیا جائے۔ میں ۳۰ر دسمبر کو ڈپٹی کمشنر کے سامنے پہنچا پھر اپنے مکان پر رہا۔ ۳۰ر جنوری ۱۸۵۹ء کو ڈپٹی کمشنر نے مجھے بلایا اور لکھنؤ بھیج دیا۔ فضل حق ایک دوسرے شخص کا نام ہے۔ اس کے بدلے میں مجھے گرفتار کیا گیا ہے وہ آج کل فیروز شاہ کے ساتھ ہے۔ وہ آنولہ کا تحصیلدار تھا۔ اور خان بہادر خاں اور بیگم کی ملازمت میں تھا۔ وہ سید ہے اور شاہجہاں پور کا رہنے والا ہے۔"

مولانا کے بیان کے بعد ۵ گواہانِ صفائی قادر بخش، نبی بخش، علی محمد خاں، ممو خاں اور احمد علی خاں کے بیانات ہوئے جن میں قیام خیرآباد اور باغیوں سے بے تعلقی پر

زور دیا گیا تھا۔ اور مولانا پر قائم کئے گئے الزامات کو دوسرے فضل حق شاہجہاں پوری سے متعلق بتایا گیا تھا۔

کیپٹن ایف۔ اے۔ وی تھربرن نے استغاثہ، ملزم اور گواہان صفائی کے بیانات کے بعد ۲۸ ر فروری ۱۸۵۹ء کو حسب ذیل فرد جرم مرتب کر کے مقدمہ جوڈیشل کمشنر اودھ کی عدالت میں منتقل کر دیا۔

فرد جرم بغاوت

نکتہ ۱:۔ ملزم نے بونڈی میں ماہ مئی ۱۸۵۸ء میں باغی ممو خاں کی کونسل میں حصہ لیا۔ اس طرح باغیوں کا خود بھی سردار رہا اور بغاوت پر لوگوں کو آمادہ کرتا رہا۔

نکتہ ۲:۔ بونڈی میں ماہ مئی ۱۸۵۸ء میں جب کہ ممو خاں کے مشیر کی حیثیت سے کام کیا تو سازش قتل کی عبد الحکیم جو سرکاری ملازم تھا اس کے قتل کا مشورہ دیا۔

وضاحت:۔ ایک سرکاری ملازم عبد الحکیم کو مئی ۱۸۵۸ء میں باغیوں نے گرفتار کر کے بیگم اور ممو خاں کے پاس بھیجا۔ جواں دنوں قلعہ بونڈی اور اس کے گرد و نواح میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ عبد الحکیم کے ساتھ ہی ایک اور شخص مرتضیٰ حسین بھی گرفتار ہوا تھا جو اگرچہ سرکاری ملازم تو نہیں تھا لیکن انگریزوں کا وفادار تھا۔ اس لئے باغیوں میں مبغوض تھا جب یہ دونوں ممو خاں کے سامنے پیش ہوئے تو ملزم نے جو وہاں موجود تھا قرآن کی آیتیں پڑھیں۔ اور یہ رائے ظاہر کی کہ یہ دونوں موت کے مستحق ہیں۔ شہادت سے ثابت ہے کہ ملزم کا ممو خاں پر بہت اثر تھا۔ ملزم اس کا مشیر اور باغی فوج میں گویا سرغنہ تھا۔ اس نے اپنے اثر و رسوخ کو عبد الحکیم اور مرتضیٰ حسین کے خلاف استعمال کیا۔ مگر کہ یہ دونوں قید سے رہائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے بجز یہ ممکن نہ تھا۔ اگر ممو خاں نے ملزم کو مولوی احمد اللہ شاہ کی جائداد ضبط کرنے کو نہ بھیجا ہوتا۔

لکھنؤ
۲۸-۲-۵۹ء

بعدالت لکھنؤ مورخہ ۲۱، ۳، ۴، مارچ ۱۹۵۹ء

بہ اجلاس لیفٹنٹ جی کیمبل جوڈیشل کمشنر آف اودھ و میجر بیرو۔ سی۔ ایم آئی فننگ کمشنر آف خیرآباد ڈویژن۔

مولوی فضل حق پر مندرجہ ذیل الزامات عائد کئے گئے۔

بغاوت اور قتل کی سازش

نکتہ ۱:۔ ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۸ء میں باغی سرکار کی حیثیت میں دہلی، اودھ اور دوسری جگہوں پر بغاوت اور قتل میں مدد دی۔

نکتہ ۲:۔ بونڈی میں ماہ مئی ۱۸۵۸ء میں باغی سردار ممو خاں کے مشیر خاص کی حیثیت سے نمایاں کام انجام دیا۔

نکتہ ۳:۔ بونڈی میں ماہ مئی ۱۸۵۸ء میں ملازم عبدالحکیم سرکار انگلشیہ کے خلاف سازشِ قتل کی۔ قیدی نے خود کو مجرم نہیں مانا۔ مقدمہ کی کارروائی ہوئی۔

عدالت نے قیدی کو مندرجہ ذیل وجوہ پر مجرم قرار دیا

۱۔ ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۸ء میں بغاوت کی سازش کی۔ اور ایسے اصولوں کی اشاعت کی جس سے قتل کے امکانات پیدا ہوئے۔

۲۔ بونڈی میں ۱۸۵۸ء میں باغیوں کی کونسل میں خاص کام انجام دیئے۔ خاص طور پر باغی سردار ممو خاں کے مشیر خاص کی حیثیت سے اس نے ایسے اصولوں کی اشاعت کی، جس سے قتل کے امکانات پیدا ہوئے۔

۴ مارچ کو مجرم کو عمر قید بعبور دریائے شور بحیثیت قیدی سرکار انگلشیہ اور ضبطیٔ جائداد کی سزا دی گئی۔ لکھنؤ۔ ۴ مارچ ۱۸۵۹ء

تشریح

اس شخص (فضل حق) کے مقدمہ کو دو حصوں میں منقسم کر کے دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ شخص ۱۸۵۷ء میں باغی سردار کے مشیر خاص کی حیثیت سے مانا جاتا تھا۔ دہلی میں اس کے

تعلقات تھے۔ دہلی کے کمشنر کے خط کے ذریعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے تقریباً وہی رویہ وہاں بھی رکھا تھا۔ اس مقدمے کا جہاں تک دہلی سے تعلق ہے وہ ثابت نہیں کیا جاسکا کیونکہ گواہیاں نہیں پیش کی جاسکیں۔ اور مجرم کو اس بات کا موقعہ نہیں ملا کہ وہ الزامات کو قبول کرسکے یا انھیں جھٹلاسکے۔ مگر چونکہ اس شخص کے خلاف اودھ کے الزامات ثابت کئے جاچکے ہیں۔ اس لئے اس کا رویہ دہلی میں بھی کم وبیش اسی قسم کا اخذ کیا جاسکتا ہے۔

مندرجہ ذیل الزامات اس ملزم پر عائد کئے گئے :۔

(۱) پوری بغاوت کے دوران اس شخص نے عام طور پر لوگوں کو اکسایا اور

(۲) خاص طور پر اودھ میں ۱۸۵۸ء میں لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کیا۔

پہلے کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عدالت کے لئے ملزم کو قتل کے لئے اکسانے کے الزام پر سزا دینا ممکن نہ ہوگا کیونکہ جن لوگوں کے لئے یہ کہا جاتا تھا کہ ملزم نے انھیں قتل کرانے کی کوشش کی۔ وہ واقعۃً قتل نہیں کئے گئے۔ اور یہ بات بھی بالکل واضح نہ ہوئی تھی۔ کہ ملزم نے انھیں کچھ شرائط پر چھوڑ دیا ہو مگر پھر بھی عدالت کا یہ خیال ہے کہ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ملزم نے اس موقع پر بالکل صریحاً اور اپنی سرکاری حیثیت میں کچھ ایسے اصول کی اشاعت کی جن سے لوگ قتل کے لئے آمادہ ہوئے۔ اس نے قرآن سے اقتباسات پیش کئے۔ اور یہ کہا کہ جو لوگ سرکار انگلشیہ کی ملازمت میں رہ چکے ہوں۔ وہ ملحد ہیں۔ اور یہ کہ اسلامی قانون کے اعتبار سے ان کی سزا موت ہے۔ اور اس نے یہاں تک کہا کہ اگر باغی سرداروں نے یہ سزا سرکار انگلشیہ کے نوکروں کو نہ دی تو وہ خود خدا کی نگاہ میں گنہگار ہوگا۔

عدالت نے شبہ کی بنا پر ملزم کو اس الزام سے بری کیا۔ کہ ملزم نے سزائے موت کے بدلے سرکار انگلشیہ کی نوکری چھوڑنے کو کہا ہو لیکن یہ بات بالکل صاف اور واضح ہے کہ ملزم نے جن اصولوں کی اشاعت کی تھی ان سے ایسے خونی مناظر دیکھنے میں آئے جو بغاوت کے جزو خاص تھے اور تمام گواہوں کے بیانات سے عدالت یہ سمجھتی ہے کہ ملزم ایک مشیر اور بغاوت کو اکسانے والا شخص تھا۔ اس نے اپنا یہ رویہ دہلی میں بھی رکھا۔ اور یقیناً وہ اودھ

میں اس جرم کا مرتکب تھا۔ اس نے ایک بار اس بات کی بھی کوشش کی کہ وہ یہ بات ثابت کر سکے کہ وہ فضل حق ہیں۔ جو کہ اودھ کی بغاوت میں منسلک رہے تھے مگر یہ بات بالکل صاف ہے کہ ایک تحصیلدار بریلی تھا۔ جو کہ بعد کو باغیوں کے ساتھ ایک جتھے کا لیڈر تھا جب کہ ملزم بالکل مختلف شخص ہے۔ یہ شخص کبھی جتھے کے ساتھ نہیں رہا۔ اور کبھی اس نے تلوار ہاتھ میں نہیں لی۔ یہ شخص باغی سردار کے دربار میں تھا۔ اور باغیوں کی عدالت عالیہ کا سب سے زیادہ با اثر ممبر تھا۔ یہ بات مشتبہ ہے کہ آیا یہ عدالت واقعی کوئی حیثیت رکھتی تھی۔ اور آیا ملزم اس عدالت میں کوئی مستقل مقام رکھتا تھا۔ لیکن یہ بات بالکل ثابت ہو چکی ہے کہ کچھ لوگ بیگم اور باغی سردار کو مشورہ دیتے رہتے تھے۔ اور باغیوں کے کیمپ میں انھیں اہل شوریٰ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس مجلس کو کبھی کبھی انگریزی نام کچہری پارلیمنٹ بھی کہا گیا ہے۔ اسی مجلس کا ملزم ایک سرگرم اور سربراہ لیڈر تھا۔

براہ راست شہادت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ملزم کو ممّو خاں کا اعتماد حاصل تھا اور یہ کہ ملزم سے براہ راست ممّو خاں مشورہ لیا کرتا تھا۔ اور اس موقع پر ملزم نے ایسے اصولوں کی اشاعت کی جن سے قتل کے امکانات ہو سکتے تھے۔

قیدی' ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک بہت عقلمند شخص ہے جس نے طاقت اور مشہور رہنے کی ہوس میں پالے انتہا شدید باتوں سے اثر انداز ہو کر باغیوں کی مجلس میں اپنی اس قدر اثر انداز جگہ بنائی تھی۔ وہ ایک بہت خطرناک ہستی ہے۔

وہ کسی بھی وقت لامحدود نقصانات پہنچا سکنے کا اہل ہے۔ وہ ایک ایسا انسان ہے جس کا ہندوستان سے ہٹا دیا جانا انصاف اور امن کے لئے ضروری ہے۔ وہ اودھ کا رہنے والا ہے مگر ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتا ہے جو سب کچھ کے لئے سرکار انگلشیہ کے مرہونِ منت رہے ہیں۔ اور وہ بذات خود سرکار انگلشیہ میں ایک اچھی حیثیت رکھتا تھا مگر اس نے بہت دنوں سے سرکار انگلشیہ کی نوکری چھوڑ دی تھی۔ اور بالذات جگہوں پر اودھ، رامپور اور الور کی ریاستوں پہ مامور رہا ہے۔ وہ ہمیشہ ایک مشہور انسان رہا ہے اور جن گواہان نے اسے دیکھا بھی نہیں تھا انھوں نے بھی مولوی فضل حق کے متعلق پہلے سے بہت کچھ سن رکھا

تھا۔ وہ خود سے دہلی آیا۔ اور اس نے تب ہی سے بغاوت میں حصہ لینا شروع کیا ہے۔
وہ ایک ایسا انسان ہے جسے بہت سخت سزا دینا چاہئے۔ اور جسے بہت احتیاط سے ہندوستان
الگ کر دینا چاہئے۔ لیکن اس کی ضعیف عمر اس کی زندگی میں پوزیشن اور اس کے اودھ
کے باشندے اور کئی برس تک مختلف دیسی ریاستوں میں کام کرنے کو مدنظر رکھتے ہوئے
ہم نے یہ مناسب سمجھا ہے کہ وہ ایک سرکاری قیدی تصور کیا جائے نہ کہ ایک معمولی مجرم۔

وارنٹ نمبر ۱۴ - ڈپٹی کمشنر لکھنؤ۔

فضل حق ولد فضل امام کو مجرم گردانا گیا۔ بوجہ اکسانے بغاوت کے۔ اور بوجہ
اشاعت ایسے اصولوں کے جن سے قتل کے حالات پیدا ہو سکتے تھے۔ اور بوجہ باغیوں
کی کونسل میں حصہ لینے کے اسے عمر قید بعبور دریائے شور بغیر مشقت کی سزا دی گئی۔ لہٰذا
یہ حکم دیا جاتا ہے کہ مندرجہ بالا سزا کو فضل حق ولد فضل امام پر عمل میں لایا جائے۔ اور یہ کہ تم اس
وارنٹ کو جب کہ اس پر عمل درآمد ہو چکے تو اسے اپنے سرکاری مہر اور دستخطوں کے تحت یہ
بتلاتے ہوئے کہ مندرجہ بالا سزا کس طرح عمل میں لائی گئی واپس کر دو۔

۱۵۳ سنہ ۱۸۶۱ء

از طرف کرنل جے کلارک کمشنر وسپرنٹنڈنٹ خیرآباد ڈویژن۔

بنام جی کیمپل اسکوائر جوڈیشل کمشنر اودھ۔

سیتاپور - ۳۰ جولائی سنہ ۱۸۶۱ء

جناب عالی!

مجھے آپ کے حضور میں مندرجہ ذیل کاغذات پیش کرتے ہوئے فخر محسوس ہوتا ہے۔ بہ
زبان ہندوستانی کمشنر لکھنؤ کی پروسیڈنگ مورخہ ۲۲ جولائی سنہ ۱۸۶۱ء معہ منسلکہ کاغذات
کیونکہ فضل حق کے مقدمے کا تبادلہ لکھنؤ کر دیا گیا تھا (جنوری سنہ ۱۸۵۹ء میں) اس کا مقدمہ
کیپٹن ہتھربرن کے اجلاس میں پیش ہوا تھا جو میرا خیال ہے آپ کا special
assistant تھا۔

آپ کا فرماں بردار خادم

کمشنر وسپرنٹنڈنٹ خیرآباد ڈویژن۔

نمبر ۴۸۰ ۔ بنام سکریٹری چیف کمشنر اودھ لکھنؤ ۔ مورخہ ۳ اگست ۱۸۶۱ء

جناب عالی!

کنارے سے نوٹ کی ہوئی خط و کتابت کے حوالے سے جو کہ فضل حق کے مقدمے سے متعلق ہیں فضل حق کو میں نے بغاوت کے اکسانے وغیرہ کے جرم میں مئی ۱۸۵۹ء میں عمر قید بعبور دریائے شور (قید بغیر مشقت) کی سزا دی تھی ۔ میں آپ کے حضور میں خیرآباد کے کمشنر سے وصول شدہ ورناکولر کاغذات بسلسلہ مقدمہ ہذا پیش کر رہا ہوں اور استدعا کرتا ہوں کہ ان کاغذات کو چیف کمشنر کی خدمت میں پیش کیا جائے ۔ تاکہ ان پر احکام دے سکیں جو وہ ضروری اور مناسب سمجھتے ہوں ۔

میں ہوں آپ کا مخلص
جوڈیشل کمشنر ۔

روداد :-

ڈاکٹ نمبر ۳۲۲ مورخہ ۱۱ مارچ ۱۸۵۹ء سکریٹری کا دفتری کاغذ نمبری ۶۵۶ مورخہ ۲۸ اپریل جو میرے پتے پر بھیجا گیا میرٹ نمبری ۶۵، مورخہ ۱۰ مئی ۵۹ء

نمبر ۱۹۷۵ ۔ از طرف سکریٹری چیف کمشنر اودھ

بنام جی کیمپل اسکوائر جوڈیشل کمشنر اودھ ۔

لکھنؤ ۱۲ اگست ۱۸۶۱ء

جناب عالی!

بحوالہ آپ کے خط نمبری ۴۸۰ مورخہ ۳ اگست مجھے ہدایت کی گئی ہے کہ میں عرض کروں کہ .... چیف کمشنر نے آپ کے اوپر حوالہ دیئے ہوئے مراسلہ کو دیکھا اور وہ سخت مخالفت کریں گے ۔ اگر منشی فضل حق کے سلسلے میں کچھ بھی رعایت کی گئی

۲ ۔ جو ورناکولر کاغذات آپ کے مراسلے کے ساتھ منسلک تھے وہ واپس کئے جا رہے ہیں

میں ہوں آپ کا فرماں بردار خادم
سکریٹری چیف کمشنر اودھ ۔

گورنمنٹ کے حکم مورخہ ۲۰ اپریل ۱۸۵۹ء سے اقتباس :۔

فضل حق کے سلسلے میں His Excellency in Council کی یہ خواہش ہے، کہ قیدی کی شخصیت اور عمر کو مدِنظر رکھتے ہوئے کوئی سختی اس پر اس طرح نہ کی جائے جو اس کی عمر کے منافی ہو۔ اصل اقتباس جوڈیشل کمشنر اودھ۔

مندرجہ ذیل قیدی واسطے عمر طبعی مسمّی فضل حق ۳۶۸۷ Penal Settlement پورٹ بلیر ۸ر اکتوبر کو بذریعہ اسٹیمر Frira Queen براہ کلکتہ وصول کیا گیا۔

دستخط سپرنٹنڈنٹ پورٹ بلیر۔

پوری مسل پڑھنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ علامہ خیر آبادی کو دہلی اور اودھ کی سرگرمیوں کی بنا پر پھانسا گیا تھا! در فضل حق شاہجہاں پوری کے الزامات اہمالی کی وجہ سے لگا کر مجرم گردانا گیا تھا۔ سوءِ اتفاق سے عبدالحکیم سرکاری ملازم اور مرتضیٰ حسین خیر خواہ برطانیہ سے جو دونوں شیعی تھے علامہ سے کسی وقت قرآنی آیات پر مباحثہ ہو گیا تھا۔ ان کی جھوٹی شہادتوں پر عدالت نے سزا کا فیصلہ کر دیا۔ برطانوی حکومت کی یہ پالیسی آخر عہد تک رہی۔ اور آج بھی ان کے سرکاری خشاگرد قانونی گرفت میں لانے کے لئے یہی داؤ پیچ کھیلتے رہتے ہیں جس کی ہزاروں مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

اس مباحثہ کے متعلق علامہ الثورۃ الہندیہ میں لکھتے ہیں :۔

"میری چغلی ایسے دو مرتد جھگڑالو اور تند خو افراد[1] نے کھائی جو مجھ سے قرآن کی اس محکم آیت میں مجادلہ کرتے تھے جس کا حکم یہ تھا کہ نصاریٰ کا دوست بھی نصرانی ہے۔ وہ دونوں نصاریٰ کی مودّت و محبت پر مصر تھے انھوں نے مرتد ہو کر کفر کو ایمان سے بدل لیا تھا۔"

اس مقدمہ میں علامہ کو ممو خاں کا مشیر اور بوندی کے قیام میں اس پر اثر انداز ہونا ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے جب کہ ممو خاں کے متعلق علامہ الثورۃ الہندیہ میں یہ اظہار رائے کر رہے ہیں :۔

"یہ تمام امور مہمہ اور ان کا اہتمام و انصرام ایسے ذلیل، غافل اور متحیر عامل[2] کو سونپا گیا تھا جو

---

[1] عبدالحکیم شیعی و مرتضیٰ حسین شیعی۔ [2] ممو خاں۔

کسی طرح اس کا اہل نہ تھا۔ وہ صحیح مشوروں سے گریزاں اور جہل سے ہمکنار تھا۔ آسان بات کو سخت اور دشوار کو آسان سمجھتا وہ ذلیل احمق اور بزدل تھا اس نے مکالمت اور مشاورت، مجالست اور منادمت کیلئے احمق جاہل اور ذلیل طبقہ کو چن لیا تھا وہ نخوت و غرور کی بنا پر شریف سرداروں اور عقلمند رہنماؤں سے بچتا اور اپنے ہی اہل خاندان اور اعزہ میں سے جاہلوں اور احمقوں کو مصاحب و حاکم بناتا۔ چنانچہ اس ناتجربہ کار نے لشکروں پر کمین، بزدل، ذلیل اور رذیل لوگوں کو سردار بنا دیا۔ وہ بڑے ہی لالچی تھے۔"

غور فرمائیے جس موخاں کے متعلق علامہ کی یہ رائے ہو اس کے مشیر کیسے بن سکتے تھے۔

علامہ نے اس مقدمہ میں جو بیان دیا ہے۔ اس کا تجزیہ کرنے سے ہمارے اس دعوے کی پوری تائید ہوتی ہے کہ علامہ کا دوران بغاوت دہلی میں موجود ہونا اور بغاوت میں بڑی حد تک سرگرمی سے رہنمائی کرنا کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں۔

حکومت کا دستور العمل مرتب کرنا، فتوئے جہاد مرتب کرنا اور تقاریر کرنا، ان سب باتوں کا ثبوت اپنے مقام پر ملاحظہ کیا جائے۔

علامہ عدالت کے سامنے اپنے بیان میں فرماتے ہیں:۔

"میں الور کے راجہ کی ملازمت میں تھا۔ میں ان کے ساتھ ۵ سال رہا۔ اور بغاوت کے شروع ہونے پر بھی ان کے ساتھ تھا۔ راجہ (بنے سنگھ) کی موت کے ایک ماہ بعد تک میں الور میں رہا۔ اگست ۱۸۵۷ء میں میں نے الور چھوڑ دیا۔ میں نے دہلی کے لئے کوچ کیا۔ وہاں ۱۵ دن رہا۔ اور پھر الور لوٹ آیا۔ میں نے اپنا خاندان الور ہی میں رہنے دیا تھا۔ میں اپنے گھر رہا تھا۔ اور میں نے کسی کی ملازمت نہیں کی۔ نہ ہی میں باغیوں سے ملا تھا۔"

یہ محفوظ رہے کہ یہ عدالتی بیان ہے۔ اس میں بڑی احتیاط کے ساتھ الفاظ کا استعمال ہوا ہے۔ جس سے علامہ کی بے پناہ ذہانت کا پتہ چلتا ہے۔ کہ بات سچی بھی ہو اور مقدمہ پر اثر انداز بھی نہ ہو۔ مثلاً یہ جملہ کہ "میں ان (راجہ) کے ساتھ ۵ سال رہا" یعنی ان کی ملازمت میں ۵ سال رہا۔ اس کا مطلب یہ نہ ہوگا کہ شبانہ روز ان کے ساتھ رہا۔ اور ان سے کسی وقت علیحدہ نہیں ہوا۔ دوسرا جملہ "بغاوت کے شروع ہونے پر بھی ان کے ساتھ تھا۔"

کتنی سچی بات ہے۔ بغاوت وسط مئی ۱۸۵۷ء میں شروع ہوئی۔ جوں ہی اس کی اطلاع ملی
علامہ اہل خانہ کو الور چھوڑ کر دہلی آ گئے۔ اور سرگرمی سے بغاوت کی رہنمائی اور حکومت کے
دستور العمل کی ترتیب شروع کر دی۔ جولائی میں جنرل بخت خاں کے دہلی آنے پر فتوئے جہاد
مرتب کر کے علماء کے دستخط کرائے۔ اسی درمیان راجہ الور بنے سنگھ[1] کی خبر ارتحال پر الور چلے گئے۔
تقریباً ایک ماہ میں واپس دہلی آ گئے۔ پھر ۱۵ یوم دہلی میں قیام کر کے الور آ گئے۔ اور اپنے اہل و
عیال کو لے کر اوائل ستمبر میں دہلی آ گئے۔ وسط ستمبر ۱۸۵۷ء میں دہلی پر انگریزوں کا مکمل قبضہ
ہو گیا۔

بادشاہ اور اس کے متعلقین مقبرۂ ہمایوں میں اقامت گزیں ہو گئے۔ علامہ بھی دہلی کو
خیرآباد کہہ کر خیرآباد کے لئے روانہ ہو گئے۔ الثورۃ الہندیہ میں فرماتے ہیں:۔

"جب نصاریٰ کا شہر پر اچھی طرح قبضہ ہو گیا اور کوئی لشکری و شہری باقی نہ رہا۔ غلہ اور
پانی دشمنوں کے ظلم و استبداد کی وجہ سے ناپید ہو گیا۔ تو وہ شبانہ روز اسی حالت میں گزار
کر اپنی عزیز ترین متاع کتابیں، مال و اسباب چھوڑ کر (باربرداری کا انتظام نہ ہو سکنے
کی وجہ سے) خدا پر بھروسہ کر کے اہل و عیال کو ساتھ لے کر نکل کھڑا ہوا۔"

علامہ اس سفر میں ریاست بھیکم پور ضلع علی گڈھ پہنچ کر نواب عبدالشکور خاں شروانی (عم محترم
نواب صدر یار جنگ مولانا محمد حبیب الرحمٰن شروانی) کے کچھ دن مہمان بھی رہے جس کی تفصیل پچھلے صفحات
میں دی جا چکی ہے۔ اس طرح وطن مالوف خیرآباد خاصے عرصے کے بعد پہنچے۔

بیان میں فرمایا "میں نے کسی کی ملازمت نہیں کی" یقیناً اس مدت میں کہیں ملازم نہیں ہے
پھر فرمایا "نہ ہی میں باغیوں سے ملا تھا" کتنی سچی بات ہے۔ علامہ تو مجاہدین سے ملے تھے۔ مغلیہ
حکومت کے تو انگریز باغی تھے۔ علامہ تو مجاہدین کے سربراہ تھے۔ انگریزوں اور ان کے حواریوں
سے ملنے کا سوال ہی کیا تھا۔

جنوری ۱۸۵۹ء میں علامہ کو خیرآباد سے گرفتار کر لیا گیا۔ اور فروری ۱۸۵۹ء میں ابتدائی
عدالت سے سزا دیدی گئی۔ اور مارچ ۱۸۵۹ء میں عدالت عالیہ سے اس کی توثیق کر دی گئی۔

---

[1] راجہ بنے سنگھ کا انتقال ۱۵ جولائی ۱۸۵۷ء کو ہوا۔ [2] ستمبر ۱۸۵۷ء

یہ بات پوری طرح ذہن نشین رکھئے کہ مقدمہ میں براہ راست عدالتی بیان علامہ کا ذاتی ہے۔ اس کے علاوہ جتنی بھی درخواستیں یا اپیلیں ہیں وہ سب علامہ کے اخلاف و وکلاء مقدمہ کی کارگزاریاں ہیں جس کی تائید مرزا غالب کے خط بنام یوسف مرزا سے بھی ہوتی ہے :-

"مولانا فضل حق کا حال کچھ تم سے مجھ کو معلوم ہوا، کچھ مجھ سے تم معلوم کرو۔ مرافعہ حکم دوام حبس بحال رہا۔ بلکہ تاکید کی گئی کہ جلد دریائے شور کی طرف روانہ کرو۔ چنانچہ تم کو معلوم ہو جائے گا ان کا لڑکا ولایت میں اپیل کیا چاہتا ہے۔ کیا ہوتا ہے۔ جو ہونا تھا۔ وہ ہو چکا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون"۔ [1]

اس کا مطلب یہ ہے کہ ان اپیلوں اور درخواستوں سے علامہ کا ذاتی طور پر تعلق نہ تھا اس لئے یہ کہنا کہ "علامہ رہائی کے لئے آخر دم تک کوشش کرتے رہے اور ہمت نہیں ہارے" سراسر الزام اور ناانصافی ہے۔ علامہ نے جو کچھ مانگا اپنے رب سے مانگا جس کی شہادت الثورۃ الہندیہ اور قصائد فتنۃ الہند سے ملتی ہے۔

اب آئیے لائق صد احترام مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور محترم بزرگ جناب مالک رام کے ان مضمونوں پر نظر ڈالیں۔ جو ماہنامہ تحریک دہلی میں اگست ۱۹۵۷ء اور جون ۱۹۶۰ء میں علی الترتیب شائع ہوئے ہیں جن سے یہ تاثر ہوتا ہے کہ علامہ کا جنگ آزادی میں کوئی حصہ نہ تھا۔ یہ دونوں بزرگ راقم الحروف کے دیرینہ کرم فرما اور مشفق و مخلص رہے ہیں۔ ان پر قلم اٹھانا یا حرف گیری کرنا شائستگی کے خلاف تھا۔ مگر یہ دونوں بزرگ جب اپنے سے بزرگ تر شخصیت پر خامہ فرسائی کر چکے ہیں تو کہا جا سکتا ہے کہ "ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند"۔

عرشی صاحب نے اپنے ۷ صفحات پر مشتمل مضمون میں علامہ کی جہاد آزادی میں عدم شرکت کی تین بنیادیں قائم کر کے طبع آزمائی فرمائی ہے۔

(۱) علامہ کا اگست سے قبل دہلی میں نہ ہونا۔ (۲) فتویٰ جہاد آزادی مشمولہ سوتنتر دہلی (۳) نواب رامپور کے نام علامہ کی درخواست۔

[1] اردوئے معلیٰ

(۱) اب پہلی بات یعنی اگست سے قبل علامہ کے دہلی میں نہ ہونے کی بنیاد "باغی ہندوستان" کی اس عبارت کو بنایا گیا ہے کہ :-

"علامہ الور سے نشر و اشاعت کرتے ہوئے اگست ۱۸۵۷ء میں دہلی پہنچے"

نیز منشی جیون لال کے ۱۶؍ اگست کی اس خبر کو کہ :-

"مولوی فضل حق شریک دربار ہوئے انھوں نے اشرفی نذر میں پیش کی اور صورتِ حالات کے متعلق بادشاہ سے گفتگو کی"

میں دیباچہ میں لکھ چکا ہوں کہ باغی ہندوستان کی ترتیب ۱۹۴۶ء میں ہوئی۔ اوائل ۱۹۴۷ء میں مطبع مدینہ پریس بجنور سے شائع ہوئی۔ اس وقت تک جو مواد میسر آسکا تھا اسی پر انحصار کرنا پڑا تھا۔ آزادی کے بعد جو مواد دستیاب ہوا اس کی بنا پر ثابت ہوتا ہے کہ علامہ "غدر" شروع ہوتے ہی دہلی پہنچ گئے تھے۔ محترم عرشی صاحب جیسے محقق کو تو "باغی ہندوستان" کے نظریہ کی تغلیط کرنی تھی۔ نہ کہ اسی کو بنیاد بنا کر عمارت کی تعمیر شروع کر دی۔ محترم عرشی صاحب نے باغی ہندوستان کی اشاعت کے پورے دس سال کے بعد مضمون تحریر فرمایا تھا۔ پورا موقع ملا تھا کہ اپنی محققانہ جودتِ طبع کو کام میں لاتے۔

ابر تھا، بجلی تھی، سورج زیرِ کوہِ قاف تھا
زلفِ شبگوں رخ سے سرکائی تو مطلع صاف تھا
داغ

اب ہمارے دعوے کو اس کسوٹی پر جانچئے۔ مولوی ذکاء اللہ لکھتے ہیں :-

"مولوی صاحب (فضل حق) عالم متبحر مشہور تھے۔ وہ الور سے ملازمت ترک کر کے دہلی آئے تھے انھوں نے بادشاہ کے لئے ایک دستور العمل سلطنت لکھا تھا جس کی ایک دفعہ یہ مشہور ہوئی تھی کہ گائے کہیں بادشاہی عمل داری میں ذبح نہ ہو"[۱]

جیون لال کا بیان ہے کہ یہ دفعہ ۹؍ جولائی ۱۸۵۷ء کو نافذ کر دی گئی۔[۲]

ایک انگریز رابرٹ لکھتا ہے :-

اس خاص موقعہ (عید الاضحیٰ) پر ہندوؤں کا لحاظ کرتے ہوئے قربانی ملتوی کر دی گئی

[۱] تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ جلد ۵ صفحہ ۶۸۶۔ [۲] غدر کی صبح و شام صفحہ ۱۶۳

اور اس کی جگہ فرنگیوں کو ختم کرنے کے لئے ہندو مسلمانوں کی زبردست متحدہ کوشش ہو رہی ہے "۔ [1]

مولوی ذکاء اللہ کی تحریر اور دوسرے حوالوں سے یہ تو ثابت ہو گیا کہ علامہ نے حکومت کا دستور العمل مرتب کیا تھا۔ اس دستور العمل کی ایک دفعہ کورٹ کے قیام کی بھی تھی جسکے قواعد بھی علامہ نے بنائے تھے۔ جس کا عکس "سوانح دہلی" میں موجود ہے۔ اور "فضل حق خیر آبادی اور سن ستاون" میں بھی، شائع ہو چکا ہے۔

دستور العمل تیار کرنا اصحاب رائے اور بادشاہ کی منظوری حاصل کرنا اور پھر اس کا نفاذ اس کے لئے دو تین ماہ کا عرصہ کچھ زیادہ مدت نہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ علامہ جولائی سے بہت پہلے دہلی میں موجود تھے۔ نہ صرف بقر عید بلکہ عید بھی دہلی میں ہی کی ہو گی۔ جو اواخر مئی ۱۸۵۷ء میں ہوئی تھی۔

(۳) اب محترم عرشی صاحب کی دوسری بنیاد فتویٰ جہاد آزادی کو لیجئے۔ آپ نے کتاب "سوانح دہلی" کے عکس فتویٰ مطبوعہ صادق الاخبار دہلی منقولہ از اخبار الظفر دہلی مورخہ ۲۶ جولائی ۱۸۵۷ء کو نقل کر کے تحریر فرمایا ہے۔ کہ اس پر مولانا فضل حق کے دستخط نہیں جب کہ دیگر ۳۳ علماء کے دستخط ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

"چونکہ یہ فتویٰ مولانا کے ورودِ دہلی سے پہلے مرتب ہو کر شائع ہو چکا تھا۔ اس لئے اس پر مولانا خیر آبادی کے دستخط نہیں ہو سکتے تھے۔"

اس فتویٰ پر تاریخ نہیں ہے جس سے معلوم ہو سکتا کہ اشاعت اخبار سے کتنے عرصے پہلے کا لکھا ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی کے دستخط میں ترتیب دیا گیا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسی فتویٰ کے متعلق علامہ نے "الثورۃ الهندیہ" میں لکھا ہو۔

"یہ تو سب کچھ ہو ہی رہا تھا۔ کہ بعض شہر و دیہہ سے بہادر مسلمانوں کی ایک جماعت علماء و زہاد اور ائمہ اجتہاد سے جہاد کے وجوب کا فتویٰ لے کر جدال و قتال کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔"

[1] جنگ آزادی ص ۱۹۱ خورشید مصطفیٰ۔

محترم عرشی صاحب نے اسی ایک فتوے پر انحصار کر کے حکم لگا دیا کہ چونکہ اس فتوے پر علامہ کے دستخط نہیں ہیں اس لئے علامہ خیر آبادی کا فتویٰ جہاد سے کوئی تعلق ہی نہیں۔

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

یہ فتویٰ، جہاد کے فرض عین اور فرض کفایہ کے استفسار کے جواب میں ہے۔ غالباً علامہ نے اسی کے متعلق جملہ "جہاد کے وجوب کا فتویٰ دے کر" سے اشارہ کیا ہے۔

یہ فتویٰ صادق الاخبار دہلی میں ۲۶ جولائی ۱۸۵۷ء کو شائع ہوا۔ اخبار الظفر دہلی سے نقل ہوا ہے۔ اخبار الظفر دہلی میں کب چھپا اور کب ترتیب دیا گیا اس کا کچھ پتا نہیں۔ ہمیں محترم عرشی صاحب کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ "یہ فتویٰ مولانا کے ورود دہلی سے پہلے مرتب ہو کر شائع ہو چکا تھا"۔ مگر ہمیں اس رائے سے اتفاق نہیں کہ یہی وہ فتویٰ ہے جو جنرل بخت خاں نے مرتب کرایا تھا، اور یہ کہ علامہ کا ورود دہلی اگست سے پہلے نہیں ہوا تھا۔ جب شروع جولائی میں جنرل بخت خاں دہلی پہنچے تو علامہ وہیں موجود تھے۔

یہ فتویٰ جنرل بخت خاں کے ورود دہلی سے قبل لکھا جا چکا تھا۔ بقول مولوی ذکاء اللہ "جب تک دہلی میں بخت خاں نہیں آیا جہاد کے فتوے کا چرچا بہت کم تھا"۔ وہی فتویٰ تھا جو صادق الاخبار میں شائع ہوا ہے۔ اب آپ مولوی ذکاء اللہ کی پوری عبارت پڑھئے:

"جب تک دہلی میں بخت خاں نہیں آیا۔ جہاد کے فتویٰ کا چرچا شہر میں بہت کم تھا۔ مساجد میں منبروں پر جہاد کا وعظ کم ہوتا تھا۔ . . . مگر جب بخت خاں جس کا نام اہل شہر نے کم بخت خاں رکھا تھا۔ دہلی میں آیا تو اس نے یہ فتویٰ لکھا کہ مسلمانوں پر جہاد اس لئے فرض ہے کہ اگر کافروں کی فتح ہوگی تو وہ ان کے بیوی بچوں کو قتل کر ڈالیں گے۔ اس نے جامع مسجد میں مولویوں کو جمع کر کے جہاد کے فتوے پر دستخط و مہریں ان کی کرالیں لیکن مولوی محبوب علی و خواجہ ضیاء الدین نے فتوے پر مہریں نہیں کیں۱؎

جنرل بخت خاں بڑی سلیقہ مندی اور ہوشیاری سے شروع جولائی میں دہلی آیا۔۲؎

۱؎ تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ جلد ۵ ص ۶۷۵ ۔ ۲؎ ایضاً ص ۶۸۱ ۔

مولوی ذکاء اللہ کے مذکورہ بالا بیان سے صاف ظاہر ہے کہ دو فتوے تھے ایک وہ جس کا چرچا شہر میں بہت کم تھا اور جس پر مولوی محبوب علی اور خواجہ ضیاء الدین کے بھی دستخط ہیں۔ اور یہ فتویٰ وہی ہے جو جنرل بخت خاں کے دہلی پہنچنے سے پہلے دیا گیا تھا! ور جس کا عکس سو تنتر دہلی میں شائع ہوا ہے! اسی کا ذکر الثورۃ الہندیہ میں علامہ نے کیا ہے۔

اب باغی ہندوستان کی عبارت پر نظر ڈالئے۔[1]

"علامہ سے جنرل بخت خاں ملنے پہنچے۔ مشورے کے بعد علامہ نے آخری تیر ترکش سے نکالا۔ بعد نماز جمعہ جامع مسجد میں علماء کے سامنے تقریر کی استفتا پیش کیا۔ مفتی صدر الدین خاں آزردہ صدر الصدور دہلی، مولوی عبد القادر، قاضی فیض اللہ، دہلوی، مولانا فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبرآبادی اور سید مبارک شاہ رامپوری نے دستخط کر دیئے۔ اس فتوے کے شائع ہوتے ہی ملک میں عام شورش بڑھ گئی"[1]

غور فرمائیے باغی ہندوستان میں جتنے نام دیئے گئے ہیں ان میں سے مفتی صدر الدین کی مہر اور مولوی عبد القادر کے سوا کسی عالم کے دستخط صادق الاخبار کے فتوے پر نہیں۔

علامہ کے فتوے پر مفتی صدر الدین کے دستخط کے بعد شہدت بالجبر[2] کے بھی الفاظ تھے۔ جس کی تائید مولوی ذکاء اللہ کے بیان سے بھی ہوتی ہے کہ مہر جبر سے کی گئی تھی۔

محترم عرشی صاحب نے اپنے مضمون میں لغوی اعتبار سے اسے غلط قرار دیا ہے۔ ہم تھوڑی دیر کے لئے عرشی صاحب کی بات مان لیتے ہیں تو کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ جہاں "جعلی" مہر کی ہو وہاں یہ جملہ بھی لکھ دیا ہو تا کہ بوقت گریز یہ کہہ سکیں کہ مجھ جیسا فاضل غلط جملہ کیسے لکھ سکتا ہے۔ محترم عرشی صاحب رسالہ تحریک دہلی کے اسی مضمون میں اعتراف کر رہے ہیں "بقیہ نے مجبوراً توثیق کی شکست کے بعد جان بچانے کی صرف یہی ایک تدبیر باقی تھی کہ جبر کی پناہ لی جائے! اس بنا پر جس سے باز پرس ہوئی اس نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ یہ دو فتوے ہیں۔ اخبار الظفر دہلی کا فتویٰ وہ ہے جو جنرل بخت خاں

[1] باغی ہندوستان مطبوعہ مدینہ پریس بجنور ص ۱۵۱ ۱۹۴۷ء [2] شہدت بالجبر کے راوی علامۃ الہند مولانا معین الدین اجمیری ہیں بفیض درس مولانا مفتی سید نجم الحسن رضوی خیرآبادی بھی بوقتِ روایت موجود تھے۔ جو بفضل خدا بقید حیات ہیں۔

کے ورودِ دہلی سے قبل لکھا گیا تھا! اور بقول مولوی ذکار اللہ اس کا چرچا شہر میں بہت کم تھا۔ اس کے عجیب نورجال تھے۔ دوسرا فتویٰ وہ ہے جو جنرل بخت خاں کی موجودگی میں لکھا گیا اور جسے علامہ خیرآبادی نے مرتب کیا۔ تیسرے فتوے کا ذکر سرسید احمد خاں نے اسباب سرکشی ہندوستان میں کیا ہے۔ جسے انھوں نے خود دیکھا تھا جو عدم وجوب جہاد کا آئینہ دار تھا۔

"شہدت بالحق" کے سلسلے میں مفتی انتظام اللہ شہابی گوپاموی لکھتے ہیں :-

"پیروی مقدمہ میں جواب دعویٰ یہ کیا۔ میں نے فتوے پر دستخط کئے مگر کچھ عبارت بھی لکھ دی ہے۔ بالخیر لوگ پڑھتے ہیں وہ بالجبر میں نے لکھا ہے۔ مفسدوں نے زبردستی مجھ سے لکھوایا تھا۔ کاغذات برآمد ہوئے تو پڑھا گیا۔ مفتی صاحب کے بیان کی تصدیق ہوئی۔ اس بنا پر چھوڑ دیئے گئے [1]

۳۔ تیسری بنیاد عرضی بنام نواب رامپور کو لیجئے۔

یہ عرضی علامہ خیرآبادی کی مہر سے مزیّن ہے۔ اور ۱۸ ؍ فروری ۱۸۵۹ء کی مرقومہ ہے۔ اس عرضی کی بنا پر محترم عرشی صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

"مولانا پر حسب ذیل تین الزام عائد کئے گئے تھے :-

(الف) نواب خاں بہادر خاں نبیرۂ حافظ رحمت خاں بہادر نے جب انگریزوں کے خلاف بریلی میں بغاوت کی تو مولانا نے ان کا ساتھ دیا اور ان کی طرف سے نظامت پیلی بھیت کا کام انجام دیا۔

(ب) جب انگریزوں نے بریلی فتح کر لی تو مولانا یہاں سے بھاگ کر اودھ پہنچے اور خان علی خاں کی طرف سے ریاست محمدی کے چکلہ دار مقرر ہوئے۔

(ج) مولانا نے اس کے بعد ایک باغی لشکر کی کمان اپنے ہاتھ میں لی۔"

مقدمہ کی پوری کارروائی درج کی جاچکی ہے ! ان میں سے کوئی الزام علامہ پر عائد نہیں کیا گیا۔ علامہ ۳۰ ؍ جنوری ۱۸۵۹ء کو گرفتار کر لئے گئے۔ بغاوت کے قیدی مجرم تھے الثورة الهندیہ میں فرماتے ہیں :-

[1] غدر کے چند علما ص ۵۲

"میرا جوتا اور لباس اتار کر موٹے اور سخت کپڑے پہنا دیئے۔ نرم و بہتر بستر چھین کر خراب سخت اور تکلیف دہ بچھونا حوالے کر دیا۔ گویا اس پر کانٹے بچھا دیئے گئے تھے یا دہکتی ہوئی چنگاریاں ڈالدی گئی تھیں۔ میرے پاس لوٹا، پیالا اور کوئی برتن تک نہ چھوڑا"

انصاف کیجئے۔ ایسی حالت میں مہر رکھنے کی اجازت دے دی گئی ہو گی یا کاغذ اور قلم دوات مہیا کر دیا ہو گا کہ علامہ عرضی لکھ کر مہر لگا کر نواب رامپور کو بھیجدیں۔ اور وہ بھی جب کہ اس کے دو دن کے بعد ہی ۱۲ر فروری کو مقدمہ شروع ہو رہا ہو۔ پھر لکھنؤ سے رامپور تک عرضی پہنچنے میں اس زمانے میں کتنی مدت لگی ہو گی۔

یہ عرضی رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے۔ میری دیکھی ہوئی ہے نہ علامہ کا رسم الخط ہے نہ طرز بیان اور نہ ہی اس پر دستخط ہیں۔ آخر دستخط کرنے میں کیا چیز مانع تھی؟ اصل چیز دستخط ہوتے ہیں مہر تو تائید میں ہوتی ہے پھر یہ بات بھی غور طلب ہے کہ ۸ر دن میں علامہ نے تابڑ توڑ ۳ عرضیاں روانہ کیں۔ جن میں سے دو بقول عرشی صاحب ضائع ہو گئیں۔ یہ تیسری اور آخری عرضی ہاتھ لگی۔ ریاستی محافظ خانہ کی داد دیجئے کہ اس نے ایک عرضی جناب عرشی صاحب کی تعمیر عمارت کے لئے سنگ بنیاد بنا کر محفوظ رکھی۔ اس عرضی پر بنیاد قائم کر لینا عرشی صاحب جیسے محقق سے باعث تعجب ہے۔ پھر ستم بالائے ستم یہ کیا گیا۔ کہ دونوں بزرگوں (محترم عرشی صاحب اور محترم مالک رام صاحب) نے علامہ خیر آبادی کی جہاد آزادی میں شرکت سے ہی انکار کر دیا۔

انھیں کو آج میرا ذکر سن کر طیش آتا ہے
ہمیشہ جن کی خاطر کیں چمن آرائیاں میں نے

قدیم و جدید مؤرخین کے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں فیصلہ ارباب نظر خود فرمالیں گے

غم زندگی کی حکایتیں ابھی شریک جرم و خطا نہ ہوں
میں سناؤں قصۂ درد دل اگر آپ سن کے خفا نہ ہوں

"مولوی فضل حق جب سے اودھ سے آئے ہیں وہ خوجیعل اند شہریوں کو برطانیہ کے خلاف بھڑکانے میں مسلسل مصروف ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"مولوی فضل حق کی اشتعال انگیزیوں سے متاثر ہو کر شہزادے بھی میدان میں نکل آئے ہیں۔ اور سبزی منڈی کے پل والے محاذ پر صف آرا ہیں۔" [1]

"مولوی فضل حق اپنے مواعظ سے عوام کو مسلسل بھڑکا رہے ہیں۔" [2]

"مولوی صاحب (فضل حق) جب بھی بادشاہ سے ملتے وہ بادشاہ کو مشورہ دیتے کہ جنگ کے سلسلے میں رعایا کی ہمت افزائی کریں۔ اور ان کے ساتھ باہر نکلیں۔ اور دستوں کو جس حد تک ممکن ہو بہتر معاوضہ دیں۔" [3]

"بادشاہ نے جنرل بخت خاں، مولوی سرفراز علی اور مولوی فضل حق پر مشتمل کنگ کونسل بنائی۔" [4]

مجلس شوریٰ دس ارکان پر مشتمل بنائی گئی تھی جس میں ۶ فوجی اور ۴ شہری تھے۔ مخبر تراب علی نے خفیہ رپورٹ دی۔

"مولوی فضل حق بھی اس کے ایک رکن ہیں۔" [5]

"اس کورٹ کا ڈائریکٹر (نگراں) مولانا خیرآبادی کو بنایا گیا۔" [6]

بادشاہ کی طرف سے حاصل اختیارات کے تحت علامہ نے:

حسن بخش عرض بیگی کو ضلع علی گڑھ کی آمدنی وصول کرنے کے لئے مقرر کیا [7]

مولانا فیض احمد بدایونی کو ضلع بلند شہر کی آمدنی وصول کرنے کے لئے مقرر کیا [8]

مولانا عبد الحق (خلف علامہ) کا تقرر کلکٹر گوڑ گانوہ کی حیثیت سے کیا گیا [9]

میر نواب (عزیز قریب علامہ) کو دہلی کا گورنر مقرر کیا گیا [10]

"جب ہنگامہ برپا ہوا تو مولوی فضل حق آئے۔ دربار میں حاضر ہوئے۔ نذر پیش کی روپیہ صدقے اتارا، انھیں انتظام سنبھالنے کی خواہش تھی۔" [11]

حکیم احسن اللہ خاں اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں:-

۱؎ اخبار دہلی رپورٹ تراب علی ۲؎ اخبار دہلی ص ۲۶۳ فائل ۱۲۷ رپورٹ از جیون لال ۳؎ میموریس ص ۲۴ ۴؎ دی گریٹ ریویلیشن آف ۱۸۵۷ از ص ۱۲۶ و ص ۱۰۲ ۵؎ میوٹنی ریکارڈ جلد ۲ حصہ ۱۱ ۶؎ بہادر شاہ دوم ص ۱۸۲ ۷؎ غدر دہلی کے گرفتار شدہ خطوط ص ۱۲۹ ۸؎ ایضاً ۹؎ جیون لال ص ۲۲۴ ۱۰؎ ایضاً ص ۱۲۶ ۱۱؎ روزنامچہ عبد اللطیف مرتبہ خلیق احمد نظامی۔ ۱۲؎ مرتبہ ڈاکٹر سید معین الحق ص ۲۳۔

"دوسرے روز مولوی فضل حق آئے۔ اور نذر پیش کی۔ وہ باغی فوج کی بڑے زور شور سے تعریف کر رہے تھے انھوں نے بادشاہ سے کہا اب وقت کا تقاضا ہے کہ باغیوں کو رقم اور سامان رسد کی مدد پہنچائی جائے۔ تاکہ انھیں کچھ سہارا ہو۔ بادشاہ نے کہا رقم کہاں ہے۔ رہا رسد کا تو وہ پہنچی تھی مگر ناکافی تھی۔ اور اس کی وجہ ان باغیوں کا عوام کے ساتھ غلط رویہ ہے۔ مولوی صاحب نے کہا حضور کے تمام ملازمین نا اہل ہیں۔ دور اور قریب کے تمام حکمرانوں سے رقم کا مطالبہ کرنے کی اجازت دیجئے۔ میرا لڑکا (مولانا عبد الحق) اور دیگر اعزہ تحصیل کا کام انجام دیں گے اور رسد بھی فراہم کریں گے۔ بادشاہ نے جواب دیا آپ تو یہیں ہیں۔ آپ انتظام سنبھالئے۔ مولوی صاحب نے جواب دیا۔ میرے لڑکے اور دوسروں کو گوڑگانوہ کی تحصیلداری اور کلکٹری کا پروانۂ تقرر جاری کیا جائے۔ وہ سب انتظام کریں گے اور الور جھجر، بلب گڑھ اور پٹیالہ کے راجاؤں کے نام بھی (رقم کے مطالبے کے) پروانے جاری کیجئے۔ پٹیالہ کا راجہ اگرچہ انگریزوں سے ملا ہوا ہے لیکن اگر دوستانہ مراسلت کی جائے تو وہ ساتھ آجائے گا۔ بادشاہ نے بتایا کہ پیرزادہ عبد السلام کی درخواست پر بخت خاں نے راجہ پٹیالہ کو ایک پروانہ بھیج دیا ہے مگر ابھی تک اس کا جواب نہیں آیا۔ مولوی صاحب نے کہا میں اپنے بھائی (فضل عظیم) کو جو راجہ کے یہاں ملازم ہیں لکھوں گا کہ وہ جلد جواب بھجوائیں۔ مولوی صاحب جب بھی بادشاہ کے پاس آتے بادشاہ کو مشورہ دیتے کہ جہاد کی مہم میں اپنی رعایا کی ہمت افزائی کریں۔ اور ان کے ساتھ باہر بھی نکلیں۔ فوجی دستوں کو جس حد تک ممکن ہو بہتر معاوضہ دیں ورنہ اگر انگریز جیت گئے تو نہ صرف خاندان تیموریہ بلکہ تمام مسلمان نیست و نابود ہو جائیں گے۔"

بہادر شاہ کے مقدمہ میں حکیم احسن اللہ خاں نے شہادت دیتے ہوئے کہا:۔

موزمین داران گوڑگانوہ نے بادشاہ کو ایک درخواست ارسال کی تھی جس میں

بدنظمی کا ذکر کر کے التجا کی تھی کہ کوئی افسر نظم و نسق کے لئے مقرر کیا جائے۔ مولوی فیض الحق (فضل حق) جو الور سے آئے تھے اپنے بھانجے کا (جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا) کی سفارش کی کہ وہ وہاں مقرر کر دیا جائے۔ کیونکہ گورنمنٹ برطانیہ کے دورِ حکومت میں وہ اس ضلع میں مقرر تھا۔ چنانچہ یہ شخص ضلع دار مقرر کیا گیا۔ مگر میں آگاہ نہیں ہوں کہ وہ گوڑگانوہ گیا یا نہیں۔ البتہ اتنا معلوم ہے کہ زوال دہلی کے ۱۵ ، ۲۰ روز قبل یہ تقرر ہوا تھا۔ مولوی فضل حق نے بھی کئی تحصیلداروں کو ضلع دار کی نیابت میں مقرر کیا تھا "۔ ؎۱

۱۹ / اگست ۱۸۵۷ء ...

"عبد الحق خلف مولوی فضل حق اور مولوی فیض احمد لگان وصول کرنے کی غرض سے گوڑگانوہ گئے"۔ ؎۲

اودھ کے چیف کمشنر کا سکریٹری، الکگزنڈ میئر لوپر کو ۸ / دسمبر ۱۸۵۸ء کو سرکاری راسلے میں لکھتا ہے:-

"باغی بسوا میں جو لکھنؤ سے شمال مغرب میں پچاس میل کے فاصلے پر ہے شکست کھا کر ۵ / دسمبر کو گنگا فرار ہو گئے ......

ان کی تعداد ۹۰۰ سوار جن میں ۲۰۰ پوری طرح مسلح ہیں اور باقی سپاہیوں کے پاس اسلحہ کافی نہیں ہے۔ ۳۰۰ پیدل وغیرہ تھے ان میں ۱۰۰ عورتیں، ۶ ہاتھی ایک توپ جس کا نام گردہ ہے۔ اس جماعت کے لیڈر فیروز شاہ شہزادہ دہلی، لکڑ شاہ، گلاب شاہ عرف پیرجی، محسن علی خاں ساکن شمس آباد، فرخ آباد (جو خود کو یورپین ظاہر کرتا ہے) اور مولوی فضل حق سابق سررشتہ دار کمشنر دہلی جس کے بہت سے اعزہ اعلیٰ مناصب حکومت پر ہیں اور جس کا بھائی پٹیالہ میں راجہ ہری سنگھ کا ملازم ہے"۔ ؎۳

یہی سکریٹری ۱۱ / دسمبر ۱۸۵۸ء کو گورنمنٹ آف انڈیا کے سکریٹری کو لکھتا ہے:-

ؔ۶۳ ملاد

؎۱ بہادر شاہ کا مقدمہ صفحہ ۲۵۶ ؎۲ باغیوں کی جان جاسوس ۔ غدر کی صبح و شام دہلی ص ۲۲۲ ؎۳ فریڈم اسٹرگل ان اترپردیش دوم

مندرجہ ذیل لوگوں کے چلے جانے کے بعد حکومت کو قیامِ امن میں کافی سہولت ہو رہی ہے۔ فیروز شاہ، لکڑ شاہ، مولوی فضل حق جو ہماری حکومت کا دشمنِ جاں ہے، حالانکہ حکومت نے اسے اور اس کے اعزہ کو اعلیٰ مناصب عطا کئے تھے۔" [1]

"کچھ لوگ مولوی فضل حق کی صحیح خبر لانے کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ جو اپنے متبعین کے ساتھ شاہ آباد کی طرف روانہ ہوئے ہیں"۔ [2]

مشہور انگریز مصنف ہنٹر اپنی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" میں مدرسہ عالیہ کلکتہ کے اس وقت کے صدر مدرس مولانا عبدالحق خیرآبادی کے متعلق لکھتا ہے:-

"موجودہ ہیڈ مولوی اس عالمِ دین کے صاحبزادے ہیں جن کو ۱۸۵۷ء کے غدر نے نمایاں کر دیا تھا۔ اور جنھوں نے اپنے جرموں کا خمیازہ اس طرح بھگتا تھا کہ بحرِ ہند کے ایک جزیرے میں تمام عمر کے لئے جلاوطن کر دیئے جائیں۔ اس غدار عالمِ دین کا کتب خانہ جس کو حکومت نے ضبط کر لیا تھا، اب کلکتہ کالج میں موجود ہے"۔ [3]

"ان (فضل حق) کو اس بغاوت کے سبب سے جلاوطنی کی سزا ملی تھی"۔ [4]

علامہ کے جہادِ آزادی میں بھرپور حصہ لینے کی معاصرین کی شہادتیں آپ نے ملاحظہ کریں اب جدید حوالے بھی دیکھئے:-

"۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف مسلح بغاوت ہوئی تو مولوی فضل حق نے اس بغاوت میں نمایاں حصہ لیا۔ بغاوت کے الزام میں ان پر مقدمہ چلا اور عمر قید کی سزا پائی"۔ [5]

(علامہ فضل حق نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں انگریزوں کے خلاف سخت حصہ لیا جس کے نتیجے میں گرفتار کر کے کالے پانی بھیج دیئے گئے جہاں اس فاضل اجل، عالم بے بدل نے نہایت کس مپرسی، بے بسی اور لاچاری کی حالت

[1] فریڈم اسٹرگل ان اترپردیش حصہ دوم ص ۵۶۵ [2] ایضاً ص ۵۱۶ [3] ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۳۱۲ (ترجمہ) [4] تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ص ۶۰۴ [5] اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۱۵ ص ۲۷۵

میں ۲۰ اگست ۱۸۶۱ء کو انتقال کیا۔ اور علم و دانش اور فضل و ہنر کا یہ آفتاب ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔" [۱]

"جنرل بخت خاں کی تحریک پر مولانا فضل حق خیر آبادی اور دوسرے علماء نے جو جہاد کا فتویٰ دیا اس کے بارے میں مولوی ذکاءاللہ دہلوی نے بھی اپنی تاریخ میں اقرار کیا ہے کہ اس سے مذہبی جوش و خروش بہت بڑھ گیا تھا۔" [۲]

"مولانا (فضل حق خیر آبادی) کے دہلی پہنچنے سے پیشتر بھی لوگوں نے جہاد کا پرچم بلند کر رکھا تھا۔ مولانا پہنچے تو مسلمانوں کو جنگ آزادی پر آمادہ کرنے کی غرض سے باقاعدہ ایک فتویٰ مرتب ہوا جس پر علمائے دہلی کے دستخط لئے گئے۔ میرا خیال ہے کہ یہ فتویٰ مولانا فضل حق ہی کے مشورے سے تیار ہوا تھا اور انہی نے علماء کے نام تجویز کئے، جن کے دستخط لئے گئے۔" [۳]

"جب برطانوی استعمار کے خلاف ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہوا تو بعض شاعروں ادیبوں اور عالموں نے اس میں سرگرمی سے حصہ لیا اور انگریزی حکومت کا اقتدار بحال ہو جانے کے بعد ان پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ مولانا فضل حق کو جہاد کا فتویٰ صادر کرنے کے جرم میں انڈمان بھیجا گیا، صہبائی کو پھانسی کے تختے پر لٹکایا گیا، شیفتہ کو قید و بند کی مصیبتیں برداشت کرنی پڑیں۔" [۴]

"مولانا فضل حق خیر آبادی علمی قابلیت میں نظیر نہیں رکھتے تھے۔ ان کو فتویٰ جہاد اور جرم بغاوت میں انڈمان بھیج دیا گیا۔" [۵]

محمد اسماعیل پانی پتی مضمون "۱۸۵۷ء میں علماء کرام کا حصہ" میں لکھتے ہیں:-

"جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامۂ عظیم دہلی میں رونما ہوا تو مولانا فضل حق فوراً دہلی پہنچے اور جہاد کا فتویٰ دیا، جنرل بخت خاں کمانڈر انچیف افواج ظفر سے طے

---

[۱] حاشیہ مقالات سرسید حصہ ۱۶ صفحہ ۳۳ [۲] جنگ آزادی صفحہ ۵۵ از خورشید مصطفی رضوی [۳] ۱۸۵۷ء کے مجاہد صفحہ ۲۰ از غلام رسول مہر [۴] مجلہ خیال لاہور ستمبر ۱۹۵۰ء [۵] بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد صفحہ ۳۱۵ از رئیس احمد جعفری۔

اور اس کی بڑی اعانت اور امداد کی"۔ [1]

"مولانا فضل حق نے ایک دن بعد نماز جمعہ جامع مسجد میں انگریزوں کے خلاف فتویٰ پڑھ کر سنایا تو بہتوں کے لئے باعث تشویش بنا۔ اس فتوے پر مفتی صدر الدین آزردہ اور دوسرے پانچ علماء کے دستخط تھے۔ اس کا شائع ہونا تھا کہ جد وجہد نے ایک نیا زور پکڑا اور جگہ جگہ انگریزوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ تاریخ ذکاء اللہ کے مطابق اس فتوے کے بعد صرف دہلی میں نوے ہزار سپاہ جمع ہو گئی"۔ [2]

پاکستان میں دیوبندی مکتب فکر کے آرگن خدام الدین لاہور میں مولانا محمد مستقیم احسن حامدی فاضل دیوبند۔ لکھتے ہیں:۔

"مولانا فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ تاریخ کے ان جو انمرد اور نڈر مجاہدین میں سے تھے جن کی جراءت وہمت اور حق گوئی وبے باکی نے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔

"مولانا فضل حق خیرآبادی نے "افضل الجہاد کلمۃ حق عند سلطان جائر" کا فریضہ ادا کیا۔ اور اپنی عمر عزیز انڈمان میں حبس دوام کی نذر کر دی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

علامہ فضل حق خیرآبادی وغیرہ نے انگریزوں کے خلاف فتویٰ دیکر مسلمانوں کو عدم تعاون پر آمادہ کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مولانا فضل حق خیرآبادی بھی باغی قرار دے گئے۔ سلطنت مغلیہ کی وفاداری فتویٰ جہاد کی پاداش یا جرم بغاوت میں مولانا خود کے سیتا پور سے لکھنؤ لائے گئے"۔ [3]

"دلاور جنگ مولوی احمد اللہ شاہ مدراسی آگرہ سے لکھنؤ آئے۔ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کے خلاف علماء میں سرگرمی عمل پیدا کر رہے تھے۔ مولانا (فضل حق) بھی ان کے ہمنوا ہو گئے! ور سرکاری ملازمت ترک کر کے الور چلے گئے۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء رونما ہوا۔ دلی آئے۔ بہادر شاہ سے ملے۔ یہاں جنرل بخت خاں کے ٹھاٹ جمے ہوئے تھے۔ نصاریٰ کے خلاف جہاد کا فتویٰ مولانا نے دیا۔ اور اس پر مفتی

[1] مجلس ونہار لاہور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء نمبر ص ۲۸ [2] سہ ماہی الزبیر بہاولپور تحریک آزادی نمبر ۱۹۷۰ء ص ۹۲۔ [3] ہفت روزہ خدام الدین لاہور۔ ۲۳ نومبر ۱۹۶۲ء ص ۱۰۔

صدرالدین آزردہ، مولوی فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبرآبادی وغیرہ کے دستخط کرلئے گئے۔" [1]

"دہلی میں بہادر شاہ نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ مولانا فضل حق خیرآبادی نیز دوسرے علماء دہلی میں موجود تھے۔۔۔۔

"جنرل بخت خاں کے مشورے سے علامہ فضل حق خیرآبادی نے بعد نماز جمعہ جامع مسجد دہلی میں جہاد کی اہمیت و ضرورت پر تقریر کی۔ جہاد کا استفتاء مرتب کر کے پیش کیا۔ جہاد کے فتوے کی تیاری میں جنرل بخت خاں کی کوشش خاص تھی۔" [2]

"مسلمانوں کو عزت و آبرو کی زندگی بسر کرنے کے لئے آخری مرتبہ جان کی بازی لگا دینے پر آمادہ کرنے کے لئے ایک باقاعدہ فتویٰ جہاد کا جاری کیا گیا جس پر دستخط کرنے والوں میں مفتی صدرالدین آزردہ اور مولوی فضل حق بھی شریک تھے۔ مولانا فضل حق نے فتوے کے بعد جگہ جگہ دورے کئے اور بالآخر دہلی پہنچ گئے۔۔۔۔ مولانا فضل حق کے مشورے صرف قلعہ معلّٰی کی پوشیدہ مجلسوں تک محدود نہ تھے وہ جنرل بخت خاں سے ملے، مشورے ہوئے۔ اور آخر میں بعد نماز جمعہ دلی کی لال مسجد میں علماء کے سامنے تقریر کی اور فتویٰ پیش کیا۔" [3]

"مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی کو جو کہ تحریک کے بہت بڑے رکن تھے اور بریلی، علی گڑھ اور اس کے ملحقہ اضلاع کے دوران تحریک میں گورنر تھے۔ آخر ان کو گھر سے گرفتار کیا گیا۔۔۔۔۔۔

خدا کے بندے ایسے ہی ہوا کرتے ہیں وہ جان کی پرواکئے بغیر سربکف ہوکر میدان میں نکلتے ہیں۔" [4]

تحریک آزادی کی مشہور تاریخ نگار سیدہ انیس فاطمہ بریلوی رقمطراز ہیں:-

"خواص میں جنرل بخت خاں، فیروز شاہ، نانا راؤ، نواب تجمل حسین خاں، جنرل محمود خاں،

---

[1] علماء حق اور ان کی مظلومیت کی داستانیں ص۵۸ از مفتی انتظام اللہ شہابی [2] جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا ایک مجاہد مولانا فیض احمد بدایونی ص۲۲،۲۱ - از محمد ایوب قادری۔ [3] مجلہ خیال لاہور سن ستاون نمبر ص۲۶۳،۲۶۲ مضمون از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ [4] تحریک ریشمی رومال ص۶۵،۶۴ از مولانا مولانا حسین احمد مدنی۔

اور عظیم اللہ خاں تھے۔ اور علماء کے سرگروہ مولوی احمد اللہ، مولوی لیاقت علی اور مولوی فضل حق خیرآبادی قرار پائے"۔ [۱]

"جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مولانا فضل حق نے مردانہ وار حصہ لیا۔ دہلی میں جنرل بخت خاں کے شریک رہے۔ لکھنؤ میں حضرت محل کی کورٹ کے ممبر رہے جب انگریزوں کو فتح ہوئی تو گرفتار کر لئے گئے"۔ [۲]

"جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مولانا فضل حق نے حصہ لیا۔ دہلی میں جنرل بخت خاں کے شریک رہے لکھنؤ میں بیگم حضرت محل کی کورٹ کے ممبر رہے آخر میں گرفتار ہوئے مقدمہ چلا اور حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔ . . . . .

انڈمان (نکوبار) کے زمانہ قیام میں علامہ خیرآبادی سے دو چیزیں یادگار ہیں۔ الثورۃ الہندیہ اور قصائد فتنۃ الہند۔ یہ دونوں چیزیں تاریخی ہونے کے علاوہ ادب کا بھی شاہکار ہیں . . . . .

یہ رسالہ اور قصیدے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے حالات کے نہایت قابل قدر ماخذ ہیں"۔ [۳]

پروفیسر خلیق احمد نظامی مرتب روزنامچہ عبداللطیف ص ۹۶، ۹۷ و ۱۶۲، ۱۶۳ پر لکھتے ہیں:۔

"جب زمانے میں شور و شر پھیلا تو مولوی فضل حق خیرآبادی نے دہلی کا عزم کیا اور بارگاہ میں باریابی کے آرزومند ہوئے اور نذر اور نثار کے لئے بہت سا روپیہ پیش کیا"۔

"مولوی فضل حق نے مختلف علوم میں خاص مرتبہ حاصل کیا تھا۔ فن منطق میں ان کا علمی سرمایہ اجتہاد کے درجہ تک پہنچا ہوا تھا"۔

مشہور ادیب و مورخ رئیس احمد جعفری اپنی کتاب "بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد" ص ۸۹ میں لکھتے ہیں:۔

"وہ (فضل حق خیرآبادی) انگریزوں سے نفرت کرتے تھے۔ اور انگریزوں کو نکالنے کے لئے ہر منظم اور باقاعدہ تحریک میں حصہ لینے پر دل و جان سے آمادہ رہتے تھے چنانچہ غدر جب شروع ہوا تو مولانا بے تامل شریک ہو گئے۔ وہ بہادر شاہ کے

[۱] ۵۷ء کے ہیرو ص ۷۰ [۲] علم و عمل ترجمہ وقائع عبدالقادر خانی جلد اول ص ۲۵ [۳] سہ ماہی اردو کراچی جنوری ۶۴ء ص ۹۲ مقالہ از محمد ایوب قادری۔

معتمد، مقرب اور مشیر تھے۔ ان کے دربار میں شریک ہوا کرتے تھے انھیں اہم معاملات و مسائل پر مشورے دیتے تھے۔ اور اس بات کے ساعی تھے کہ آزادی کی یہ تحریک کامیاب ہو اور انگریز اس دیش سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جائیں۔ مولانا نے غدر میں دلیری اور جرأت کے ساتھ علانیہ حصہ لیا۔ انھوں نے متعدد والیانِ ریاست اور امرائے ہند کو اس تحریک میں شامل کرنے کی کوشش کی جس جس والیٔ ریاست سے ان کے ذاتی تعلقات و مراسم تھے۔"

۔۔۔۔ ۱۸۵۹ء میں مولانا فضل حق خیرآبادی کو مغلیہ حکومت کی وفاداری اور انگریزوں کے خلاف بغاوت میں شریک ہونے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔[۱]

"۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں مولانا فضل حق الور سے دہلی پہنچے اور دہلی سے بعد از خرابیٔ بسیار اودھ پہنچے۔ حضرت محل کی کورٹ کے ممبر ہوئے۔ بعد ازاں مولانا فضل حق گرفتار ہوئے۔ بغاوت کے جرم میں اس یگانۂ روزگار شخصیت پر مقدمہ چلا۔" [۲]

"۱۸۵۹ء میں جب غدر کے بعد انگریزوں کا تسلط ہو گیا تو اور لوگوں کے ساتھ مولانا فضل حق پر بھی جرم بغاوت عائد کیا گیا اور حبس دوام بعبور دریائے شور کا حکم ہوا۔" [۳]

"ہماری پہلی جنگ آزادی کے ہیرو بلاشبہ انگریزی فوجی اور سول افسران سے کسی طرح قابلیت اور حب الوطنی میں کم نہیں تھے۔ جنرل بخت خاں، جنرل محمود خاں، بیگم حضرت محل، مولانا احمد اللہ شاہ، سید لیاقت علی، مولانا فضل حق، خان بہادر خاں، نانا راؤ، تانتیا ٹوپی، شہزادہ فیروز شاہ، جھانسی کی رانی، محمد علی خاں عرف جیمی گرین وغیرہ مجاہدین کے لیڈر تھے۔ اور اپنی اپنی جگہ بڑی خوبیوں کے لوگ تھے۔"[۴]

سوویٹ یونین کی سائنس اکیڈمی کے ادارہ علوم شرقیہ کی ایک ممتاز رکن مادام پولونسکایا لکھتی ہیں:۔

---

[۱] آزادی کی جدوجہد ص ۳۵ از محمود الرحمٰن [۲] روزنامہ حریت کراچی ۹ جولائی ۱۹۷۶ء مضمون محمد ایوب قادری [۳] داستان تاریخ اردو ص ۳۲۹ از حامد حسن قادری [۴] مضمون جنگ آزادی کی کہانی انگریزوں کی زبانی از سید مصطفیٰ علی بریلوی ماہنامہ ترجمان اہلسنت کراچی جنگ آزادی نمبر ۱۹۷۵ء۔

"مولانا فضل حق الور تشریف لائے جہاں انھوں نے انگریزوں کے خلاف ایک مسلح بغاوت کا پرچار کیا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ وہ زمین دار جو برطانوی حکومت سے مطمئن نہیں ہیں۔ اس کی بنیادی طاقت ہوں گے۔ مولانا موصوف کے معاصرین اور ان کے سوانح نگاروں نے ان کے بہت سے خطوط کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے مختلف ریاستوں کے حکمرانوں کو لکھے تھے۔ انھوں نے برطانیہ کے خلاف ایک مسلح بغاوت کا پیغام دیا تھا۔ بغاوت کے زمانے میں مولانا انگریزوں کے مخالفوں کی صف میں رہے"۔۔۔۔

"مولانا فضل حق خیرآبادی کے سماجی اور سیاسی نظریات سامراجی محکومی کے جوئے سے ملک کو آزاد کرنے کی اس خواہش کے آئینہ دار تھے جو پوری قوم کے سینے میں پروان چڑھ رہی تھی۔ اس حیثیت سے ان کی جملہ سرگرمیاں ہندوستان کے قومی مفاد کو پورا کرتی تھیں"۔[1]

محترم عرشی صاحب کے مضمون بعنوان "مولانا فضل حق خیرآبادی اور ۱۸۵۷ء کا فتویٰ جہاد" مطبوعہ ماہنامہ تحریک دہلی بابت ماہ اگست ۱۹۵۷ء نے اہل علم میں کیسی غلط فہمیاں پیدا کیں اس کا اندازہ جناب مالک رام کے مضمون "مولانا فضل حق خیرآبادی" مطبوعہ ماہنامہ تحریک دہلی بابت ماہ جون ۱۹۶۰ء سے لگایا جا سکتا ہے جو عرشی صاحب کی تائید میں فتویٰ جہاد کے ساتھ مطلق شرکتِ جہاد سے بھی انکار کر بیٹھے۔

ناطقہ سر بگریباں ہے کہ اسے کیا کہیے۔

اسی قسم کی غلط فہمی کی عکاسی مندرجۂ ذیل مکتوب کر رہا ہے۔

۷۸۶

"کامٹی ضلع ناگپور مہاراشٹر
مورخہ ۳ر مارچ ۱۹۸۲ء

معظم و محترم جناب مولانا عبدالشاہد خاں صاحب شروانی مدظلہ العالی۔ سلام و رحمت۔
بہت برسوں سے جناب سے غائبانہ تعارف ہے۔ اب پہلی بار قلمی تخاطب

[1] پندرہ روزہ سودیٹ دیس دہلی۔ ۱۰ر جولائی ۱۹۵۸ء

کا شرف حاصل کر رہا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
سہ روزہ دعوت کی ۲۰ فروری ۱۹۸۲ء کی اشاعت میں مولانا فضل حق خیرآبادی
کے فتویٰ جہاد پر آپ کا توضیحی مضمون (بجواب مضمون حکیم نجمی سکندرپوری مطبوعہ
سہ روزہ دعوت دہلی مورخہ ۱۳ ۲/۸۲ء) نظر نواز ہوا۔ ماہنامہ تحریک کا وہ پرچہ میرے
پاس بھی محفوظ ہے جس میں مولانا عرشی کا مضمون شائع ہوا ہے ! اس مضمون نے
علمی حلقوں میں بڑی غلط فہمی پیدا کی ہے ! اور اس کے اثرات بھی بہت ہوئے
ہیں ۔ میں بھی اس مضمون سے ذہنی طور پر کشمکش میں مبتلا رہا ہوں ۔ اب
جناب کے توضیحی مضمون سے اطمینان کی صورت پیدا ہوئی ۔ اتنے اہم اور
تاریخی معاملہ میں اتنی طویل عرصے تک خاموشی مناسب نہیں تھی ۔ بہر حال
پھر بھی اب آپ کے ذریعے قلمی طور پر جو کچھ ہوا وہ غنیمت ہے جس کے لئے
علمی دنیا آپ کی شکر گزار ہوگی !

زیادہ والسلام ۔ محتاج دعا ۔ محمد ظہیر وارثی ۔
مقام کامٹی ضلع ناگپور ۔ مہاراشٹر "

اپنے مٹنے کی ہمیں کچھ نہیں پروا لیکن
تو نے سوچا ہے کچھ اپنا بھی زیاں اے ساقی

مقدمہ کی کارروائی ، معاصرین و مؤرخین کی شہادتیں اور انگریزوں کے بیانات
کی روشنی میں محترم بزرگ مولانا امتیاز علی خاں عرشی رامپوری اور جناب مالک رام صاحب
کے نظریۂ عدمِ شرکتِ جنگِ آزادی پر نظر ڈالیں تو آپ کو صاف نظر آئے گا ؂

حریفِ صافی و دردی نہ ای خطا ایں جاست
تمیز ناخوش و خوش می کنی بلا اینجاست

اور اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ :-

تفاوت ست میانِ شنیدنِ من و تو
تو بستن در و من فتحِ باب می شنوم

ہمارے یہ دونوں بزرگ ہمیشہ غازیٔ گفتار رہے غازیٔ کردار کبھی نہ بن سکے ساحل پر کھڑے ہوکر شناورانِ بحرِ بیکرانِ سیاست وجہادِ حریت کا تماشا دیکھتے رہے۔ ان کے عنفوانِ شباب سے ہندوستان کے دریائے جنگِ آزادی میں دیوں تلاطم ومدوجزر آئے مگر یہ اپنی عافیت پسندی اور راحت آشامی کے حصار سے باہر نہ نکل سکے جبکہ ہزاروں جواں مرد اور باہمت خواتین مصائب انگیزی اور جاں سپاری کا مظاہرہ کرتے رہے۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اس موضوع پر "فضل حق خیرآبادی اور سن ستاون" مرتبہ مولانا حکیم محمود احمد برکاتی ٹونکی ثم کراچوی مطبوعہ برکات اکیڈمی کراچی ۱۹۷۵ء اور "اعتیاز حق" مرتبہ راجہ غلام محمد۔ (شائع کردہ مکتبہ قادریہ لاہور ۱۹۷۹ء والمجمع الاسلامی مبارکپور) خاص توجہ کی مستحق ہیں۔ یہ دونوں کتابیں ہماری بھی ماخذ رہی ہیں۔

———— • ● • ————

مقدمہ سے متعلق پوری روداد آپ نے پڑھ لی۔ اب الثورۃ الہندیہ کے متعلق مفحکہ خیز شبہات پر بھی نظر ڈال لیں۔

محترم نادم سیتاپوری اپنی کتاب "غالب نام آورم" میں اندھیرے میں تیر چلاتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ الثورۃ الہندیہ اور قصائد فتنۃ الہند کے کوئلوں اور پنسل سے لکھے ہوئے منتشر پرزے جب مولانا عبدالحق کو مفتی عنایت احمد کاکوردی کے ذریعے ملے تو وہ اپنے والد ماجد علامہ فضل حق کی رہائی کے لئے کوشاں تھے۔ انھیں خطرہ ہوگا کہ پرزے مرتب ہوکر حکام وقت کے ہاتھ لگ گئے تو رہائی مشکل ہوگی۔ اس لئے اس میں ترمیم کردی گئی ہوگی۔ [1]

اس کا جواب محترم محمد ایوب قادری نے دیا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

---

[1] غالب نام آورم صفحہ ۱۲۳۔

(۱) داخلی یا خارجی شواہد پیش کیے بغیر محض ظن وتخمین سے رسالہ وقصائد کو مشکوک قرار دینا درست نہیں ہے۔

(۲) یہ رسالہ و قصائد مولانا عبدالحق کی زندگی میں شائع نہیں ہوئے لہٰذا حکومت کے خوف کی بنا پر تحریف و ترمیم کی ضرورت کیا تھی۔

(۳) اس رسالہ و قصائد میں حکومت برطانیہ پر سخت تنقید کی گئی ہے! اگر حکومت کے خوف سے ترمیم کی گئی ہوتی تو لب و لہجہ نرم ہوتا۔

(۴) ۱۲۷۷ھ میں مفتی عنایت احمد کاکوروی رہا ہوکر آئے۔ ایک دو ماہ کے بعد رسالہ اور قصائد مولانا کو پہنچے ہوں گے۔ ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ کو علامہ فضل حق کا وصال ہو جاتا ہے اس لیے یہ بات قرین قیاس ہے کہ مولانا عبدالحق نے علامہ کے وصال کے بعد رسالہ و قصائد کی طرف توجہ دی ہوگی۔ لہٰذا علامہ کی رہائی کے لیے کوشش ان کی ترتیب سے مانع نہ ہوئی ہوگی۔ [۱]

میرے خیال سے قادری صاحب کو جواباً ان دلائل کی ضرورت ہی نہ تھی۔ نادم صاحب زبان عربی اور اس کے ادب سے نابلد محض ہیں۔ علامہ کے اسلوب بیان اور طرز نگارش کو وہ خود تو کیا سمجھ سکتے ہیں بڑے سے بڑا ماہر لسان ولغت بھی کتب لغات کی مدد کے بغیر علامہ کے مفہوم تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر کوئی ترمیم کی گئی ہوتی تو وہ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند ہوتی۔

اب خود محمد ایوب قادری صاحب کا شبہ ملاحظہ فرمائیں اسی مضمون میں لکھتے ہیں:

"جزائر انڈمان و نکوبار میں دفتر قائم ہوچکا تھا۔ اسکول کھل چکا تھا۔ عدالتی کارروائیاں جاری تھیں۔ وہاں کے انگریز حکام کی اجازت سے تصنیف و تالیف کا کام جاری تھا تو پھر کوئے سے لکھنے کا کیا قرینہ؟

مولانا مفتی عنایت احمد کاکوروی انڈمان سے رہا ہوکر آئے تو اپنے ساتھ اپنی تین کتابیں بھی لائے جن میں سے تواریخ حبیب الٰہ اور علم الصیغہ شائع ہوکر مقبول عام ہوئیں۔ جب یہ تین کتابیں بحفاظت پہنچ گئیں تو رسالہ اور

[۱] جزائر انڈمان و نکوبار میں مسلمانوں کی علمی خدمات۔ سہ ماہی اردو جنوری ۱۹۶۸ء ص ۶۲ و ۶۳

قصائد کے پہنچنے سے کیا مانع تھا ؟

کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا ؟

موصوف نے سوچا کہ تا دم سیتاپوری دور کی کوڑی لائے تو بھی کیوں محروم رہوں لیاقت آشکارا کرنے کے لئے کوئی نئی بات پیدا کرنی چاہیئے۔

رسالہ وقصائد کو علم الصیغہ اور تواریخ حبیب الٰہ اور "غدر" کے حالات کو موجودہ حالات پر قیاس کرنا انھیں جیسے مفکر کا کام ہوسکتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد تعارف باغی ہندوستان میں تحریر فرماتے ہیں:-

"حال اس زمانے کا دوسرا تھا۔ غدر کے حوادث کا تذکرہ اور پھر ایسے شخص کی زبانی جسے بجرم بغاوت مدۃ العمر قید کی سزا دی گئی تھی۔ زیادہ سے زیادہ خطرناک بات یقین کی جاتی تھی۔"

تواتر روایت کی تغلیط کی جسارت بڑی ہمت چاہتی ہے جو کسی قادری صاحب کے پاس کہاں۔

خود لکھتے ہیں کہ تواریخ حبیب الٰہ اور علم الصیغہ شائع ہوکر مقبول عام ہوئیں۔ یہی بات تھی تو رسالہ وقصائد ۱۹۴۷ء تک کیوں شائع ہوکر مقبول عام نہ ہوئے ؟ اور کیوں ان کی معدودے چند نقلیں خواص نے حرز جاں بناکر رکھیں۔

بزرگوں پر لکھ کر بھیجنے میں مصلحت یہی تھی کہ اگر راہ میں کسی کے ہاتھ لگ جائیں کچھ ہاتھ نہ آئے۔ اس کی ترتیب میں خلف الرشید مولانا عبدالحق جیسے فاضل کو کیا کیا دقتیں پیش آئی ہوں گی۔ یہ وہی جانتے ہوں گے۔ مولانا تو "الولد سر لابیہ" تھے کہ فائز المرام ہوگئے۔ ؎

ہرچہ در طبع تو نہ آید راست
تو ندانستہ ای گو کہ خطاست

تضمین حرماں خیر آبادی بر نعت حضرت رضا بریلوی ؒ

وصفت زبشر ہم نا ممکن ہستی ممدوح خدا جانا
من یا ہے بچار کرت تسدن تو ہے پر کہن ہار گیا جانا
کہتی ہے یہی چشم باطن ، میں نے تو تجھے یکتا جانا
لم یات نظیرک فی نظر مثل تو نہ شد پیدا جانا
جگ راج کا تاج تورے سر سو ہے تجھکو شہ دوسرا جانا

رحم اے شافع روز جزا ، شد غرقہ بحر گنہ دل ما
من کوان لوگ کا روگ لگا جن چاہے نہ آپ بلیں نہ خدا
کرتا ہوں یہی دن رات دعا ، اے ساقی چشمۂ کوثر آ
الموج علا و البحر طغیٰ ، من بیکس و طوفاں ہوش ربا
منجدھار میں ہوں بگڑی ہے ہوا ، موری نیّا پار لگا جانا

من تیرہ نصیب سیاہ عمل ، دارم ہمہ عقدۂ لاینحل
نہ تو کام کی آس نہ کام کا بل ، موری چت کو دھیر نہیں اک پل
اب تو چاہے تو مجھے کل ، تر ہو سوکھی ہوئی یہ کشت عمل
لک بدر فی الوجہ الاجمل ، خط ہالۂ مہ زلف ابر اجل
تورے چندن چندر پرو کنڈل ، رحمت کی بھرن برسا جانا

تا چند کشم بہ فراق تو غم ، تا کے خورد نوش سر شک الم
ہر آن کا راج بڑھے جم جم ، سدھ کا ہے بسار دئی ہیتم ،
میں تشنۂ شوق ہوں تیری قسم ، تپ ہجر سے البو ن ہے دم
انا فی عطش و سخاک اتم ، اے گیسوئے پاک اے ابر کرم
برسن ہارے رم جھم رم جھم ، دو بوند ادھر بھی گرا جانا

بگذشت بہ لہو و لعب طفلی، ایام شباب بہ بے خبری
اب تیرے نیت کی لاگ لگی، یا چھیے پران نکس جائی
جز تیرے نہیں دنیا میں کوئی، جو روز دہاں جائے قطعی
یا شمس نظرتِ الی لیلی چو بہ طیبہ رسی عرضے بکنی

تورے جوت کی جھل جھل جگ میں رچی، مری شب نے نہ دن ہونا جانا

از گردشِ بخت و جفائے فلک، ہستم در امن و اماں اینک
اب جات رہی جیرا کی کسک، نہ دہ ٹیس رہی نہ دکھ نہ تپک
لیکن یہ مزا ہے، اسی در تک، اسمیں نہیں شک اسمیں نہیں شک
یا قافلتی زیدی اجلک رحمے بر حسرتِ تشنہ لبک

مورا جیرا لرجے درک درک طیبہ سے ابھی نہ سنا جانا

یا شاہ دخبر گراست، نہ دارم بادست غم فرقت
تجلائے دی توری کارنمت، موئے سیس سوا ہے سیل کو ست

حسرت ہے اگر تو یہی حسرت، کہ وہیں بھول جائے مجھے قسمت
دا ہا لسو، لعاتِ ذہبت، آں عہد حضورِ بار گہت

جب یاد آوت موہے کو نہ پرت، درداوہ طیبے کا جانا

چہ کنم شکرِ کرم تو ادا، نہ دہن دارم نہ زباں بخدا
داتا تو راج بڑھائے سوا، حرماں کی بھی تسدکن ہے یہ دعا
ملنے میں جو مجھ کو ملا ہے مزا، واللہ میں کچھ کہہ نہیں سکتا
الروح فداک فزد حرقا، یک شعلہ دگر برزن عشقا

مورا تن من دھن سب پھونک دیا، یہ جان بھی پیارے جلا جانا

علامہ فضل حق خیر آبادی کی صاحبزادی بی بی
سعیدۃ النساء حرماں کی تضمین بر نعت امام احمد رضا

۲